BAHS501CCT

تاریخ ہندوستان

(1750عیسوی تا 1885عیسوی)

History of India

(1750 A.D. – 1885 A.D.)

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

بیچلر آف آرٹس (بی۔اے۔)

(پانچواں سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-بھارت

©Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Course: History of India (1750 A.D. – 1885 A.D.)
ISBN: 978-81-969329-7-8
First Edition: January 2024

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2024
Copies	:	1200
Price	:	340/- (The price of the book is included in the admission fee of distance mode students)
Copy Editing	:	*Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha, Programme Coordinator–History, DDE, MANUU, Hyderabad Dr. Syed Meer Abul Hussain, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad Mr. Mohd Aasim, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, Asst. Professor of Urdu (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Print Time and Business Enterprise, Hyderabad

History of India (1750 A.D. – 1885 A.D.)

for

B.A. 5th Semester

On behalf of the Registrar, Published by:
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad – 500 032 (TS), Bharat
Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing from the publisher (registrar@manuu.edu.in).

مدیر
(Editor)

Vidya Vachaspati **Shaik Mahaboob Basha**
Programme Coordinator – History
DDE, MANUU, Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کوآرڈی نیٹر، تاریخ، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مجلس ادارت
(Editorial Board)g

Prof. S.M. Azizuddin Husain
Former Head, Department of History & Culture
Jamia Millia Islamia, New Delhi

پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین
سابق صدر، شعبہ تاریخ و ثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

Prof. Mushtaq Ahmad Kaw
Former Head, Department of History
Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

پروفیسر مشتاق احمد کاؤ
سابقہ صدر شعبہ تاریخ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Prof. Perwez Nazir
Centre for Advanced Studies, Department of History
Aligarh Muslim University, Aligarh

پروفیسر پرویز نظیر
سینٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز، شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Prof. Alauddin Khan
Head, Department of History
Shibli National College, Azamgarh

پروفیسر علاؤالدین خان
صدر، شعبہ تاریخ، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

Dr. Syed Meer Abul Hussain
Assistant Professor of History (C) / Guest Faculty
DDE, MANUU, Hyderabad

ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی، نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Mohd Aasim
Assistant Professor of History (C) / Guest Faculty
DDE, MANUU, Hyderabad

محمد عاصم
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی، نظامت فاصلاتی تعلیم،
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مدیر زبان
(Language Editor)

Dr. Mohd. Akmal Khan
Assistant Professor of Urdu (C) / Guest Faculty
DDE, MANUU, Hyderabad

ڈاکٹر محمد اکمل خان
اسسٹنٹ پروفیسر اردو (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی، نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

کورس کوآرڈی نیٹر

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

اسسٹنٹ پروفیسر (تاریخ)، نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد

مصنفین	اکائی نمبر
• محمد عاصم	اکائی 1،2،4،5،24
• پروفیسر علاؤالدین خان	اکائی 3،6
• سعید احمد	اکائی 7،8،9
• ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	اکائی 10،11،12،13
• ڈاکٹر داؤد ابراہیم	اکائی 14،17
• ڈاکٹر کھانڈے پرویز احمد	اکائی 15
• ڈاکٹر خورشید احمد بٹ	اکائی 16،21
• ڈاکٹر فردوس حمید پرے	اکائی 18،20
• ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا	اکائی 19
• پروفیسر مجیب اشرف	اکائی 22،23

پروف ریڈرس:

اول	:	محمد عاصم
دوم	:	سید میر ابوالحسین
فائنل	:	شیخ محبوب باشا

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	9
بلاک I	**یورپیوں کی آمد**	
اکائی 1	ابتدائی یوروپی آبادیاں-I: پرتگالی، فرانسیسی اور ڈچ	13
اکائی 2	ابتدائی یوروپی آبادیاں-II: برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی	30
اکائی 3	اینگلو-فرانسیسی عداوت اور کرناٹک کی جنگیں	48
اکائی 4	پلاسی اور بکسر کی جنگیں	62
اکائی 5	پیشواؤں کا عروج: مراٹھا وفاق اور اینگلو-مراٹھا جنگیں	77
اکائی 6	حیدر علی اور ٹیپو سلطان اور اینگلو-میسور جنگیں	100
اکائی 7	اینگلو-سکھ جنگیں	114
بلاک II	**ہندوستان میں نوآبادیاتی نظم ونسق**	
اکائی 8	دوہرا نظام حکومت اور دیوانی اختیارات کی تفویض	127
اکائی 9	ریگولیٹنگ ایکٹ-1773 اور پٹس انڈیا ایکٹ-1784ء	139
بلاک III	**ہندوستانی معیشت**	
اکائی 10	استمراری بندوبست	149
اکائی 11	رعیت واری اور محل واری بندوبست	159
اکائی 12	دولت کی نکاسی	169
اکائی 13	برطانوی صنعتی پالیسی: عدم صنعتکاری	184

بلاک IV	**ہندوستانی سماج**	
اکائی 14	18ویں اور 19ویں صدی میں ہندوستانی سماج	198
اکائی 15	جدید تعلیم کا ارتقاء	209
اکائی 16	تعلیم نسواں کی ترقی	223
بلاک V	**19ویں صدی میں سماجی-مذہبی اصلاحی تحریکیں**	
اکائی 17	سماجی اصلاحی تحریکوں کے ابھرنے کے اسباب	244
اکائی 18	شمالی ہندوستان میں سماجی-مذہبی اصلاحی تحریکیں	255
اکائی 19	جنوبی ہندوستان میں سماجی-مذہبی اصلاحی تحریکیں	275
اکائی 20	مغربی ہندوستان میں سماجی-مذہبی اصلاحی تحریکیں	295
بلاک VI	**مزاحمت**	
اکائی 21	1857ء سے پہلے مزاحمتی تحریکیں	315
اکائی 22	1857ء: پہلی جنگ آزادی: نوعیت اور اسباب	331
اکائی 23	پھیلاؤ، قیادت اور ناکامی	343
اکائی 24	ملکہ وکٹوریہ کا اعلامیہ اور انتظامی تنظیم نو	363
نمونہ امتحانی پرچہ		383

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1)اردو زبان کی ترویج و ترقی (2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور(4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جواِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔یہی کیفیت اکثر رسائل واخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر ان شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم از سرِ نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈویژن سے ہوا اور اس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کر کے خود اکتسابی مواد SLM از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جا رہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِدست 161 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر محمد رضاء اللہ خان

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

عزیز متعلمین! آداب۔ کورس 'ہندوستان کی تاریخ (1750عیسوی تا 1885عیسوی) میں خوش آمدید۔ اس کورس میں آپ ہندوستان کی اٹھارویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک کی تاریخ کو سمجھیں گے۔ اس عرصے کے دوران ہندوستان کی تاریخ بہت سی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سولہویں صدی سے ہندوستان میں غیر ملکی یورپی تجارتی کمپنیاں آنے لگی تھیں، لیکن وہ ہندوستان میں علاقائی توسیع کے بجائے صرف تجارت سے سروکار رکھتی تھیں۔ زیر مطالعہ دور میں ان تجارتی کمپنیوں نے مغل سلطنت کے زوال اور حکمرانوں کی آپسی نااتفاقی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاسی معاملات میں مداخلت کی۔ فرانسیسی اس معاملے میں اول تھے لیکن آئندہ دور میں وہ اپنے رقیب انگریزوں سے پچھڑ گئے، جسے آپ اس کورس کے مطالعے سے بہتر طریقے سے سمجھ سکیں گے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ کیسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہ صرف اپنے یوروپی رقیبوں کو شکست دی بلکہ مقامی ہندوستانی طاقتوں جیسے بنگال، اودھ، حیدرآباد، میسور، مراٹھوں اور سکھوں پر بھی اپنی برتری ثابت کی۔ آپ کمپنی کے ذریعے اپنائی جانے والی، سیاسی، معاشی اور انتظامی پالیسیوں کو بھی سمجھ سکیں گے، جن کے ذریعہ اس نے اپنی حکمرانی کو مستحکم کیا اور معاشی اعتبار سے ترقی یافتہ ملک ہندوستان کو بدحال ترین ملک میں تبدیل کر دیا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ انگریزوں نے نہ صرف سیاسی اور معاشی میدان میں مداخلت کی بلکہ انہوں نے ہندوستانی سماج کو بھی بدلنے اور اپنے مفاد کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ نتیجتاً ملک میں بہت سی سماجی اور اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ان سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیوں اور انگریزوں کے ظلم و ستم کے نتیجے میں 1857 کی پہلی جنگ آزادی برپا ہوئی، جس نے ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی چولیں ہلا دیں۔ اس جنگ آزادی کو تو بیدردی سے کچل دیا گیا، لیکن ہندوستان میں برطانیہ کو متعدد اہم انتظامی تبدیلیاں کرنی پڑیں جن سے آپ کورس کے مطالعے کے بعد واقف ہو سکیں گے۔

حالیہ دور تک، تاریخ کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے عظیم کارناموں / بداعمالیوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ملکائیں بھی زیادہ تر اپنے عظیم مردوں کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں، تاریخ کو بادشاہوں اور ریاستوں، شہنشاہوں اور سلطنتوں، کے ناموں کی ایک لمبی فہرست سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ان کے ذریعے لڑی جانے والی جنگوں اور ان کی محبوباؤں وغیرہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ مختصراً، تاریخ کا مطلب سیاسی تاریخ تھا اور بدقسمتی سے یہ سوچ عام لوگوں کے ذہنوں پر ابھی بھی حاوی ہے۔ عام لوگ، محنت کش عوام، جو اصل تاریخ ساز تھے، شاید ہی کبھی تاریخ کے ڈرامے میں نظر آئے۔ لیکن، اب تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور اسی لیے تاریخ لکھنے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے۔ عام لوگ بشمول مرد و خواتین، نے تاریخ میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تاریخ کی توجہ حکمرانوں سے رعایا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ تیلگو شاعر سری سری (سری رنگم سری نواس راؤ) نے اپنی نظم میں مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، اب مورخین اس کی کھوج کرنا چاہتے ہیں اور تاریخ کے اندھیرے میں دبی پڑی سب کہانیوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ پوچھنے لگے کہ دریائے نیل کی تہذیب میں عام زندگی کیسی تھی اور تاج محل کی تعمیر میں پتھر ڈھونے والے قلی کون تھے اور سلطنتوں کے باہمی جنگوں میں عام لوگوں کی بہادری کیسی تھی۔ ناوہ ڈولی گنتی کی تھی چڑھ بیٹھا جس پر راجا، اس کے واہک قلی کون تھے؟' یہ بے حد ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ مشہور ادیب جارج اورویل نے تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ: 'جو ماضی کو قابو کرتے ہیں وہی مستقبل کو قابو کرتے ہیں: جو حال کو قابو کرتے ہیں وہی ماضی کو قابو کرتے ہیں۔' ممتاز مورخ پروفیسر کے ایس ایس شیشن نے زور دیا کہ 'تاریخ کا سماج سے وہی رشتہ ہے جو یادداشت کا فرد سے ہے۔' ودیاواچسپتی ایس ایم باشا کے مطابق جو ماضی کو اچھے سے سمجھتے ہیں، وہ حال کو بہترین طریقے سے سمجھ سکتے ہیں؛ اور اسی طرح ماضی کو اچھے ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے حال کا گہرا علم ضروری ہے۔

UGC-DEB کی ہدایات کے مطابق، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سیلف لرننگ مٹیریل لکھنے کے لیے بہترین مصنفین کو راغب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ نہ صرف آپ کی تعلیمی کارکردگی کے لیے کارآمد ثابت ہوگا بلکہ مختلف مسابقتی امتحانات کو اعتماد کے ساتھ دینے کے قابل بھی بنائے گا۔ ہم شعبہ تاریخ، نظامت فاصلاتی تعلیم میں، آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ کورس میں ایک بار پھر خوش آمدید اور میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

کورس کوآرڈی نیٹر

تاریخ ہندوستان

(1750عیسوی تا 1885عیسوی)

History of India

(1750 A.D. – 1885 A.D.)

اکائی 1۔ ابتدائی یوروپی بستیاں-I: پرتگالی، فرانسیسی اور ڈچ

(Early European Settlements–I: Portuguese, French, and Dutch)

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 پرتگالی نوآبادیت

1.2.1 پرتگالی ہندوستان میں

1.2.2 پرتگالی بحری سلطنت

1.2.3 پرتگالی تجارتی سلطنت کے ذرائع

1.2.4 پرتگالی تجارتی سلطنت کی نشوونما

1.3 ڈچ نوآبادیت

1.3.1 ڈچ تجارت کی نوعیت

1.3.2 ڈچ فیکٹریوں کا نظم ونسق

1.3.3 ہندوستانی سماج اور ریاست پر ڈچ 'تجارتی سلطنت' کا اثر

1.4 ہندوستان میں فرانسیسی

1.4.1 فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی

1.4.2 تجارتی سلطنت سے علاقائی سلطنت میں منتقلی

1.5 اکتسابی نتائج

1.6 کلیدی الفاظ

1.7 نمونہ امتحانی سوالات

1.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید (Introduction)

پندرہویں صدی میں مشرق وسطیٰ میں بدلتے سیاسی منظر اور تجارتی راستوں میں خلل نے یورپی تاجروں کو مجبور کردیا کہ وہ ہندوستان کے لیے نئے تجارتی راستے تلاش کریں۔ کافی کوششوں کے بعد یورپی تاجر پندرہویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے بحری ساحل پر پہلی بار وارد ہوئے۔ مئی 1498 میں واسکوڈگاما کا کالی کٹ پہنچنا، یورپ ایشیائی تجارت میں نئے دور کی ابتدا کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ سب سے پہلے پرتگالیوں نے ہی رأس امید (Cape of Good Hope) کے راستے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا تھا، اس لیے ابتدائی طور پر ہندوستان اور یورپ کے درمیان تجارتی سرگرمیوں پر ان کی ہی اجارہ داری قائم ہوگئی۔ تاہم پرتگال کے پاس ایک طاقتور تاجر طبقہ موجود نہیں تھا اور پرتگالی سمندر پار تجارتی مہم جوئی کی مالی اور سیاسی مدد پرتگالی بادشاہ ہی سے حاصل ہوتی تھی۔ سولہویں صدی کے آخر میں ڈچ اور انگریز کارپوریٹ تجارتی کمپنیاں، مقابلے کے میدان میں داخل ہوگئیں اور اس سے پرتگالی اجارہ داری کو چنوتی ملنے کی شروعات ہوئی۔ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل 1600 میں ہوئی اور ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی 1602 میں وجود میں آئی۔ فرینچ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی 1664 میں اپنے قیام کے بعد اس دوڑ میں شامل ہوگئی۔ اگرچہ ان کے اپنے وطن میں بھی واحد بڑے تجارتی کارپوریشنوں کا غلبہ تھا لیکن نجی تاجروں نے بھی کسی حد تک یورپ ایشائی تجارت میں حصہ لیا۔ یہ تجارتی سلطنتیں اپنے ملکوں کی بحری برتری کے ذریعہ قائم رہیں اور تجارت پر اجارہ داری قائم کرنے کی کوششیں کرتی تھیں۔ ان کی سرگرمیاں ہندوستان کے ساحلی بندرگاہ شہروں تک محدود تھیں اور بڑی حد تک مقامی ریاستوں کے اقتدار اعلیٰ پر اثرانداز نہیں ہوئیں۔ انہوں نے حصولیابی اور تجارت کے مقامی نظام کے پہلے سے موجود نیٹ ورک سے استفادہ کیا۔ وہ عام طور پر ہندوستانی سامانوں کو چاندی سونے (Bullion) کے بدلے میں حاصل کرتی تھیں۔ اس سے غیر ملکی تجارت کا توازن ہندوستان کے حق میں ہوگیا اور یہ معاشی ترقی کا ذریعہ بن گیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے لیے ہندوستانی حکمرانوں کا رویہ، نرمی اور رواداری پر مبنی تھا۔ تجارت اور بازار پر کنٹرول قائم کرنے سے جھگڑے بھی پیدا ہوجاتے تھے لیکن عموماً مسلح جنگی حکمت عملیوں سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ فرانسیسی وہ پہلے لوگ تھے جنھوں نے ہندوستان میں ایک طرح سے بڑے پیمانے پر علاقائی سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے بعد میں ان کی علاقائی توسیع کی پالیسی کو اپنایا، جس پر بعد میں ڈچوں نے بھی عمل کیا۔ تجارتی اجارہ داری اور علاقائی کنٹرول کے لیے ان یورپی طاقتوں کے درمیان جھگڑے بھی ہوجاتے تھے۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- کس طرح یورپی نوآبادیاتی طاقتیں، تاجروں کے طور پر ہندوستان پہنچی؟ اسے سمجھ سکیں گے۔
- یورپی تجارت کے ہندوستانی ریاست اور سماج پر پڑنے والے اثرات سے واقف ہوسکیں گے۔
- ابتدائی تجارتی سلطنتوں کے ذریعہ اپنائے گئے تسلط کے مختلف طریقوں کو جان سکیں گے۔

- ایشیا اور ہندیورپی تجارت میں یورپی تاجروں کے کردار اور ان کے انتظامی طریقہ کار کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- ان کے بحری تجارتی طاقتوں سے علاقائی طاقت بننے تک کے بارے میں پڑھیں گے۔
- ہندوستانی افواج میں یورپی فوجیوں کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔

1.2 پرتگالی نوآبادیت (Portuguese Colonisation)

1.2.1 پرتگالی ہندوستان میں (The Portuguese in India)

واسکوڈی گاما کی مہم جو راس امید کا چکر لگانے کے بعد مئی 1948 میں کالی کٹ پہونچی، اسے کئی مقاصد کے ذریعہ ترغیب ملی تھی۔ پرتگالی بادشاہ ڈی۔ مینوئل (D. Manuel، 1495تا1521) کی خواہش تھی کہ ہندوستان تک سیدھا سمندری راستہ دریافت کیا جائے۔ یہ خواہش بنیادی طور پر تجارتی مقصد کے لیے تھی، اگرچہ کبھی کبھی یہ تبدیلی مذہب کے عیسائیت کے مشن کے بھیس میں چھپی ہوتی تھی۔ پرتگالیوں کا بنیادی مقصد ہندیورپی مسالوں کی تجارت (اس زمانے کی نفع بخش تجارت) پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے ذریعہ خود کو اور اپنی ریاست کو خوشحال بنانا تھا۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے فوجی طاقت کا بھی استعمال کرتے تھے اور کوچین (Cochin) اور کینور (Cannanore) میں قلعے بھی بنائے گئے۔ 1505 میں پہنچنے والا پہلا پرتگالی وائسرائے، فرانسسکو ڈی المیڈا (Francisco d' Almeida) ہندوستان میں پرتگالیوں کے تجارتی اور علاقائی ڈھانچے کو مضبوط کرنے میں بہت زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ یہ الفانسو ڈی البقرق (Alfonso de Albuquerque) تھا جس نے (1509تا1515) پرتگالی علاقائی سیاسی ساخت کو ٹھوس شکل دی۔ اس نے ہندوستان میں متعدد بندرگاہ والے شہروں اور بحر ہند میں جزائر پر تیزی سے قبضہ کیا۔ 1510 میں گوا (Goa) پر اور اس کے بعد 1511 میں ملکا (Malacca) پر قبضہ کر لیا گیا۔ 1515 میں ہرمز (خلیج فارس کے دہانے) بھی پرتگالی قبضے میں چلا گیا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان قبضوں کے بعد پرتگالی نوآبادی میں کافی کم ہی علاقائی توسیع ہوئی لیکن ان کی دفاعی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ 1518ء میں سری لنکا میں کولمبو کا قلعہ تیار ہوا۔ 1530 میں 'گوا' ہندوستان میں پرتگالی تجارتی 'سلطنت' کی راجدھانی بنا۔ اس کے بعد سولہویں صدی میں اور بھی کئی علاقوں پر فتح حاصل کی گئی۔ پرتگالیوں نے دیو (Diu)، دمن (Daman) اور بیسین (Bassein) پر بھی قبضہ کر لیا، اس طرح گجرات سے ہونے والی تجارت پر ان کا تسلط قائم ہو گیا۔ انہوں نے مالابار سے تجارت پر کنٹرول کے لیے کونکن اور مالابار کے ساحل کو بھی اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ سولہویں صدی کے آخر میں ان کے پاس تقریباً پچاس قلعوں اور سو جہازوں کا ایک طاقتور بحری بیڑہ تھا۔ تجارتی اور علاقائی 'سلطنت' کی تعمیر کے اس عمل میں بعض اوقات مقامی حکمرانوں نے بھی پرتگالیوں کی مدد کی۔ مثال کے طور پر، کوچین کا راجہ اپنے محض نام کے فرمانروا کالی کٹ کے زیمورین کے مقابلے اپنی طاقت بڑھانے کے چکر میں پرتگالیوں کی کٹھ پتلی بن گیا۔ اس پوری صدی میں پرتگالیوں کے تجارتی اور بحری جہازوں کو جزوی طور پر مقامی لوگوں سے بھرتی کیے گئے عملے اور سپاہیوں کے ذریعہ چلایا جاتا تھا۔

1.2.2 پرتگالی بحری سلطنت (The Portuguese Naval Empire, 1500–1640)

پرتگالیوں کی کوششوں سے بنائی گئی یہ سلطنت کوئی علاقائی سلطنت نہیں تھی، بلکہ ایشیا اور مشرقی افریقہ کے درمیان یہ ایک سمندری نیٹ ورک تھا جس کے اندر علاقے، ادارے، جہاز، افراد اور انتظامی بندوبست، پرتگالی حکمرانی کے تحت رکھے گئے تھے۔ لسبن (Lisbon) میں '*Casa da India*' نامی ایک شاہی تجارتی فرم اس بحری 'سلطنت' کی سربراہی کرتی تھی۔ بادشاہ کے علاوہ، یورپ کے مختلف ملکوں کے تاجر، مہاجن اور بینک کار اس 'کاسا دا انڈیا' سے وابستہ تھے جو ایشیا سے واپسی پر تجارتی سامان کے حصول اور نقل و حمل میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ ایشیا میں کاروباری ادارہ جس انتظامی ساخت کے کنٹرول میں تھا اسے '*Estada da India*' (ہندوستانی ریاست) کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اس کی سربراہی گوا کا وائسرائے کرتا تھا جو مشرقی افریقہ سے لے کر ملکا اور مکاؤ (Macao) تک پوری بحری سلطنت کی شہری اور فوجی حکومت کا سربراہ تھا اور صرف بادشاہ کو جواب دہ تھا۔ غیر رسمی کونسلیں جو وائسرائے کی خواہش پر طلب کی جاتی تھی، ان سے وائسرائے کی مدد کے لیے صرف مخصوص، عموماً فوجی امور پر صلاح حاصل کی جاتی تھی۔ ابتدائی طور پر کوئی مقررہ رکنیت یا معاملات کو انجام دینے کے لیے طریقہ عمل نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے یہ کونسلیں باقاعدہ اداروں میں تبدیل ہو گئیں۔ صدر کے طور پر وائسرائے کے علاوہ اس میں گوا کے آرک بشپ، محتسب اعلیٰ، گوا کے بعض اہم فڈالگو (fidalgos) یا معزز شہری، گوا شہر کے کپتان، ہائی کورٹ کے منصف اعلیٰ اور مالیاتی افسر اعلیٰ شامل ہوتے تھے۔ گوا کے نظم و نسق کے لیے ایک بلدیہ کونسل بھی تھی جس کا انتخاب پرتگالیوں اور یورپ ایشیائی آبادی کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ ماتحت قلعوں اور بستیوں میں گوا میں قائم انتظامی ساخت کی نقل کی گئی۔ قلعوں اور ان کے کپتان کا خاص مقصد یورپی مسالوں کی تجارت اور ایشیا میں مختلف مخصوص بندرگاہوں کے درمیان تجارت پر اجارہ داری (monopoly) کو یقینی بنانا تھا تاکہ اس کو محصول نظام کے تحت لایا جائے اور بحر ہند میں اس کے بہاؤ پر قابو رکھا جائے۔ کپتان اور دیگر پرتگالی باشندے اپنی خود کی ذاتی تجارت میں بھی مشغول رہتے تھے۔ ہندوستان میں پرتگالی بحری سلطنت مقامی تاجروں کی بحری تجارت کو کنٹرول کرنے اور محصول عائد کرنے کے ذریعہ قائم رہی۔ سولہویں صدی میں در حقیقت کل سلطنت میں درآمد برآمد پر چنگی سے حاصل ہونے والی آمدنی کل محاصل کی تقریباً 60 تا 65 فیصد تھی۔ ہم اس میں محصولات کی دیگر مدوں کو بھی شامل کر سکتے ہیں جو بحری تجارت پر نگرانی رکھنے کے ذریعہ مثلاً پکڑے گئے ایشیائی جہازوں سے مال غنیمت کے طور پر حاصل کی جاتی تھی۔

ایشیاء میں پرتگالیوں کے ذریعہ جو اہم اشیا حاصل کی جاتی تھیں وہ مسالے خاص طور پر کالی مرچ ہوا کرتی تھیں۔ پرتگالی بڑی تعداد میں ان اشیا کو مالابار علاقے سے اور بعد میں ہندوستان کے جنوب مغرب ساحل پر واقع کنارا سے حاصل کرتے تھے۔ پرتگال سے ہندوستان کو قیمتی دھاتوں کی تجارت اور ہندوستان سے پرتگال کو مسالے کی تجارت پر 1506 سے شاہی اجارہ داری قائم تھی۔ اجارہ داری والی اشیا میں نجی تجارت کی اجازت صرف بحری عہدیداروں اور شاہی لائسنس کے تحت مخصوص افراد کو ہوا کرتی تھی۔ شاہی گھرانے کو مالیات کی فراہمی کے ذریعہ نجی تاجر بالواسطہ طور پر اس میں شرکت کرتے تھے۔ ہندوستان میں پرتگالی ریاست، ہندوستان سے کالی مرچ حاصل کرتی تھی اور سولہویں صدی کے وسط تک اسے انٹ ورپ اور اس کے بعد لزبن میں فروخت کرتی تھی۔ 1564 کے بعد بادشاہ کالی مرچ کی تجارت پر اپنی

اجارہ داری برقرار نہیں رکھ سکا اور اسے نجی تجارتی فرموں کو اس میں شریک کرنا پڑا۔ 1575 میں کالی مرچ کی تجارت کی شاہی اجارہ داری آگسبرگ کے تاجر کونراڈ روٹ (Konrad Rott) اور ملان کے تاجر رووالیسکا (Rovalesca) کو 32 کروزادوس (Cruzados) فی کنٹل کی شرح پر سونپ دی گئی۔ اس کے بعد بادشاہ نے دیگر تاجر گھرانوں کو بھی اس میں شریک کیا ساتھ ہی اس نفع بخش تجارت میں اپنا بھی کچھ حصہ برقرار رکھا۔ اس معاہدے کا نظام 1598 تک چلا جب مسالے کی بحری تجارت میں برٹش اور ڈچ لوگوں سے ملنے والے زبردست چنوتی کے سبب کالی مرچ کے معاہدہ کاروں کے لیے تجارت غیر منفعت بخش ثابت ہونے لگی۔ 1628 میں پرتگالی انڈیا کمپنی کی تشکیل کا تجربہ بھی کامیاب نہیں ہوا اور 1633 میں یہ کمپنی بھی تحلیل کر دی گئی۔

کالی مرچ اور دیگر اشیاء کے حصول کے لیے پرتگال سے ایشیا بھیجے جانے والے سامان میں قیمتی دھاتیں (مغربی افریقی سونا اور امریکی چاندی کا ڈھلا ہوا ریال سکہ) غیر قیمتی دھاتیں جیسے تانبہ، جستہ، ٹن، سیال پارہ (Quicksilver)، پارہ اور کچھ مقدار میں مونگا، المونیم، زیتون کا تیل اور شراب بھی شامل تھے۔ غیر قیمتی دھاتوں میں تانبہ کو کچھ عرصے کے لیے سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ پرتگالی بین ایشیائی تجارت میں بھی شامل تھے، جو کہ قدر و قیمت کے لحاظ سے غالباً گوا اور لسبن کے درمیان تجارت کے مقابلے زیادہ بڑی اور منافع بخش تھی۔ حالانکہ نجی تاجروں نے اس بین ایشیائی تجارت سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ پرتگالی بین ایشائی تجارت کا ایک حصہ لزبن کو ملکائی مسالے کی برآمد کے ساتھ جاری رہا جو کہ ملکا کو خاص طور پر ہندوستانی کپڑے کی برآمد کے ذریعہ حاصل کیا جاتا تھا۔ ابتداء ہی سے یہ بادشاہ کی ایک ڈھیلی ڈھالی اجارہ داری تھی جس میں شاہی جہازوں کے عملے کو تجارت میں حصہ لینے کی اجازت تھی۔ منتخب ریاستی عہدیداروں کو بھی کسی حد تک اس میں شامل ہونے کی منظوری دی گئی تھی۔ وسائل کی قلت کے چلتے نجی تاجروں کو بھی اس میں شریک ہونے کی اجازت دی گئی۔ چونکہ جہاز کے کپتان اپنی خود کی تجارت کے لیے بھی شاہی جہازوں کا استعمال کرتے تھے، لہٰذا بادشاہ کی شرکت سامان کی ترسیل سے متعلق خدمات کو فراہم کرنے تک محدود تھی اس طرح اس سے شاہی منافع کم ہو رہا تھا۔ 1540 اور 1550 کے دوران، پرتگالی ریاستی مالیات کی حالت مزید ابتر ہو گئی اور بادشاہ نے بین ایشیائی تجارت میں شرکت جاری رکھنے کو غیر نفع بخش پایا۔ بادشاہ کے لیے اس کی اجارہ داری قائم رکھنا مشکل تھا کیونکہ شاہی گھرانے کے پاس اس کے تحفظ کے لیے ضروری مالی وسائل نہیں تھے۔

1.2.3 پرتگالی تجارتی سلطنت کے ذرائع (Sources of the Portuguese Commercial Empire)

آپ جانتے کہ جیسے ہی پرتگالی ہندوستان پہنچے۔ انہوں نے کامیابی کے ساتھ مسالوں کی تجارت کو اپنی اجارہ داری بنانے کی کوشش کی۔ پوری سولہویں صدی میں لسبن اور گوا سے ملے احکامات اور ہدایات کے سلسلے نے یہ بات واضح کر دی کہ مسالوں کی تجارت پرتگالی بادشاہ اور اس کے گماشتوں کے لیے محفوظ تھی۔ اس اجارہ داری کو سختی کے ساتھ نافذ کیا گیا اور پرتگالیوں کی بحری برتری نے اس میں اہم کردار نبھایا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بحری تجارت کی ضابطہ بندی اور کنٹرول ضروری تھا۔ بادشاہ نے اجارہ دارانہ بنیادوں پر ایشیا میں مخصوص مقامات کے لیے مہمات کا انتظام کیا۔ صرف نامزد جہاز ہی کسی مخصوص سال میں مقررہ سمندری سفر کر سکتے تھے۔ شاہی جہازوں کے مال تجارت کی جگہوں کو ابتدائی سولہویں صدی میں اونچی شرح پر نجی تاجروں کو فروخت کیا جاتا تھا۔ بادشاہ نے 1540 کے دہے کے بعد اس

تجارتی مہم کو مہنگا پایا کیونکہ جہازوں کی تعمیر کافی مہنگی ہو چکی تھی۔ پرتگالی ریاست نے نجی تاجروں اور افراد کو لائسنس (اجازت نامہ) جاری کرنے کی شروعات کی، تاکہ اس طرح کی تجارتی مہموں کو جاری رکھا جائے۔ یہ لائسنس مختلف بنیادوں پر دیے جاتے تھے جیسے فوجی خدمات کے صلے کے طور پر، ممتاز لیکن مفلس میڈا ئکو کی بیٹیوں کے لیے جہیز کے طور پر کسی مخصوص عہدے کی مطلوبہ شرائط کے طور پر۔ لیکن اکثر ان لاسینسوں کو اونچی بولی لگانے والے کو دیا جاتا تھا اور اس طرح حاصل کرنے والوں کے لیے یہ نہایت منافع بخش ثابت ہو سکتا تھا۔

پرتگالیوں نے بحر ہند میں دیگر تاجروں کے ذریعہ انجام دی جانے والی تجارت پر کنٹرول کرنے اور ٹیکس عائد کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے خصوصی ذریعہ کرتاز (*Cartaz*) تھا۔ یہ ایک ایسا اجازت نامہ تھا جسے پرتگالی بحری بیڑے 'ارمدا' کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ایشیا میں بحری تجارت کو قابو کرنے کی کوششوں کے لیے پرتگالیوں کا جواز سمندروں کے مالک ہونے کے دعوے پر مبنی تھا۔ ایشیا میں تمام جہازوں کو یہ اجازت نامہ یا کرتاز حاصل کرنے کی ضرورت تھی جسے پرتگالی حکام کے ذریعہ جاری کیا جاتا تھا۔ اس میں جہاز کے کپتان کی شناخت، جہاز کا سائز اور اس کو لے جانے والے عملے کی تفصیلات ہوتی تھیں۔ ہتھیار گولہ بارود یا سامان جنگ لے جانے کی اجازت انتہائی محدود تھی۔ جہاز کو اس کی منزل پر روانہ ہونے سے قبل پرتگالی قلعے پر تجارتی محصول دینا دینی پڑتا تھا۔ کوئی بھی جہاز اگر بغیر اجازت نامے کے ہوتا تو اسے ضبط کر لیا جاتا اور اس کے عملے کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ کرتاز جاری کرنے کے لیے بھی فیس عائد کی گئی تھی جو حالانکہ تھوڑی ہوتی تھی لیکن مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو پرتگالی بے حد فائدہ میں تھے۔ بعد میں سولہویں صدی میں پرتگالیوں نے تجارت پر کنٹرول کا ایک نیا ذریعہ 'کیفیلا' (*Cafila*) ایجاد کیا۔ یہ چھوٹے مقامی تاجر جہازوں کا قافلہ تھا جس کی حفاظت پرتگالی بیڑے کیا کرتے تھے۔ کیفیلا اصول کی بنیاد دوہری تھی: ایک پرتگالی جنگی گھر کے لیے آمدنی اور دوسرے مقامی تاجروں کے لیے تحفظ۔ بعض کیفیلا، پرتگالی قلعوں اور بندرگاہوں کے لیے خوراک بھی لاتے تھے۔

1.2.4 پرتگالی تجارتی سلطنت کی نشو و نما (Growth of the Portuguese Commercial Empire)

پرتگالی اجارہ داری کا ابتدائی خراب اثر سولہویں صدی کے پہلے نصف میں بحر احمر سے بحیرہ روم تک کی تجارت میں محسوس کیا گیا۔ سولہویں صدی کے دوسرے نصف میں اس تجارت میں اس وقت نئی جان پڑی جب پرتگالیوں کا تسلط ڈھیلا ہوا۔ سترہویں صدی میں پرتگالیوں کی اجارہ داری نے زیادہ بہتر ڈچ اجارہ داری کا راستہ صاف کیا۔ مزید برآں، مسالے کی تجارت میں کتنا زیادہ منافع حقیقت میں تھا اس پر غور کیا جانے لگا۔ پرتگال کا ریاستی مالی نظام سولہویں صدی کے دوسرے نصف میں ابتر ہو چکا تھا۔ قلعوں اور جنگی بیڑوں کی مرمت میں کافی رقم خرچ ہوتی تھی۔ ایشیائی تجارت کی اجارہ داری کو پروان چڑھانا اس طرح ایک مہنگا معاملہ ثابت ہو رہا تھا۔ دوسرے پرتگالی ریاست غیر ملکی تجارتی سرمایے، غیر ملکی مہارت اور غیر ملکی بازاروں پر منحصر تھی۔ پرتگالیوں کو ایشیائی تاجروں اور حکمرانوں کی مخالفت کے سبب مکمل طور پر اجارہ داری قائم کرنے میں مشکلیں پیش آئی۔ اس نظام میں کافی نقائص تھے۔ گجراتی تاجروں نے خلیج بنگال میں 1540 اور 1500 کے دہے میں کالی مرچ کی کافی مقدار اکٹھا کی اور پورے ایشیا میں اس کی تجارت کی۔ پرتگالی عدن پر قبضہ کرنے ناکام رہے جس پر حریف سلطنت عثمانیہ نے 1538 میں قبضہ کر لیا تھا۔ اس سے ان کی اجارہ داری کے ڈھانچے میں کافی بڑا خلا رہ گیا۔ پرتگالی فارس کی کھاڑی کے راستے ایشیائی تاجروں

کی نجی تجارت کو بھی برداشت کرتے تھے کیونکہ وہ گھوڑوں کی فراہمی کے لیے ان تاجروں پر منحصر تھے۔ درحقیقت گجرات میں گھوڑے کی تجارت پر کنٹرول پرتگالیوں کے لیے بنیادی طور پر ایک غور طلب معاملہ تھا۔

کنارا اور مالا بار میں بھی جو کہ کالی مرچ کی پیداوار کے علاقے تھے، پرتگالی موثر طور پر اجارہ داری قائم کرنے میں ناکام رہے۔ مالا بار میں کالی کٹ کے زمورن نے پرتگالی نظام کی مخالفت کی کیونکہ کوچین کا راجہ جن پر پرتگالیوں کا بھروسہ تھا وہ کالی کٹ کا سابق ماتحت تھا۔ تجارتی طور پر اس مزاحمت نے وہ شکل اختیار کی کہ مقامی تاجر کالی مرچ میں تجارت کرتے رہے۔ ان علاقوں پر جہاں کالی مرچ اگائی جاتی تھی پرتگالی کنٹرول میں کمزوری کے سبب ان کا کام آسان ہو گیا۔ چونکہ پرتگالیوں کا تسلط ساحلی علاقوں پر تھا جہاں وہ کالی مرچ لگانے والوں کو کم قیمت ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے، جب کہ 'غیر قانونی' مقامی تاجروں اس سامان کو زیادہ قیمت دے کر آسانی سے حاصل کر لیتے تھے۔ وہ اسے خشکی کے راستے کورومنڈل بھیج سکتے تھے جو پرتگالی مداخلت سے آزاد تھا یا سمندر کے راستے گجرات بھیجتے جو کافی جوکھم بھرا تھا۔ مزید برآں پرتگالی عہدیداروں کی نجی تجارت کے سبب اس اجارہ دارانہ تجارت میں کافی خلا پیدا ہو گئے۔

پرتگالیوں نے عرب اور ایران کی گھوڑے کی تجارت کو گوا کے راستے مرکوز کرکے اس تجارت کی بھی اجارہ داری حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جنوبی عرب یا ہرمز سے گھوڑوں کے ساتھ آنے والے سبھی جہاز صرف گوا آسکتے تھے۔ سیاسی اسباب کی بنا پر مقامی حکمرانوں سے خیر سگالی حاصل کرنے کی ضرورت تھی لیکن اس نظام میں اس کی کمی موجود تھی۔ پرتگالی مقامی حکمرانوں سے رعایتیں حاصل کر سکتے تھے اگر وہ بغیر کسی رکاوٹوں کے انہیں گھوڑوں کی فراہمی ہونے دیتے یا ان کے دشمنوں کو گھوڑے فراہم کرنے سے منع کر دیتے۔ پرتگال میں جو چرچ تھا وہ بھی لا مذہبوں کو گھوڑے کی فروخت کا تصور پسند نہیں کرتا تھا۔

مقامی حکمرانوں اور تاجروں کی خدمات کے سلسلے میں پرتگالیوں اور طبقہ امراء کے درمیان کبھی کبھی جھگڑے پیدا ہو جاتے۔ گجرات میں مقامی طاقتور گروہوں کا تجارتی مفادات کے سلسلے میں پرتگالیوں کے ساتھ اکثر جھگڑا ہو جاتا تھا۔ گجرات کے سلطان کے ایک غلام امیر نے ابتدائی سولہویں صدی میں، دیو میں پرتگالیوں کے حملے کی مزاحمت کی، لیکن پرتگالیوں کی بحری سلطنت کے ذریعہ ہندوستانی حکمرانوں اور سلطنتوں کے معاشی وسائل کے لیے کبھی سنجیدہ خطرہ نہیں پیش آیا۔ ہندوستانی تاجروں کے جہاز جب کہ گوا میں چنگی کے واجبات ادا کرتے تھے ، وہ مقامی حکمرانوں کے زیر اہتمام بندرگاہوں پر درآمد برآمد محصول بھی ادا کیا کرتے تھے۔ بحری تجارت کے کنٹرول کو مقامی نظام حکومت کے ذریعہ ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا کیونکہ ان کا خشکی کے علاقوں پر پہلے ہی قبضہ تھا۔ زیادہ تر وہ کسانوں سے وصول کیے جانے والے محصولات پر منحصر رہتے تھے۔ لٰہذا یہ ان کے لیے پرتگالی تسلط کوئی مقامی چنوتی نہیں تھی۔ پرتگالیوں نے بحری تجارت اور سمندر پر اقتدار اعلیٰ کا اپنا تصور ایجاد کیا اور اپنی بحری برتری کے ساتھ اسے قائم رکھا۔ مقامی تاجر بھی پرتگالی تحفظ کے لیے تھوڑی رقم ادا کرنے کے خواہش مند تھے۔ ساتھ ہی جب بھی ممکن ہوا وہ ان کے کنٹرول سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ پرتگالیوں کی بحری سلطنت ان علاقوں کے اعتبار سے بڑی تھی جس پر وہ کنٹرول کرنا چاہ رہے تھے۔ اس وسیع مہم کے لیے دستیاب مالیاتی اور انسانی وسائل نسبتاً بہت کم تھے۔ اتنی بڑی مہم کے لیے دستیاب یورپیوں اور

یوریشیوں کی کل تعداد کبھی بھی 15000 افراد سے زیادہ نہیں تھی۔ پوری سلطنت میں فوجی خدمات کے اہل افراد کی کل تعداد تقریباً 10000 رہی ہوگی۔ پرتگالیوں کی بحری برتری کے باوجود اتنی قلیل افرادی قوت کے سبب پرتگالی تجارتی کنٹرول سے متعلق مناسب اقدامات میں ناکام رہے۔ اصلاًوہ صرف مقامی تاجروں سے خراج وصول کررہے تھے۔ پرتگالیوں نے موجودہ طریقوں یاراستوں، اشیایا تجارتی تکنیکیوں میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ایک طرح سے وسائل کی ازسرنو تقسیم تھی جہاں پرتگالی اپنے لیے دوسروں کی بحری تجارتی سرگرمیوں سے حاصل شدہ منافع کا کچھ حصہ لیناچاہتے تھے۔

1.3 ڈچ نوآبادیت (Dutch Colonisation,1600تا1680)

ڈچ جمہوریہ کی قومی مجلس انتظامیہ، اسٹیٹس جنرل نے '*Verenigde Oost-Indische Compagnie*' نام سے ایک کمپنی قائم کی جسے عام طور ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کہا جاتا ہے۔ کچھ کمپنیوں کو ملا کر اس جوائنٹ کمپنی کی تشکیل کی گئی تھی۔ ایمسٹرڈم (Amsterdam)، روٹرڈم(Rotterdam) اور زی لینڈ(Zeeland) کے دولت مند تاجروں نے اس طرح کمپنی کے سرمایہ وسائل کی بنیاد میں اضافہ کیا۔ اسٹیٹس جنرل کے منشور میں کمپنی کو مشرق میں تجارت کے لیے 21 سال کی مدت کے اجارہ داری حقوق دیے گئے۔ اس کے بعد ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کورومنڈل ساحل پر اپنی پہلی فیکٹری قائم کی۔ کورومنڈل، جنوب ایشیائی بازاروں بشمول مسالے کی پیداوار والے جزائر جیسے ملکا، باندااور سیلیباس (Celebas) اور یورپی ممالک کو بھیجے جانے والے کپڑوں کا اہم مقام تھا۔ کورومنڈل ساحل پر کمپنی کی تجارت میں پوری سترہویں صدی کے دوران نمایاں اضافہ درج کیا گیا۔ اس کی خاص وجہ جنوبِ مشرقی ایشیائی بازاروں میں کپڑے کی مانگ میں اضافہ ہوناتھا۔ 1980 تک ڈچ اور انگریز کمپنیاں عملاًپوری تجارت پر چھاچکی تھیں۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اس تجارت پر غلبہ تھا جب کہ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی 1680 سے خاص طور پر یورپ ایشیائی بازاروں میں اس کی برابری کو پہنچ رہی تھی۔ تاہم ڈچوں نے بین ایشیائی تجارت میں بالخصوص کورومنڈل ساحل اور جنوب مشرقی ایشیائی منڈیوں کے درمیان اپنی مجموعی بالادستی برقرار رکھی، جب کہ پرتگالی بنیادی طور پر سولہویں صدی میں ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل تک محدود تھے۔ ڈچوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے جلد ہی اپنے تجارتی نیٹ ورک کی توسیع کی اور اب اس میں کورومنڈل ساحل بنگال اور گجرات شامل ہوچکے تھے۔ یہ نئی نوآبادیاتی طاقتیں پہلے ہی ساحلی علاقوں تک محدود تھیں لیکن انہوں نے اندرونی علاقوں جیسے احمد آباد اور آگرہ میں بھی تجارتی مراکز قائم کیے۔

1.3.1 ڈچ تجارت کی نوعیت (Nature of the Dutch Trade)

حالانکہ سترہویں صدی میں ڈچوں کا عروج، بازار میں ان کی مسابقتی اہلیت پر مبنی تھا لیکن وہ پھر بھی مسالوں کے جزائر میں پیدا کاروں کو کم شرح پر ادائیگی کرنے میں اپنی اجارہ داری کا استعمال کرتے تھے۔ مقامی تاجروں سے مسابقت کو کم کرنے اور مخصوص اشیااور بازاروں میں خصوصی حقوق حاصل کرنے کے لیے وہ طاقت اور تشدد کا استعمال بھی کرتے تھے۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پرتگالیوں کے ذریعہ فروغ دیے گئے کرتاز نظام سے اس لیے بھی فائدہ اٹھایا تاکہ ایشیائی مسابقت کاروں کو اجارہ دارانہ اشیاء کی تجارت سے باہر رکھا جاسکے۔ سترہویں

صدی کے درمیان یورپ ایشیائی تجارت کے حجم اور قدر میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہوا۔ اس تجارت کی ساخت میں بھی تنوع تھا۔ ڈچ کمپنی کی بین ایشیائی تجارت میں اپنے کردار کے سبب ہندوستان ڈچوں کے لیے ایک اہم فراہم کار بنا رہا۔ کورومنڈل اور گجرات سے کپڑوں کا انڈونیشیائی جزائر میں کالی مرچ اور دیگر مسالوں سے مبادلہ کیا جاتا تھا۔ کمپنی کچے ریشم اور افیون کو بنگال سے برآمد کرتی تھی۔ یورپ ہندوستانی تجارت کی ساخت تبدیل ہو چکی تھی۔ ہندوستان سے یورپ جانے والے اہم درآمدی مال کے طور پر کالی مرچ اور مسالے کی اہمیت کم ہو گئی تھی۔ کپڑے اور کچے ریشم کا حصہ سترہویں صدی کی ابتداء میں یورپ میں کل درآمد کے 16 فیصد سے بڑھ کر صدی کے آخر میں 55 فیصد ہو گیا۔ کورومنڈل کے علاوہ بنگال جہاں کچے ریشم اور کپڑے کی پیداوار ہوا کرتی تھی وہ بھی ڈچوں کے لیے تجارت کا اہم مرکز بن چکا تھا۔

ہندوستان کے ساتھ ڈچ تجارت کی دوسری اہم خصوصیت ہندوستانی اشیاء کے لیے قیمتی دھاتوں میں ادائیگی، ڈچوں کے لیے لازمی تھی۔ یہ ایشیا میں یورپی اشیا کی ان قیمتوں پر فراہمی میں جن کی بنیاد پر مانگ پیدا کی جا سکتی تھی، یورپ کی نااہلیت ثابت کرتی ہے۔ اس کا ایک اہم پہلو، یورپ ایشیائی تجارت کے لیے 'اشیا کے بدلے بلین (سونا چاندی) کا یورپی ماڈل' یہ تھا کہ تجارت سے ہونے والا منافع، ایشیا میں یورپی اشیا کی فروخت کے بجائے پوری طرح یورپ میں ایشیائی اشیا کی فروخت سے اخذ کیا جاتا تھا۔ بلین یا قیمتی دھاتوں کے علاوہ ڈچ ہندوستان کو اون، ریشم اور دیگر کپڑے بالخصوص جو لیڈن (Leiden) میں تیار ہوتے تھے اور شراب اور بیر کے علاوہ غیر قیمتی دھاتیں جیسے کہ سیسہ، لوہا اور پارہ برآمد کرتے تھے۔

1663 میں کوچین کے راجا نے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد سے پرتگالیوں کو اپنے علاقے سے باہر کرنے میں کامیابی حاصل کی اور پرتگالیوں کو اجارہ داری کی جو رعایتیں حاصل تھیں وہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو مل گئیں۔ ابتدا میں ڈچ کمپنی نے انڈونیشیا کے جزایر میں حکام کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ مسالوں جیسے لونگ، جائفل اور جاوتری جیسے مسالوں کو حاصل کرنے کے لیے کمپنی کو اجارہ داری حقوق دینے کو منظوری دیں۔ برصغیر ہند میں بھی ڈچ کمپنی اور مقامی حکمراں ارباب اقتدار نے ان رشتوں کو باہمی طور پر مفید پایا۔ مقامی حکام نے کمپنی کی تجارت کو اپنی آمدنی اور معاشی وسائل میں خالص اضافے کے طور پر دیکھا۔ اس کا فوری فائدہ چنگی محصولات تھے جو کہ مغل خزانے کے لیے وصول کی جانے والی مالگزاری میں اضافے کا سبب تھے۔ مزید برآں، کمپنی ہندوستان سے اشیا کے حصول کے لیے سونا چاندی یا قیمتی دھات لاتی تھی۔ ان دھاتوں کی مقامی گھریلو پیداوار برائے نام تھی اس لیے ہندوستانی نظام زر کے لیے قیمتی دھاتوں کا آتے رہنا ضروری تھا۔ عام طور پر مغل ارباب اقتدار اور دیگر علاقائی طاقتوں کے ذریعہ لگائے جانے والی درآمد برآمد محصولات وہی تھے جو ہندوستانی تاجروں سے حاصل کیے جاتے تھے۔ تاہم مغل انتظامیہ نے ڈچ اور انگلش کمپنیوں کو ہندوستانی عبوری (راہداری) محصول کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا تھا جس سے ان کو ہندوستانی تاجروں کے مقابلے تھوڑی برتری حاصل ہو گئی۔ اس کے علاوہ وہ علاقائی راہداری محصول ادا کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ڈچ اور انگریزی کمپنیاں ہندوستانی بازار میں ہندوستانی تاجروں کے دیگر گروہوں کی طرح عمل کرتی تھیں۔ ان کو نہ تو کوئی خاصی رعایت تھی اور نہ ہی ان کی سرگرمیوں پر کسی طرح کی بندش تھی۔

1.3.2 ڈچ فیکٹریوں کا نظم ونسق (Management of the Dutch Factories)

ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی پہلی فیکٹری شمالی کورومنڈل ساحل پر پیٹاپولی (Petapuli) میں 1606 میں قائم کی تھی۔ دوسری فیکٹری اسی سال مسولی پٹنم کی بندرگاہ پر قائم کی گئی تھی۔ 1610 میں پولی کٹ (Pulicat) میں ایک فیکٹری قائم کی گئی تھی جو کورومنڈل کے ڈچ انتظامیہ کا ہیڈ کوارٹر بھی بنا۔ 1613 میں پولی کٹ میں گیلڈریا (Geldria) قلعے کی تعمیر کی گئی تھی۔ کورومنڈل فیکٹریوں کا مجموعی کنڑول گورنر کو دیا گیا تھا۔ مسولی پٹنم فیکٹری کا سربراہ انتظامیہ میں دوسرے درجے پر تھا اور اسے 1621 میں صدر بنایا گیا۔ 1690 میں کورومنڈل حکومت کا صدر مقام جنوبی کورومنڈل ساحل میں پولی کٹ سے ناگاپٹنم (Nagapattinam) منتقل کر دیا گیا۔ 1680 میں کورومنڈل ساحل کے ان تجارتی اداروں میں صرف 441 افراد کا عملہ تھا جن میں سے مختلف کام انجام دے رہے 233 افراد ہندوستانی تھے۔ 208 یورپی کارکنان میں صرف 128 فوجی تھے جس میں ایک لفٹنٹ 5 سارجنٹ اور 7 کارپورل شامل تھے۔ ان میں سے زیادہ تر فورٹ گلیڈریا میں مقیم تھے۔ باقی شہری انتظامیہ کمپنی کے تجارتی کاموں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور یہ صدر کاروباری گماشتے، گماشتے، ماتحت گماشتے اور معاون کلرک پر مشتمل تھا۔ فصیل بند فیکٹری احاطہ لوگوں کے رہنے کے لیے کوارٹر اور قیمتی اشیا کے لیے اسٹور ہاؤس دونوں کا کام کرتا تھا۔ اسی طرح کے ادارے مالا بار اور گجرات میں بھی قائم کیے گئے۔ بنگال اور گجرات میں فیکٹریوں کی نمایاں خصوصیت (بحیثیت ملازم) فوجی عملے کا نہ ہونا تھا۔ اسی لیے بنگال اور گجرات میں ڈچ اور یورپی عہدیدار تجارتی فرائض کو ہی زیادہ تر انجام دیتے تھے۔ حتیٰ کہ ہگلی میں قانون نافذ کرنے والے افسر (مالیات) کا خاص کام کمپنی کے گماشتوں کے ذریعہ غیر قانونی طور پر کی جانے والی نجی تجارت کو روکنا تھا۔ 1665 میں بنگال فیکٹریوں کو آزاد نظامت کے تحت منظم کیا گیا تھا جو کہ پولی کٹ حکومت کے کنڑول سے آزاد تھی۔

ہگلی میں بنیادی فیکٹری بنگال کی ڈچ انتظامیہ کا صدر مقام بنی۔ اس فیکٹری میں خاص انتظامی کونسل تھی جس کا سربراہ گورنر یا ڈائرکٹر ہوا کرتا تھا۔ ہگلی کونسل میں ڈائرکٹر کے علاوہ، کمپنی کے حساب کتاب کے انچارج صدر فیکٹر (گماشتہ)، قانون نافذ کرنے والے افسر، فیکٹری کے گوداموں کا انچارج فیکٹر اور بعض دیگر گماشتے یا عوامل پر شامل تھے۔ ایک کونسل جو کہ صدر فیکٹر کے ماتحت تھی ہر ماتحت فیکٹری کی نگراں تھی۔ صدر منتظم کا دفتر جو بٹاویہ (Batavia) بھیجے جانے سے قبل کورومنڈل ساحل پر سبھی فیکٹریوں کے حسابات کی دیکھ بھال کرتا تھا، وہ کورومنڈل کی فیکٹریوں کی نگرانی کرتا تھا۔ کورومنڈل ساحل کے لیے ایک عدالتی کونسل بھی تھی جس کو ساحل پر فیکٹریوں کے ڈچ ملازمین کا فیصلہ کرنے اور انہیں سزا دینے کا اختیار حاصل تھا۔ جاوا میں بٹاویہ کے مقام پر گورنر جنرل اور اس کی کونسل ایک بڑے ادارے کے ساتھ پوری تجارتی سلطنت کو منظم کرتی تھی۔ یہ کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرس جسے *Heren XVII* کے طور پر جانا جاتا تھا اور ایشیا میں کمپنی کے مفاد کے درمیان وسطی انتظامی ادارہ تھا۔ ابتدائی طور پر یہ وسطی انتظامی ادارہ بانتم (Bantam) میں واقع تھا لیکن بعد میں 1619 میں بٹاویہ میں منتقل ہو گیا تھا۔ یہ کمپنی کا مشرقی ہیڈ کوارٹر بنا اور صدر فیکٹری اور بورڈ آف ڈائرکٹرس کے درمیان اہم کڑی بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ پورے ایشیا سے سامان ہالینڈ بھیجے جانے سے قبل بٹاویہ میں اکٹھا کیا جاتا تھا۔ بین ایشیائی تجارت میں ڈچ کمپنی کی وسیع طور پر شرکت (جو کہ اسے انگلش اور فرانسیسی کمپنیوں سے منفرد کرتی تھی) بٹاویہ سے دی جانے والی ہدایات کے ذریعہ ممکن ہوئی۔ ڈچ ایسٹ کمپنی نے اپنی بحری برتری کا

استعمال کرتے ہوئے، ہندوستانی تجارت پر کنٹرول کرنے کے لیے پرتگالیوں کے ذریعہ فروغ دیے گئے ادارہ جاتی ذرائع جیسے کرتاز اور کیفیلا کو اختیار کیا۔ ہندوستانی جہاز جو اپنے تختوں کو صحیح جگہ پر گرفت میں رکھنے کے لیے رسی اور سخت چوبی کیل پر منحصر تھے، اس میں اندر سے بھاری توپ سے بمباری برداشت کرنے کی نہ تو مضبوطی تھی اور نہ ہی بڑی توپوں کے پیچھے کی طرف دھکے کو برداشت کرنے کی صلاحیت۔ اعلیٰ ترین بحری قوت کے باوجود ڈچ، اجازت نامہ یا پاس نظام کو موثر طور پر نافذ کرنے کے ہمیشہ اہل نہیں ہو پائے تھے۔ مثال کے طور پر ڈچ کمپنی نے 1641 میں ملاکا کی اپنی فتح کے بعد ہندوستانی جہازوں کے ملاکا کے شمال میں ٹن بندرگاہوں تک پہنچنے پر پابندی لگانے اور بعد میں جزیرہ نما ملایہ میں بنیادی ٹن پیدا کار خطے کے ساتھ ایک اجارہ داری معاہدہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہندوستانی جہاز آسانی سے ڈچ کنٹرل سے بچ نکلتے تھے کیونکہ وہ شمالی ساترہ میں خلیج بنگال کی بندرگاہ آچیہ (Acheh) جو خطے کا بہت بڑا عبوری مال گودام تھا، تک آزادانہ رسائی رکھتے تھے۔ مزید برآں ڈچ کمپنی کو گجرات میں جوابی کارروائی کی شکل میں ہونے والے نتائج کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

1.3.3 ہندوستانی سماج اور ریاست پر ڈچ 'تجارتی سلطنت' کا اثر

(Impact of the Dutch 'Commercial Empire' on Indian Society and State)

ہندوستان کے مشرقی اور مغربی دونوں ساحلوں پر بندرگاہ شہروں کی بڑھتی تعداد، یورپی تجارتی کمپنیوں کی تجارتی سرگرمیوں کا نتیجہ تھی۔ ابتدائی دور میں، بندرگاہ، تاجروں اور اندرون ملک واقع مضافاتی علاقوں کی بحری تجارتی سرگرمیوں کے درمیان محض ایک کڑی تھے۔ یہ بندرگاہ یورپی کمپنیوں (اقتدار کے خود مختار مقامات) کے ماتحت آچکے تھے۔ چونکہ وہ ایک اجنبی ملک اور بھرپور مخالف ماحول میں کام کر رہے تھے اس لیے انہوں نے فوری طور پر دفاعی مورچہ بندی کی کوشش کی تاکہ وہ خود کا دفاع کر سکیں۔ پولی کٹ کی ڈچ بندرگاہ قلعہ گیلڈریہ میں بندوقوں کے ذریعہ تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ ڈچوں نے ہندوستان میں علاقائی سلطنت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی، تاہم انہوں نے جاوا اور مسالوں کے جزائر میں ایک مضبوط علاقائی بنیاد قائم کرنے کے ذریعہ فرانسیسی اور انگریز کمپنیوں کے لیے پہلے ہی مثال قائم کر دی تھی۔

بندرگاہ شہروں میں مختصر یورپی برادری، ہندوستان میں ریاست اور سماج کی ساخت پر کوئی خاص اثر نہیں ڈال سکی۔ کمپنیوں نے قابل برآمد اشیا حاصل کرنے کے لیے ہندوستان میں دستیاب پیداوار اور حصولیابی کے موجودہ نیٹ ورک کو ہی استعمال کیا، اگرچہ رفتہ رفتہ انہوں نے بعض مخصوص مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں کچھ اصلاحات بھی شروع کیں۔ یورپیوں نے دلالوں (یعنی وہ ہندوستان ملازم جو ہندوستانی تاجروں کے ساتھ معاملات میں مددگار اور مقامی بازاروں کی گہری معلومات رکھتے تھے) کی خدمات سے بھی استفادہ کیا۔ اگرچہ بعض مواقع پر ہندوستانی حکمرانوں اور ڈچ لوگوں کے درمیان جھگڑے بھی ہوئے لیکن ڈچ اس حیثیت میں نہیں تھے کہ وہ حکمرانوں کو اپنے تابعدار بناتے۔ ہندوستانی حکمرانوں نے ڈچ کمپنی کی تجارت کو فائدہ مند پایا۔ ہندوستان میں سونا اور چاندی درآمد ہونے سے سونا چاندی اور قیمتی دھاتوں کی فراہمی میں کافی اضافہ ہوا۔ معیشت میں بڑھتے زر کے چلن (monestisation) کے سبب زمینی محاصل کے نقد مطالبے سے لین دین میں بھی سہولت پیدا ہوئی۔ اس سے مبادلہ بازار اور تجارت میں مزید اضافہ ہوا۔ بینکنگ فرموں کے اضافے میں بھی مدد ملی جو کہ تجارت کے

پھیلاؤ کے لیے نہایت اہم تھیں۔ اسی سیاق و سباق میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو پولی کٹ میں فورٹ گیلڈریا میں ٹکسال چلانے کی اجازت ملی اور 1658 میں انہیں ناگا پٹنم کی ٹکسال سے پگوڈا جاری کرنے کی رعایت بھی حاصل ہوئی۔

1.4 فرانسیسی نوآبادیت (The French Colonisation)

فرانسیسیوں نے 1668 میں سورت کے مقام پر ہندوستان میں اپنی پہلی فیکٹری قائم کی۔ اس کے کچھ عرصے بعد فرانکوئس مارٹن (Francois Martin) نے 1674 میں پانڈیچری (Pondicherry) میں فیکٹری قائم کی جو ہندوستان میں فرانسیسیوں کے ہیڈ کوارٹر کے طور پر ابھری۔ دیگر یورپی تجارتی کمپنیوں کی طرح فرانس نے بھی بالاسور، مسولی پتنم، چندر ناگور، تیلی چیری اور کالی کٹ میں دیگر فیکٹریاں قائم کیں۔ زیادہ تر تجارتی مراکز سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں بہار اور بنگال میں قائم کیے گئے۔

1.4.1 فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی (The French East India Company)

فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی جس کا اصل نام '*Campaignie des Indes Orientales*' تھا، ریاست کی مالی امداد سے 1664 میں شروع کی گئی تھی۔ کمپنی کی تشکیل میں بنیادی تحریک، فرانس کے تجارتی مفکر، جے۔ بی کولبرٹ کے خیالات سے حاصل ہوئی۔ 1644 میں اس کا سرمایہ ڈچ کمپنی کا صرف نصف ہی تھا۔ کمپنی کا ابتدائی سرمایہ 1665 میں 8 ملین لیورس (Livers) تھا جو کہ 1670 میں بڑھ کر 12 ملین لیورس ہو گیا۔ ریاستی مالیات اور انتظامیہ نے اس عمل میں اپنی جواب دہی اور ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھایا۔ صرف 16 فیصد حصہ کے حاملین (stockholders) جہاز کے مالک تاجر اور 8 فیصد کے سرمایہ فراہم کار تھے جب کہ بقیہ حصے پر شاہی خاندان اور طبقہ امراء کا قبضہ تھا۔ کمپنی کی قسمت یورپی جنگوں کی غیر یقینی صورتحال پر منحصر تھی۔ 1675 کے بعد کمپنی بحیرہ ہند میں سال میں صرف چار جہاز چلایا کرتی تھی اور 1680 میں اس نے اپنے شیئر مالکوں کو منافع ادا کرنا بھی روک دیا۔ اس نے اب اپنے تجارتی حقوق کی نمائندگی ایک نجی کاروباری ادارے '*Messieurs de saint Malo*' کو سونپ رکھی تھی جس کے زیر انتظام اس نے پھر منافع کمانا شروع کیا۔ تاہم فرانسیسی ریاست نے اس کے تجارتی حقوق 1719 میں واپس لے لیے اور ایک نئی کمپنی '*Compaignie Perpetuelle des Orientales*' قائم کی جس کے سرمایہ وسائل 300 ملین لیورس تھے۔ اس کمپنی نے 1769 تک کام کیا۔ اس کے بحری بیڑے کی طاقت 10 سے بڑھ کر 75 جہاز ہو گئی۔ نئی کمپنی نے بین ایشیائی تجارت میں بھی حصہ لیا، اگرچہ یورپ ایشیائی تجارت اب بھی اہم بنی رہی۔ فرانس کے ذریعہ ہندوستان سے برآمد کیے جانے والے اہم سامانوں میں سفید سوتی کپڑے، ململ، رنگین کپڑے، کالی مرچ، شورہ، سرخ لکڑی اور صدف (سیپی و کوڑی) شامل تھے۔ وہ ہندوستان میں الکوحل، شراب، مونگا، سونے کے دھاگے اور لوہے کی اشیا بھیجا کرتے تھے۔ ہندوستان سے برآمد کی جانے والی اشیا کی قیمت ہندوستان کو درآمد کی جانے والی اشیا کی قیمت سے کہیں زیادہ ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی یہ گھاٹا، درآمد کی گئی اشیا کے 75 فیصد تک پہنچ جاتا تھا۔ قیمتی دھاتوں کی ہندوستان درآمد سے اس گھاٹے کا بڑا حصہ ہوتی تھی۔ فرانسیسی کمپنی ہمسر ڈچ اور انگلش کمپنیوں کی طرح ہندوستانی تاجروں کی خدمات کا استعمال گماشتوں کی طرح کرتی تھی۔ وہ ہندوستانی دستکاروں سے اشیا کو

حاصل کرنے کے لیے پیشگیوں کے نظام کا بھی استعمال کرتے تھے۔ فرانسیسی اپنے مالی بحران پر قابو پانے کے لیے کبھی کبھی ٹیکسوں کے نام پر ہندوستانی تاجروں سے خراج وصول کرتے تھے۔ چیٹی(Chetti)، مڈلیر (Mudaliar) اور پلئی (Pillai) ذاتوں کے ہندوستانی تاجر فرانسیسیوں کو ادھار دیتے تھے اور ادھار پر اشیا فراہم کرتے تھے۔ یہ ہندوستانی تاجر تنازع کی صورت میں مقامی حکمرانوں اور فرانسیسیوں کے درمیان صلح بھی کراتے تھے۔

1.4.2 تجارتی سلطنت سے علاقائی سلطنت میں منتقلی

(Transition from Commercial Empire to a Territorial Empire)

فرانسیسیوں کا ابتدائی قبضہ پرتگالیوں اور ڈچ جیسا ہی تھا۔ فرانسیسی کمپنی نے 1721 میں مالا بار ساحل میں ماہے پر قبضہ کر لیا تھا اس کے بعد 1731 میں ینام اور 1758 میں کرائی کل پر قبضہ کر لیا۔ پانڈیچری فرانسیسیوں کا ہیڈ کوارٹر بنا جہاں 1700 تا 1707 میں فورٹ لوئس بھی تعمیر کر لیا گیا تھا۔ 1741 تک 1,20,000 کی آبادی کے ساتھ یہ ایک بڑا بندرگاہ شہر بن چکا تھا۔ یہ سبھی کوششیں کمپنی کے آسانی کے ساتھ کام کرنے کے لیے مطلوبہ تجارتی نیٹ ورک قائم کرنے کا حصہ تھیں۔ فرانسیسی گورنر ڈیومس(Dumas)اور جوسف فرکونکوئس ڈپلیکس(Joseph Francois Dupleix) ہندوستان میں ایک علاقائی نوآبادی قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ اس طرح کی علاقائی سلطنت سے محصولات اکٹھا کیا جا سکے جس سے ہندوستان میں تجارتی اشیا خریدنے کے لیے قیمتی دھاتوں کو لانے کی ضرورت نہ رہے۔ تاہم، کمپنی کے فرانسیسی حصص مالکوں کو ایسی نوآبادیاتی مہم جوئی کے لیے بھاری لاگت ادا کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ فرانسیسیوں کے اس طرح کی سامراجی عزائم کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے مخالفت، ڈپلیکس کے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ تاہم اس کے کمانڈروں کو اس وقت کچھ عارضی کامیابی ملی جب لابورڈونیس نے 1746 میں مدراس پر قبضہ کر لیا اور 1750 میں جنجی پر بسی نے فتح حاصل کی۔ مارکیس دی بسی (The Marquis de Bussy) جو ڈپلیکس کے ماتحت رہا تھا، دکن میں فرانسیسی عملداری قائم کرنے میں زیادہ کامیاب تھا۔ نظام الملک کی موت کے بعد جانشینی کی جنگ نے دکن کی سیاست میں فرانسیسیوں کو مداخلت کرنے کا ایک موقع فراہم کر دیا۔ انہوں نے نظام کے دوسرے بیٹے ناصر جنگ جسے انگریزوں نے تسلیم کیا تھا، کے مقابلے نظام کے پوتے مظفر جنگ کی حمایت کی۔ مظفر جنگ 1749 میں امبور کی جنگ میں فاتح بن کر ابھرا اور کرشاندی کے جنوب کے سبھی علاقوں کے لیے اس نے ڈوپلیکس کو اپنا نائب مقرر کیا۔ اس نے فرانسیسیوں کے حمایت یافتہ چاند صاحب کو ارکاٹ کا حکمراں تسلیم کیا۔ مسولی پٹنم کی سرکار کو فرانسیسیوں کو ہدیہ کر دیا گیا اور انہیں کرناٹک کے تمام مالگزاری وسائل عطا کیے گئے۔ فرانسیسی افواج کا ایک مستقل دستہ نئے نظام کے زیر انتظام رکھا گیا تھا۔ مظفر جنگ کی موت کے بعد صلابت خاں تخت نشین ہوا تب اس نے فرانسیسیوں کو کچھ مزید سرکاریں عطا کیں۔ اس سے تقریباً پورا کورومنڈل ساحل، فرانسیسی عملداری کے تحت آ گیا۔ فرانسیسی دستے کے نفری بڑھ کر 2000 ہو گئی۔ نظام کے دربار اور انتظامیہ میں بسی کو زبردست اختیارات حاصل تھے۔ فرانسیسی علاقائی سلطنت کے خواب کو پورا کرنے کے بالکل قریب ہی تھے۔ لیکن ڈپلیکس کو 1754 میں کرناٹک میں اس کے تباہ کن تجربے کے بعد بلا لیا گیا۔ گوڈے ہیو (Godeheu)، اس کا جانشین بنا جو انگریزوں کے خلاف فرانسیسی موقف کے دفاع میں ناکام رہا۔ اگر

چہ ہندوستان میں فرانسیسی فوجی مہم کے کمانڈر کومٹے ڈی لیلی (Comte de Lally) نے 1758 میں کڈالور پر عارضی طور پر قبضہ کر لیا تھا لیکن اس کے موقع ناشناس ہونے کے سبب پانڈیچیری اور چندر ناگور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ فرانسیسیوں کو چندر وتی اور ونڈی واش میں بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس طرح وہ علاقائی حکومت قائم رکھنے میں اہل نہیں ہو پائے، بلکہ پیرس معاہدہ (1763) کے اختتام کے بعد جس کے تحت برطانیہ اور فرانس کے درمیان سات سال کی جنگ ختم ہوئی تھی، فرانسیسی طاقت مغلوب ہو گئی۔

پیرس معاہدے کے بعد ہندوستان کے فوجی اور سیاسی معاملوں میں فرانسیسی جو اہم کردار ادا کرتے تھے، اس سے دستبردار ہو گئے۔ تاہم فرانسیسیوں نے انگریزوں کو راستہ دکھادیا کہ علاقائی سلطنت قائم کرنے کے طریقے اور ذرائع کیا تھے۔ فرانسیسی ایک معنی میں نوآبادیت کے پیش رو تھے۔ 1762 میں بیجاپور کے سلطان سے پانڈیچیری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اسے بندرگاہ شہر کے طور پر فروغ دیا۔ فرانسیسی کوارٹروں میں ہندوستانی تعمیراتی تکنیکوں کی بعض خصوصیات کو شامل کرتے ہوئے اونچی دیواروں اور علاحدہ باغیچوں کے ذریعہ انہوں نے اپنی انفرادیت قائم کی۔ بعد میں برطانوی نوآبادکاروں نے برادریوں اور مذہب کی علاحدگی کی بنیاد پر اپنی بستیوں کو فروغ دیا۔

1.4.3 ہندوستانی ریاستوں میں فرانسیسی پیشہ ور فوجیوں کا کردار

(Role of the French Professional Soldiers in Indian States)

ہندوستانی حکمرانوں کی ملازمت میں پیشہ ور فوجیوں کے طور پر فرانسیسیوں کا کردار کافی اہم رہا تھا۔ ہندوستانی مسلح دستوں کی تنظیم اور کمان میں فرانسیسیوں کو مہارت حاصل تھی۔ ان فوجیوں کو فرانس میں اتنی تنخواہ نہیں دی جاتی تھی اور عام فوجی، افسران کے عہدے کی خواہش نہیں رکھ پاتے تھے کیونکہ اس پر طبقہ امراء کا غلبہ تھا۔ ہندوستانی حکمراں فرانسیسی سپاہیوں کو فراخدلانہ تنخواہ دینے کے لیے آمادہ تھے اور اگر کوئی فوجی باصلاحیت ہوتا تو اس کے لیے اس کی عہدے اور حیثیت میں ترقی کے بھی بھرپور مواقع تھے۔ لہٰذا، فرانسیسی کرائے کے فوجیوں یا پیشہ ور سپاہیوں کی بڑی تعداد ہندوستانی حکمرانوں کی افواج میں کام کرتی تھی۔ 1764 کی بالکل ابتدا میں یوسف خاں نے مدورائی میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی اور فرانسیسی سپاہیوں اور افسروں کی مدد سے دو طویل محاصروں کے ساتھ مزاحمت کی۔ فرانسیسی تربیت یافتہ ہندوستانی فوجیوں نے ہندوستانی حکمرانوں کے سامنے کئی طرح سے اپنی برتری ثابت کی۔ انہوں نے جنگ کے دوران کنٹرول قائم رکھنے کے لیے کمان کا نظام مراتب فراہم کیا۔ فوج کی نئی تنظیم میں حسب معمول ڈرل (مشق) کی ضرورت رہتی تھی اس طرح وہ صف آرائی یا لام بند ہونے کی ایک بڑی تربیت کے ساتھ بہتر طور پر بندوقوں (تفنگ) سے لیس ہوتے تھے اور ان کو پیچھے سے تیز فائر کرنے والی توپوں کا سہارا ملتا تھا جس سے وہ ہلاکت خیز اثر ڈال سکتے تھے۔ اس سے گھڑ سواروں کے رسالے کے امدادی کردار اور حیثیت میں کمی آئی اور جنگوں میں پیادہ فوج خاص سہارا بن کر ابھری۔ لیکن ان کی صلاحیت اور ڈسپلن میں اضافے کے لیے باقاعدگی کے ساتھ ان کی تربیت ضروری بن گئی۔ ہندوستانی حکمراں اپنے فوجیوں کی از سر نو تنظیم، نئے سرے سے لیس کرنے اور تربیت دینے کے لیے فرانسیسیوں کی خدمات کا استعمال کرتے تھے۔ فرانسیسیوں نے فوجی انجینیرنگ جیسے قلعہ بندی اور بندوقوں کے استعمال سے متعلق معاملوں میں کافی مدد کی۔ سری رنگا پٹنم، پال گھاٹ، ادے گری اور علی گڑھ کی قلعہ بندی فرانسیسی فوجی تعمیر کی بعض اہم مثالیں ہیں۔

مشیل جوکم میری ریمنڈ (Michel Joachim Marie Raymond) میسور فوج کی کمان سنبھالنے میں خود کی پہچان قائم کر لینے کے بعد 1786 میں نظام کی خدمت میں آیا۔ اس نے اپنے ماتحت فوجی دستے کارپس فرینکوئس ڈی ریمنڈ (Corps Francois de Raymond) کی تنظیم کی جس کی تعداد 11,000 تک پہنچ چکی تھی۔ وہ 'امین جنسی' (توپ خانے کا نگراں) بنا اور توپوں کو تیار کرنے کے لیے ایک بندوق کارگاہ قائم کی۔ نظام نے اسے بہت سے خطابات سے نوازا اور اس کے علاوہ سات لاکھ کی نجی جاگیر عطا کی۔ دوسرا امتیاز فرانسیسی کمانڈر ڈی بوئگین (De Boigne) تھا جس نے مہاد جی سندھیا کے ماتحت کام کیا، اس نے فرانسیسی نمونے پر فوجی دستوں کی تنظیم کی جن کی قوت 50,000 افراد تک پہنچ گئی تھی۔ اسے ہندوستان کے وائسرائے کا خطاب، کافی تنخواہ اور زرخیز جمنا دوآب میں اپنی افواج کی دیکھ بھال کے لیے جاگیر دی گئی۔ اس کے مشہور دستے کی ترکیب بعد کی برٹش انڈین فوج سے مشابہ تھی جس میں جاٹوں، سکھوں، افغانوں اور راجپوتوں وغیرہ سے فوجی بھرتی کیے جاتے تھے۔ اسی طرح استاچ ڈیلانوئے (Eustachius De Lannoy) ایک ادنیٰ حیثیت سے تراونکور کے حکمراں رام ورما کی 50,000 مضبوط فوج کا کمانڈر بنا۔ اس نے ادے گری قلعہ کی قلعہ بندی کرائی اور ایک بندوق کارگاہ اور بارود کا کارخانہ بھی قائم کروایا۔ اگرچہ میسور کی فوجی تنظیم میں فرانسیسی افسروں کی کمان میں کوئی علاحدہ اکائی نہیں تھی لیکن فرانسیسی کمانڈر، سپاہیوں اور انجینیروں نے میسور فوج میں ایک اہم کردار نبھایا۔ اسی طرح الارڈ (Allard) اور وینٹورا (Ventura) نے رنجیت سنگھ کی خاص فوج کو منظم کیا جو کہ گھڑ سواروں کے دو دستوں، پیادہ فوج کی چار پلٹنوں اور اعلیٰ ترین فرانسیسی کمان کے تحت 24 توپوں کے توپخانے پر مشتمل سبھی بازوؤں کی مربوط تشکیل تھی۔ درحقیقت رنجیت سنگھ کی فوج کی تقریباً ایک تہائی فوج کی تربیت یورپی انداز سے ہوئی تھی اور قابلیت کی بنیاد پر ترقی کے اصول پر مبنی تھی۔ سماج میں یہ فوج ایک طرح کی بے قاعدگی پر مبنی تھی جہاں فرد کی حیثیت اور درجہ اس کی پیدائش پر منحصر تھا۔ فرانسیسیوں نے نہ صرف ایسے ہندوستانی نظام ریاست میں اپنی جاگیروں میں مالیاتی اور عدالتی اختیارات استعمال کیے بلکہ انہوں نے ان میں نمایاں اثر ورسوخ بھی قائم کیا۔

1.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں آپ نے ابتدائی یورپی تجارتی کمپنیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں پڑھا۔ یورپی تجارتی کمپنیوں نے بحری تجارت میں اجارہ داری قائم کرنے کے ذریعہ اپنی 'تجارتی سلطنتیں' قائم کیں۔ سمندر پر یورپیوں کی مکمل برتری اس طرح کی سلطنتوں کے قیام میں کافی اہم تھی۔ ان سلطنتوں کی سرگرمیاں اکثر برصغیر ہند کے ساحلی علاقوں تک محدود رہیں اور انہوں نے حصولیابی، تجارت اور مالیات کے موجودہ نیٹ ورک سے استفادہ کیا۔ یورپ اور ہندوستانی تجارت کا توازن، ہندوستان کے لیے موافق تھا اور ہندوستان اپنے برآمدات سے 'بلین' (سونا چاندی) کی کثیر مقدار کماتا تھا۔ اس طرح یورپی تجارتی کارپوریٹ گھرانوں کی غیر ملکی تجارت سے ہندوستانی معیشت کو کافی فائدہ پہنچا۔ اگرچہ یورپی کمپنیوں اور ہندوستانی حکمرانوں میں تجارت کے کنٹرول کو لے کر کبھی کبھی جھگڑے پیدا ہو جاتے تھے لیکن بڑے پیمانے پر طاقت کا استعمال کبھی نہیں ہوا۔ یورپی کمپنیوں کی دستیاب افرادی قوت محدود تھی اور وہ مقامی حکمرانوں کو چنوتی دینے کی حیثیت میں نہیں تھے۔ فرانسیسیوں نے نئے قسم کی پیشہ ورانہ تربیت یافتہ پیادہ فوج، جسے بڑے پیمانے پر مربوط حملوں کے لیے لام بند کیا جاسکتا تھا، کی طاقت کی بنیاد پر

سب سے پہلے علاقائی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ فرانسیسی تجربہ ناکام ہوالیکن بعد میں انگریزوں نے سلطنت کی تعمیر میں فرانسیسی نمونے کا کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔

1.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

بلین	:	سونا چاندی یا قیمتی دھات وغیرہ۔
کرتاز	:	پرتگالی بحری تجارتی اجازت نامہ یالائسنس۔
راس امید	:	راس امید(Cape of Good Hope)جنوبی افریقہ کاایک ساحلی شہر
کیفیلا	:	مقامی تجارتی جہاز۔
دلال	:	وہ ہندوستانی جو ہندوستانی تاجروں کے ساتھ معاملات اور مقامی بازاروں کی گہری معلومات رکھتے تھے۔
پگوڈا	:	کرنسی کی اکائی تھی، سونے یا آدھے سونے سے بنا سکہ جو ہندوستانی خاندانوں کے ساتھ ساتھ برطانوی، فرانسیسی اور ڈچوں نے اپنایا تھا۔
لیور	:	781سے1794تک مملکت فرانس اوراس کی پیشرو ریاست مغربی فرانسیا کی کرنسی۔

1.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. واسکوڈی گاماکالی کٹ کب پہونچا؟
2. واسکوڈی گاما کس ملک کارہنے والا تھا؟
3. پرتگالیوں نے گواپر قبضہ کس سال کیا؟
4. ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کب وجود میں آئی؟
5. ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی پہلی فیکٹری کہاں قائم کی؟
6. کرتاز (*Cartaz*) کیاہے؟
7. کیفیلا کیاہے؟
8. راس امید(Cape of Good Hope)کس ملک میں ہے؟
9. فرینچ ایسٹ انڈیا کمپنی کب وجود میں آئی؟
10. فرانسیسیوں نے اپنی پہلی فیکٹری کہاں قائم کی؟

1.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. پرتگالیوں کے ہندوستان آمد پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. پرتگالیوں کے تجارتی ذرائع پر نوٹ لکھیے۔
3. ڈچ تجارت کی کیا نوعیت تھی ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
4. ہندوستانی سماج اور ریاست پر ڈچ سلطنت کا کیا اثر تھا نوٹ لکھیے۔
5. فرانسیسی کمپنی تجارتی کمپنی سے علاقائی سلطنت میں کیسے تبدیل ہوئی؟ ایک نوٹ لکھیے۔

1.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پرتگالیوں نے تجارت کو کس طرح مضبوط کیا؟ تفصیل سے لکھیے۔
2. ڈچ فیکٹریوں کے نظم و نسق پر مفصل لکھیے۔
3. ہندوستانی ریاستوں میں فرانسیسی پیشہ ور فوجیوں کے کردار پہ روشنی ڈالیے۔

1.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
3. Dalrymple, William, *The Anarchy*: *The East India Company*, *Corporate Violence*, *and the Pillage of an Empire*, Bloomsbury, London, 2019.
4. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
5. Durant, Will, *The Case for India*, Standard Book Stall, Mumbai, 2007.
6. Freedman, Paul, *Out of the East*: *Spices and the Medieval Imagination*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2008.
7. Gandhi, Rajmohan, *A History of Modern South India*: *A History from the 17th Century to Our Times*, Aleph book Company, New Delhi, 2018.
8. Metcalf, Barbara D., and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).
9. Pearson, M.N., *The Portuguese in India*: *The New Cambridge History of India*, Cambridge University Press, Cambridge, 2006 (first pub. 1987).
10. Roy, Tirthankar, *The East India Company*: *The World's Most Powerful Corporation*, Allen Lane/ Penguin, New Delhi, 2012.
11. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707–1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.
12. Wilson, Jon, *India Conquered*: *Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon and Schuster, London and New Delhi, 2017.

اکائی 2۔ابتدائی یوروپی بستیاں-II: برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی

(Early European Settlements–II: The English East India Company)

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید
2.1 مقاصد
2.2 برطانوی فتح کے وقت ہندوستان کی حالت
2.3 ایسٹ انڈیا کمپنی: عروج اور ارتقا
2.3.1 کمپنی کی داخلی تنظیم
2.3.2 ہندوستان میں کمپنی کی فیکٹریوں کی تنظیم
2.4 جنوبی ہند میں انگریزی فرانسیسی جدوجہد
2.5 بنگال پر انگریزوں کا قبضہ
2.5.1 پلاسی اور بکسر کی جنگیں
2.6 اکتسابی نتائج
2.7 کلیدی الفاظ
2.8 نمونہ امتحانی سوالات
2.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
2.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
2.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
2.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان میں برطانوی حکومت کا قیام ہندوستانی تاریخ کا اہم ترین سنگ میل ہے۔اس نے ہندوستانی لوگوں کی زندگی کے ہر پہلو میں دوررس تبدیلیاں پیدا کیں۔اس امر کا مطالعہ انتہائی حیران کن اور بہت دلچسپ بھی ہوگا کہ کیسے ایک تجارتی کمپنی، جس نے پہلے پہل ہندوستانی حکمرانوں سے تجارتی سرگرمیاں شروع کرنے کی اجازت مانگی تھی،وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ملک کی حکمران بن گئی۔کیسے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اتنی طاقتور ہوگئی؟اس طویل عمل میں کن عوامل نے اہم کردار ادا کیا؟اس نے کیا طریقہ کار اپنایا؟اس نے کیسے ہندوستان کو انچ بہ انچ فتح کیا؟ہندوستان کی فتح میں اسے اپنے لیے کیا فوائد مضمر نظر آئے اور،اس نے ہندوستانی اداروں کو ایک ایک کر کے کیسے تباہ کیا؟یہ کچھ پہلو ہیں جنہیں ہم اس اکائی میں ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان آنے کو سمجھ سکیں گے۔
- کمپنی کی مختلف تجارتی سرگرمیوں کو سمجھ سکیں گے۔
- کمپنی کی سیاسی امنگوں کی وجوہات،اوران کے حصول کے ذرائع کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- اٹھارویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی حالات کا اندازہ لگا سکیں گے۔
- ان دو فیصلہ کن لڑائیوں کو سمجھ سکیں گے جنہوں نے ہندوستانی تاریخ کا رخ بدل دیا۔
- بنگال میں کمپنی کی جابرانہ حکمرانی اور لوٹ کھسوٹ کو سمجھ سکیں گے۔

2.2 برطانوی فتح کے وقت ہندوستان کی حالت (India on the Eve of British Conquest)

ہندوستان کی فتح اور اس کے بعد کے دور میں انگریزوں نے خود کو ایک 'تہذیبی مشن' پر سمجھا،اور ہندوستان میں اپنی آمد اور حکمرانی کو 'خدائی انتظام' کہا۔انہوں نے یہ مفروضہ قائم کیا اور اسے دہرایا کہ ہندوستان ہمیشہ سے پسماندہ ملک رہا ہے، جہاں غیر مہذب لوگ آباد ہیں۔یہ ایک جامد معاشرہ تھا جو برسوں سے ایسا ہی چلا آرہا تھا۔اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی ممنوع تھی۔اس کے علاوہ ہندوستانی تہذیب میں کوئی بھی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔انہوں نے اپنی غیر ملکی حکمرانی کو قانونی حیثیت دینے کے لیے اس طرح کے متعصبانہ خیالات کو پھیلایا۔لیکن کیا ہندوستان ویسا ہی تھا جیسا کہ انگریزوں نے اسے سمجھا اور دنیا کے سامنے پیش کیا؟ بہت سے ماہرین نے ہندوستان کے بارے میں برطانوی متعصبانہ تصورات کو سختی سے مسترد کر دیا۔اپنی کتاب *India in Bondage: Her Right to Freedom* میں امریکی وزیر Jabez T. Sunderland نے پرزور طریقے سے کہا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جس ہندوستان کو فتح کیا وہ کوئی قدیم یا قبائلی ملک نہیں تھا بلکہ اس نے تہذیبی سطح پر بہت سی حیران کن کامیابیاں حاصل کی تھیں۔وہ لکھتا ہے:

ہر اس قسم کی مصنوعات جسے مہذب دنیا جانتی ہے، انسانی دماغ اور ہاتھ سے تخلیق کردہ تقریباً ہر قسم کی تخلیق، چاہے وہ کہیں بھی ہو اور چاہے وہ اپنی خوبصورتی کے لیے جانی جاتی ہو یا افادیت کے لیے، وہ طویل عرصہ سے ہندوستان میں تیار کی جاتی تھی۔ ہندوستان یورپ یا ایشیا میں کسی بھی دوسری ریاست سے کہیں زیادہ صنعتی اور مصنوعات تیار کرنے والا ملک تھا۔ اس کی کپڑے کی مصنوعات سوتی، اون، کتان اور ریشم سے بنی اس کے کرگھوں کی عمدہ پیداوار پوری مہذب دنیا میں مشہور تھی۔ اسی طرح اس کے شاندار جاذب نظر زیورات اور قیمتی پتھر ہر خوبصورت شکل میں تراشے گئے تھے۔ اس کے مٹی کے برتن، چینی مٹی کے برتن، ہر قسم کے ظروف بہترین معیار، رنگ اور خوبصورت شکل کے تھے۔ یہی معاملہ لوہے، چاندی اور سونے سے بنی دھاتی اشیا کا تھا۔ ہندوستان شاندار فن تعمیر سے آراستہ تھا جس کی خوبصورتی دنیا کے کسی اور ملک سے کم نہیں تھی۔ اس کے پاس انجینئرنگ کے شاندار شاہکار تھے۔ عظیم سوداگر، بڑے تاجر، بہترین بینکر اور مہاجن بھی تھے۔ اسے نہ صرف بحری جہاز سازی میں مہارت حاصل تھی بلکہ اس کی تجارت اور کاروبار، زمینی اور بحری راستے سے تمام مشہور مہذب ممالک تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ وہ ہندوستان تھا جو انگریزوں نے آتے ہی پایا۔

The Story of Civilisation کے مصنف اور مشہور امریکی مورخ و فلسفی، ول ڈیورنٹ (Will Durant)، نے 1930 میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ انہوں نے *The Case for India* کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو 1930 میں شائع ہوئی۔ اس کے دیباچے 'اے نوٹ ٹو دی ریڈر' (A Note to the Reader) میں، ڈیورنٹ ہندوستانیوں کی غربت اور تکالیف کو دیکھ کر 'خوفزدہ' ہو گئے تھے جو 'زمین پر پائی جانے والی کسی بھی جگہ کے مقابلے بہت زیادہ تھی۔' وہ یہ جان کر حیران رہ گئے کہ 'وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی بھی حکومت اپنی رعایا کو اس طرح کے مصائب میں مبتلا کیسے کر سکتی ہے؟' ان کے مطابق انگلینڈ نے جان بوجھ کر 'ان ڈیڑھ صدیوں میں' ہندوستان کا خون بہایا۔ اور برطانوی راج 'پوری تاریخ کا سب سے گھناؤنا جرم' تھا۔ ہندوستان پر انگریزوں کی فتح کو مختصراً بیان کرتے ہوئے ول ڈیورنٹ نے کہا:

> ہندوستان پر برطانیہ کی فتح، ایک تجارتی کمپنی کی جانب سے مکمل طور پر بغیر کسی اصول یا عذر کے، تہذیب سے بے پرواہ اور فائدے کے لالچی لوگوں کی جانب سے، ایک بے بس اور لاچار ملک پر آگ اور تلوار کے بے جا استعمال، رشوت اور قتل و غارت گری، جوڑ توڑ اور غیر قانونی اور 'قانونی' لوٹ کھسوٹ کے ذریعے ایک اعلیٰ تہذیب کی تباہی تھی جو 173 سالوں سے بے رحمی سے جاری ہے، اور آج تک چل رہی ہے۔

2.3 ایسٹ انڈیا کمپنی: عروج اور ارتقا (Rise and Growth of the East India Company)

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا بہت چھوٹی حیثیت سے آغاز ہوا ہوا۔ 1687 تک ان کی تجارت کا مرکز سورت رہا۔ اس تمام عرصے میں مغل دربار میں ان کی حیثیت ایک سائل کی رہی۔ 1623ء تک انہوں نے سورت، بڑوچ، احمد آباد، آگرہ اور مچھلی پٹنم میں فیکٹریاں قائم

کر لیں۔ انگریزی تجارتی کمپنی نے تجارت و سفارت کے دوش بدوش جنگ کا اور جہاں ان کی فیکٹریاں تھی ان علاقوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کا سلسلہ ابتداہی سے جاری رکھا۔ مستقبل میں ہندوستان کے ساتھ انگریزوں کے تعلقات کی جو نوعیت تھی، اس کی بنیاد سر تھامس روکا یہ مشورہ تھا جو انگریز ارباب اختیار کو اس نے دیا تھا: 'یقین جانو! میری دانست میں ان لوگوں کے ساتھ پیش آنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں عصائے نامہ بر' اس نے مزید اتنا اضافہ کیا کہ 'انگریزوں کو وہی روش اختیار کرنی چاہیے جس سے ہم نے آغاز کیا تھا اور جس کی بدولت ہم زندہ رہے، یعنی خوف وہراس پیدا کرنا۔'

1625ء میں کمپنی کے ارباب اختیار نے سورت کی فیکٹری کو قلعہ بند کرنے کی کوشش کی، لیکن اس وقت مغل حکومت طاقتور تھی۔ اس لیے مقامی حکام نے کمپنی کے افسر اعلی کو گرفتار کر کے فوراپابہ زنجیر دہلی روانہ کر دیا۔ اسی طرح جب انگریزی کمپنی کے حریفوں نے مغل سلطنت کے جہازوں پر حملہ کیا تو مغل شہنشاہ نے سورت کی کمپنی کے صدر اور اس کی کونسل کے اراکین کو جوابی کارروائی کے طور پر قید کر لیا اور اٹھارہ ہزار پاؤنڈ سے جرمانے کی ادائیگی کے بعد ہی انہیں رہا کیا۔ جنوبی ہند کے حالات انگریزوں کے لیے زیادہ سازگار تھے، کیونکہ وہاں ان کو مضبوط ہندوستانی حکومت سے سابقہ نہیں پڑتا تھا۔ 1565ء میں وجے نگر کی عظیم سلطنت کی تباہ ہو گئی اور اس کی جگہ پر متعدد چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستیں قائم ہو گئیں۔ ان کی حرص کو آسودہ کر کے یا فوجی طاقت سے ڈرا دھمکا کر ان کو باآسانی قابو میں کیا جا سکتا تھا۔ انگریزوں نے جنوبی ہند میں اپنی پہلی فیکٹری مچھلی پٹنم کے مقام پر 1611ء میں قائم کی۔ لیکن جلد ہی انہوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز مدراس کو بنایا جسے 1639ء میں مقامی راجہ سے انہوں نے پٹے پر حاصل کیا تھا۔ اس وقت مدراس کی حیثیت ایک ساحلی پٹی کی سی تھی جس کی لمبائی چھ میل اور چوڑائی ایک میل تھی۔ راجہ نے اس شرط پر انگریزوں کو اسے قلعہ بند کرنے کا، وہاں کا نظم ونسق چلانے اور سکہ جاری کرنے کا اختیار دیا کہ ساحل کی چنگی کی آمدنی کا نصف حصہ اسے دیا جائے گا۔ یہاں انگریزوں نے فیکٹری کے قریب قلعہ سینٹ جارج کے نام سے ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کر لیا۔

سترہویں صدی کے آخری برسوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی، مدراس پر اپنی مکمل فرمانروائی کا دعوی کرتی تھی اور اپنے اس دعوے کے دفاع میں جنگ کرنے کے لیے تیار رہتی تھی۔ یہ بھی کم دلچسپ نہیں ہے کہ منافع کمانے والے تاجروں کی کمپنی ابتداہی سے اس پر تلی تھی کہ ملک کو فتح کیے جانے کے اخراجات بھی ہندوستانیوں ہی سے وصول کیے جائیں، مثلاً کمپنی کے مجلس ناظمین (Court of Directors) نے اپنے مدراس کے اہلکاروں کو 1683ء میں لکھا: 'ہم چاہتے ہیں کہ تم لوگ ہمارے قلعے (سینٹ جارج) اور شہر (مدراس) کو رفتہ رفتہ قلعہ بند کر لو، تاکہ کسی ہندوستانی راجہ کے یاڈچوں کے لیے، یا کسی بھی ہندوستانی طاقت کے لیے اس پر حملہ کرنا مشکل ہو جائے لیکن تم سے ہم یہ توقع بھی کریں گے کہ اس کام کو تم اس طرح انجام دو گے (مگر بڑی نرمی کے ساتھ) کہ قلعہ بندی اور مرمت کے جملہ اخراجات وہاں کے باشندے ہی ادا کریں۔' بمبئی کا جزیرہ کمپنی کو پرتگالیوں سے 1668ء میں ملا۔ کمپنی نے فوراً اس کی قلعہ بندی کی۔ بمبئی انگریزوں کے لیے ایک وسیع بندرگاہ ثابت ہوئی، جس کا آسانی سے دفاع کیا جا سکتا تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ بڑھتے ہوئے مراٹھا اقتدار سے پیدا ہونے والے خطرے کے پیش نظر مغربی ساحل پر کمپنی کے ہیڈ کوارٹر کی حیثیت سے بمبئی نے سورت پر فوقیت حاصل کر لی۔

مشرقی ہند میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی پہلی فیکٹری 1633ء میں اڑیسہ میں قائم کی۔ 1651ء میں اسے بنگال میں ہگلی کے مقام پر تجارت کرنے کی اجازت دی گئی لیکن جلد ہی اس نے پٹنہ، بالا سور، ڈھاکہ اور بنگال و بہار کے دوسرے مقامات پر فیکٹریاں قائم کر لیں۔ اب اس کی یہ خواہش تھی کہ بنگال میں بھی اسے خود مختار نوآبادی کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ مزید برآں تجارت میں کامیابی اور مدراس و بمبئی میں خود مختار نے نوآبادیوں کے قیام کی وجہ سے، نیز مراٹھوں کے خلاف اورنگزیب کے دکن میں پھنسے ہونے کی وجہ سے، انگریزوں نے سائلانہ انداز ترک کر دیا تھا۔ اب ہندوستان میں ایک ایسے سیاسی اقتدار کی تعمیر کا خواب وہ دیکھ رہے تھے، جس کے بل پر مغل حکومت کو وہ مجبور کر سکیں گے کہ انہیں تجارت کی مکمل آزادی دی جائے۔ تاکہ ہندوستانیوں سے کم سے کم دام پر مال خریدیں اور زیادہ سے زیادہ دام پر اپنا مال ان کے ہاتھ فروخت کریں، یورپ کے حریف تاجروں کو ہندوستان میں قدم نہ رکھنے دے اور اپنی تجارت کو ہندوستانی طاقتوں کی پالیسیوں سے آزاد رکھیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ سیاسی اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد یہ بہ آسانی ہندوستانی محاصل پر قابض ہو سکیں گے اور پھر اسی رقم سے ملک کو فتح کر سکیں گے۔ اس طرح کے منصوبے ابتدا ہی میں واضح طور پر تیار کر لیے گئے تھے۔ بمبئی کے گورنر جیرالڈ اونگیر (Gerald Aungier) نے کمپنی کے ڈائریکٹروں کو لندن لکھا تھا کہ 'وقت آگیا ہے کہ اپنی جنرل کمیٹی کو آپ اس کے لیے آمادہ کریں کہ اب تلوار اٹھائے۔' 1687ء میں ڈائریکٹروں نے گورنر مدراس کو مشورہ دیا: دیوانی اور فوجی اقتدار کی ایسی پالیسی اختیار کرو کے وسیع محاصل کے وسائل پیدا ہوں، محصولات وصول ہوں اور اسی آمدنی سے دیوانی اور فوجی دونوں اخراجات پورے ہو سکیں اور ایک عظیم، مستحکم اور محفوظ انگریزی سلطنت کی بنیاد رکھی جا سکے جو ہمیشہ قائم رہے۔ 1689ء میں انہوں نے اعلان کیا کہ: 'اپنے محاصل میں اضافے کی ہمیں اتنی ہی فکر ہے، جتنی اپنی تجارت کی۔ جب کہ بیسیوں حادثات ہماری تجارت کی راہ میں حائل ہوں گے، اسی سے ہمارے فوجی اخراجات پورے ہو سکیں گے اور اسی سے ہندوستان میں ہم ایک قوم بن سکیں گے۔'

انگریزوں اور مغل شہنشاہ میں پہلی جنگ 1686ء میں اس وقت ہوئی جب انگریزوں نے ہگلی کو تاخت و تاراج کیا اور شہنشاہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ مگر انگریزوں نے صورتحال اور مغلوں کی قوت کا بہت غلط اندازہ لگایا تھا۔ اورنگزیب عالمگیر کے عہد حکومت میں مغل سلطنت کی فوج، ایسٹ انڈیا کمپنی کی بے حقیقت فوجوں کے مقابلے میں بہت طاقتور تھی۔ انگریزوں کے لیے یہ لڑائی تباہ کن ثابت ہوئی۔ ان کی بنگال کی فیکٹریوں سے انہیں باہر نکال دیا گیا اور گنگا کے دہانے پر ایک بخار زدہ جزیرے میں انہیں پناہ لینی پڑی۔ سورت، مچھلی پٹنم اور وشاکھا پٹنم کی فیکٹریوں پر قبضہ کر لیا گیا اور بمبئی کے قلعہ کا بھی محاصرہ کر لیا گیا۔ یہ محسوس کرنے کے بعد کہ ابھی مغل اقتدار سے لوہا لینا ان کے لیے ممکن نہیں ہے انگریزوں نے پھر ناچیز درخواست گزاروں کا روپ دھار لیا اور انہوں نے التجا کی کہ 'جو خطائیں ان سے سرزد ہوئی ہیں، انہیں معاف کیا جائے'۔ ہندوستانی حکمرانوں کے زیر حفاظت تجارت کرنے پر بھی انہوں نے آمادگی ظاہر کی۔ ظاہر ہے، انہیں سبق مل گیا تھا۔ مغل شہنشاہ سے مراعاتیں حاصل کرنے کے لیے ایک بار پھر انہوں نے چاپلوسی اور عاجزی کی روش اختیار کر لی۔

مغل حکمرانوں نے انگریزوں کی خطائیں بخش دیں، کیونکہ اس بات کے معلوم کر لینے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا کہ معصوم سے نظر آنے والے غیر ملکی تاجر ایک دن ملک کے لیے شدید خطرہ بن جائیں گے۔ اس کے برعکس وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ کمپنی کی وساطت سے

ہونے والی غیر ملکی تجارت سے ہندوستانی صنعت کاروں اور تاجروں کو فائدہ پہنچتا ہے اور اس سے بالواسطہ سرکاری خزانے میں اضافہ ہوتا ہے۔ مزید برآں، انگریزوں کی زمینی فوج اگرچہ کمزور تھی، تاہم سمندر پر انہیں بالادستی حاصل تھی اور ہندوستان کا سامان تجارت وہ باآسانی ایران، مشرقی و مغربی ایشیا، شمالی و مشرقی افریقہ تک لے جانے کے اہل تھے۔ اسی بنا پر اورنگزیب نے ڈیڑھ لاکھ روپے بطور تاوان وصول کر کے انگریزوں کو پھر سے تجارت کی آزادی دے دی۔ 1691ء میں تین ہزار روپے سالانہ کے بدلے کمپنی کو بنگال میں چنگی معاف کر دی گئی۔ 1698ء میں کمپنی نے ست نتی، کالی گتا اور گوبند پور دیہاتوں کی زمینداری حاصل کرلی اور وہیں اپنی فیکٹری کے ساتھ ساتھ فورٹ ولیم قلعہ تعمیر کیا۔ ان تینوں دیہاتوں نے جلد ہی شہر کی شکل اختیار کرلی اور کلکتہ کے نام سے مشہور ہوا۔ 1717ء میں کمپنی نے شہنشاہ فرخ سیر سے ایک فرمان حاصل کیا، جس میں ان مراعاتوں کی توثیق کی گئی تھی جو کمپنی کو 1691ء میں عطا کیے گئے تھے اور ان مراعاتوں کا دائرہ گجرات اور دکن تک وسیع کر دیا گیا تھا۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں بنگال میں مرشد قلی خان اور علی وردی خان جیسے طاقتور نوابوں کی حکمرانی تھی۔ انگریز تاجروں کو انہوں نے سختی سے قابو میں رکھا اور مراعاتوں کے غلط استعمال سے روکا۔ اس کے علاوہ کلکتہ کی قلعہ بندی کو مستحکم کرنے اور شہر پر آزادانہ حکومت کرنے سے بھی باز رکھا۔ اس جگہ انگریزوں کی حیثیت نواب کے ایک زمیندار سے زیادہ نہ تھی۔

کمپنی اپنے سیاسی عزائم کے حصول میں تو ناکام رہی، لیکن تجارت میں اسے جو کامیابی حاصل ہوئی، وہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ہندوستان سے انگلینڈ میں درآمد کرنے والی تجارت جو 1708ء میں پانچ لاکھ پاؤنڈ تھی، 1740ء میں بڑھ کر سترہ لاکھ پچانوے ہزار پونڈ ہوگئی اور یہ اضافہ اس حالت میں ہوا تھا جب کہ انگلینڈ کی حکومت نے کپڑے کی انگریزی صنعت کو بچانے اور انگلینڈ سے بلین (سونا چاندی) باہر جانے سے روکنے کے لیے انگلینڈ میں ہندوستانی سوتی اور ریشمی کپڑوں کا استعمال ممنوع قرار دیا تھا۔ اس طرح سے ایک ایسے وقت میں جب انگریز ہندوستان میں آزاد تجارت کا مطالبہ کر رہے تھے خود اپنے ملک میں آزاد تجارت اور ہندوستانی مصنوعات کی درآمد کو روک رہے تھے۔ مدراس، بمبئی اور کلکتہ کی برطانوی بستیاں، ترقی پذیر شہری زندگی کا مرکز بن گئیں۔ کثیر تعداد میں ہندوستانی تاجر اور مہاجران شہروں میں آنے لگے۔ اس کی کچھ وجہ تو یہ تھی کہ ان شہروں میں نئے تجارتی مواقع موجود تھے اور کچھ وجہ وہ غیر یقینی حالات تھے جو ان شہروں کے باہر مغل حکومت کے انتشار سے پیدا ہوگئے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط تک مدراس کی آبادی بڑھ کر تین لاکھ، کلکتہ کی دولاکھ اور بمبئی کی ستر ہزار ہوگئی تھی۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان تینوں شہروں میں قلعہ بند انگریزی نوآبادیاں تھیں، وہاں ساحل سمندر تک باآسانی پہنچا جاسکتا تھا جہاں انگریزی بحری طاقت موجود تھی، جو ہندوستانی بحری طاقت کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور تھی۔ یہ شہر انگریزوں کو اس بات کے بھی بہت عمدہ مواقع فراہم کرتے تھے کہ ملک میں جب سیاسی انتشار پیدا ہو تو اس کا فائدہ اٹھا کر ملک پر تسلط حاصل کرلیں۔

2.3.1 کمپنی کی داخلی تنظیم (Internal Organisation of the Company)

ایسٹ انڈیا کمپنی کو مشرق کے ساتھ راس امید (Cape of Good Hope) کے راستے پندرہ سال کے لیے تجارت کرنے کا منشور (Charter) عطا کیا گیا تھا۔ منشور کے مطابق کمپنی کا انتظام ایک مجلس (committee) کے سپرد تھا، جو ایک گورنر، ایک نائب گورنر اور چوبیس اراکین (members) پر مشتمل تھی۔ جن اراکین نے کمپنی قائم کی تھی وہی اراکین کا انتخاب کرتے تھے۔ آگے چل کر

اس مجلس کو 'کورٹ آف ڈائریکٹرس' اور اس کے اراکین کو 'ڈائریکٹر' کہا جانے لگا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جلد ہی انگلینڈ کی سب سے بڑی تجارتی کمپنی بن گئی۔ 1601ء سے 1612ء تک کی درمیانی مدت میں کمپنی کو بیس فی صدی سالانہ منافع حاصل ہوا۔ یہ منافع تجارت اور بحری قزاقی دونوں ذرائع سے حاصل ہوا تھا۔ اس وقت ان دونوں وسائل میں واضح خط فاصل قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔ 1612ء میں دو لاکھ کے سرمائے پر کمپنی کو دس لاکھ پاؤنڈ کا منافع ہوا۔ سترہویں صدی میں بھی منافع کی شرح بہت زیادہ رہی۔

یہ کمپنی ایک محدود کارپوریشن، یا اجارہ داری تھی۔ غیر لوگوں کو نہ تو مشرق کے ساتھ تجارت کرنے کی اور نہ منافع میں حصہ لگانے کی اجازت تھی۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی جیسی تجارتی کمپنیوں کو شاہی منشور کے ذریعہ تجارتی اجارہ داری عطا کیے جانے کے خلاف انگریز صنعتکاروں نے اور تجارت میں حصہ نہ پاسکنے والے تاجروں نے زبردست تحریک چھیڑ رکھی تھی۔ لیکن حکام اور سیاسی رہنماؤں نے اپنا سارا اثر ورسوخ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے وقف کر دیا تھا، کیونکہ اس نے انہیں بھاری رشوتیں دے رکھی تھیں۔ 1609ء سے 1676ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے چارلس دوم کو ایک لاکھ ستر ہزار پونڈ بطور قرض دیے تھے۔ اس کے معاوضے میں چارلس دوم نے کمپنی کو متعدد منشور عطا کیے، جن کی رو سے کمپنی کو سابقہ مراعاتیں حاصل رہیں۔ وہ قلعے کی تعمیر کر سکتی تھی، فوج بھرتی کر سکتی تھی اور مشرق کے حکمرانوں سے جنگ اور صلح کر سکتی تھی۔ ان منشوروں نے کمپنی کے اہلکاروں کو اس کا بھی مجاز قرار دیا کہ ان نوآبادیوں میں رہنے والے انگریزوں اور دوسرے لوگوں کے مقدمات بھی فیصل کریں۔ اس طرح سے کمپنی کو وسیع فوجی و عدالتی اختیارات بھی حاصل ہوگئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارتی اجارہ داری حاصل ہو جانے کے بعد بھی بہت سے انگریز تاجر، ایشیائی ملکوں میں تجارت کرتے رہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو 'آزاد تاجر' کہتے تھے اور کمپنی ان لوگوں کو 'غیر قانونی تاجر' کا نام دیتی تھی لیکن آگے چل کر کمپنی ان غیر قانونی تاجروں کو اپنا حصہ دار بنانے پر مجبور ہوگئی۔ 1688ء میں قسمت نے ایک اور پلٹا کھایا اور 1688ء کے انقلاب نے اسٹوارٹ خاندان کے بادشاہ کو معزول کر کے ولیم سوم اور اس کی بیوی میری کو برطانیہ کا مشترکہ فرمانروا بنا دیا اور اس کے ساتھ ہی پارلیمنٹ کو اقتدار اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ آزاد تاجروں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے اب عوام اور پارلیمنٹ، دونوں پر زور دینا شروع کر دیا۔ کمپنی نے اپنے دفاع کے لیے بادشاہ، اس کے وزراء اور پارلیمنٹ کے اراکین کو بھاری رشوتیں دی۔ صرف ایک سال میں اس نے اسی ہزار پونڈ رشوت میں دیے جس میں دس ہزار پونڈ بادشاہ کو دیے گئے تھے۔ بالآخر 1693ء میں کمپنی کو ایک نیا منشور عطا کر دیا گیا۔

لیکن وقت کمپنی کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس کی کامیاب زندگی مختصر ثابت ہوئی۔ برطانوی پارلیمنٹ 'ہاؤس آف کامنز' نے 1694ء میں یہ قرارداد منظور کی کہ 'انگلینڈ کے ہر باشندے کو اس وقت تک ایسٹ انڈیز (ہندوستان اور بحر ہند کے جزائر) کے ساتھ تجارت کرنے کا حق حاصل ہے، جب تک کہ پارلیمنٹ کا قانون اسے ممنوع قرار نہ دے۔' ایسٹ انڈیا کمپنی کے حریفوں نے 'نیو کمپنی' کے نام سے ایک نئی تجارتی کمپنی قائم کرلی۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی، برطانوی حکومت کو صرف سات لاکھ پونڈ قرض دینے پر تیار ہوئی، تو نیو کمپنی نے 20 لاکھ پونڈ پیش کر دیے۔ چنانچہ پارلیمنٹ نے نیو کمپنی کو مشرق کے ساتھ تجارت کرنے کا منشور عطا کر دیا۔ لیکن پرانی کمپنی اپنی

منافع بخش تجارت سے ہاتھ دھونے پر آسانی سے تیار ہونے والی نہیں تھی۔ نیو کمپنی کے پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کے بہت سے حصے خرید لیے۔ دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکاروں نے نیو کمپنی کے نمائندوں کو ہندوستان میں داخل ہونے ہی نہیں دیا۔ بالآخر 1702ء میں دونوں کمپنیاں متحد ہو گئیں۔ 1708 میں ایسٹ انڈیز میں تجارت کرنے والی ایک متحدہ کمپنی، انگریزی تاجروں کی متحدہ کمپنی ('United Company of the Merchants of England') کے نام سے وجود میں آئی۔

2.3.2 ہندوستان میں کمپنی کی فیکٹریوں کی تنظیم

(Organisation of the Company's Factories in India)

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جیسے جیسے اقتدار حاصل کیا اور ہندوستان میں اسے علاقائی ریاست کی حیثیت حاصل ہونے لگی، اس کی فیکٹریوں نے ترقی کرنا اور رنگ ڈھنگ بدلنا شروع کر دیا۔ کمپنی کی فیکٹریاں بالعموم قلعہ بند ہوتی تھیں، جن میں گودام، دفتر اور کمپنی کے ملازمین کی رہائش گاہیں ہوتی تھیں۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ان فیکٹریوں میں کوئی بھی سامان قطعاً تیار نہیں کیا جاتا تھا۔ کمپنی کے ملازمین تین عہدوں میں منقسم تھے۔ منشی (Writers) گماشتے (Factors) اور تاجر (Merchants)۔ یہ سب ایک ساتھ رہتے اور کھاتے پیتے تھے۔ ان کی زندگی ہاسٹل کی سی زندگی تھی۔ ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے اخراجات کمپنی برداشت کرتی تھی۔ منشی کو سالانہ دس پونڈ (سو روپے)، گماشتے کو بیس سے چالیس پونڈ (دو سو سے چار سو روپے) اور تاجر کو چالیس پونڈ (چار سو روپے) ملتے تھے۔ اس حساب سے ان لوگوں کو بہت کم تنخواہ ملتی تھیں۔ لیکن کمپنی کی ملازمت میں داخل ہونے کے لیے لوگ اس لیے بیتاب رہتے تھے کہ کمپنی اپنے ملازمین کو اندرون ملک میں نجی تجارت کرنے کی اجازت دیتی تھی۔ حالانکہ ہندوستان اور یورپ کے درمیان ہونے والی تجارت پر کمپنی کی مکمل اجارہ داری تھی۔ فیکٹری اور اس کی تجارت گورنر یا کونسل کے زیر انتظام ہوتی تھی۔ گورنر صرف کونسل کا صدر ہوتا تھا اور اس کے کوئی اختیارات نہیں تھے۔ سارے اختیارات کونسل کو حاصل تھے جو ووٹ کی اکثریت پر فیصلے کرتی تھی۔ کونسل کمپنی کے بڑے تاجروں پر مشتمل ہوتی تھی۔

2.4 جنوبی ہند میں انگریزی فرانسیسی جدوجہد (Anglo-French Conflict in South India)

ہندوستان میں علاقائی فتوحات حاصل کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے منصوبوں کو اورنگزیب نے سترہویں صدی کے اواخر میں ناکام بنا دیا تھا، لیکن مغل سلطنت کے زوال پذیر ہوتے ہی کمپنی نے اٹھارہویں صدی کی پانچویں دہائی میں دوبارہ کوششیں شروع کر دیں۔ نادر شاہ کے حملے نے مرکزی اقتدار کے زوال کو ظاہر کر دیا۔ مغربی ہند میں کسی غیر ملکی اقتدار کے قدم جمانے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ وہاں طاقتور مراٹھوں کا اقتدار قائم ہو گیا تھا اور مشرقی ہند میں علی وردی خان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ لیکن جنوبی ہند کے حالات رفتہ رفتہ غیر ملکی قسمت آزماؤں کے لیے سازگار ہوتے جا رہے تھے۔ اورنگ زیب کے بعد دکن سے مرکزی اقتدار غائب ہو چکا تھا۔ 1748ء میں نظام الملک آصف جاہ کے انتقال کے ساتھ دکن سے ایک مضبوط ہاتھ اٹھ گیا۔ مزید برآں مراٹھوں نے دکن سے چوتھ وصول کرنے کے لیے حیدر آباد پر مسلسل حملے شروع کیے۔ ان حملوں نے سیاسی عدم استحکام اور بدنظمی پیدا کر دی۔ کرناٹک باہمی جنگ میں مبتلا ہو گیا۔

ان حالات میں غیر ملکیوں کو اس کا موقع مل گیا کہ اپنے توسیعی عزائم کو عملی جامہ پہنائیں اور جنوبی ہند کی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کر سکیں۔ صرف انگریز ہی تجارتی اور سیاسی اقتدار کے دعویدار نہیں تھے۔ انہوں نے سترہویں صدی میں اگرچہ پرتگالی اور ڈچ حریفوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ تاہم اب ایک نیا حریف، فرانس میدان میں آ گیا تھا۔ 1744ء سے 1763ء کے درمیان تقریباً بیس سال تک ہندوستان کی تجارت، دولت اور علاقوں پر تسلط حاصل کرنے کے لیے انگریز اور فرانسیسی مسلسل لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔

فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی 1664ء میں قائم ہوگئی تھی۔ 1720ء میں اسے باضابطہ تسلیم کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی تیزی سے اس نے ترقی شروع کی اور جلد ہی وہ انگریزی کمپنی کی ہمسری کرنے لگی۔ اس نے کلکتہ کے قریب چندر نگر اور مشرقی ساحل پر پانڈیچری میں مضبوطی سے قدم جما لیے۔ پانڈیچری کو انہوں نے مکمل طور پر قلعہ بند کر دیا تھا۔ ان دونوں مقامات کے علاوہ مشرقی اور مغربی ساحل پر متعدد بندرگاہوں پر بھی ان کی فیکٹریاں قائم ہو گئیں۔ بحر ہند کے جزیروں 'ماریشس' اور 'ری یونین' پر بھی فرانسیسیوں نے تسلط حاصل کر لیا تھا۔ فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کا زیادہ تر انحصار، فرانسیسی حکومت پر تھا جو اسے عطیہ، امداد، قرض اور دوسری شکل میں سرکاری خزانے سے رقمیں فراہم کرتی تھی۔ چنانچہ اس پر بڑی حد تک حکومت کا کنٹرول تھا، جو 1723ء کے بعد کمپنی کے ڈائریکٹروں کا بھی تقرر کرنے لگی تھی۔ مزید برآں کمپنی کے بڑے حصہ دار امرا اور صاحب املاک لوگ تھے جنہیں کمپنی کو پائیدار تجارتی ادارہ بنانے سے زیادہ جلد سے جلد منافع حاصل کرنے سے ہی دلچسپی تھی۔ سرکاری قرضوں اور امدادی رقموں سے ڈائریکٹر جب تک حصے داروں کے منافع کا اعلان کرتے رہے، اس وقت تک حصے داروں کو اس تجارتی مہم کی کامیابی اور استحکام سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ریاست کے زیر اقتدار ہونے سے کمپنی کو ایک اور نقصان بھی پہنچا۔ اس وقت فرانسیسی حکومت مطلق العنان، نیم جاگیردارانہ اور غیر مقبول تھی۔ رشوت ستانی، نااہلی اور عدم استحکام کا دور دورہ تھا۔ دوراندیش ہونے کی جگہ پر حکومت زوال پذیر اور روایت پرست ہونے کے علاوہ وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہل بھی نہیں تھی۔ کمپنی پر اس طرح کی حکومت کا اقتدار اس کے حق میں مضر ثابت ہوا۔

1742ء میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان یورپ میں جنگ شروع ہو گئی۔ جنگ کی بڑی وجہ امریکی نو آبادیوں پر تسلط حاصل کرنے کی ہوڑ تھی۔ دوسری وجہ ہندوستانی تجارت کی رقابت تھی۔ اس احساس نے آتشِ رقابت کو تیز کر دیا تھا کہ مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرنے والا ہے اور ماضی کے مقابلے میں اب تجارت اور علاقوں کی شکل میں مزید بڑے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کا ٹکراؤ بیس سال تک جاری رہا اور بالآخر ہندوستان میں انگریزی اقتدار کی فتح اور استحکام پر اس کا خاتمہ ہوا۔ ان دونوں کمپنیوں میں، تجارتی برتری کے اعتبار سے انگریزی کمپنی زیادہ دولت مند تھی اور اسے ہی بحری برتری بھی حاصل تھی۔ مزید برآں اس کے ہندوستانی مقبوضات، زیادہ قدیم، زیادہ قلعہ بند اور زیادہ خوشحال تھے۔ اس لیے مادی اعتبار سے انگریز کافی بہتر حالت میں تھے۔

یورپ میں فرانس اور انگلینڈ کے درمیان جو جنگ شروع ہوئی تھی، اس نے جلد ہی ہندوستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور دونوں ایسٹ انڈیا کمپنیاں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔ 1745ء میں انگریزی بحریہ نے ہندوستان کے جنوب مشرقی ساحل پر فرانسیسی

جہازوں کو پکڑ لیا اور پانڈیچری پر بھی ان کی نظریں پڑنے لگیں۔ اس وقت پانڈیچری کا فرانسیسی گورنر جنرل 'ڈوپلے' (Dupleix) نہایت ذہین، مدبر اور دور اندیش تھا۔ اس کی قیادت میں فرانسیسیوں نے جوابی کارروائی کے طور پر 1746ء میں مدراس پر قبضہ کر لیا۔ یہ اقدام جنگ کا اہم ترین واقعہ ثابت ہوا۔ مدراس چونکہ کرناٹک کے علاقے میں واقع تھا اس لیے انگریزوں نے اپنی نوآبادی کو بچانے کے لیے نواب سے اپیل کی۔ نواب چونکہ غیر ملکی تاجروں کو یہ جتانا چاہتا تھا کہ وہی اس علاقے کا اصلی مالک ہے، اس لیے وہ مداخلت کے لیے آمادہ ہو گیا۔ اس نے فرانسیسیوں کے مقابلے کے لیے ایک فوج روانہ کی، تاکہ غیر ملکی تجارتی کمپنیوں کو اس کے علاقے میں جنگ کرنے سے روکا جائے۔ نواب کی مضبوط فوج، جو دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی، مختصر سی فرانسیسی فوج کے خلاف صف آراء ہو گئی۔ جو 230 یوروپی اور سات سو ہندوستانی سپاہیوں پر مشتمل تھی جنہیں مغربی طرز پر تربیت دی گئی تھی۔ دریائے اڈیار کے کنارے سینٹ تھامس کے مقام پر دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا جس میں نواب کو بری طرح شکست ہوئی۔ اس جنگ نے ہندوستانی فوجوں پر مغربی فوجوں کی برتری کو ثابت کر دیا، کیونکہ وہ بہتر طور پر مسلح ہوتی تھیں اور ان کی تنظیم بھی بہتر اصولوں پر ہوتی تھی۔ نہ تو ہندوستانی نیزہ بردار، مغربی دستی بندوقوں اور سنگینوں کا مقابلہ کر سکتے تھے اور نہ ہی ہندوستانی گھوڑ سوار دستے مغربی توپخانوں کے مقابلے میں ٹھہر سکتے تھے۔ نظم و ضبط سے عاری بڑی سے بڑی ڈھیلی ڈھالی ہندوستانی فوج چھوٹی سے چھوٹی بہتر منظم مغربی فوج کا مقابلہ کرنے کی اہل نہیں تھی۔

1748ء میں انگلینڈ اور فرانس کی جنگ کا یورپ میں خاتمہ ہوا اور اس کے نتیجے میں جو صلح نامہ ہوا اس کے مطابق مدراس انگریزوں کو واپس مل گیا۔ جنگ اگرچہ ختم ہو گئی تھی، تاہم تجارت اور ہندوستانی مقبوضات کے لیے رقابت جاری رہی، جس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی رہ گیا تھا۔ مزید برآں جنگ نے ہندوستانی حکومت اور اس کی فوجوں کی کمزوری عیاں کر دی، جس کی وجہ سے ہندوستان میں دونوں کمپنیوں کی توسیعی ہوس تیز تر ہو گئی۔ کرناٹک کے نواب کے ساتھ حالیہ جنگ میں ڈوپلے کو جو تجربہ ہوا تھا، اس سے وہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے ہندوستانی حکمرانوں کے باہمی جھگڑوں میں منظم اور جدید طرز کی فرانسیسی فوج کو استعمال کرنے کا طریق کار اختیار کیا۔ کسی ایک فریق کا ساتھ دے کر فاتح سے وہ نقد اور تجارتی و علاقائی مراعات حاصل کرتا رہا۔ اس نے مقامی راجاؤں، نوابوں اور سرداروں کے وسائل اور ان کی فوجوں کو فرانسیسی مفاد کے لیے استعمال کر کے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کا منصوبہ بنایا۔ فرانسیسیوں کے منصوبے کی کامیابی میں صرف یہی بات حائل ہو سکتی تھی کہ ہندوستانی حکمراں اپنے جھگڑوں میں انہیں مداخلت کی اجازت نہ دیں۔ لیکن ہندوستانی حکمراں ایک متحدہ ہندوستانی قوم کے تصور سے انجان تھے اور محدود شخصی عزائم اور فائدے حاصل کرنا ہی ان کا بنیادی مقصد تھا۔ اپنے داخلی حریف کو شکست دینے کے لیے غیر ملکی قوت کو مداخلت کی دعوت دینے میں ان کو بہت کم تردد ہوتا تھا۔

1748ء میں کرناٹک اور حیدرآباد میں ایسے حالات پیدا ہوئے، جنہوں نے ڈوپلے کو اپنی اہلیت کے مظاہرے کا پورا موقع دے دیا۔ کرناٹک میں چندا صاحب نے نواب انورالدین کے خلاف سازش شروع کی اور حیدرآباد میں نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ناصر جنگ اور پوتے مظفر جنگ میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر ڈوپلے نے اپنی بہترین تربیت یافتہ فرانسیسی اور ہندوستانی فوجوں سے چندا صاحب اور مظفر جنگ کی مدد کرنے کا خفیہ معاہدہ کر لیا۔ 1749ء میں تینوں فوجوں نے امبور کی جنگ میں انورالدین

کو شکست دے کر قتل کر ڈالا۔ اس کے بیٹے محمد علی نے بھاگ کر ترچنا پلی میں پناہ لی اور کرناٹک کا باقی حصہ چندا صاحب کے قبضے میں چلا گیا۔ اس کے انعام میں اس نے پانڈیچری کے نواح کے اسّی گاؤں فرانسیسیوں کو دے ڈالے۔ حیدرآباد میں بھی فرانسیسیوں کو کامیابی ہوئی ناصر جنگ مارا گیا اور مظفر جنگ، نظام، یا دکن کا وائسرائے بن گیا۔ اس نئے نظام نے بھی پانڈیچری کے قریب کا کچھ علاقہ اور مچھلی پٹنم فرانسیسیوں کے حوالے کر دیا۔ اس نے پانچ لاکھ روپے فرانسیسی کمپنی کو اور اتنی ہی رقم فوج کو دی۔ ڈوپلے کو 20 لاکھ روپے نقد اور ایک لاکھ روپے سالانہ آمدنی کی جاگیر ملی۔ اس کے علاوہ ڈوپلے کو دریائے کرشنا سے لے کر کنیا کماری تک کے مغل علاقے کا اعزازی گورنر مقرر کیا گیا۔ یہ علاقہ مشرقی ساحل پر واقع تھا۔ ڈوپلے نے اپنے بہترین افسر 'بسی' (Bussy) کو فرانسیسی فوج کے ساتھ حیدرآباد میں متعین کیا۔ اس کا بظاہر مقصد تو نظام کو اس کے دشمنوں سے بچانا تھا، لیکن حقیقی مقصد حیدرآباد کے دربار میں فرانسیسی اثر ورسوخ کو برقرار رکھنا تھا۔ اپنی راجدھانی کی طرف لوٹتے وقت ایک اتفاقی حادثے میں مظفر جنگ مر گیا۔ بسی نے فوراً اس کے تیسرے بیٹے صلابت جنگ کو نظام کی گدی پر بٹھا دیا۔ اس کے صلے میں نئے نظام نے فرانسیسیوں کو آندھرا کا وہ علاقہ دے ڈالا جسے شمالی سرکار کہا جاتا تھا اور جو مصطفیٰ نگر، ایلورو، راجہ مندری اور سکاکول کے چار اضلاع پر مشتمل تھا۔ جنوبی ہند میں فرانسیسی طاقت اب اپنے عروج پر تھی۔ ڈوپلے کا منصوبہ اس کے خوابوں سے بہت زیادہ بہتر ثابت ہو رہا تھا۔ فرانسیسیوں نے ہندوستانی ریاستوں کو دوست بنانے سے اپنے کام کا آغاز کیا تھا، لیکن آخر میں ہندوستانی ریاستوں کو انہوں نے اپنا موکل یا طفیلی بنا دیا۔

انگریز بھی اپنے حریف کی کامیابیوں کے خاموش تماشائی نہیں رہے۔ فرانسیسیوں کے اثر ورسوخ کو ختم کرنے اور خود اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے کے لیے انہوں نے ناصر جنگ اور محمد علی سے ساز باز کی۔ 1750ء میں انہوں نے محمد علی کے لیے اپنی ساری قوت لگا دینے کا فیصلہ کیا۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک نوجوان کلرک، رابرٹ کلائیو (Robert Clive) نے یہ تجویز پیش کی کہ محمد علی جو ترچنا پلی میں محصور ہے، اس پر سے فرانسیسیوں کا دباؤ کم کرنے کے لیے کرناٹک کی راجدھانی آرکاٹ پر حملہ کر دیا جائے۔ یہ تجویز قبول کر لی گئی اور کلائیو نے دو سو انگریز اور تین سو ہندوستانی سپاہیوں کو لے کر ارکاٹ پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ حسب توقع چندا صاحب اور فرانسیسی ترچنا پلی سے محاصرہ اٹھانے اور ارکاٹ واپس آنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد کی جنگ میں چندا صاحب اور فرانسیسیوں نے شکست کھائی۔ چندا صاحب جلد ہی گرفتار ہوا اور مارا گیا۔ اب فرانسیسیوں کی قسمت پلٹا کھا رہی تھی، کیونکہ ان کے جنرل اور ان کی فوج اپنے انگریز حریف کے مقابلے میں بہت کم تر ثابت ہوئی تھی۔ ڈوپلے نے فرانسیسیوں کی بدقسمتی کے طوفان کو روکنے کی جان توڑ کوشش کی۔ لیکن اس کام میں فرانسیسی حکومت، بلکہ فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلیٰ افسروں کی بھی، اسے بہت کم حمایت حاصل ہو سکی۔ اس کے علاوہ اعلی فرانسیسی افسر اور بری اور بحری کمانڈر آپس میں اور ڈوپلے سے بھی مسلسل لڑتے جھگڑتے رہے۔ بالآخر فرانسیسی حکومت نے ہندوستانی جنگ کے بھاری اخراجات سے تنگ آکر اور امریکی نوآبادیوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے خطرے کے پیش نظر صلح کی بات چیت شروع کی۔ 1754ء میں ڈوپلے کو ہندوستان سے واپس بلا لینے کے انگریزی مطالبے کو فرانسیسیوں نے قبول کر لیا۔ فرانسیسی کمپنی کی قسمت کو اس سے ہندوستان میں شدید دھکا لگا۔

1756ء میں جب انگلینڈ اور فرانس کے مابین جنگ کا دوبارہ آغاز ہوا، تو دونوں کمپنیوں کی عارضی صلح کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ جنگ کے

ابتدائی دور میں ہی انگریزوں کا بنگال پر قبضہ ہو گیا۔ بہر کیف اس واقعے کے بعد فرانسیسیوں کی کامیابی کا امکان بہت کم باقی رہا تھا۔ بنگال کے بیش قیمت وسائل نے کامیابی کا پلہ قطعی طور پر انگریزوں کے حق میں جھکا دیا تھا۔ فرانسیسی حکومت نے اس موقع پر انگریزوں کو ہندوستان سے خارج کرنے کی اگر چہ پوری کوشش کی اور کاؤنٹ ڈی لیلی کی قیادت میں ایک زبردست فوج بھی بھیجی۔ تاہم یہ کوشش بھی بے سود ثابت ہوئی۔ فرانسیسی بحری بیڑے کو ہندوستان کے سمندر سے نکال باہر کیا گیااور اور کرناٹک میں فرانسیسی فوج کو شکست کھانی پڑی۔ مزید برآں حیدر آباد میں نظام کے محافظ کا درجہ فرانسیسیوں کی جگہ پر انگریزوں کو مل گیااور مچھلی پٹنم نیز شمالی سرکار بھی انگریزوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ 22 جنوری 1760ء کو ونڈی واش کے مقام پر فیصلہ کن جنگ ہوئی، جس میں انگریز جنرل، آیر کوٹ نے لیلی کو شکست دی۔ اس کے بعد سال بھر ہی کے اندر فرانسیسیوں کے تمام ہندوستانی مقبوضات ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ 1763ء میں صلح نامہ پیرس پر دستخط کیے گئے اور جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ فرانسیسیوں کو ان کی فیکٹریاں تو بحال کر دی گئی، لیکن اب وہ نہ تو انہیں قلعہ بند کر سکتے تھے اور نہ ہی زیادہ حفاظتی فوج ہی رکھ سکتے تھے۔ ان فیکٹریوں کی حیثیت اب صرف تجارتی مرکز کی تھی اور فرانسیسی باشندے انگریزوں کے زیر حفاظت تھے۔ ہندوستان میں سلطنت قائم کرنے کا فرانسیسیوں کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس بحر ہند پر انگریزوں کی مکمل حکمرانی قائم ہو گئی۔ تمام یورپی حریفوں سے نجات حاصل کر لینے کے بعد اب وہ ہندوستان کو فتح کرنے کی طرف توجہ دے سکتے تھے۔

فرانسیسیوں اور ان کے ہندوستانی حلیفوں کے ساتھ جنگ میں انگریزوں نے بعض اہم اور قابل قدر سبق سیکھے تھے۔ ایک تو یہ کہ ملک میں قوم پرستی کا کوئی وجود نہیں ہے اور ہندوستانی حکمرانوں کے باہمی جھگڑوں سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے سیاسی منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ دوسرے انہیں یہ تجربہ بھی ہوا کہ مغربی وضع کی تربیت یافتہ پیدل فوج، خواہ یورپی ہو یا ہندوستانی، اگر جدید اسلحہ سے لیس ہو اور اس کی پشت پر توپخانہ بھی ہو، تو قدیم وضع کی ہندوستانی فوجوں کو بڑی سے بڑی جنگ میں بہ آسانی شکست دے سکتی ہے۔ تیسری بات یہ ان پر ثابت ہو گئی کہ ہندوستانی سپاہیوں کو اگر مغربی وضع کی فوجی تربیت دی جائے اور یورپ کے جدید اسلحہ سے انہیں مسلح کیا جائے تو وہ بھی یورپی سپاہیوں جیسے ہو سکتے ہیں اور ہندوستانی سپاہیوں میں چوں کہ قوم پرستی کی کمی ہے اس لیے جو بھی انہیں اچھی تنخواہ دے، کرائے کی سپاہی کی طرح بھرتی کر کے ان سے کام لے سکتا ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے ہندوستانی سپاہیوں کی ایک عظیم فوج تیار کی، جنہیں سیپوئے یا سپاہی کہا جاتا تھا۔ ان کے افسر سب انگریز تھے۔ اس فوج کو اپنا آلہ کار بنا کر اور ہندوستان کے تجارتی و علاقائی وسائل پر قابو حاصل کر کے انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے جنگیں کی اور علاقائی توسیع کی شروعات کی۔

2.5 بنگال پر انگریزوں کا قبضہ (British Occupation of Bengal)

2.5.1 پلاسی اور بکسر کی جنگیں (The Battles of Plassey, and Buxor)

1757ء کی پلاسی کی جنگ کو ہندوستان میں برطانوی سیاسی اقتدار کا نقطہ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس جنگ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کے نواب سراج الدولہ کو شکست دی۔ اس سے قبل انگریزوں نے جنوبی ہند میں جو لڑائیاں فرانسیسیوں سے لڑی تھیں، وہ دراصل ڈرل یا

مشق کے لیے تھیں۔ان جنگوں کے تجربات کو انہوں نے پلاسی کی جنگ میں کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔

بنگال ہندوستان کا زرخیز ترین اور انتہائی متمول صوبہ تھا۔اس کی صنعت و تجارت بھی ترقی پر تھی۔اس کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس صوبے میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے ملازمین بڑی پُر منافع تجارت کر رہے تھے۔ کمپنی نے 1717ء میں مغل شہنشاہ سے ایک فرمان حاصل کیا، جس کی رو سے کمپنی کو متعدد کارآمد مراعاتیں حاصل ہو گئیں۔ مثلاً وہ اپنا اسبابِ تجارت بلا چنگی ادا کیے ہوئے بنگال میں درآمد و برآمد کر سکتی تھی۔ سامان کے لانے لے جانے کا پروانہ، جسے دستک (Dastak) کہتے تھے، کمپنی کے حکام خود جاری کرتے تھے، حالانکہ شاہی فرمان میں اس کا ذکر نہیں تھا۔تاہم کمپنی کے ملازمین کو نجی طور پر تجارت کرنے کی اجازت نہیں تھی، بلکہ انہیں اسباب تجارت پر ہندوستانی تاجروں کی طرح چنگی ادا کرنی پڑتی تھی۔ یہ فرمان بنگال کے نواب اور کمپنی کے درمیان مسلسل تنازع کا سبب بنا رہا۔اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس فرمان سے بنگال کی حکومت چنگی کی آمدنی سے محروم ہو جاتی تھی۔ لیکن دوسری اور ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ دستک کی مراعات جو صرف کمپنی ہی کے لیے تھی، کمپنی کے ملازمین اس کا غلط استعمال کرتے تھے۔ یہ لوگ چنگی سے بچنے کے لیے اپنے نجی اسبابِ تجارت کے لیے بھی دستک استعمال کیا کرتے تھے۔ بہر کیف اس فرمان کی جو تشریح و تعبیر کمپنی کرتی تھی اس سے مرشد قلی خان سے لے کر علی وردی خان تک تمام نوابان بنگال کو اختلاف رہا۔انہوں نے کمپنی کو مجبور کیا کہ وہ ان کے خزانے میں ایک تاوانی رقم داخل کرے۔ دستک کے بیجا استعمال کو بھی سختی سے انہوں نے روکا۔اس معاملے میں نواب کے اختیارات کو تسلیم کرنے پر کمپنی کو اگرچہ مجبور ہونا پڑا تھا، تاہم کمپنی کے ملازمین نواب کے احکام کو نظرانداز کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

1756ء میں نوجوان سراج الدولہ جب بنگال کا نواب بنا تو معاملات انتہا کو پہنچ گئے۔اس نے کمپنی سے مطالبہ کیا کہ وہ انہیں شرطوں پر تجارت کرے، جن شرطوں پر مرشد قلی خان کے وقت میں تجارت کرتی تھی۔ کمپنی نے اس صورتحال کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ جنوبی ہند میں فرانسیسیوں کو شکست دینے کے بعد اس کو اپنی قوت کا احساس ہو گیا تھا۔ہندوستانی ریاستوں کی سیاسی اور فوجی کمزوری بھی اس پر ظاہر ہو گئی تھی۔اپنے مال پر نواب کو چنگی ادا کرنے کی بجائے کمپنی نے کلکتہ آنے والے ہندوستانی مال پر بھاری چنگی عاید کر دی، کیونکہ کلکتہ ان کے زیرِ انتظام تھا۔اس اقدام نے نوجوان نواب کو مشتعل کر دیا۔نواب کو یہ بھی گمان تھا کہ کمپنی اس کی مخالف ہے اور اس کے حریف کی حمایت کر رہی ہے، جو بنگال کی حکومت کا دعویدار ہے۔ حالات انتہا کو اس وقت پہنچے جب نواب کی اجازت کے بغیر کمپنی نے کلکتہ کو قلعہ بند کرنا چاہا۔دراصل کمپنی کو فرانسیسی حملے کا خطرہ اس وجہ سے لاحق ہو گیا تھا کہ فرانسیسی فوجوں نے چندر نگر میں ڈیرے ڈال دیے تھے۔ سراج الدولہ نے کمپنی کے اقدام کو اپنے اقتدارِ اعلیٰ پر حملہ تصور کیا اور اس میں وہ حق بجانب تھا۔کوئی بھی خودمختار حکومت، تاجروں کی کسی نجی کمپنی کو اپنی قلمرو میں قلعے بنانے کی نہ تو اجازت دے سکتی ہے اور نہ ہی اپنی سرزمین پر نجی جنگ کرنے کی اجازت دے سکتی ہے۔اس کے علاوہ سراج الدولہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کو اس نے اگر بنگال کی سرزمین پر جنگ کرنے دی تو اس کا بھی حشر کرناٹک کے نوابوں جیسا ہو گا۔دوسرے الفاظ میں سراج الدولہ اہلِ یورپ کو آقا کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف تاجر ہی کی حیثیت سے رہنے کی اجازت دینا چاہتا تھا۔

سراج الدولہ نے انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں کو ہدایت کی کہ کلکتہ اور چندر نگر کی قلعہ بندیاں ڈھادی جائیں اور دونوں باہم جنگ نہ کریں۔ فرانسیسیوں نے تو اس حکم کی تعمیل کی لیکن انگریزوں نے اس حکم کی بجاآوری سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کے حوصلے بہت بلند ہو چکے تھے اور کرناٹک کی فتوحات نے ان کے اعتماد کو بے حد طاقتور کر دیا تھا۔ اب وہ بنگال میں نواب کی مرضی کے خلاف بھی رہنے پر اور اپنی شرطوں پر وہاں تجارت کرنے پر تلے تھے۔ کمپنی نے اپنی سرگرمیوں پر برطانوی پارلیمنٹ کے اختیارات کو تو تسلیم کر لیا تھا اور کمپنی کے انگلینڈ میں تجارت کرنے پر برطانوی حکومت کی عاید کردہ پابندی کے سامنے تو اس نے فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا تھا، نیز 1693ء میں جب پارلیمنٹ نے مشرق میں تجارت کرنے کے اس کے منشور کو واپس لیا تھا تو بادشاہ کو، پارلیمنٹ کے اراکین اور سیاسی لیڈروں کو اس نے بھاری رشوتیں دی (صرف ایک سال میں اسّی ہزار پونڈ رشوت کی مد میں دیے گئے تھے)۔ تاہم بنگال میں نواب کے احکام کو نظرانداز کر کے وہ بنگال میں آزاد تجارت کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس کا یہ طرز عمل نواب کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف ایک براہ راست چیلنج کے مترادف تھا۔ سراج الدولہ کی سیاسی بصیرت نے انگریزوں کے طویل المیعاد منصوبوں کو سمجھ لیا تھا، چنانچہ ان سے ملک کے قوانین کی پابندی کرانے کا اس نے تہیہ کر لیا۔

سراج الدولہ نے غیر معمولی سرعت، مگر غیر ضروری جلد بازی اور ناکافی تیاری کے ساتھ کاروائی کی۔ قاسم بازار کی انگریزی فیکٹری پر قبضہ کرنے کے بعد وہ کلکتہ کی طرف بڑھا اور 20 جون 1756ء کو اس نے فورٹ ولیم پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اپنی فتح کا جشن منانے کے لیے وہ کلکتہ سے واپس لوٹ گیا اور انگریزوں کو اپنے جہازوں کے ساتھ بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی، کیونکہ دشمن کی طاقت کا اس نے غلط اندازہ کیا تھا۔ انگریزوں نے سمندر کے قریب ایک جزیرے میں پناہ لی جہاں ان کی طاقتور بحریہ نے ان کی حفاظت کی۔ یہاں ایک طرف انہوں نے مدراس سے کمک آنے کا انتظار کیا اور دوسری طرف نواب کے درباریوں کے ساتھ سازش اور غداری کا جال بچھایا۔ سازش کے خاص سرغنہ تھے میر بخشی میر جعفر، کلکتہ کا افسر اعلیٰ مانک چند، ایک بڑا تاجر امی چند، بنگال کا سب سے بڑا مہاجن جگت سیٹھ اور نواب کی فوج کا کمانڈر خادم خان۔ مدراس کے امیر البحر واٹسن اور کرنل کلائیو کی سرکردگی میں مدراس سے ایک مضبوط بحری اور بری فوج پہنچ گئی۔ 1757ء کے اوائل میں کلائیو نے کلکتہ دوبارہ فتح کر لیا اور نواب کو انگریزوں کے مطالبات قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

انگریز اسی پر مطمئن نہیں ہوئے، کیونکہ ان کے عزائم بلند تھے۔ سراج الدولہ کی جگہ پر وہ کسی اطاعت گذار شخص کو بنگال کا حکمراں بنانا چاہتے تھے۔ نواب کے مخالفوں کے ساتھ مل کر، جو میر جعفر کو بنگال کا حکمران بنانا چاہتے تھے، انگریزوں نے سازش کی۔ انہوں نے نواب کے سامنے ایسے مطالبات پیش کیے جو ناقابل قبول تھے۔ فریقین محسوس کر رہے تھے کہ زندگی اور موت کا ایک آخری معرکہ ابھی باقی ہے۔ 23 جون 1757ء کو مرشد آباد سے بیس میل کے فاصلے پر پلاسی کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ یہ ایک برائے نام جنگ تھی۔ انگریزوں کے صرف 29 سپاہی مارے گئے اور نواب کے تقریباً 500 سپاہی کام آئے۔ نواب کی فوج کے اس بڑے حصے نے لڑائی میں کوئی حصہ نہیں لیا، جس کی کمان غدار میر جعفر اور رائے درلبھ کے ہاتھ میں تھی۔ نواب کی فوج کے چھوٹے سے حصے نے میر مدن اور موہن لال کی قیادت میں داد شجاعت دی اور بڑی بہادری سے لڑا۔ نواب کو میدان جنگ سے بھاگنا پڑا اور میر قاسم کے بیٹے میرن نے اسے قتل کر دیا۔

پلاسی کی لڑائی، بنگالی شاعر نبین چندر سین (Nabinchandra Sen) کے الفاظ میں 'ہندوستان کے لیے ابدی تاریکی کی رات تھی۔' انگریزوں نے میر جعفر کو بنگال کا نواب بنایا اور کمپنی پر انعام و اکرام کی بارش ہونے لگی۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ میں کمپنی کو آزادانہ تجارت کے جملہ حقوق حاصل ہو گئے۔ کلکتہ کے مضافات میں چوبیس پرگنہ کی زمینداری بھی اسے دے دی گئی۔ میر جعفر نے کلکتہ پر حملے کے تاوان کے طور پر ایک کروڑ ستر لاکھ روپے کمپنی اور تاجروں کو ادا کیے۔ وہ بھاری رقمیں اس کے علاوہ تھیں جو تحفے یا رشوت میں کمپنی کے اعلیٰ افسروں کو دی گئی تھیں۔ کلائیو کو بیس لاکھ روپے سے زائد اور واٹسن کو دس لاکھ سے زائد ملے۔ کلائیو کے تخمینے کے مطابق کمپنی اور اس کے ملازمین نے بنگال کے کٹھ پتلی نواب سے تین کروڑ روپے سے زیادہ وصول کر لیے تھے۔ ان سب کے علاوہ یہ بھی منوالیا گیا تھا کہ برطانوی تاجروں اور کمپنی کے ملازموں کو ان کی نجی تجارت پر کوئی چنگی ادا نہیں کرنی پڑے گی۔

پلاسی کی لڑائی عظیم تاریخی اہمیت کی حامل تھی۔ اس نے بنگال پر اور پھر سارے ہندوستان پر برطانوی تسلط کے قیام کی راہیں ہموار کیں۔ اس سے انگریزوں کے وقار میں اضافہ ہوا اور وہ ہندوستان کی سلطنت کے بڑے دعوے داروں میں شمار کیے جانے لگے۔ بنگال کے بیش بہا محاصل کی آمدنی سے انہوں نے بہت بڑی فوج تیار کر لی۔ بنگال پر کمپنی کے تسلط نے انگریزی فرانسیسی جدوجہد میں بھی فیصلہ کن کردار ادا کیا اور سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ بنگال کے بے یار و مددگار عوام کو لوٹ کر کمپنی اور اس کے ملازمین نے بے اندازہ دولت جمع کر لی۔ برطانوی مصنفین ایڈورڈ تھامپسن (Edward Thompson) اور جی۔ ٹی۔ گریٹ نے لکھا ہے کہ:

> انقلاب برپا کر دینا دنیا کا سب سے زیادہ منافع بخش کھیل ہے۔ عہد کورٹیز اور پیزر کے اہل ہسپانیہ پر دولت کی ہوس کی جو دیوانگی طاری ہوئی تھی، پھر اس کے بعد دنیا کی کوئی قوم بھی اس دیوانگی میں اس درجہ مبتلا نہ ہوئی، جس درجہ انگریزی دل و دماغ ہوا تھا۔ خصوصاً بنگال کو تو امن کی شکل ہی اس وقت تک نظر نہ آئی جب تک کہ اس کا سارا خون چوس نہ لیا گیا۔

پلاسی کی جنگ کے بعد میر جعفر کو تخت پر بٹھایا گیا مگر وہ ان کے کبھی نہ ختم ہونے والے مطالبات کو پورا نہ کر سکا اور اسے معزول کر کے میر قاسم کو لایا گیا۔ میر قاسم ایک باصلاحیت انسان تھا۔ اس نے کمپنی کی لوٹ پاٹ پر روک لگائی اور مالیاتی اور انتظامی اصلاحات نافذ کیں۔ یقیناً ان اصلاحات کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے اور بنگال ترقی کرنے لگا۔ یہ بات انگریزوں کو پسند نہ آئی۔ انہوں نے میر قاسم کو بھی معزول کر دیا۔ میر قاسم بھاگ کر اودھ جا پہنچا جہاں اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی کے ساتھ اتحاد کر کے بکسر کے میدان میں انگریزوں کے مقابلے پر آیا۔ فوجی اور تکنیکی برتری کی وجہ سے انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی اور انہیں بنگال بہار اور اڑیسہ کے دیوانی اختیارات حاصل ہو گئے یا یوں کہیے کہ ان علاقوں کی حقیقی حکومت، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں آگئی۔ اس طرح ایک تجارتی کمپنی سے ترقی کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی ایک علاقائی طاقت میں تبدیل ہو گئی اور پھر اس نے دیگر ہندوستانی طاقتوں کو بھی شکست دے کر پورے ملک پر اپنی حکومت قائم کی۔ اسی کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کے دن ختم ہوتے چلے گئے۔ ملک کی دولت باہر جانے لگی۔ یہاں کے مقامی کاروبار اور صنعتیں تباہ ہونے لگے اور زراعت بھی زوال پذیر ہو گئی۔ ہندوستان کی دولت سے برطانیہ میں صنعتی انقلاب رونما ہوا اور ہندوستان جو صنعتی ترقی کے راستے پر تھا، مکمل تباہ اور بدحال ہوتا چلا گیا۔ اس کے بارے میں آپ آئندہ اکائیوں میں تفصیل سے پڑھیں گے۔

2.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تاجروں کی شکل میں آنے والی ایک برطانوی کمپنی کس طرح ایک غالب علاقائی طاقت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دوسرے یورپی تاجروں کی طرح برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقصد بھی ایشیائی تجارت سے فائدہ اٹھانا تھا۔ اس سلسلے میں اسے اپنی حریف تجارتی کمپنیوں، پرتگالی، ڈچ، فرانسیسیوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ سمندر میں انہیں اپنی مضبوط بحری طاقت کا فائدہ حاصل تھا لیکن خشکی میں انہیں مقامی طاقتوں سے مصالحانہ رویہ اپنانا پڑا۔ مغلوں کے دور عروج میں انہوں نے علاقائی اجارہ داری حقوق پر زور دینے کی جو کوشش کی تھی وہ بری طرح ناکام ہوئی اور انہیں مغل شہنشاہ اورنگزیب سے معافی طلب کرنی پڑی۔ مغل سلطنت کے زوال سے انہیں اپنے اقتدار کی توسیع کا موقع فراہم ہوا۔ فرانسیسیوں نے انگریزوں علاقائی فتوحات کی راہ دکھائی اور کرناٹک جنگوں میں مقامی ہندوستانی فوج کی کمزوریاں صاف ظاہر ہوگئیں۔ اس سے حوصلہ پاکر انہوں نے بنگال میں منمانی کرنی شروع کردی اور نواب کے احکام کی حکم عدولی کی۔ نتیجتاً پلاسی کی جنگ ہوئی جس نے بنگال کو عملاً کمپنی کے کنٹرول میں دے دیا۔ بنگال کے وسیع وسائل سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے مقامی سپاہیوں پر مشتمل اپنی افواج منظم کیں اور مزید فتوحات کی راہ ہموار کی۔ بکسر کی جنگ میں اس باقاعدہ اظہار ہوا، کیونکہ پلاسی کی جنگ تو غداری اور دھوکہ دہی کے بل پر جیتی گئی، لیکن بکسر کی جنگ ایک باقاعدہ آمنے سامنے کی جنگ تھی جس میں قلیل تعداد میں برطانوی فوج نے اپنے سے کئی گنا زیادہ تعداد والی فوج کو دھول چٹادی۔ اس جنگ کے بعد بنگال، بہار اور اڑیسہ کے دیوانی حقوق کمپنی کو منتقل ہوگئے۔ اودھ کو ماتحت امدادی معاہدہ کرنا پڑا اور مغل شہنشاہ پہلے سے زیادہ انگریزوں پر منحصر ہوگیا۔

2.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

چارٹر : منشور

راس امید : راس امید (Cape of Good Hope)، براعظم افریقہ کا انتہائی جنوبی سرا

ڈچ : ہالینڈ کے باشندے

2.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

2.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. امریکی وزیر Jabez T. Sunderland کی کتاب کا نام بتائیے۔
2. کتاب The Story of Civilisation کے مصنف کون ہیں؟
3. 1687ء تک انگریزوں کی تجارت کا مرکز کہاں رہا؟
4. کس سال میں کمپنی کے ارباب اختیار نے سورت کی فیکٹری کو قلعہ بند کرنے کی کوشش کی؟

5. بمبئی کا جزیرہ کمپنی کو 1668ء میں کس سے حاصل ہوا؟
6. انگریزوں اور مغل شہنشاہ میں پہلی جنگ کس سال میں ہوئی ؟
7. ایسٹ انڈیا کمپنی کو مشرق کے ساتھ کس راستے سے پندرہ سال کے لیے تجارت کرنے کا منشور عطا کیا گیا تھا؟
8. منشور کے مطابق کمپنی کا انتظام کس کے سپرد تھا؟
9. فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کس سال میں قائم کی گئی تھی ؟
10. ہندوستان میں فرانسیسی علاقائی سلطنت کی بنیاد کس نے ڈالی ؟

2.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. برطانوی فتح کے وقت ہندوستان کی حالت پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔
2. کمپنی کی داخلی تنظیم پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. ہندوستان میں کمپنی کی فیکٹریوں کی تنظیم پر روشنی ڈالیے۔
4. بنگال کی معاشی لوٹ کھسوٹ پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔
5. بنگال میں دوہری حکومت پر ایک نوٹ لکھیے۔

2.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ایسٹ انڈیا کمپنی کے عروج وارتقا پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. جنوبی ہند میں انگریزی فرانسیسی جدوجہد پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے فرانسیسیوں کے ناکامی کے اسباب بیان کیجیے۔
3. پلاسی کی جنگ کے اسباب ونتائج پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔

2.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
3. Dalrymple, William, *The Anarchy*: *The East India Company*, *Corporate Violence*, *and the Pillage of an Empire*, Bloomsbury Publishing, London, 2019.
4. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
5. Durant, Will, *The Case for India*, Standard Book Stall, Mumbai, 2007.
6. Freedman, Paul, *Out of the East*: *Spices and the Medieval Imagination*, Orient

BlackSwan, New Delhi, 2008.
7. Gandhi, Rajmohan, *A History of Modern South India*: *A History from the 17th Century to Our Times*, Aleph book Company, New Delhi, 2018.
8. Metcalf, Barbara D., and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).
9. Pearson, M.N., *The Portuguese in India*: *The New Cambridge History of India*, Cambridge University Press, Cambridge, 2006 (first pub. 1987).
10. Roy, Tirthankar, *The East India Company*: *The World's Most Powerful Corporation*, Allen Lane/ Penguin, New Delhi, 2012.
11. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707–1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.
12. Wilson, Jon, *India Conquered*: *Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon and Schuster, London and New Delhi, 2017.

اکائی 3۔اینگلو-فرانسیسی عداوت اور کرناٹک کی جنگیں

(Anglo-French Rivalry, and the Carnatic Wars)

اکائی کے اجزاء

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 ہندوستان میں یورپیوں کی آمد

3.2.1 پرتگالی

3.2.2 ڈچ/ولندیزی

3.2.3 دیگر یوروپی اقوام

3.2.4 انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی

3.2.5 فرانسیسی ایسٹ انڈا کمپنی

3.3 انگریز اور فرانسیسیوں کے مابین تجارتی مقابلہ آرائی

3.3.1 کرناٹک کی پہلی جنگ

3.3.2 کرناٹک کی دوسری جنگ

3.3.3 کرناٹک کی تیسری جنگ

3.4 انگریزوں کی فتح اور فرانسیسیوں کی شکست کی وجوہات

3.5 اکتسابی نتائج

3.6 کلیدی الفاظ

3.7 نمونہ امتحانی سوالات

3.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید (Introduction)

14ویں اور 15ویں صدی میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ نے مرکنٹائل تحریک یا بحری تجارت کی تحریک کو جنم دیا۔ یورپ کے ممالک کو اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایشیاء اور آفریقہ کے ممالک سے تجارتی تعلقات رکھنے پڑتے تھے۔ ان ممالک کے مابین گرم مسالوں کی تجارت عرصہ دراز سے ہو رہی تھی۔ یورپ میں گرم مسالوں کی بے حد مانگ تھی۔ یہ گرم مسالے وہ ایسٹ انڈیز اور ہندوستان سے حاصل کرتے تھے۔ رومن امپائر کے زوال کے بعد عربوں کے عروج سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد یہ تجارت عرب تاجروں کے توسط سے کرتے تھے۔ عرب تاجر ہندوستان سے گرم مسالے خرید کر فارس کی کھاڑی' اسکندریہ' قسطنطنیہ اور بحر روم کے راستے سے وینس اور جنیوا کے تاجروں کو فروحت کرتے تھے وہاں سے ڈچ تاجروں کے ذریعے گرم مسالے تمام یورپ تک پہنچ جاتے تھے۔ 13ویں اور 14ویں صدی میں چنگیزی اور تیموری حملوں نے اس تجارتی راستے کو پُر خطر بنا دیا۔ 1453 میں ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر لیا۔ یونان کے عالم اپنے علمی ذخیروں کے ساتھ روم میں سکونت پذیر ہو گئے جہاں انہوں نے دیگر دانشوروں کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور انہیں آزاد خیال لوگوں کے رابطے میں آنے کا موقع ملا اور اظہار خیال کی آزادی ملی۔ اس طرح یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی ابتداء ہوئی۔ نشاۃ ثانیہ نے یورپ کی زندگی اور حالات کو یکسر تبدیل کر دیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب نئی نئی ایجادات ہوئیں اور قطب نما کی مدد سے اٹلی' اسپین اور پرتگال کے تاجروں نے نئے سمندری راستے تلاش کرنا شروع کیے تاکہ وہ ہندوستان اور ایشیاء سے براہ راست تجارت کر سکیں۔ پرتگال میں پرنس ہینری دی نوی گیٹر نے تاجروں کو باہر بھیجنے کے لیے سمندری جہاز رانی کی تربیت کا اسکول کھولا۔ مارکو پولو جو ہندوستان اور چین کا سفر کر چکا تھا، اس کا سفر ناموں کی مدد سے بھی ان ملکوں میں جانا آسان ہوا۔

اٹلی کا مشہور سیاح کولمبس جو ہندوستان کی تلاش میں 1492ء میں چلا تھا وہ نئے ملک امریکہ پہنچ گیا۔ 1498ء میں واسکوڈی گاما جنوبی ہند (کالی کٹ) کے علاقے میں پہنچا۔ اس طرح 1498 سے لے کر 17ویں صدی کے وسط تک مختلف یورپی اقوام بغرض تجارت ہندوستان میں آتی رہیں۔ ان میں پرتگالی' ڈچ' انگریز اور فرانسیسی قابل ذکر ہیں۔ تجارت کے میدان میں اپنے تسلط کو قائم کرنے کے لیے ہندوستان میں انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی اور فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین تجارتی و سیاسی کشمکش جاری رہی اور یہی آگے چل کر جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ نتیجتاً انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان 1746 سے 1763 تک تین جنگیں ہوئیں جنہوں کرناٹک جنگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس اکائی میں ہندوستان میں مختلف یورپی قوم کی آمد' تجارت و سیاست اور انگریز و فرانسیسی کے درمیان جنگ اور اس کے اثرات کا مطالعہ کیا جائے گا۔

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان میں یورپی اقوام کی آمد کب، کیوں اور کیسے شروع ہوئی، جان سکیں گے۔

- ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی اور سیاسی و معاشی عزائم سمجھ سکیں گے۔
- فرانسیسی ہندوستان کب آئے اور ان سے انگریزوں کی تجارتی مقابلہ آرائی کے اسباب و نتائج پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- فرانسیسی اور انگریزی کمپنیوں کے مابین جنگوں کے اسباب و نتائج کی وضاحت کر سکیں گے۔

3.2 ہندوستان میں یوروپیوں کی آمد (The Arrival of Europeans in India)

اٹلی کا مشہور سیاح کولمبس 12 اکٹوبر 1492 میں ہندوستان کی تلاش میں نکلا مگر ہندوستان کے بجائے وہ امریکہ پہنچ گیا جو یورپی ممالک کے لیے بیحد مفید ہوا۔ بالآخر پرتگالی ملاح واسکوڈی گاما افریقہ کا چکر کاٹتے ہوئے رأس امید (Cape of Good Hope) کے راستے 17 مئی 1498ء میں ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہوا۔

3.2.1 پرتگال (Portugal)

16 ویں صدی میں ہندوستان اور نئی دنیا کے ساتھ اہلِ یورپ کی براہ راست بحری آمد و رفت کا آغاز ہوا اور پرتگال کے جہاز سواحل ہند تک آنے جانے لگے۔ بحر ہند اور بحر عرب کی تجارت ان دنوں عربوں کے ہاتھ میں تھی، لیکن پرتگالیوں نے مختلف تدبیروں سے کالی کٹ کے راجہ زمورن سے تجارت کی اجازت حاصل کرلی اور ان کی حکومت نے تیرہ جہازوں کا بیڑہ ہندوستان کی جانب روانہ کیا جس میں بارہ سو سپاہی سوار تھے۔ یہ بیڑہ جنوبی امریکہ کی جانب چلا گیا اور بہت دنوں کے بعد کالی کٹ پہنچا۔ پہنچتے ہی اس کے سردار کی زمورن اور عرب سوداگروں سے لڑائی ہوگئی جس میں صدہا پرتگالی مارے گئے۔ اس طرح پرتگالی کالی کٹ میں ٹھہر نہ سکے اور انہیں مجبوراً چین سے مدد لینی پڑی۔ اس طرح یہ مہم ناکام رہی۔ اس مہم کی ناکامی کے بعد واسکوڈی گاما 17 مئی 1498ء میں بیس جہازوں کا بیڑہ لے کر ہندوستان آیا۔ کالی کٹ کے راجہ زمورن نے اس کا خیر مقدم کیا اور پرتگالی اپنے کچھ سپاہی کو چین میں چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ 1499ء میں واسکوڈی گاما اپنے اخراجات سے ساٹھ گنا مال پرتگال واپس لے گیا۔ دوسرے سال کیبرال 13 جہازوں کا بیڑہ لے کر ہندوستان آیا۔ اس مرتبہ عرب تاجروں نے کیبرال کی مخالفت کی اور زمورن کو اس کے خلاف بھڑکایا، اس لیے کیبرال کو تجارت میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس ناکامی کے بعد ایک بار پھر واسکوڈی گاما کو (1502 سے 1504) ہندوستان بھیجا گیا۔ واسکوڈی گاما نے زمورن کو سمندری لڑائی میں شکست دی اور تجارت میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

پرتگالی حکمراں نے 1505ء میں 'المیڈا' کو ہندستان میں اپنا نائب 'وائسرائے' مقرر کردیا۔ 1509ء تک اس نے پرتگالی تجارت کو خوب فروغ دیا۔ پرتگالیوں نے ہندوستان میں کامیابی کے لیے بڑی جدوجہد کی لیکن انہیں یہاں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس کے مشہور جنرل 'البقرق' (1509-1515) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے مغربی ساحل ہند کے ایک جزیرہ 'گوا' (الہاس) کو 1510ء میں فتح کرلیا جو ان دنوں سلطنت بیجاپور کے علاقے میں داخل تھا۔ اس نے اپنے تجارتی اڈے مستقل طور پر قائم کیے بلکہ گوا، ڈمن اور ڈیو میں اپنی حکومت بھی قائم کرلی۔

ہندوستان میں گوا جس پر پرتگالیوں کا 1510 میں قبضہ ہوا، یورپ والوں کا پہلا مقبوضہ علاقہ تھا جسے پرتگالیوں کی بحری تجارت اور جنگی قوت کی بدولت نہایت ترقی حاصل ہوئی۔ پرتگالیوں نے 1511ء میں مشرقی ایشیاء میں ملکا پر قبضہ کیا۔ 1515ء میں فارس کی کھاڑی کے تجارتی اڈے آرموز (ہرمز) پر قبضہ کیا۔ آفریقہ میں سوکوترا اور سری لنکا میں کولمبو پر بھی قبضہ کرلیا۔ ہندوستان میں جہاں کہیں مستقل اور بڑی حکومتیں قائم تھیں، وہاں پرتگالیوں کا اتنا زور نہ چل سکا کہ گوا کی طرح دوسرے مقامات پر بھی متصرف ہو جاتے۔ گجرات کی بندرگاہ 'دیو یا دمن' کو انہوں نے گجراتی سلطان سے مصالحانہ طریقے پر 1535ء میں حاصل کیا تھا، لیکن جب بنگال میں انہوں نے ہگلی کو قلعہ بند کرکے خود مختار حکومت بنانی چاہی تو شاہجہاں کے حکم سے وہ جبراً وہاں سے نکال دیے گئے۔ بہر حال پرتگالیوں کی آمد و رفت اور جنگی نوآبادیوں سے مجموعی طور پر ہندوستان کی بحری تجارت کو فائدہ پہنچا اور انہوں نے ہی یورپ کی دوسری قوموں کو اس ملک کا راستہ دکھایا۔ البقرق نے تجارت کے علاوہ یہاں کے لوگوں کو بزور تلوار عیسائی مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا۔ پرتگالی جہاں بھی گئے انہوں نے اپنے مذہب کو فروغ دینے میں طاقت کا استعمال کیا۔ اس طرح تقریباً ایک صدی تک پرتگالی تن تنہا ہندوستان کی تجارت سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ 1580ء میں پرتگال، ہسپانیہ کی سلطنت کا جز بن گیا۔ اس دوران ان کی بحری اور تجارتی ترقی کو نقصان پہنچا۔ 17ویں صدی کی ابتداء میں حکومت پرتگال، ہسپانیہ سے علاحدہ ہوگئی لیکن اس عرصے میں ڈچ اور انگریز تاجر ایشیائی سمندروں میں پہنچ گئے تھے جس کے باعث پرتگالیوں کو تجارت اور طاقت کا پہلا سا موقع پھر حاصل نہ ہوسکا۔ 17ویں صدی کے وسط میں لنکا اور ملابار پر ان کے جس قدر تجارتی مقبوضات تھے قریب قریب سب ڈچوں نے چھین لیے، اس طرح پرتگالی پنپ نہیں سکے۔

3.2.2 ڈچ/ولندیزی (Dutch)

ہالینڈ کے تاجر کافی عرصے تک پرتگال کے بسبن بندرگاہ سے گرم مسالے خرید کر یورپ کے تمام ممالک کو مہیا کرتے تھے۔ 1580ء کے بعد ہالینڈ کو بسبن بندرگاہ سے گرم مسالے ملنا بند ہوگئے، لہٰذا ڈچ تاجروں نے بھی بحری راستوں کی تلاش شروع کردی۔ ڈچ تاجروں نے پرتگالیوں ہی کے بحری راستے کو اپنا کر ہندوستان پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ مغربی قوموں میں سب سے پہلے ڈچوں یا ہالینڈ والوں نے پرتگالیوں کا زور توڑا تھا۔ پہلے پہل ان ڈچوں کی ایشیائی تجارت نے پرتگالیوں ہی کی وساطت سے ترقی پائی اور اینٹ ورپ، ایمسٹرڈم وغیرہ شمالی یورپ میں ایشیائی اجناس کی بہت بڑی منڈیاں بن گئے جہاں پرتگالی جہاز، ایشیائی ممالک کا مال لاتے اور یورپ کی اشیاء مشرق کی طرف لے جاتے تھے۔ اس کے بعد خود ڈچ اس کوشش میں رہے کہ یورپ و ایشیاء کے شمال سے مشرق کا بحری راستہ دریافت کریں، اس میں ان کو ناکامی ہوئی اور آخر انہوں نے بھی بحر ہند کا وہی افریقہ کے گرد سے آنے کا راستہ اختیار کیا جس سے پرتگالی ہندوستان پہنچے تھے۔ اس طرح واسکوڈی گاما کے ٹھیک ایک صدی بعد 96-1595 میں کورنلس دی ہاؤٹ مین (Cornelis de Houtman)، ایشیائی سمندروں تک پہنچنے والا ڈچ قوم کا پہلا جہاز راں بن گیا۔ اس کے بعد ڈچوں کے تجارتی جہاز بھی آنے جانے لگے اور ان کی پرتگالیوں سے کشمکش شروع ہوگئی۔

ڈچوں کا ایشیاء آنے کا مقصد تجارت تھا۔ انہوں نے ساڑھے پانچ لاکھ پونڈ کے سرمائے سے ایک مشترکہ کمپنی (دی یونائیٹیڈ ایسٹ انڈیا کمپنی اوف دی نیدر لینڈ) قائم کی اور ڈچ حکومت سے اس کمپنی کے تجارت کرنے کی اجارہ داری حاصل کی۔ انہوں نے ہندوستان میں کورو

منڈل کے پلی کٹ کے علاقے میں تجارتی اڈہ قائم کیا۔ ہندوستان میں پلی کٹ کے علاوہ بنگال میں چنسورا اور گجرات میں سورت میں اپنے تجارتی اڈے قائم کیے اور 1641ء میں جزیرہ ملاکا پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح پرتگالیوں کی تجارت متاثر ہوئی۔ ڈچوں نے جزائر ملایا (جہاں سے گرم مسالہ یورپ جاتا تھا) پر بھی اپنا اثر قائم کیا۔ پھر انہوں نے لنکا سے پرتگالیوں کو نکال دیا اور رفتہ رفتہ جنگ کر کے ساحل مالابار کے تمام پرتگالی مقبوضات 1664ء تک اپنے قبضے میں کر لیے۔ اس طرح ڈچوں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں کورومنڈل اور بنگال کے سواحل کے علاوہ ڈھاکہ، پٹنہ، آگرہ اور احمد آباد (گجرات) میں قائم کیں اور یہ سب علاقے ان کے مستقل کارخانے بن گئے اور یورپ و ایشیاء کے مابین تجارت کا سب سے بڑا ذریعہ ڈچ کمپنی ہو گئی۔

3.2.3 دیگر یورپی اقوام (Other European Nations)

پرتگال اور ہالینڈ (ڈچ یا ولندیزی) کے علاوہ ڈنمارک کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی سیرام پور (بنگال) میں بہت بڑی تجارتی کوٹھی قائم کی تھی۔ اس کے علاوہ جرمن شہنشاہ نے 18 ویں صدی کے اوائل میں ہندوستان سے تجارت شروع کی تھی۔ اس تجارت سے اوس ٹینڈ کمپنی کو تجارت میں بہت نفع ہوا۔ اس کمپنی نے کورومنڈل اور بنگال میں ہگلی کے کنارے انگریزوں اور ڈچوں کی تجارتی کوٹھیوں کے قریب اپنے کارخانے کھولے تھے اور ان ہی قوموں نے اس کے قیام کی سخت مخالفت کی تھی۔ آخر میں شہنشاہ بعض مقامی فوائد کے عوض میں اس کمپنی کی سرپرستی سے دست بردار ہو گیا اور ڈچ و انگریز تاجروں نے ہگلی کے فوجدار کو مختلف حیلوں سے جرمن تاجروں کا دشمن بنا دیا اور اس نے تھوڑی سی فوجی جمعیت بھیج کر انہیں جبراً اپنے علاقے سے نکال دیا اور ان کی تجارتی کوٹھی چھین کر 1731ء میں منہدم کرا دی۔ پرشیا کے مشہور بادشاہ فریڈرک نے اپنی رعایا کو ایشیاء میں تجارت کرنے کی ترغیب دی اور خود بھی بنگال کمپنی کے نام سے 1753ء میں تاجروں کی ایک جماعت بنائی۔ ابتداء میں اس کو نقصان ہوا اور حکومت بنگال کی مخالفت اور دوسرے فرنگیوں کی رقابت سے اہل پرشیا کو ہندوستان کے اس صوبے میں قدم جمانے کا موقع نہ مل سکا اور جلد ہی یہ کمپنی ٹوٹ گئی۔

3.2.4 انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی (English East India Company)

84-1583 میں انگلینڈ کے چار سوداگر، سب سے پہلے بری راستوں سے ہندوستان آئے۔ گوا میں پرتگالیوں نے انہیں پکڑ کر قید میں ڈال دیا بعد میں ان کو رہا کر دیا گا۔ جہاں تک ہندوستان سے انگریزوں کی تجارت کے آغاز کی بات ہے تو یہ اس وقت ہوا جب کہ ہسپانیہ اور پرتگال کی بحری قوت کمزور ہو گئی اور ہسپانیہ کے بیڑے آرمیڈا کی تباہی کے بعد انگریز سوداگروں نے ملکۂ ایلزبیتھ سے 1591ء میں درخواست کی کہ ہمیں بھی ایشیاء کے ممالک سے بحری تجارت کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ درخواست منظور ہوئی اور ان سوداگروں نے تین تجارتی جہاز ہندوستان روانہ کیے جن میں سے ایک راستے میں ڈوب گیا، دو جنوبی ہند تک آئے اور یہی انگریزوں کے پہلے جہاز تھے جو آفریقہ کے گرد پرتگالیوں کے دریافت کردہ راستے سے ایشیاء پہنچے۔ ابتداء میں انگریزوں کو ہندوستان کی بحری تجارت میں چنداں نفع نہیں ہوا، لیکن ان کے شوق میں کسی بھی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی اور لندن کے کئی دولت مند سوداگروں نے تقریباً 7 لاکھ روپیے کے سرمائے سے ایک کمپنی بنائی اور 31 ڈسمبر 1600ء کو ملکۂ ایلزبیتھ نے شاہی فرمان کے ذریعے ان کو ایشیاء سے تجارت کی اجازت دے دی۔ شروع میں انگریز

کمپنی نے جزائر شرق الہند سے تجارت کی اور جب اس کے جہازیوں نے دیسی سوداگروں کے جہاز لوٹنے شروع کیے تو ان جزیروں میں اس کی ساکھ بگڑ گئی اور تجارت میں نقصان ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب پرتگالیوں سے انگریزی کمپنی کی لڑائی شروع ہوئی۔ انگریزوں نے اپنے حریفوں کو شکست دینے کے لیے ایرانیوں اور پرتگالیوں کو ان کی مقبوضہ بندرگاہ ''ہرمز'' سے 1622ء میں بے دخل کر دیا، لیکن سواحل ہند پر پرتگالیوں نے بہت دن تک انگریزوں کے قدم نہ جمنے دیے لیکن بعد کے دنوں میں انگریزوں نے پرتگالیوں کو شکست دے کر اپنی جگہ بنالی لیکن انہیں ڈچوں اور فرانسیسیوں کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتداء میں ڈچوں کی یہ کوشش رہی کہ انگریز جزائر شرق الہند میں قدم نہ جمانے پائیں۔ چنانچہ ان کی جو تجارتی کوٹھیاں ان جزیروں میں قائم تھیں ان پر بارہا ڈچ تاجروں نے حملے کیے اور جابجا انگریزوں کو نقصان پہنچایا۔ 1619ء میں دونوں قوموں کے تاجروں کی یورپ میں مصالحت بھی ہوگئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے شریک رہ کر تجارت کریں لیکن یہ معاہدہ ٹوٹ گیا اور جزائر شرق الہند کے دو مشہور انگریزی کارخانوں پر ڈچ جبراً قابض ہوگئے۔ جزائر شرق الہند میں انگریزی تجارت فروغ نہ پا سکی، البتہ کپتان ہاکنس اور سر تھامس رو کی سعی و سفارت سے انگریموں کو سلطنت مغلیہ کے علاقوں میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی اور 1612ء میں سورت میں ان کی تجارتی کوٹھی بھی قائم ہوگئی اور بعد میں اس کی شاخیں برہان پور، احمد آباد، اجمیر و آگرہ میں قائم ہوئیں جو مغربی ہند میں اس زمانے کے بڑے تجارتی مرکز تھے۔ 1616ء میں کورومنڈل کے ساحل مچھلی پٹنم اور پیٹہ پلی میں بھی انگریزی دوکانیں کھل گئیں۔ 1639ء میں چیناپٹم کے راجہ نے ایک انگریز ایجنٹ کو بطور معافی مدراس میں کچھ زمین دے دی اور 1640ء میں یہاں ان کا قلعہ سینٹ جارج تعمیر ہو گیا۔

انگریز تاجروں کو اپنی حکومت کی طرف سے ایشیائی تجارت کا اجارہ بھی مل گیا تھا اور 1661ء میں (شاہ چارلس دوم کے عہد میں) ایک شاہی فرمان کی رو سے تجارت کے ساتھ ہی اپنے ایشیائی مقبوضات میں انہیں ضرب سکہ اور حکومت کرنے کے حقوق مل گئے۔ چارلس دوم نے جزیرہ بمبئی، برطانوی کمپنی کو دے دیا۔ اصل میں یہ جزیرہ پرتگالیوں کے قبضے میں تھا۔ جب پرتگال کی شہزادی کی انگلینڈ کے حکمراں سے شادی ہوئی تھی تو یہ جہیز میں برطانیہ کو ملا تھا۔ 1687ء میں کمپنی نے اپنے صدر کارخانے کو سورت سے بمبئی منتقل کر دیا تھا۔

سترہویں صدی کے اواخر میں انگریز تاجروں کے دل میں ملک گیری کا شوق پیدا ہوا اور انہوں نے اپنے تجارتی کارخانوں کو جنگی اغراض کے لیے مستحکم کرنا شروع کر دیا اور فوجی مصارف اور منافع کے واسطے گردونواح کے علاقوں پر بھی تصرف حاصل کرنا چاہا۔ ان کے اندر یہ جذبہ ڈچوں کی تقلید اور مزید منافع حاصل کرنے کے لالچ سے پیدا ہوا تھا، لیکن جب اس پر عمل شروع ہوا تو کمپنی اور اس کے ملازمین کو سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ کمپنی کے بعض انگریز ملازمین قید کر لیے گئے۔ انہوں نے ساحلی بنگال پر جو حملے کیے ان سب میں نقصان و ناکامی ہوئی۔ اسی طرح انہوں نے عرب میں حاجیوں کے جہاز لوٹنے شروع کیے، لیکن شاہی جہازوں نے اس دست و برد کا بھی خاطر خواہ انسداد کر دیا اور دو تین سال کی اس لڑائی میں ہندوستان کا کوئی قابل ذکر نقصان نہیں ہوا، البتہ کمپنی گھاٹے میں چلی گئی۔ کمپنی کے وکلاء نے عجز وندامت کے ساتھ بادشاہ سے معافی مانگی۔ اس کے بعد 1690ء میں از سر نو کچھ شرائط پر تجارت کی اجازت حاصل ہوئی اور اسی سال انہیں کلکتہ میں تجارتی کارخانہ قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ 1694ء میں انگلینڈ کے ہر شخص کو ایشیاء سے تجارت کا حق مل گیا اور کمپنی کے مخصوص حقوق سوخت

کر لیے گئے۔ایک نئی انگلش کمپنی قائم ہوئی جس میں بہت سے دولت منداور ذی اثر لوگ حصہ دار تھے، مگر اس کمپنی کا ہندوستان میں کوئی اثر و رسوخ قائم نہ ہوسکااور 1708ء میں دونوں کمپنیوں کو متحد کر دیا گیااور یہی ایشیاء سے تجارت کرنے والے سوداگروں کی متحدہ جماعت تھی جس سے بعد میں ہندوستان کو تجارتی وسیاسی واسطہ پڑا۔

1715 سے 1717ء تک ایک انگریز ایلچی جان سورمان(John Surman)دربار شاہی میں رہااور اس نے سلطنت مغلیہ کی طرف سے کمپنی کے لیے بعض تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی مراعات حاصل کیں۔18ویں صدی کی ابتداء ہی سے مغل سلطنت زوال پذیر ہوتی گئی۔1759ء میں بیدرا(Bedara) کے مقام پر ڈچ اور انگریزوں کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی۔1795ء تک انگریز تاجروں نے ڈچوں کے تمام ہندوستانی اڈوں پر قبضہ کر لیا۔اس دوران ہندوستان میں پرتگالیوں اور ڈچوں کا اثر تقریباً ختم ہو گیا تھا۔تاراچند کے مطابق 'اگرچہ انگریزوں نے اس وقت مغل سلطنت پر سیدھے حملے کرنا خطرناک سمجھا مگر وہ ہر ممکن طریقے سے اپنی طاقت بڑھاتے رہے اور ان کی تجارت بھی دن بدن بڑھتی گئی۔'18ویں صدی کے وسط میں ہندوستان میں مرکزی حکومت کی کمزوری کے باعث چاروں طرف انتشار تھا۔ ہندوستان کی انگریز بستیوں کے ذمہ داران، اپنی بڑھتی ہوئی تجارت کے تحفظ کے لیے فکر مند تھے اور اس کے لیے تلوار کا استعمال کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔فوجی طاقت مضبوط کیے بغیر وہ اپنے دشمنوں خصوصاً فرانسیسیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے،اسی لیے انہوں نے اپنے کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔

3.2.5 فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی (French East India Company)

17ویں صدی کے وسط میں حکومت فرانس مشرقی ممالک سے تعلقات بڑھانے میں کوشاں ہوئی اور بادشاہ لوئی چہاردہم کے عہد میں اس کے وزیر کولبرٹ کی سرپرستی میں 1664ء میں فرانس کی ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی۔اس طرح فرانس کے تاجر تجارت کی غرض سے ہندوستان آنے لگے۔1668'1669اور 1674 میں سورت' مولی پٹم اور پانڈیچری میں فرانسیسیوں نے اپنی فیکٹریاں قائم کیں۔فرانس کی ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا تجارتی کارخانہ سورت میں قائم ہوااور بعد میں مچھلی پٹنم میں اس کی ایک شاخ کھل گئی۔کلکتہ سے 16 میں دور چندر نگر میں بھی ایک شاخ کھولی گئی۔1672ء سے 1713ء تک یورپ میں فرانس اور ہالینڈ کے درمیان جنگ چلتی رہی۔اس جنگ کے چھڑ جانے کے باعث کارخانے محفوظ نہ رہ سکے اور تجارت میں بھی نقصان اٹھانا پڑا۔اس طرح میلاپور(مدراس) کے ڈچ(ولندیزی) کارخانے پر جن فرانسیسیوں نے قبضہ کر لیا تھا،انہیں ڈچوں نے گول کنڈہ کے بادشاہ کی مدد سے 1674ء میں جبراً خالی کرالیا۔1693ء میں ڈچوں نے ان سے پانڈیچری جیت لیا مگر چھ سال بعد یہ دوبارہ فرانسیسیوں کے قبضے میں آگیا۔اس کے بعد فرانسیسی ساحل کورومنڈل کے اس مقام پر گئے جو بیجاپور میں جنجی ندی کے کنارے تھا۔یہیں پر مارتین فرانسیسی نے شیر خان کی اجازت و تعاون سے وہ بستی بسائی جو"پھل چیری" کہلاتی تھی اور بعد میں یہی پانڈیچری کے نام سے مشہور ہوئی۔یہ بستی ترقی کر کے 1706ء تک ایک بڑا تجارتی مرکز بن گئی۔

1690-92ء میں بنگال کے نواب نے بھی فرانسیسیوں کو چندر نگر فیکٹری قائم کرنے کی اجازت دے دی۔1707ء تا1720ء

فرانسیسیوں کو بھی ڈچ تاجروں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ 1721ء میں فرانس کے تاجروں نے آفریقہ میں ماریشس پر قبضہ کر لیا۔اس طرح فرانسیسی ہندوستان کے اہم علاقوں میں اپنے تجارتی اڈے قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ 1735ء میں ڈیوما پانڈیچری کا گورنر بنا۔ تاراچند لکھتے ہیں کہ ''ڈیومانے تجارتی مفاد میں ترقی کے ساتھ ہی سیاسی اثرات قائم کرنے کی حکمت عملی اپنائی۔اسی نے فرانسیسی بستیوں کی قلعہ بندی کی''ڈاڈویل کے مطابق ''فرانسیسیوں کا یہ ماننا تھا کہ کچھ خوشحال بستیاں اور قلعہ بندی ان کی کمپنی کے اثرات میں اضافہ کرے گی''تاراچند کے مطابق ''1740ء سے اس حکمت عملی پر عمل شروع ہوا'' 1742ء میں ڈوپلے ہندوستان میں فرانسیسی بستیوں کا گورنر جنرل مقرر ہوا اور اس نے ہندوستان میں اپنا سامراج قائم کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے اسے انگریزوں سے مقابلہ آرائی کرنی پڑی۔

3.3 انگریز اور فرانسیسیوں کے مابین مقابلہ آرائی

(Competition between the English, and the French)

ہندوستان میں یورپ کی قوموں کے درمیان خصوصاً انگریز اور فرانسیسیوں کے درمیان کشمکش کا ایک ہی بنیادی سبب تھا اور وہ تھا ہندوستان میں تجارت کی اجارہ داری حاصل کرنا۔ تجارت میں اجارہ داری قائم کرنے کے لیے انگریز اور فرانسیسیوں کے درمیان کرناٹک میں تین جنگیں ہوئیں۔ تجارت میں اپنی خود مختاری اور اجارہ داری قائم کرنے کی اس کوشش کو اس دور کے مورخین نے ''مرچینٹ کیپٹلزم'' کے نام سے منسوب کیا ہے۔ تجارت میں مقابلہ آرائی پہلے انگریز اور پرتگالیوں کے درمیان پھر انگریز اور ڈچوں کے درمیان اور آخر میں انگریز اور فرانسیسیوں کے درمیان ہوئی۔ یہ مقابلہ آرائی جنگ میں تبدیل ہو گئی جسے کرناٹک جنگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔انگریزوں اور فرانسیسیوں میں یہ جنگ جنوبی ہندوستان (کرناٹک) میں 1746ء تا 1763 ہوئی۔اس جنگ میں فرانسیسی بری طرح سے ناکام ہوئے اور ہندوستان کی سیاست اور تجارت دونوں پر انگریزوں کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ یہ جنگ یورپ میں چل رہی سیاست سے بھی متاثر تھی اور اس جنگ میں ہندوستان کے ریاستی حکمراں بھی شامل ہو گئے تھے۔ کرناٹک کی تین جنگوں میں پہلی اور تیسری جنگ یورپ کی سیاسی صورتحال کے بہانے شروع ہوئی تھی۔ 1744ء میں پرشیا کے فریڈرک دوم نے آسٹریا کی حکمراں میریا تھریسا کی جانشینی کے خلاف جنگ شروع کی تھی اس میں فرانس نے فریڈرک کا ساتھ دیا اور انگلینڈ نے میریا تھریسا کا ساتھ دیا تھا۔ادھر ہندوستان میں تجارت کے میدان میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کے مابین رقابت زوروں پر تھی۔ انگریز فرانسیسیوں کو تجارت کے میدان میں برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لیے جیسے ہی آسٹرین وار آف سکسیشن شروع ہوئی، انگریزوں نے فرانسیسیوں کے جہازوں کو ہندوستان کے سمندری کناروں پر لوٹ لیا، یہیں سے کرناٹک کی پہلی جنگ کا آغاز ہوا۔ کرناٹک کی دوسری جنگ کا آغاز 1748ء میں ناصر جنگ کے قتل سے ہوا۔اس میں ہندوستان سیاست کا دخل تھا۔ کرناٹک کی تیسری جنگ بھی یورپ کے تاریخی واقعات کا نتیجہ تھی۔ میریا تھریسا نے فریڈرک سے اپنے زرخیز علاقے سائیلیشیا کو حاصل کرنے کے لیے 1756ء میں جنگ چھیڑ دی تھی، اس میں فرانس نے میریا کا ساتھ دیا اور برطانیہ نے فریڈرک کا ساتھ دیا۔اس کا اثر ہندوستان میں انگریز اور فرانسیسیوں کے تعلقات پر پڑا اور یہاں بھی جنگ شروع ہو گئی۔

3.3.1 کرناٹک کی پہلی جنگ (The First Carnatic War, 1746–1748)

انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مابین آپسی رقابت (کشمکش) بہت تیزی کے ساتھ جنوبی ہند (کرناٹک) میں پروان چڑھی۔ جنوبی ہند کی سیاست خصوصاً کرناٹک کے اندرونی حالات نے دونوں کو اپنی اپنی طاقت آزمانے کا موقع دیا۔ مغل سلطنت کی کمزوری کے باعث بہت سی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں۔ ان ریاستوں میں آپسی رسہ کشی چلتی رہتی تھی۔ ان حالات کا فائدہ اٹھا کر انگریز اور فرانسیسی دونوں ہی اپنا اپنا اقتدار قائم کرنے کا خواب دکھ رہے تھے۔ اسی وقت یعنی 1840ء میں آسٹریا میں وراثت کی جنگ کا آغاز ہو گیا، اس کو لے کر انگریز اور فرانسیسیوں کے مابین ہندوستان میں بھی جنگ چھڑ گئی۔ جنگ کی شروعات اس لیے ہوئی کہ انگریز بحری افواج نے کچھ فرانسیسی بحری جہازوں کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ پانڈیچری کے فرانسیسی گورنر ڈوپلے (Dupleix) نے انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ماریشس کے فرانسیسی گورنر لابورڈینی (La Bourdonnais) سے تعاون کی اپیل کی۔ وہ فوراً ہی 3,000 فوجیوں کے ساتھ ڈوپلے کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ دونوں نے جنوبی ہند میں انگریزوں کی طاقت کے مرکز مدراس کا رخ کیا۔ راستے میں فرانسیسیوں نے انگریزوں کو سمندری جنگ میں شکست دیدی۔ مدراس پہنچ کر فرانسیسی فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ انگریزوں کے ساتھ ہی کلائیو کو قید کر لیا۔ لابورڈینی انگریزوں سے تاوان وصول کرا نہیں مدراس لوٹا دینا چاہتا تھا، لیکن ڈوپلے اس کا مخالف تھا، اس لیے اس نے دوبارہ مدراس پر قبضہ کر لیا جسے لابورڈینی نے چار لاکھ پونڈ کے عوض میں انگریزوں کو واپس کر دیا تھا۔ یہ واقعہ ستمبر 1746ء کا ہے۔ ڈوپلے نے فورٹ سینٹ ڈیویڈ اور انگریزوں نے پانڈیچری پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ڈوپلے کے دوبارہ مدراس پر قبضہ کرنے سے انگریزوں کے حوصلے پست ہو گئے اور ان لوگوں نے کرناٹک کے نواب انورالدین سے تعاون کی اپیل کی۔ نواب بھی دونوں کے مابین جنگ سے پریشان تھا۔ اس نے دونوں کمپنیوں کو جنگ ختم کرنے کا حکم دیا۔ لیکن ڈوپلے نے نواب کو جھوٹا یقین دلایا کہ وہ مدراس نواب کے لیے ہی حاصل کرنا چاہتا ہے، اس پر نواب خاموش ہو گیا۔ ڈوپلے نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور پورا مال غنیمت اپنے پاس رکھ لیا اور مدراس پر بھی قابض رہا۔ غصے میں نواب نے مدراس پر حملہ کرنے کے لیے اپنی فوج بھیجی اس سے ڈوپلے پریشان اور مایوس نہیں ہوا بلکہ اس نے مقابلہ کیا۔ سینٹ ٹومی کے مقام پر دونوں میں جنگ ہوئی۔ ڈوپلے کے پاس صرف 230 فرانسیسی اور 700 ہندوستانی فوجی تھے جب کہ اس کے مقابلے میں نواب کی فوج میں 10,000 فوجی تھے۔ پھر کپتان پیراڈائز نے نواب کی فوج کو شکست دے دی۔ اسی وقت 1748ء میں ایکس لا چیپل (Aix-La-Chapelle) کے معاہدے کے ذریعے آسٹریا کی جنگ وراثت کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے نتیجے میں ہندوستان میں بھی فرانسیسیوں اور انگریزوں کے مابین جنگ ختم ہو گئی۔ مدراس انگریزوں کو واپس مل گیا اور شمالی امریکہ میں لوئی برگ (لوبر) کا علاقہ فرانسیسیوں کو مل گیا۔ سرکار اور دت کے مطابق 'امریکہ میں لامحدود فوائد کے لیے فرانسیسیوں نے ہندوستان میں محدود فائدہ چھوڑ دیا اور جلد ہی وہ امریکی فوائد کو بھی کھو بیٹھے۔'

کرناٹک کی پہلی جنگ سے ہندوستانی سیاست اور فوج کی کمزوری دونوں یورپین اقوام کے سامنے ظاہر ہو گئی۔ کرناٹک کا نواب تجارتی کمپنی کو جنگ کرنے سے روکنے میں ناکام رہا اور نواب کی فوج فرانسیسیوں سے شکست بھی کھا گئی۔ اس سے یورپین کو ہندوستان کی سیاست میں مداخلت کا حوصلہ ملا۔ اب یہ دونوں تجارت کے ساتھ ہی سیاسی طاقت و قوت کی بھی دعویدار ہو گئیں۔

3.3.2 کرناٹک کی دوسری جنگ (The Second Carnatic War, 1749–1754)

ایکس لاچیپلے (Aix-La-Chapelle) کے معاہدے نے انگریز فرانسیسی مقابلہ آرائی کو کچھ دنوں کے لیے روک دیا تھا، مگر دونوں موقع کی تلاش میں تھے۔ اور یہ موقع دونوں کو حیدر آباد اور کرناٹک میں متنازع جانشینی کے باعث حاصل ہوا۔ 1748ء میں حیدر آباد اور کرناٹک میں وراثت کی جنگ شروع ہو گئی۔ 21 مئی 1748ء کو حیدر آباد کے نظام آصف جاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ناصر جنگ (1748-50) تخت جانشین ہوا، مگر نظام آصف جاہ کے پوتے مظفر جنگ نے ناصر جنگ کو نظام قبول کرنے سے انکار کر دا۔ اس انکار نے خانہ جنگی کی شکل اختیار کر لی۔ ادھر کرناٹک میں بھی امن و امان نہیں تھا۔ کرناٹک کے نواب انورالدین کے مخالف نواب دوست علی کے داماد چندا صاحب کو نواب بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ ان بحرانی حالات کا فائدہ اٹھا کر ڈوپلے علاقائی توسیع کے ساتھ اپنے سیاسی اختیارات واثرات بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے تیاری کی اور اس نے مظفر جنگ اور چندا صاحب کو فوجی تعاون دینے کا وعدہ کیا اور اس نے فرانسیسی فوج بھی بھیجی۔ اس فوج کی مدد سے اگست 1749ء میں ویلور کے قریب امبور کے مقام پر انورالدین کو ہرا دیا اور دسمبر 1750ء میں ناصر جنگ بھی مارا گیا۔ اس طرح انورالدین اور ناصر جنگ کو شکست دے کر حیدر آباد میں مظفر جنگ اور کرناٹک میں چندا صاحب تخت نشین ہو گئے۔ فرانسیسیوں کو مدد کے عوض میں دونوں نے کافی دھن دولت دیا۔ ڈوپلے کو مظفر جنگ نے کرشاندی کے جنوبی حصے میں مغل صوبوں کا گورنر مقرر کر دیا۔ شمالی سرکار کے کچھ اضلاع بھی فرانسیسیوں کو عطا کر دیے گئے۔ ڈوپلے نے مظفر جنگ کی درخواست پر فرانسیسی فوج کی ایک ٹکڑی کپتان بوسی کی ماتحتی میں حیدر آباد میں تعینات کر دی۔ 1751ء میں چندا صاحب کرناٹک کا نواب بن گیا۔ اس طرح حیدر آباد اور کرناٹک پر فرانسیسیوں کا سیدھا کنٹرول ہو گیا اور ڈوپلے کی طاقت بڑھ گئی۔ انگریز بھی فرانسیسیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے اور یہ موقع انہیں مل ہی گیا۔ نواب انورالدین کا لڑکا محمد علی چندا صاحب کے خوف سے فرار ہو کر ترچناپلی چلا گیا جہاں وہ انگریز تعاون کا خواہش مند تھا۔ چندا صاحب اور فرانسیسی محمد علی کے تعاقب میں آگے بڑھ رہے تھے۔ انگریزوں نے فوراً اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرانسیسیوں کو شکست دینے کا منصوبہ بنایا۔ محمد علی کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور فرانسیسیوں سے مقابلے تیاری کر لی۔ فرانسیسیوں نے ترچناپلی کے قلعہ کا محاصرہ کیا اور اس کو فتح کرنے کی کافی کوشش کی لیکن انگریزوں نے قلعہ تسخر نہیں کرنے دیا۔ کلائیو نے دور اندیشی کا ثبوت دیا۔ اس نے ترچناپلی سے فرانسیسیوں کا دھیان ہٹانے کے لے ارکاٹ کا محاصرہ کر لیا۔ اب چندا صاحب کو اپنی راجدھانی کے تحفظ کے لیے فوج بھیجنی پڑی لیکن ڈوپلے اور چندا صاحب کی فوج ارکاٹ کو آزاد نہیں کرا سکی۔ کلائیو نے محض 210 فوجیوں کی مدد سے ارکاٹ فتح کر لیا۔ چندا صاحب نے 4000 فوجی بھیجے لیکن ارکاٹ کو واپس نہیں لے سکا۔ 1752ء میں اسٹنگر لارنس کی سربراہی میں انگریزوں نے ترچناپلی کو بچا لیا اور جون 1752ء میں فرانسیسیوں نے انگریزوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔

یہ ڈوپلے اور فرانسیسیوں کی انگریزوں کے ہاتھوں پہلی شکست تھی۔ اس نے ڈوپلے کے سیاسی عزائم کا خاتمہ کر دیا۔ چندا صاحب بھاگ کر تنجور پہنچا جہاں اس کا قتل ہو گیا۔ اس طرح انگریزوں کا حمایتی محمد علی کرناٹک کا نواب بن گیا۔ ڈوپلے نے دوبارہ اپنی قوت اور وقار کی بحالی کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ڈوپلے کی حکمت عملی سے ناخوش ہو کر فرانس کی حکومت نے 1754ء میں اسے واپس بلا لیا۔ اس کی جگہ

گوڈی ہو (Godeheu) ہندوستان آیا۔اس نے 1755ء میں انگریزوں سے معاہدہ کرکے دوسری کرناٹک جنگ کا خاتمہ کیا۔ کرناٹک کی دوسری جنگ نتائج کے نقطۂ نظر سے پہلی جنگ سے زیادہ اہم ثابت ہوئی۔سندر لال کے مطابق ''یہ وہ چٹان ہے جس سے ٹکرا کر اس ملک کے اندر ڈوپلے اور فرانسیسیوں کے تمام عزائم وخواہشات چور چور ہو گئیں''اس جنگ کے بعد انگریزوں کی پوزیشن پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی۔

3.3.3 کرناٹک کی تیسری جنگ (The Third Carnatic War)

1756ء میں یورپ میں شروع ہونے والی ہفت سالہ جنگ کے ساتھ ہی ہندوستان میں بھی دونوں طاقتیں ایک دوسرے سے برسرپیکار ہو گئیں۔اس وقت تک یعنی 1758ء تک پلاسی کی جنگ کے باعث بنگال پر انگریزوں کی فتح نے ان کی پوزیشن اور بھی مضبوط کردی تھی۔اس لیے وہ فرانسیسیوں کو ہندوستان سے نکالنے پر آمادہ ہو گئے۔ہندوستان میں فرانسیسیوں کی بقاء وتحفظ نیز ان کے کھوئے ہوئے عزت ووقار کی بحالی کے لیے فرانس حکومت نے 1757ء میں کاؤنٹ دی لالی کو ہندوستان بھیجا۔1758ء میں وہ ہندوستان پہنچا۔ہندوستان آتے ہی اس نے 1758ء میں سینٹ ڈیویڈ کے قلعے پر حملہ کردیا اور اسے اپنے کنٹرول میں کرلیا۔اس کے بعد تنجور کے حکمراں کے خلاف اپنی فوج روانہ کی۔ تنجور کے حکمراں پر فرانسیسی کمپنی کا 50 یا 60 لاکھ روپیہ بقایا تھا جسے وہ وصول کرنا چاہتا تھا،اس لیے اس نے تنجور پر حملہ کردیا۔ انگریزوں کی مداخلت سے لالی کو قلعہ کا محاصرہ ختم کرکے واپس ہونا پڑا۔اس سے فرانسیسیوں کا وقار مجروح ہوا۔اس کے بعد لالی نے مدراس کا محاصرہ کیا لیکن انگریزوں کی مدد کے لیے طاقت جہازی بیڑہ پہنچ گیا اس لیے مجبوراً لالی نے 1758ء میں یہ محاصرہ اٹھالیا۔اس کے بعد لالی نے بوسی کو حیدرآباد سے واپس بلالیا۔ یہ اس کی سب سے بڑی چوک تھی۔اس کی وجہ سے حیدرآباد میں فرانسیسیوں کی پوزیشن کمزور ہو گئی۔ 1760ء میں وانڈی واش کی فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں انگریز جرنیل آئر کوٹ نے فرانسیسیوں کو بری طرح شکست دی اور بوسی کو گرفتار کرلیا۔ میلیسن (Malleson) کے لفظوں میں مارٹین (Marten) ڈوماس (Dumas) اور ڈوپلے (Dupleix) جس طاقتور اور مضبوط عمارت کو کھڑا کرنے میں اپنا کردار ادا کیا تھا اسے اس جنگ نے ملیامیٹ کردیا۔لالی کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا اور پانڈیچری کی قسمت کو اس نے چوپٹ کردیا۔

جنوری 1761ء میں فرانسیسی پوری طرح شکست کھانے کے بعد پانڈیچری لوٹ گئے۔انگریزوں نے اس کا بھی محاصرہ کرلیا اور آٹھ مہینے کے بعد 1761ء میں فرانسیسیوں نے اسے بھی دشمن کے حوالے کردیا۔ جلد ہی ماہی اور جنجی بھی ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔اس طرح انگریز فرانسیسی مقابلہ آرائی میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی۔ہفت سالہ جنگ کے اختتام پر 1763ء میں دونوں کے مابین صلح ہوئی۔پانڈیچری دوبارہ فرانسیسیوں کو واپس مل گیا لیکنا نہیں اس کی قلعہ بندی کا اختیار نہیں دیا گیا۔بنگال سے فرانسیسیوں کا اثر ختم کردیا گیا۔اس طرح طویل کشمکش کے بعد فرانسیسی ایک تجارتی کمپنی اور قوم کی حیثیت سے بالکل ختم ہو گئے اور انگریزوں کو پورے ہندوستان کی تجارت کی اجارہ داری حاصل ہو گئی۔

3.4 انگریزوں کی فتح اور فرانسیسیوں کی شکست کی وجوہات

(Causes for the Victory of the British, and the Defeat of the French)

انگریزاور فرانسیسیوں کی فتح و شکست کے بہت سے اسباب تھے جو درج ذیل ہیں:

1. انگریزوں کی فتح کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کی سمندری طاقت فرانسیسیوں کے مقابلے میں برتر تھی۔ ٹی اے ماہن، الفریڈ لائل اور خیر الدین کہتے ہیں کہ 'Whoever rules the waves rules the worlds.' (جس ملک کی سمندری طاقت برتر ہوگی وہی دنیا پر حکومت کرے گی۔) برطانیہ اور ہالینڈ کے تیز طرار جہازوں نے اسپین کے بڑے بھاری مگر سست جہازی بیڑے کو شکست دی تھی۔ یہی بات ہندوستان میں انگریزاور فرانسیسیوں کی جنگ میں پیش آئی۔
2. انگریزوں کی فتح کی دوسری وجہ یہ تھی کہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نجی کمپنی تھی۔ کمپنی باصلاحیت افسروں کا تقرر کرتی تھی۔ ایسے مقام پر اپنی فیکٹری قائم کرتی تھی جو تجارتی اعتبار سے مفید ہوتے تھے۔ کمپنی اقتصادی اور فوجی اعتبار سے اپنے کو مضبوط کرتی تھی تاکہ اپنے حریفوں کا مقابلہ کرسکے۔ اس کے مقابلے میں فرانسیسی کمپنی، سرکاری تھی۔ اس کا انحصار حکومت کی مضبوطی پر تھا۔ اگر فرانس کی حکومت مضبوط ہوتی تھی تو ممکن تھا کہ فرانسیسی کمپنی کو کامیابی حاصل ہوتی، مگر بد قسمتی سے یہ دور سیاسی انتشار، سماجی بے چینی اور اقتصادی بد حالی کا دور تھا۔ انقلاب فرانس کے آثار ظاہر ہو چکے تھے۔ سولہواں لوئی بے حد کمزور تھا، اس لیے فرانس کی حکومت اپنی کمپنی کی مدد نہ کرسکی۔
اس کے علاوہ ڈوپلے جیسے قابل گورنر کو واپس بلا لیا گیا اور اسے سزا بھی دی گئی۔ یہ قدم فرانسیسی نوآبادیات کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔
3. تیسری وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کے زیادہ تر افسر بہادر اور باصلاحیت تھے، کلائیو، آئر کوٹ وغیرہ عقل مند اور بہادر تھے۔ فرانس کا گوڈہیو (Godeheu) بہت کمزور اور بزدل تھا۔ کاؤنٹ ڈی لالی بھی کمزور تھا، اس لیے تیسری کرناٹک جنگ میں فرانس کی ہار ہوئی۔
4. چوتھی اور آخری وجہ یہ تھی کہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستانی اڈے بہتر علاقوں میں تھے، جس کی وجہ سے کمپنی کی اقتصادی حالت اچھی تھی۔ خصوصاً بنگال انگریزوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا تھا۔

3.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آنے والی یورپی اقوام میں پرتگالی، ڈچ، انگریز اور فرانسیسی تھے۔ یہاں انگریز اور فرانسیسیوں کے مابین تجارتی مقابلہ آرائی چلتی رہی، بعد میں یہی کرناٹک جنگ میں تبدیل ہوگئی۔ کرناٹک کی جنگ ہندوستان، برطانیہ اور فرانس کے مابین 17ویں صدی کے وسط میں اپنے اقتدار کو قائم کرنے کی کوششوں میں ہونے والی جنگ ہے۔ برطانیہ اور فرانس کے مابین کئی جنگ ہوئی۔ جنگ کا مرکز کرناٹک کا علاقہ تھا، لہٰذا اسے کرناٹک کی جنگیں کہا جاتا ہے۔ انگریزوں نے فرانسیسیوں کے جہازوں کو ہندوستان کے سمندری کناروں پر لوٹ لیا۔ یہیں سے کرناٹک کی پہلی جنگ (48-1746) کا آغاز ہوا۔ اس جنگ میں فرانسیسیوں کی جیت ہوئی۔ فرانسیسی گورنر ڈوپلے نے ماریشس کے گورنر لابورڈینو سے مدد حاصل کرکے مدراس تک قبضہ کرلیا۔ 1748ء میں ایکس لاچیپلے کے معاہدے کے تحت ایک دوسرے کے علاقے واپس کردیے گئے۔ دوسری کرناٹک جنگ (54-1749) میں فرانسیسی گورنر نے انگریزوں کے دوست ناصر جنگ کے قتل

کے بعد مظفر جنگ سے دوستی کرکے اسے حیدرآباد کا نظام بنادیا تھا۔ چندا صاحب کرناٹک کا تخت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح ایک طرف انگریز اور محمد علی تھے اور دوسری طرف فرانسیسی، مظفر جنگ اور چندا صاحب تھے۔ دوسری جنگ کے پہلے مرحلے میں فرانسیسیوں کی جیت ہوئی۔ مدراس کے گورنر نے کلائیو کو نبرد آزمائی کی اجازت دے دی۔ کلائیو کو ارکاٹ کے محاصرے میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور فرانسیسیوں کی ہار ہوئی۔ اس طرح دوسری جنگ میں انگریزوں کی فتح ہوئی۔ 1756ء میں یورپ میں ہفت سالہ جنگ شروع ہونے کے ساتھ ہندوستان میں تیسری کرناٹک جنگ (63-1758) چھڑ گئی۔ یہ جنگ سات سال تک جاری رہی۔ 1760ء میں وانڈی واش کی آخری جنگ میں لالی کی ہار ہوئی۔ 1761ء میں اس کی فوجوں نے اپنے آپ کو انگریزوں کے سپرد کردیا۔ 1763ء میں معاہدہ پیرس ہوا۔ انگریزوں کو ہندوستان پر تجارتی اور سیاسی اجارہ داری حاصل ہوگئی اور فرانسیسی ایک سیاسی قوت کی حیثیت سے بالکل ختم ہوگئے۔

3.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

متصرف	:	قابض، مالگزاری کا حاکم، صوبہ دار انتظامی
مصالحانہ	:	صلح آمیز، دوستانہ
وساطت	:	وسیلہ، بیچ میں پڑنا
مخاصمت	:	بغض، عداوت، دشمنی
دست و برد	:	عمل دخل، خرد برد کرنا، غبن یا خیانت کرنا
انسداد	:	روک، بندش
سوخت	:	کالعدم ہونا، منسوخ ہونا، ختم ہونا

3.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

3.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. ترکوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کس سن میں کیا؟
2. واسکوڈی گاما کالی کٹ کے علاقے میں کب پہنچا؟
3. المیڈا ہندوستان کے وائسرائے کس سن میں بنا؟
4. پرتگالیوں کا گوا پر قبضہ کس سن میں ہوا؟
5. ڈچوں نے اپنی مشترکہ کمپنی کس نام سے قائم کی؟
6. بدیرا کے مقام پر ڈچ اور انگریزوں کے مابین جنگ کب ہوئی؟
7. ڈیوما پانڈیچری کا گورنر کب بنا؟

8. پہلی کرناٹک جنگ کب شروع ہوئی؟

9. ایکس لاشیپل کا معاہدہ کس سن میں ہوا؟

10. کاؤنٹ دی لالی ہندوستان کب آیا؟

3.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں پرتگالیوں کی آمد پر روشنی ڈالیں۔
2. ہندوستان میں ڈچوں کی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کریں۔
3. انگریزوں کے مقابلے میں فرانسیسیوں کی شکست کے اسباب لکھیں۔
4. کرناٹک کی پہلی جنگ کا جائزہ لیں۔
5. ڈوپلے کے کردار کا جائزہ لیں۔

3.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. کرناٹک میں انگریز فرانسیسی مقابلہ آرائی کو بیان کریں۔
2. یورپی طاقتوں کے مقابلے میں انگریزوں کی کامیابی کے اسباب کا جائزہ لیں۔
3. کرناٹک کی تیسری جنگ کا تجزیہ پیش کریں۔

3.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
3. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
4. Gandhi, Rajmohan, *A History of Modern South India*: *A History from the 17th Century to Our Times*, Aleph book Company, New Delhi, 2018.
5. Metcalf, Barbara D., and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).
6. Roy, Tirthankar, *The East India Company*: *The World's Most Powerful Corporation*, Allen Lane/ Penguin, New Delhi, 2012.
7. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707–1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.

اکائی 4۔ پلاسی اور بکسر کی جنگیں

(The Battles of Plassey, and Buxar)

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید
4.1 مقاصد
4.2 پس منظر
4.3 پلاسی کی جنگ
4.3.1 اسباب
4.3.2 قاسم بازار پر حملہ
4.3.3 فوری اسباب
4.3.4 جنگ کا آغاز
4.3.5 پلاسی کی جنگ کے نتائج
4.3.6 میر جعفر
4.3.7 میر قاسم
4.4 بکسر کی جنگ
4.4.1 اسباب
4.4.2 جنگ کا آغاز
4.4.3 جنگ کے نتائج
4.5 اکتسابی نتائج
4.6 کلیدی الفاظ
4.7 نمونہ امتحانی سوالات
4.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان کے شمال مشرق میں ایک خوشحال خطہ بنگال واقع ہے۔قدیم زمانے میں یہ مگدھ کے حکمرانوں، موریہ اور گپت خاندان کے زیر حکومت رہا۔ چھٹی صدیء میں بنگال، شمالی ہند کے عظیم حکمراں ہرش کے کٹر مخالف ششانک کا دارالحکومت تھا اور اس وقت یہ گوڑ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ابتدائی عہد وسطیٰ میں یہ پال اور سین خاندان کے ماتحت رہا جنہوں نے اسے بڑے پیمانے پر ترقی دی۔جنگلات صاف کرائے اور بدھ خانقاہیں تعمیر کروائیں۔ان خانقاہوں کی زیارت کے لیے بدھ راہب بڑی دور دراز سے آیا کرتے تھے۔1204 میں بنگال بختیار خلجی کے ہاتھوں دہلی سلطنت میں شامل ہوا لیکن 1338 کے بعد یہ کافی عرصہ تک خود مختار حکمرانوں کے زیر نگیں رہا۔ بنگال پر کسی بھی مرکزی ریاست کے لیے اقتدار قائم رکھنا آسان نہیں تھا۔ یہ ایک مالدار صوبہ اور تجارت اور زراعت کا مرکز تھا۔ خلیج بنگال میں اس کی متعدد بندرگاہیں تھیں۔بنگال کا ہر گورنر وسیع ذرائع کا مالک ہونے کی وجہ سے خود مختاری کی کوششیں شروع کر دیتا تھا۔1565 میں اکبر کے عہد میں یہ عظیم مغل سلطنت کا حصہ بن گیا۔ فرخ سیر نے 1717 میں مرشد قلی خاں کو صوبہ بنگال کا گورنر مقرر کیا جس میں بہار اور اڑیسہ بھی شامل تھا۔ مرشد قلی خان کے دور میں ہی بنگال مغل سلطنت سے خود مختار ہو گیا۔اسی دوران انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی بھی بنگال میں اپنا اقتدار اور منافعہ بڑھانے کو بیتاب تھی، جس کی وجہ سے ان کا اور بنگال کے نواب کا ٹکراؤ ہوا۔ پلاسی اور بکسر کی جنگیں اسی ٹکراؤ کا نتیجہ تھیں۔ان جنگوں کے نتیجے میں ہندوستان کی برطانوی فتح کا راستہ کھل گیا اور بنگال کی دولت سے انگلینڈ میں صنعتی انقلاب رونما ہوا۔اس اکائی میں آپ انہیں دونوں جنگوں کی تفصیلات اور نتائج کے بارے میں جانیں گے۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- انگریزوں اور بنگال کے نوابوں میں تنازعہ کی وجوہات سے واقف ہو سکیں گے۔
- پلاسی کی جنگ کے اسباب اور نتائج سے واقف ہو سکیں گے۔
- بکسر کی جنگ کے اسباب اور نتائج سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہندوستان پر انگریزوں کے بتدریج تسلط کے آغاز کو سمجھ سکیں گے۔

4.2 پس منظر (Background)

پچھلے سمسٹر میں آپ نے پڑھا کہ کس طرح بنگال میں مغل سلطنت سے علیحدہ ہو کر ایک آزاد ریاست کا قیام ہوا۔ خود مختار بنگال کا پہلا نواب مرشد قلی خان ایک قابل اور باصلاحیت منتظم اور حکمراں تھا۔اس کے عہد میں بنگال ایک مالدار اور خوشحال صوبہ بن گیا۔اسی دوران انگریز بھی برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی قیادت میں بنگال میں اپنے قدم جمانے کی کوششوں میں تھے۔1717 میں انہوں نے مغل شہنشاہ فرخ سیر سے بنگال میں بنا چنگی تجارت کرنے کا لائسنس بھی حاصل کر لیا تھا جسے 'دستک' کہا جاتا تھا۔ لیکن انگریز اس دستک کا استعمال اپنی ذاتی تجارت

کے لیے بھی کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے بنگال کے نواب کے خزانے پر اثر پڑتا تھا۔ مرشد قلی خان کے جانشینوں کے دور میں یہی دستک انگریزوں اور بنگال کے نوابوں کے درمیان جھگڑے کی جڑ بن گیا۔ سراج الدولہ کے تخت پر بیٹھنے تک حالات بے حد سنگین ہو چکے تھے۔ اہل برطانیہ سمجھ چکے تھے کہ اگر انہیں بنگال میں بناروک ٹوک تجارت کرنی ہے تو تخت پر ایک ایسا نواب بٹھانا پڑے گا جو ان کی کٹھ پتلی کی طرح کام کرے۔

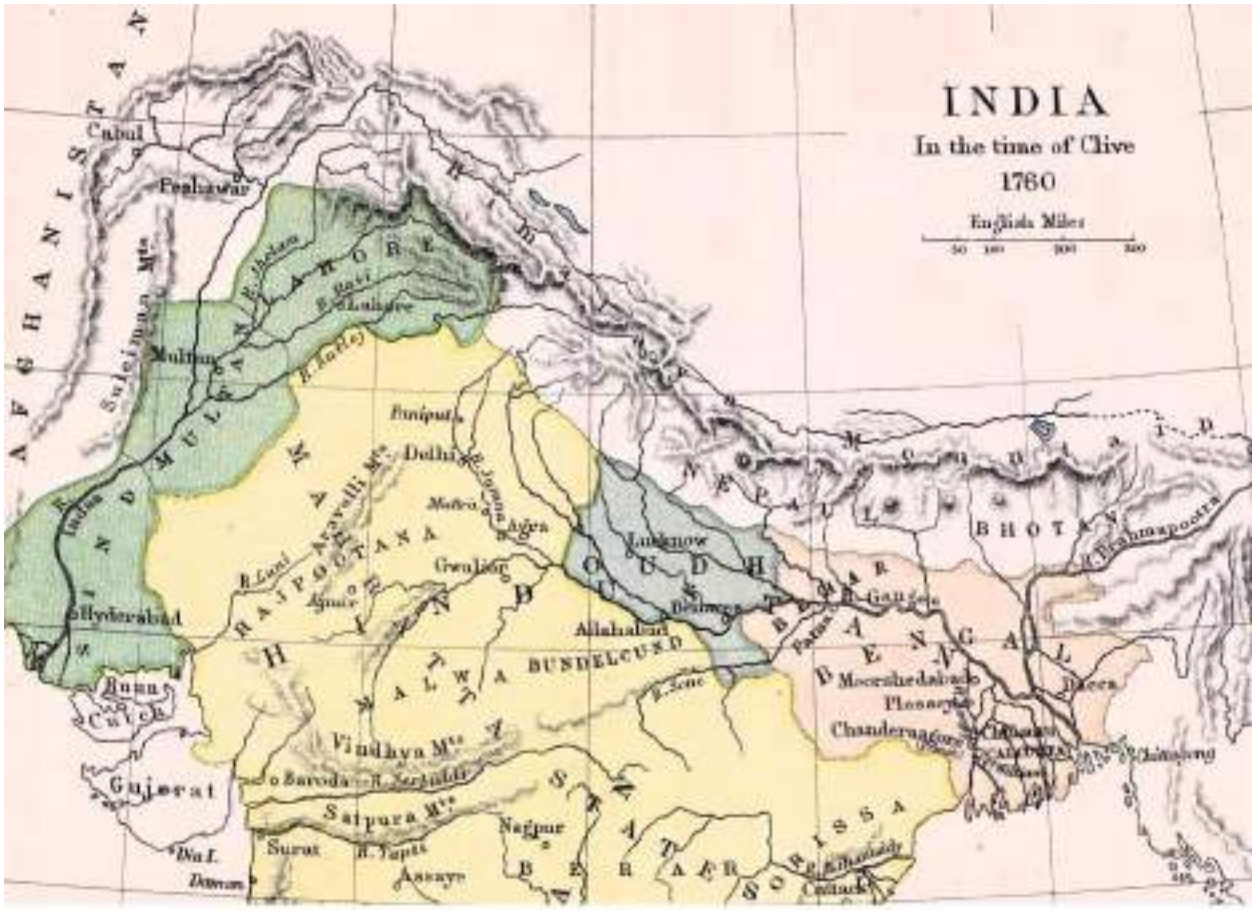

شمالی ہندوستان (تقریباً1760)

(Source:https://www.tutorialspoint.com/modern_indian_history/modern_indian_history_north_states_18th_century.htm)

4.3 پلاسی کی جنگ (The Battle of Plassey)

4.3.1 اسباب (Causes)

علی وردی خاں کے بعد اس کا پوتا سراج الدولہ جسے وہ خود نامزد کر گیا تھا گدّی پر بیٹھا۔ مگر اس کے بعد حالات اتنی تیزی سے بدلے کہ ایک سال کے اندر ہی پلاسی جیسی تاریخی اور فیصلہ کن جنگ اس صوبہ کا مقدر بن گئی۔ سراج الدولہ کو تخت پر بیٹھتے ہی بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت حکمرانی کے کئی دعوے دار تھے جو سراج الدولہ کی جگہ لینا چاہتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی خالہ گھسیٹی بیگم جس نے بہت دولت جمع کر رکھی تھی وہ اپنے گود لیے بیٹے مراءالدولہ کو جو سراج الدولہ کا چھوٹا بھائی تھا نواب بنانا چاہتی تھی۔ تخت کا دوسرا دعویدار سراج

الدولہ کی دوسری خالہ کا بیٹا شوکت جنگ تھا جو پورنیا کا صوبیدار تھا۔اس کے علاوہ اس کا سپہ سالار میر جعفر جو علی وردی خاں کا بہنوئی تھا،خود سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ سراج الدولہ نے ان سب کے خلاف کاروائی کی۔اس نے گھسیٹنی بیگم کی سب دولت ضبط کرلی۔میر جعفر کو ہٹا کر فوج کی باگ دوڑ میر مدن کے ہاتھ میں دی۔اکتوبر 1756 میں شوکت جنگ کو شکست دی اور ہلاک کر دیا۔

سراج الدولہ کے سب سے طاقتور دشمن انگریز تھے۔ایسٹ انڈیا کمپنی اور نواب کے درمیان کئی طرح کے تنازعات تھے۔وہ شروع سے ہی انگریزوں کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔کہا جاتا ہے کہ علی وردی خاں نے مرتے وقت سراج الدولہ کو انگریزوں سے ہوشیار رہنے کو کہا تھا اور یوروپی طاقتوں کو دبانے اور قلعے بنانے سے روکنے کے لیے وصیت کی تھی۔دوسری طرف انگریز نہ صرف سراج الدولہ کی کھلی حکم عدولی کرتے بلکہ اس کے دشمنوں کو پناہ دیتے اور اکساتے۔دوسرا مسئلہ 'دستک' کا تھا۔یہ ایک پرمٹ تھا جس سے انگریزوں کو تجارت میں ٹیکس کی چھوٹ تھی۔انہوں نے اس کا غلط استعمال کیا اور ہندوستانیوں کو یہ پرمٹ بیچنے لگے۔جس سے ریاست کی آمدنی کو نقصان ہو رہا تھا۔اس کے علاوہ انگریزوں نے کلکتہ میں ریاست کے مجرمین کو پناہ دے رکھی تھی۔جس کی سب سے بڑی مثال کرشن بلّبھ تھا۔یہ گھسیٹی بیگم کے دیوان راج بلّبھ کا بیٹا تھا اور اس کی ساری دولت لے کر انگریزوں کے پاس چلا گیا تھا۔انگریزوں نے نہ صرف اس کو واپس دینے سے انکار کیا بلکہ سراج الدولہ کے سفیر نارائن سنگھ کی بے عزتی بھی کی۔یہ وہ دور تھا جب انگریزوں اور فرانسیسیوں میں رسّہ کشی چل رہی تھی۔دونوں نے اپنی اپنی بستیوں کی قلعہ بندی شروع کردی۔انگریزوں نے تو قلعہ کے چاروں طرف خندق بھی کھود دی۔نواب نے دونوں کو اس سے روکنے کا حکم دیا۔فرانسیسی تو مان گئے مگر انگریزوں نے اپنا عمل جاری رکھا،اس پر نواب نے انگریزوں کے خلاف کاروائی کا آغاز کیا۔

4.3.2 قاسم بازار پر حملہ (The Invasion of Qasim Bazar)

6جون 1756 کو سراج الدولہ نے انگریزوں کی قاسم بازار کی کوٹھی پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔وہاں سے چل کر 16جون کو کلکتہ پر حملہ کر دیا۔جس کے بعد گورنر ڈریک اور بیشتر انگریز جہاز کے ذریعہ فلتا ٹاپو پر چلے گئے اور 20 جون کو قلعہ پر سراج الدولہ کا قبضہ ہو گیا۔اس کا نام بدل کر علی نگر رکھا۔یہاں بلیک ہول المیہ (Black Hole Tragedy) کا ذکر غیر ضروری ہے جس کے مطابق ایک چھوٹے سے کمرے میں 146 انگریزوں کو نواب نے بند کر دیا تھا اور جگہ کی تنگی کی وجہ سے دم گھٹنے سے 123 افراد مر گئے تھے۔یہ واقعہ کبھی ہوا ہی نہیں صرف انگریزوں نے نواب کو بدنام کرنے کی غرض سے اس کہانی کو جنم دیا تھا۔

کلکتہ ہاتھ سے نکلنے پر مدراس سے ایک فوج ایڈمرل واٹسن اور دوسری زمینی راستہ سے کلائیو کی سرکردگی میں 14 دسمبر 1756 کو بنگال پہنچیں۔نواب کے افسر مانک چند کو انگریزوں نے رشوت دے کر اپنی طرف ملا لیا نتیجتاً 2 جنوری 1757 کو معمولی سی لڑائی کے بعد کلکتہ پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔انہوں نے آس پاس کے علاقوں کو لوٹا۔9 فروری 1757 کو سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان علی نگر کا معاہدہ (Treaty of Ali Nagar) ہوا۔جس کے مطابق طے ہوا۔

1. نواب نے انگریزوں کو مغل بادشاہوں کے ذریعہ دی گئی تمام مراعات مان لیں۔

2. دستک کے ذریعہ آئے ہوئے انگریزوں کے مال کو بنگال، بہار اور اڑیسہ میں ٹیکس سے آزاد کر دیا گیا۔
3. انگریزوں اور کمپنی سے چھینی گئیں تمام اشیاء نواب واپس کرنے اور تاوان کی شکل میں روپیہ ادا کرنے پر بھی راضی ہو گیا۔
4. مرضی کے مطابق کلکتہ کی قلعہ بندی کرنے کا انگریزوں کو اختیار مل گیا۔
5. انگریزوں کو اپنے سکے چلانے کا حق بھی دے دیا گیا۔

یہ معاہدہ دراصل عارضی تھا جو فریقین نے اپنی اپنی مجبوری کے سبب کیا تھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی اس پر دل سے تیار نہیں تھا۔ نواب خود بھی ان شرطوں کو پورا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ انگریزوں نے اس پر الزام لگایا کہ وہ تاوان کی رقم ادا نہیں کر رہا ہے۔ دوسری طرف انگریزوں کو یہ شکایت بھی تھی کہ سراج الدولہ ان کے دشمن فرانسیسیوں کی مدد کر رہا ہے۔ خاص طور پر جب انگریزوں نے چندر نگر پر حملہ کیا تو نواب نے اس کی مخالفت کی اور فرانسیسی افواج کی مدد کی۔ سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان فیصلہ کن معرکہ کی زمین ہموار ہو رہی تھی۔ مخاصمت کی دیوار جو اول دن سے دونوں کے بیچ کھڑی ہو گئی تھی وہ وقت کے ساتھ مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ انگریز اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ اپنانے کو تیار تھے۔ وہ نواب کو کٹھ پتلی بنانا چاہتے تھے لیکن دوسری طرف سراج الدولہ کسی بھی صورت اپنے حقوق محفوظ رکھنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ مفاد کے اس ٹکراؤ نے دونوں کو پلاسی کے میدان میں پہنچا دیا۔ لیکن اس آخری معرکہ کے کچھ فوری اسباب بھی تھے جنہوں نے اس جنگ کو ناگزیر بنا دیا۔

4.3.3 فوری اسباب (The Immediate Causses)

1. **علی نگر معاہدہ کی شرائط پر عمل درآمد نہ ہونا:** جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ علی نگر کا معاہدہ دراصل مجبوری کا سودا تھا۔ اسی وجہ سے فریقین میں سے کوئی بھی اس کو عملی شکل دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ سراج الدولہ نے تاوان کی شکل میں جو روپیہ انگریزوں کو دینے کا وعدہ کیا تھا، اسے پورا نہیں کیا۔ رامسے میور نے لکھا ہے 'نواب معاہدہ کی شرائط کو پورا کرنے کے لیے راضی نہیں تھا اس لیے جنگ لازمی ہو گئی۔' اس لیے انگریزوں نے مناسب سمجھا کہ سراج الدولہ کو تیاری کا موقع دیے بغیر جنگ شروع کرنا بہتر ہو گا۔ بلاشبہ نواب بنگال۔ علی نگر معاہدہ کو عملی شکل دینے کے لیے تیار نہیں تھا مگر یہی بات انگریزوں پر بھی صادق آتی تھی۔ وہ یہ بات بخوبی سمجھتے تھے کہ جب تک سراج الدولہ محفوظ ہے خود ان کے لیے خطرہ بنا رہے گا۔ انہیں یقین تھا کہ انگریزی مفاد سراج الدولہ کے کانٹے کو ہٹائے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔
2. **نواب پر الزام:** انگریزوں کا نواب پر کا الزام تھا کہ نواب نے اپنی طرف سے انہیں جو یقین دہانی کرائی تھی اور جو وعدے کیے تھے وہ اس پر پورے نہیں اترے۔ سراج الدولہ نے کچھ نجی خطوط میں انگریزوں کو یقین دلایا تھا کہ وہ ان کے یعنی انگریزوں کے دشمنوں سے دوستی نہیں رکھے گا۔ یہ بات معاہدہ کی شرائط میں شامل نہیں تھی مگر انگریز اس کو بھی سمجھوتہ کی ایک شق قرار دیتے تھے۔ یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ انگریزوں کی خواہش کے باوجود نواب نے اسے معاہدہ کی شرائط میں شامل نہیں کیا۔ چنانچہ چندر نگر میں فرانسیسیوں کی مدد کرنے کو انگریزوں نے اپنی دشمنی اور مخالفت قرار دیا، اور نواب پر الزام لگایا کہ اس نے ایسا کر کے معاہدہ کی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے۔ سراج الدولہ نے اس الزام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سراج الدولہ فرانسیسیوں کو انگریزوں کا

دشمن نہیں سمجھتا تھا کیوں کہ اس وقت تک بنگال میں فرانسیسیوں نے انگریزوں کے خلاف کوئی کام نہیں کیا تھا۔

3. **سراج الدولہ کے خلاف اندرونی سازشیں :** صرف انگریز ہی ایک محاذ نہیں تھے۔ جہاں سراج الدولہ جدوجہد کر رہا تھا اس کے خلاف اندرونی سازشوں کا جال بھی بڑی مضبوطی سے بُنا جا رہا تھا۔ اس کا روح رواں تھا میر جعفر جو اس وقت میر بخشی تھا۔ اس کے علاوہ با اثر اور دولت مند مہاراجہ کرشن چندر اور جگت سیٹھ بھی اس سازش کے سرخیل تھے۔ بہت جلد اس میں انگریزوں کو بھی شامل کر لیا گیا اور امی چند نے درمیان میں پڑ کر 10 جون 1757 کو سازشیوں اور انگریزوں کے درمیان خفیہ معاہدہ کرا دیا۔ جس میں طے کیا گیا۔

- میر جعفر کو بنگال کا نواب بنایا جائے گا۔
- تاوان کے طور پر میر جعفر کمپنی کو ایک کروڑ روپیہ، یورپی شہریوں کو 50 لاکھ روپیہ اور ہندو تاجروں کو 20 لاکھ روپیہ دے گا۔
- جنگ کا خرچ بھی میر جعفر کو ادا کرنا ہوگا۔
- کلکتہ کی تمام آراضی کے مالک انگریز ہوں گے۔
- ہگلی کے قریب کوئی قلعہ بندی نہیں ہوگی۔

امی چند جو فریقین میں معاہدہ کرا رہا تھا اس نے تیس لاکھ روپیہ اور نواب کے خزانے کا نصف حصہ خود لینے کی مانگ کی اور نہ ماننے پر یہ دھمکی دی کہ وہ اس سازش کی اطلاع سراج الدولہ کو کر دے گا۔ اس پر کلائیو نے اسے دھوکہ دیا۔ دو معاہدہ نامے تیار کرائے گئے۔ اصلی پر واٹسن کے دستخط ہوئے۔ دوسرا، جس میں امی چند کی مانگ کو مان لیا تھا اس پر خود کلائیو نے واٹسن کے جعلی دستخط کیے۔

4.3.4 جنگ کا آغاز (Beginning of the Battle)

خفیہ معاہدہ کے بعد کلائیو نے سراج الدولہ پر علی نگر معاہدہ کی شرائط کو پورا نہ کرنے کا الزام لگایا اور فوج کے ساتھ پلاسی کے میدان میں پہنچ گیا۔ پلاسی مرشد آباد کے جنوب میں 22 میل کی دوری پر واقع گاؤں تھا۔ سراج الدولہ بھی اپنی پچاس ہزار فوج کے ساتھ پلاسی پہنچا۔ فرانسیسی بھی اس کی مدد کے لیے فوج میں تھے۔ کلائیو کی فوج میں 2100 ہندوستانی اور تقریباً 1000 یوروپی تھے جن میں 100 توپچی تھے۔ 23، جون 1757 کو جنگ کا آغاز ہوا۔ سازش کے مطابق نواب کی فوج کا بڑا حصہ جو درلبھ رائے اور میر جعفر کے ماتحت تھا، جنگ سے الگ رہا۔ صرف ہراول دستہ نے جو میر مدن اور موہن لال کی قیادت میں تھا اور جس کے ساتھ فرانسیسی بھی تھے جنگ میں حصہ لیا۔ انگریزوں نے انہیں شکست دی۔ سراج الدولہ کو حالات کا اندازہ ہو گیا تھا مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ فرار ہونے کی کوشش کی مگر پکڑا گیا اور مارا گیا۔ پلاسی کی جنگ نے ہندوستان کی قسمت کا بہت حد تک فیصلہ کر دیا۔ جس کے بعد پورا ہندوستان بتدریج انگریزوں کی دسترس میں آگیا۔

4.3.5 پلاسی کی جنگ کے نتائج (Results of the Battle)

جنگ کے نتائج کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے ہندوستان کی بساط پر بہت کچھ تبدیل کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ فوجی نقطہ نظر سے اس کی بہت اہمیت نہیں ہے۔ نواب کی فوج انگریزی فوج سے تعداد میں بہت زیادہ تھی لیکن سراج الدولہ کی طرف فوج کے ایک بڑا

حصہ جنگ میں شامل ہی نہیں ہوا۔ 65 انگریز اور 500 ہندوستانی فوجی مارے گئے۔ جن کی اس فیصلہ کن جنگ میں کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ میر جعفر اور درلبھ رائے نے میدان جنگ میں نواب کو دھوکہ دیا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب نواب کے پاس بچاؤ کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ اس لیے یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کی شکست اس کی فوج کی کمزوری نہیں تھی بلکہ حقیقتاً کلائیو کی سازش کا جال تھا جس نے سراج الدولہ کو جکڑ لیا۔ کے۔ ایم۔ ٹیکر نے لکھا ہے 'پلاسی ایک ایسی تجارت تھی جس میں بنگال کے مالدار سیٹھوں اور میر جعفر نے نواب کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا۔'

پلاسی کے بعد رونما ہونے والے واقعات نے ظاہر کر دیا کہ یہ جنگ کتنی اہم تھی۔ مالی اعتبار سے یہ انگریزوں کے لیے بڑی منفعت بخش ثابت ہوئی۔ امین چند کو کچھ نہیں ملا اور ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ کی رقم انگریزوں کے حصہ میں آئی۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کو روپیہ دینے کے لیے میر جعفر کو اپنے محل کے برتن اور دیگر سامان تک فروخت کر دینا پڑا۔ 24 پرگنہ کی جاگیر بھی انگریزوں کو مل گئی۔ بہار، بنگال اور اڑیسہ میں انگریزوں کو تجارت کی مکمل آزادی حاصل ہو گئی اور انہوں نے مختلف علاقوں میں اپنی فیکٹریاں قائم کر لیں۔ 1757 میں انہوں نے سب سے پہلے کلکتہ ٹکسال قائم کی اور اپنے سکے جاری کیے۔ کلائیو سمیت کمپنی کے تمام بڑے عہدیداران و تاجروں کو میر جعفر نے قیمتی تحائف پیش کیے۔ بنگال جیسے خوش حال صوبہ کے وسائل سے انگریزوں نے خود کو مضبوط کیا اور کرناٹک کی جنگوں میں کامیابی حاصل کی۔ بنگال میں ڈچ اور فرانسیسی دونوں ناکام رہے۔ اس طرح پلاسی کی فتح انگریزوں کے لیے ہندستان کی کامیابی کی کلید بن گئی۔ سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جنگ کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ میر جعفر انگریزوں کی مدد سے نواب بنا تھا اور پوری طرح انہی کا دست نگر تھا۔ صحیح معنوں میں اس کا اقتدار انگریزوں کا مرہون منت تھا یا یوں کہیے کہ بلا واسطہ انگریز ہی حکمراں تھے۔ نواب کی حفاظت کے لیے 16 ہزار سپاہیوں پر مشتمل انگریزی فوج تعینات تھی۔ میر جعفر اتنا بے بس تھا کہ چاہتے ہوئے بھی اپنے دیوان درلبھ رائے اور بہار کے نائب دیوان کو سزا نہیں دے سکا کیوں کہ یہ انگریز نہیں چاہتے تھے۔ ریاست بنگال میں انگریزوں کی مدد سے کوئی بھی شخص کسی بھی مقام تک پہنچ سکتا تھا۔ انگریزوں کی سیاسی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میر جعفر کو گدی سے ہٹانے کے لیے انہیں ایک قطرہ خون بھی بہانا نہیں پڑا۔ جی۔ وی ملسن نے لکھا ہے 'کوئی ایسی جنگ نہیں ہوئی جس کے نتائج اتنے گہرے، اور مستقل ثابت ہوئے۔ پلاسی کی جنگ نے نفسیاتی اور اخلاقی اثرات بھی مرتب کیے۔ تاجروں کی ایک کمپنی کے حکمراں کو ایسی شکست دی جس کے بعد اختیار کی حقیقی مالک وہ خود بن گئی۔ اس سے انگریزوں کے وقار میں اضافہ ہوا اور ہندستانیوں کی کمزوری کھل کر سامنے آ گئی۔ اس جنگ کے بعد انگریزوں کے لیے تجارت اور مملکت دونوں میدانوں میں وسعت کا دروازہ کھل گیا۔

4.3.6 میر جعفر (Mir Jafar)

میر جعفر نواب تو بن گیا مگر اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ سارے اختیارات کمپنی کے پاس تھے اور کلائیو کی مرضی ہی میر جعفر کی بھی مرضی تھی۔ وہ نہ تو اس حالت میں تھا کہ نظم و نسق سنبھالتا، نہ ہی ایسی حیثیت رکھتا تھا جو خود اس کے وقار کا تحفظ کر سکے۔ وہ تو اس لائق بھی نہیں بچا تھا کہ روز بروز بڑھتی ہوئی انگریزوں کی حرص و ہوس کی بھوک کو مٹا سکتا۔ وہ چاروں طرف سے جکڑا ہوا تین سال تک بنگال کا حکمراں

بنا رہا۔ بنگال کی بدلتی ہوئی صورتحال کسی سے بھی پوشیدہ نہیں تھی۔ شہزادہ علی گوہر نے جو بعد میں شاہ عالم ثانی کے خطاب کے ساتھ مغل بادشاہ بنا، بنگال کے ان حالات کا فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے 1759 میں اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے ساتھ مل کر بہار پر حملہ کردیا۔ اس کے مقابلہ کے لیے ایک فوج کلائیو کی قیادت میں اور دوسری میر جعفر کے بیٹے میرن کے ہمراہ بہار پہنچی جس کے نتیجہ میں شہزادہ کو ناکام واپس لوٹنا پڑا۔ اس نے بعد میں 1760 اور 1761 میں بنگال کے حصول کے لیے کوششیں کیں مگر کامیابی ہاتھ نہیں لگی۔ 2/جولائی 1760 کو میرن کا قتل کردیا گیا۔ کچھ مورخین کی رائے ہے کہ اس قتل میں انگریزوں کا ہاتھ تھا کیوں کہ وہ میرن کو اپنے راستہ کا کانٹا سمجھتے تھے۔ 1759 میں ہی ڈچ بنگال پر حملہ آور ہوئے۔ بال ویل کے مطابق، حملہ بنگال کے نواب کی سازش کا نتیجہ تھا مگر اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے کیوں کہ ڈچ، اپنے تجارتی مفاد میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو خطرہ سمجھتے تھے اور اسے روکنا چاہتے تھے۔ بیدرا کی جنگ میں ڈچ فوج کو شکست ہوئی اور انہوں نے انگریزوں کو تاوان جنگ دینا قبول کرلیا۔ اسی اثنا میں میرن نے ایک دوسری ڈچ فوج کو شکست دی اور انہیں معاہدہ کرنے پر مجبور کیا۔ بیدرا کے اس معاہدہ میں مندرجہ ذیل باتیں طے کی گئیں۔

1. نواب ڈچوں کو تجارتی مراعات دے گا۔
2. ڈچ کبھی بھی نواب سے جنگ کرنے، اس کی مدد میں قلعہ بندی کرنے اور فوجیں اکھٹی کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔
3. وہ (ڈچ) پٹنہ، چن سرا، اور قاسم بازار میں واقع اپنی فیکٹریوں کی حفاظت کے لیے 125 یورپین سے زیادہ نہیں رکھیں گے۔
4. وہ اپنے جہازوں اور فوجیوں کو نواب کی حدود سے باہر لے جائیں گے۔
5. مندرجہ بالا شرائط میں سے کسی کی بھی خلاف ورزی کی صورت میں نواب انہیں اپنی حدود سے بے دخل کردے گا۔

بیدرا کے اس معاہدہ نے ڈچ توسیع کے سبھی دروازہ بند کردیے اور وہ بنگال میں مکمل طور سے انگریزوں کے ماتحت ہوگئے۔ مورخین کے مطابق بیدرا کی جنگ میں فتح، بنگال میں انگریزی اقتدار کے قیام کے لیے پلاسی کے بعد دوسرا قدم ثابت ہوئی۔ فروری 1760 میں کلائیو انگلینڈ واپس چلا گیا جس کے بعد انگریزوں نے میر جعفر کو بھی تخت سے اترنے کے لیے مجبور کردیا۔ میر جعفر انگریزوں کی مدد سے بنگال کا نواب بنا تھا۔ اس کے اقتدار کا انحصار انگریزوں پر ہی تھا۔ اپنے دور میں اس نے انگریزی احکامات کی بجاآوری میں پوری مستعدی دکھائی لیکن پھر بھی انگریزوں نے اسے حکمرانی کے عہدے سے ہٹانا ہی مناسب سمجھا۔ اس کے مختلف اسباب ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

- **میر جعفر کی نااہلی:** جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں۔ میر جعفر پوری طرح سے انگریز پر منحصر تھا۔ وہ اسے کٹھ پتلی کی طرح استعمال کرتے۔ اس نے بے تحاشہ خزانہ انگریزوں پر خالی کردیا لیکن پھر بھی ان کا لالچ کم نہیں ہوا بلکہ وقت کے ساتھ میر جعفر کا وقار اور سیاسی حیثیت بالکل ہی صفر ہوگئی۔ اس میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ ان مخالف حالات میں اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرتا یا انگریزوں کے پنجہ سے نکل پاتا۔ یہ اس کی نااہلی ہی تھی کہ اپنے اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ کوئی سنجیدہ کوشش بھی نہیں کرسکا۔ یہی نہیں نواب کی حیثیت سے ریاست کے نظم نسق میں بھی وہ کوئی سدھار نہیں کرسکا اور نہ ہی ریاست کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کوئی ٹھوس قدم اٹھا سکا۔ بلاشبہ یہ بات بالکل درست ہے کہ انگریزوں کی مضبوط گرفت میں رہ کر، اپنی مرضی سے کچھ کرنا آسان نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی وہ یہ

کوشش تو ضرور کر سکتا تھا کہ انگریزوں کا عمل دخل کم کرے۔ منتظم کی حیثیت سے ریاست میں عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اقدام کرنا اور اپنے عوام کی ہمدردی اور تعاون حاصل کرتا۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اُس میں انگریزوں کی کسی بھی درجہ میں مخالفت کا حوصلہ ہی نہیں تھا بلکہ اس نے تو کوشش بھی نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے جب ضرورت سمجھی اسے بہ آسانی اقتدار چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

- **معاہدہ کے مطابق انگریزوں کو رقم فراہم نہ کرنا:** پلاسی کی جنگ سے قبل ہوئے معاہدہ کے مطابق میر جعفر کو ہر مہینہ ایک لاکھ روپیہ انگریزوں کو ادا کرنا تھا۔ نواب نے کمپنی کو بردوان اور نادیہ (60-1758) کے لیے دے دیے اور رقم دینے کے لیے محل کا سامان تک فروخت کر دیا مگر پھر بھی وہ انگریزوں کا قرضدار ہی رہا۔ صورتحال یہ تھی کہ نواب کا دیوالیہ نکل چکا تھا، فوج تنخواہ نہ ملنے کے سبب بغاوت پر آمادہ تھی، مگر انگریز اپنی بقایا رقم کے لیے دباؤ ڈال رہے تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق فروری 1760 تک یہ رقم بڑھتے بڑھتے 25 لاکھ ہوگئی تھی۔ لیکن میر جعفر کے سامنے ان مسائل کا کوئی حل نہیں تھا۔ نواب کی اس معاشی تنگی کا سبب یہ تھا کہ ریاست کی باگ ڈور سنبھالتے وقت اسے اتنا خزانہ نہیں ملا جس کی اسے توقع تھی۔ خود میر جعفر نے نواب بننے کے بعد کمپنی کے ملازمین کو جو بیش بہا تحفے تحائف دیے تھے اس نے بھی مالی حالت خستہ کر دی تھی۔ ان حالات میں خود کو بے بس پا کر میر جعفر نے انگریزوں سے درخواست کی کہ اسے معاہدہ کی مالی شرطوں کی تکمیل سے بری الذمہ قرار دے۔ مگر انگریز اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے اس معاشی بدحالی کا ذمہ دار بھی میر جعفر کو قرار دیا اور معاہدہ کی خلاف ورزی کا الزام عائد کر دیا۔
- **ہال ویل کے تئیں نواب کا رخ:** کلائیو کے انگلینڈ جانے کے بعد بنگال کی انگریز کمپنی کا گورنر عارضی طور پر ہال ویل (Holwell) کو مقرر کیا گیا۔ میر جعفر کلائیو کو بہت عزت دیتا تھا کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ کلائیو کی بدولت ہی اسے حکمرانی ملی ہے۔ لیکن وہ ہال ویل کو وہ مقام نہیں دے سکا جس کے سبب ہال ویل ناراض ہو گیا اور اس نے نواب پر الزامات عائد کرنا شروع کر دیے۔ اس کے مطابق نواب انگریزوں کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ یہی نہیں ہال ویل نے نواب کو ظلم و جبر اور انتظامی معاملات میں تساہل کا قصوروار بھی ٹھہرایا۔
- **نواب کی ڈچ افسران سے خط و کتابت:** ہالویل کے مطابق میر جعفر چن سرا کے ڈچ اہل کاروں سے خفیہ طور پر مل گیا ہے۔ نواب نے اس کی تردید کی اور نہ ہی یہ الزام ثابت ہو سکا لیکن پھر بھی خیال کیا جاتا ہے کہ شاید اس نے انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس طرح کا کوئی قدم اٹھایا ہو۔
- **انگریزوں کی بڑھتی ہوئی ہوسِ زر:** میر جعفر کو نواب بنا کر انگریزوں نے اس لیے خوب دولت حاصل کر لی۔ یہاں تک کہ وہ بالکل دیوالیہ ہو گیا۔ اب اگر انگریز کسی دوسرے کو نواب بناتے تو اس مدد کے عوض اس سے بھی دولت اور قیمتی تحائف ملتے۔

ان حالات میں انگریزوں نے میر جعفر کی قسمت پر مہر لگانے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے انہوں نے 27/ستمبر 1760 کو میر جعفر کے داماد اور فوج کے سپہ سالار میر قاسم سے ایک معاہدہ کیا۔ جس کے مطابق نواب بننے پر میر قاسم:

1. انگریز کمپنی کو بردوان، میدناپور، اور چٹاگانگ کے اضلاع سونپ دے گا۔
2. میر جعفر کے قرض کو فوراً کمپنی کو ادا کر دے گا۔

3. اپنی فوج میں تخفیف کرے گا۔
4. کمپنی کو کرناٹک کی جنگوں میں مدد کے طور پر 5 لاکھ روپیہ دے گا۔
5. کمپنی کے حلیفوں کو اپنا دوست اور کمپنی کے مخالفین کو اپنا دشمن سمجھے گا۔
6. والیسٹوارٹ کو 50 ہزار پونڈ، ہال ویل کو 27 ہزار پونڈ اور کمپنی کونسل کے دو دیگر ممبران کو 25-25 ہزار پونڈ دے گا۔
7. ان سب کے عوض کمپنی نواب کے اندرونی معاملات میں کوئی دخل اندازی نہیں کرے گی اور فوجی مدد دستور دیتی رہے گی۔

اس معاہدہ کے بعد 1760 میں کلکتہ کی انگریز کونسل نے میر جعفر کو ہٹانے کی کاروائی شروع کردی۔اس پر ظلم و جبر، خونریزی، رہزنی، عیاشی اور سستی کے الزام عائد کردیے۔ معاہدے کو لاگو کرنے کے لیے والیسٹوارٹ اور کیلارڈ 14 اکتوبر 1760 کو مرشدآباد پہنچے۔ میر جعفر نے ان کے حکم کی تعمیل سے انکار کردیا۔اس پر انگریز کمانڈر کیلارڈ کی قیادت میں نواب کے محل کا محاصرہ کرلیا گیا۔اب نواب کے پاس گھٹنے ٹیکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔اس نے گدی چھوڑدی اور میر قاسم کے نواب بننے کا اعلان کردیا گیا۔بغیر خون بہائے اقتدار کی باگ ڈور تبدیل ہوگئی۔ میر جعفر 15000 روپیہ پنشن پر کلکتہ روانہ کردیا گیا۔

4.3.7 میر قاسم (Mir Qasim)

1760 سے 1763 تک میر جعفر کے داماد میر قاسم نے ریاست بنگال کی نوابی کے فرائض انجام دیے۔اس کا شمار بنگال کے باصلاحیت حکمرانوں میں ہوتا ہے۔اس نے معاہدہ کے مطابق بردوان، میدناپور اور چٹاگانگ انگریزوں کو سونپ دیے۔ کرناٹک کی جنگوں کے لیے 5 لاکھ روپیہ دیا اور میر جعفر کے قرض کی جلد ادائیگی کا یقین بھی دلایا۔اس کے علاوہ اس نے تقریباً 17 لاکھ روپیے کمپنی کے افسران کو دیے۔ انگریزوں سے کیے وعدے پورے کرنے کے بعد اس نے ریاست کی طرف نظر ڈالی۔ وہ جانتا تھا نظم و نسق بہتر کرنا اور خزانہ کو بھرنا ضروری ہے۔اس نے دیکھا کہ فوج کو باقاعدگی سے تنخواہ نہیں مل رہی ہے اور وہ کبھی بھی بغاوت پر آمادہ ہوسکتی ہے۔مالگزاری صحیح سے وصول نہیں کی جارہی۔ ریاستی ملازمین بے ایمان اور رشوت خور ہوگئے ہیں۔ان سب مسائل سے نمٹنے کے لیے اس نے اقدامات شروع کردیے۔

سب سے پہلے اس نے معاشی حالت کو بہتر بنانے کی طرف توجہ دی۔اس نے ایک نیا شعبہ قائم کرکے حسابات میں گڑبڑی کی جانچ کرائی۔ جن ملازمین نے غبن کیا تھا ان پر بڑے بڑے جرمانے عائد کیے۔ بے ایمانی کے ذریعہ سرکاری رقم ہڑپنے والے اہلکاروں کو مجبور کیا کہ وہ یہ رقم سرکاری خزانہ میں جمع کریں۔ میر قاسم نے کچھ نئے ٹیکس عائد کیے اور پرانے چلے آرہے محصولات میں 3/32 حصہ کا اضافہ کیا۔مالی حالت بہتر کرنے کی سمت میں یہ اقدامات مستحکم ثابت ہوئے۔ یہی نہیں اس نے مقامی زمینداروں، امراء اور جگت سیٹھ جیسے مالدار تاجروں سے قرض لیے۔ آمدنی میں اضافہ کی ترکیبوں کے ساتھ ساتھ اس نے خرچوں پر بھی روک لگائی۔ فضول خرچی بند کردی گئی۔ میر قاسم نے فوجی معاملات کی بہتری کے لیے عملی اقدامات اٹھائے۔اس نے فوج کو یورپی طرز پر منظم کرنے کا فیصلہ کیا۔اس نے مرشدآباد کی جگہ مونگیر کو اپنی راجدھانی بنایا اور یہاں گولہ بارود تیار کرنا اور فوجیوں کو یورپی طرز پر جنگ کی تربیت دینا شروع کیا۔اس کام کے دوران گورگن خان اور

ایک مسلم تقی خان نے اس کی بھرپور مدد کی۔

میر قاسم کی ان کوششوں سے انتظامیہ اور دربار کے اخراجات میں کمی آئی اور فوجیوں کو تنخواہیں ملنے لگیں۔ کمپنی کا قرض بھی ادا ہو گیا۔ عوام میں اپنی ساکھ بہتر کرنے کے لیے اس نے غیر مطمئن سرداروں اور افسروں کو تدبر سے کام لیتے ہوئے اپنی حمایت اور تعاون کے لیے راضی کر لیا۔ باصلاحیت افراد کو ریاست میں عہدے دیے۔ اس کے علاوہ میر قاسم نے کچھ سخت قدم اٹھائے۔ مثلاً بہار کے نائب صوبیدار رام نارائن کو جو میر قاسم کے خلاف سازشوں میں مصروف تھا، انگریز گورنر کی مرضی لے کر پہلے برطرف کیا اور بعد میں مروادیا۔

4.4 بکسر کی جنگ (The Battle of Buxar)

4.4.1 اسباب (Causes)

میر قاسم کے ذریعہ کیے گئے یہ تمام کام اس کی صلاحیت اور حوصلہ کے مظہر ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایک عملی آدمی تھا۔ لیکن جس طرح میر جعفر کی نااہلی اس کے لیے اقتدار کی محرومی کا باعث بنی، اسی طرح میر قاسم کی اہلیت اس کے اور انگریزوں کے درمیان دشمنی کا سبب بن گئی۔ میر قاسم نے بنگال میں نظم و نسق بہتر کیا، مالی حالت درست کی اور انتظامیہ پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ یہ سب باتیں انگریزوں کی پسند کے خلاف تھیں۔ وہ تو ایسا نواب دیکھنا چاہتے تھے جو پوری طرح سے ان پر منحصر ہو اور ان کے اشاروں پر کام کرے۔ ظاہر ہے میر قاسم اس کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ دیگر اسباب بھی تھے جو نواب اور انگریزوں کے درمیان مخاصمت کا سبب بنے۔

1760 میں مغل بادشاہ عالم گیر ثانی کی موت ہو گئی۔ اس وقت شہزادہ علی گوہر بہار میں تھا، اس نے شاہ عالم ثانی کے خطاب کے ساتھ اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ انگریزوں نے میر قاسم سے کہا کہ وہ شاہ عالم ثانی کو مغل بادشاہ تسلیم کر لے۔ میر قاسم کو خدشہ ہوا کہ کہیں اس کے بعد انگریز مغل بادشاہ سے بہار، بنگال، اڑیسہ کی صوبیداری نہ لے لیں۔ ایسا ہونے پر میر قاسم مجبور ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے سوچا جب بادشاہ دلی چلا جائے گا تو وہ تسلیم کر لے گا۔ لیکن انگریزوں نے اسے دھمکایا تو مجبور ہو کر اس نے شاہ عالم ثانی کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور شاہ عالم ثانی سے ملنے پٹنہ گیا۔ بعد میں مغل بادشاہ مراٹھوں کی مدد سے دلی چلا گیا لیکن اس واقعہ نے انگریزوں اور میر قاسم کے درمیان رنجش پیدا کر دی۔

اس کے علاوہ دونوں فریقوں کے درمیان سب سے بڑا مسئلہ تجارت کو لے کر تھا۔ کمپنی بہار، بنگال اور اڑیسہ میں بغیر محصول دیے تجارت کرتی تھی۔ اس کے لیے اسے ایک پاس جاری کیا جاتا جو دستک کہلاتا تھا۔ میر قاسم نے دیکھا کہ انگریزی گماشتے دستک کا غلط اور ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔ وہ یہ اجازت نامہ ہندوستانی تاجروں کو بیچ دیتے جس سے ہندوستانی تاجر بھی بنا چنگی کے خرید و فروخت کر لیتے۔ اس طرح ریاست کی آمدنی کم ہو رہی تھی۔ چنگی کی شکل میں جو رقم حاصل ہوتی اس کے نہ ملنے سے انتظامی امور بھی متاثر ہوتے۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے نواب نے کمپنی سے رابطہ کیا۔ دونوں کے درمیان طے ہوا کہ کمپنی کے ملازمین بھی اندرونی خرید و فروخت پر 9 فیصد ٹیکس دیں گے اور دستک جاری کرنے کا اختیار نواب کے پاس ہی رہے گا۔ لیکن کلکتہ کی انگریز کونسل نے اس سمجھوتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس

صورتحال میں نواب نے 1762 میں سبھی محصول ہٹا لیے اور اندرونی تجارت میں ہندوستانیوں کے لیے بھی بنا چنگی دیے تجارت کرنا ممکن ہو گیا۔اس فیصلہ سے انگریزوں کو جو خصوصی مراعات حاصل تھیں وہ ختم ہو گئیں ۔ چنانچہ کلکتہ کونسل نے نواب سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستانیوں پر دوبارہ چنگی لگائے جسے نواب نے مسترد کر دیا۔اسی طرح نواب اور انگریزوں کے درمیان خلیج بڑھ گئی اور بالآخر اس رنجش کا اختتام بکسر کی جنگ کے ساتھ ہوا۔

4.4.2 جنگ کا آغاز (Beginning of the Battle)

انگریزوں نے اب نواب کے خلاف سازشیں کرنا شروع کر دیں۔وہ میر جعفر کو دوبارہ تخت نشین کرنا چاہتے تھے۔اس کی اطلاع پاکر میر قاسم نے خود ہی پہل کرنا مناسب سمجھا۔ابتدائی معمولی تصادم کے بعد 4/ستمبر 1763 کو ادوانالا مقام میں نواب اور میجر ایڈمس کی افواج میں مقابلہ ہوا۔فریب دہی کے سبب نواب کو شکست ہوئی اور وہ مونگیر ہوتا ہوا پٹنہ چلا گیا۔انگریز فوج پٹنہ کی جانب بڑھی۔ان حالات میں نواب نے پٹنہ میں میجر الس اور کچھ ہندوستانی باغیوں کو جرمن افسر سمرو کے ذریعہ قتل کرا دیا۔یہ واقعہ ہندوستانی تاریخ میں 'پٹنہ قتل عام' (The Patna Massacre) کے نام سے جانا جاتا ہے۔لیکن پھر بھی پٹنہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔میر قاسم اپنی کچھ فوج، توپ خانہ اور خزانہ کے ساتھ اودھ بھاگ گیا۔وہاں پہنچ کر اس نے اودھ کے نواب شجاع الدولہ سے مدد مانگی۔نواب اودھ نے بنگال میں اپنی طاقت میں اضافہ کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا اور وہ میر قاسم کو گدی واپس دلانے کے لیے اس کی مدد کو تیار ہو گیا۔میر قاسم نے اودھ کی فوج کے خرچ کے لیے 11 لاکھ روپیہ ماہانہ دینا قبول کر لیا۔اس وقت مغل بادشاہ شاہ عالم بھی اودھ میں موجود تھا اس اتحاد میں وہ بھی شامل ہو گیا۔اس طرح بنگال ،اودھ اور مغلوں کی متحدہ افواج بہار کی سرحدوں میں داخل ہو گئیں ۔انگریز کمانڈر میجر ہیکٹر منرو کی فوج سے 23/اکتوبر 1764 کو ان ہندوستانی حکمرانوں کے بیچ بکسر کی جنگ لڑی گئی۔انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی۔3 مئی 1765 کو کڑا کے مقام پر ایک مقابلہ ہوا،ہندوستانیوں کی شکست کے ساتھ یہ کشاکش ختم ہو گئی۔میر قاسم وہاں سے بھاگ نکلا اور 1777 میں دلی کے نزدیک پریشانی کی حالت میں اس کی موت واقع ہو گئی۔

4.4.3 جنگ کے نتائج (Consequence of the Battle)

بکسر میں فتح کے بعد کلائیو (جو دوبارہ گورنر بن کر ہندوستان پہنچا تھا) الہ آباد گیا اور 16 اگست 1765 کو مغل بادشاہ شاہ عالم اور نواب بنگال کو بھی شامل کیا گیا۔دراصل انگریزوں نے میر قاسم کے ساتھ تصادم کے آغاز میں ہی جولائی 1763 میں میر جعفر کو دوبارہ بنگال کا نواب بنا دیا تھا۔چنانچہ اس معاہدہ کے تحت بنگال کے نواب کی حیثیت سے میر جعفر سے مندرجہ ذیل شرائط طے کی گئیں۔

- بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی نواب سے لے کر انگریزوں کو دی گئی۔
- کمپنی نے نواب کو 53 لاکھ روپیہ سالانہ پنشن دینا منظور کر لیا۔

اس طرح میر جعفر دوبارہ نواب بن گیا اس نے انگریزوں کے مطالبہ پر ہندوستانیوں پر دوبارہ سے چنگی عائد کر دی۔انگریزوں کو کثیر

رقم دی۔ میر جعفر کے نواب بننے کے بعد بنگال میں دوبارہ سے حالات خراب ہونے لگے۔ یہاں تک کہ 5 فروری 1765 کو میر جعفر کی موت ہوگئی۔اس کی موت کے بعد انگریزوں نے اس کے کمسن بیٹے نجم الدولہ کو نواب بنادیا۔نئے نواب نے ایک معاہدہ کے تحت اپنی فوج کو ہٹادیا اور ریاست میں عہدیداروں کے تقرر کا حق بھی انگریزوں کو دے دیا۔اس طرح سے انگریز بنگال بہار اور اڑیسہ کے مالک بن گئے اور دارن ہیٹنگز کے عہد میں نوابی مکمل طور پر ختم ہوگئی۔

4.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

بنگال، بہار اور اڑیسہ کے علاقوں پر پھیلا ہوا بنگال کا صوبہ اپنے صوبہ دار مرشد قلی خان کے دور میں خود مختار ہوا۔ وہ ایک کامیاب منتظم اور لائق حکمراں تھا۔اس کے دور میں بنگال نے صنعت و حرفت اور کاروبار میں ترقی کی۔1756 میں علی وردی خان کی موت کے بعد اس کا پوتا سراج الدولہ بنگال کا حکمراں بنا۔تخت کے کئی دعویداروں سے وہ نمٹنے میں تو کامیاب ہوگیا مگر انگریزوں نے بنگال کے افسران کے ساتھ مل کر سازش کے ذریعہ اس کی حکمرانی کو خاتمہ کر دیا۔23 جون 1757 کو کلائیو نے پلاسی کی جنگ میں اسے شکست دی اور ہلاک کر دیا۔جس کے بعد بنگال پر انگریزوں کی گرفت مضبوط ہوئی اور ان کا ہندوستان میں ان کی فتوحات کا راستہ ہموار ہوگیا۔پلاسی کے بعد بنگال کے تخت پر کئی کٹھ پتلی نواب بیٹھے، لیکن ان میں میر قاسم سب سے الگ تھا۔وہ قابل اور بہترین منتظم تھا۔اس کی اصلاحات سے خزانے کا بوجھ کم ہوا اور بنگال کی ترقی ہوئی۔انگریزوں کو اس کی یہ اہلیت پسند نہیں آئی اور اسے تخت سے اتار دیا۔وہ بھاگ کر اودھ جا پہنچا اور وہاں اودھ کے نواب شجاع الدولہ، مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی کے ساتھ مل کر انگریزوں سے بکسر کے مقام پر مقابلہ کیا، لیکن جدید تربیت یافتہ کمپنی کی فوج ہندوستانی روایتی فوج پر غالب آئی۔اس فتح کے بعد انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کے دیوانی اختیارات حاصل ہوگئے اور وہ اب وسیع وسائل کے مالک بن گئے۔اسی کے ساتھ ہی ہندوستان کی ترقی کی رفتار منفی ہوگئی اور ملک کی دولت بہت تیزی سے برطانیہ پہنچنے لگی۔

4.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

امراء	:	امیر کی جمع، سردار و افسران
تسلط	:	قبضہ
تصادم	:	ٹکراؤ
خالصہ زمین	:	براہ راست حکمراں کی ملکیت
قلعہ بندی	:	چہار دیواری سے گھراؤ کرنا
ہراول دستہ	:	فوج کا سب سے اگلا حصہ
خود مختار	:	تمام اختیارات کا مالک ہونا
دستک	:	تجارتی اجازت نامہ

4.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

4.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. علی وردی خان کے بعد بنگال کے تخت پر کون بیٹھا؟
2. اٹھارہویں صدی میں بنگال میں دو دوسرے کون سے صوبے شامل تھے ؟
3. سراج الدولہ نے قاسم بازار پر کب حملہ کیا؟
4. علی نگر کا معاہدہ کس کس کے درمیان ہوا؟
5. سراج الدولہ کے خلاف ہونے والی سازشوں کا سرغنہ کون تھا؟
6. پلاسی کی جنگ کب ہوئی ؟
7. میر جعفر کے ساتھ میدان جنگ میں نواب کو کس نے دھوکہ دیا؟
8. بکسر کی جنگ کب ہوئی ؟
9. بکسر کی جنگ میں میر قاسم کے دوسرے دو اتحادی کون تھے ؟
10. میر قاسم کے بعد کون بنگال کے تخت پر بیٹھا؟

4.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سراج الدولہ اور انگریزوں کے تعلقات پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. علی نگر معاہدہ کے شرائط بیان کیجیے۔
3. پلاسی کی جنگ کے اسباب پر نوٹ لکھیے۔
4. پلاسی کی جنگ کے نتائج پر روشنی ڈالیے۔
5. میر جعفر کی معزولی کے اسباب بیان کیجیے۔

4.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پلاسی کی جنگ کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. بکسر کی جنگ کے اسباب و نتائج پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. میر قاسم ایک لائق منتظم تھا مگر وہ بگڑ چکے حالات کو نہیں سنبھال پایا، وضاحت کیجیے۔

4.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition: A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
3. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
4. Lyall, Sir Alfred, *The Rise and Expansion of the British Dominion in India*, New Book Corner, 2018.
5. Malleson, Colonel George Bruce, *The Decisive Battles of India from 1746 to 1849*, Lucknow Books, 2014.
6. Roberts, P. E., *History of British India*, OUP, New Delhi, 1978.
7. Thompson, Edward and G.T. Garratt, *Rise and Fulfilment of British Rule in India*, 2d edn., Central Book Depot, 1973.
8. Wilson, John, *India Conquered: Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon & Schuster, London/ New Delhi, 2016.

اکائی 5۔ پیشواؤں کا عروج، مراٹھا وفاق اور انگریز- مراٹھا جنگیں

(Rise of Peshwas, Maratha Confederacy, and the Anglo-Maratha Wars)

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 شیواجی کے جانشین اور ان کے اختلافات

5.3 پیشواؤں کا عروج

5.3.1 پیشواؤں کے عروج کے اسباب

5.3.2 بالاجی وشوناتھ

5.3.3 باجی راؤ اوّل

5.3.4 بالاجی باجی راؤ

5.3.5 پانی پت کی تیسری جنگ

5.3.6 مادھو راؤ اول

5.4 اینگلو مراٹھا جنگیں

5.4.1 مراٹھا وفاق

5.4.2 معاہدہ سورت

5.4.3 معاہدہ پورندر

5.4.4 پہلی اینگلو- مراٹھا جنگ

5.4.5 معاہدہ سلبائی

5.4.6 پہلی اینگلو- مراٹھا جنگ کے نتائج

5.4.7 دوسری اینگلو- مراٹھا جنگ

5.4.8 تیسری اینگلو مراٹھا جنگ

5.4.9 مراٹھوں کے زوال کی وجوہات
5.5 اکتسابی نتائج
5.6 کلیدی الفاظ
5.7 نمونہ امتحانی سوالات
5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان کی تاریخ میں مراٹھا سلطنت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ مغلوں کے زوال نے جو سیاسی خلا پیدا کیا تھا اس کو پُر کرنے کی ان میں صلاحیت بھی تھی اور حالات بھی موافق تھے۔ مراٹھا ریاست کا بانی شیواجی ایک فاتح مدبر اور عمدہ منتظم تھا۔ پیشواؤں کے دور میں مراٹھوں کو انتہائی عروج حاصل ہوا اور وہ شمالی ہند تک اپنے گھوڑے دوڑاتے چلے گئے۔ شمالی ہندوستان میں انہوں نے دہلی فتح کیا اور مغل شہنشاہ کو اپنا وظیفہ خوار بنا دیا۔ مزید برآں راجپوتوں، اودھ اور بنگال کے حکمرانوں کو بھی ہراساں کر کے ان سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کیا۔ جنوب میں میسور اور حیدرآباد کے حکمرانوں کو بھی انہوں نے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ قریب تھا کہ وہ مغلوں کے وارث بن کر ایک کل ہند سلطنت کی بنیاد ڈالتے کہ 1761 میں افغان حکمران احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں پانی پت کی تیسری جنگ میں ان کی شکست نے ان کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ حالانکہ اس کے بعد یہ پھر اُٹھ کھڑے ہوئے مگر دوسری طرف ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے مستحکم ہونے سے پورے ملک پر ان کی حکومت کا خواب پورا نہیں ہو سکا۔ بہر کیف مراٹھے، انگریزوں کے لیے سب سے طاقتور اور خطرناک دشمن ثابت ہوئے۔ انگریزوں اور مراٹھوں کے درمیان اقتدار کے لیے کئی جنگیں ہوئیں۔ پہلی جنگ میں کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہیں پہنچا جا سکا کیونکہ اس وقت تک مراٹھا سرداروں کا وفاق نانا فڑنویس کی قیادت میں متحد اور طاقتور تھا، البتہ دوسری جنگ کے خاتمے تک مراٹھے اندرونی سازشوں کی وجہ سے کافی کمزور ہو چکے تھے، پھر بھی انگریزوں نے ان سے صلح کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ بسین کے معاہدے سے انگریزوں کو ہندوستانی طاقتوں، مراٹھے، میسور اور نظام کے سیدھے ٹکراؤ سے بچنے میں مدد ملی۔ اس صلح کے بعد کے سالوں میں کمپنی نے 1799 تک اپنی مکمل توجہ میسور کی طاقت توڑنے اور جنوبی ہند میں اپنا تسلط قائم کرنے میں لگائی۔ اس کے بعد انہوں نے پوری طاقت سے مراٹھوں کی رہی سہی طاقت کچلنے اور انہیں امدادی معاہدے کرنے پر مجبور کرنے میں صرف کی۔ 1871 میں پیشوا باجی راؤ دوم جو اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکا اور بغاوت پر آمادہ ہو گیا، اسے شکست دے پیشوا کے عہدے کو ہی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا اور پوری مراٹھا سلطنت، انگریزوں کے قبضے میں آگئی۔ مراٹھوں کے بعد اب کوئی طاقت ہندوستان میں ایسی نہ بچی جو برطانوی اقتدار کو چنوتی دے سکے یا اس کے لیے خطرہ بن سکے۔ نتیجتاً انگریزوں کو جی بھر کر اس ملک کو لوٹنے کا موقع میسر آگیا۔

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- پیشواؤں کے عروج پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- دیگر ہمعصر طاقتوں کے ساتھ مراٹھوں کی جدوجہد کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- مراٹھوں کے ایک عظیم طاقت بننے کی وضاحت کر سکیں گے۔
- پانی پت کی تیسری جنگ میں مراٹھوں کی شکست کے اسباب ونتائج پر تبصرہ کر سکیں گے۔
- انگریز مراٹھا جنگوں کے اسباب ونتائج پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- مراٹھا طاقت کے زوال میں کارفرما عناصر کی نشان دہی کر سکیں گے۔

5.2 شیواجی کے جانشین اوران کے اختلافات

(Successors of Shivaji, and their Internal Conflicts)

شیواجی کی موت کے بعد اس کی بیوی سوئیرا بائی نے راجہ رام کو گدی پر بٹھایا مگر وہ دونوں شمبھاجی کے ہاتھوں قید ہوئے اور تخت شمبھاجی کے حصہ میں آیا۔ وہ ایک تیز مزاج، مغرور اور عیش پسند آدمی تھا۔ اورنگ زیب کا بیٹا اکبر جب بغاوت کر کے جنوبی ہند آیا تو شمبھاجی نے اسے پناہ دی لیکن کوئی مدد نہیں کی۔ اورنگ زیب نے 1686 میں بیجاپور اور 1687 میں گولکنڈہ کی فتح کے بعد شمبھاجی پر دھیان دیا۔ 1688 میں شمبھاجی نے شکست کھائی اور نگ زیب کے سپہ سالار مقرب خاں نے فروری 1688 میں سنگمیشور کے قلعہ سے شمبھاجی کو ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا جنہیں مارچ 1789 میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دکن اورنگ زیب کے زیر نگیں آگیا۔ شمبھاجی کے بعد 19 فروری 1789 کو راجہ رام گدی پر بٹھایا مگر اس نے خود کو شمبھاجی کے بیٹے شاہو کا نمائندہ کہا کیونکہ اس وقت شاہو مغلوں کی قید میں تھا۔ 1700 میں اپنی موت تک راجہ رام کا پورا وقت مراٹھوں کو متحد کرنے اور مغلوں سے جنگ کرنے میں گزرا۔ مراٹھا سردار کبھی کرناٹک میں ہوتے تو کبھی مہاراشٹر اور کبھی مالوہ اور گجرات تک پہنچ جاتے۔ یہ دوران کا مغلوں کے ساتھ گوریلا جنگ کرنے میں گزرا۔ اس دور میں راجہ رام کے گرد بہت سے باصلاحیت مراٹھا سردار اکٹھا ہو گئے تھے جنہوں نے اس جد وجہد کو جاری رکھا۔ بالآخر اس تگ و دو میں 12 مارچ 1700 کو 30 سال کی عمر میں راجہ رام کی موت ہو گئی۔ راجہ رام کی موت کے بعد اس کی بیوی تارابائی نے اپنے 6 سالہ بیٹے کو شیواجی دوم کے نام سے تخت نشین کیا اور مغلوں سے جدوجہد جاری رکھی۔ وہ ایک باصلاحیت عورت تھی اور بخوبی مراٹھا سرداروں کی مدد سے لڑتی رہی۔ 1707 میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب کا انتقال ہو گیا جس کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ اول گدی پانے میں کامیاب ہوا۔ اس نے شمبھا جی کے بیٹے شاہو کو آزاد کر کے مراٹھا واڑ واپس بھیج دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح کچھ لوگ شاہو کے طرف دار ہو جائیں گے اور مراٹھا سرداروں میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ ہوا بھی یہی کئی نامی سردار جن میں بالاجی وشوناتھ جو بعد میں پیشوا بنا اور منہیاجی سندھیا نے شاہو کا ساتھ دیا۔ تارابائی جو اپنے بیٹے شیواجی دوم کی تاجپوشی کرا چکی تھی، اس نے شاہو کو جائز حقدار ماننے سے انکار کر دیا اور ایک فوج اپنے باصلاحیت افسر دھنا

جی جادو کی سرکردگی میں شاہو کو مہاراشٹر سے ہٹانے کے لیے بھیج دی۔ مگر شاہو نے دھناجی کو اپنی طرف ملالیا اور کھید کے مقام پر تارا بائی کو شکست دی۔اس طرح 22 جنوری 1708 میں ستارہ میں شاہو کا جشن تاج پوشی ہوا۔ دوسری طرف راجہ رام کی دوسری بیوی یشو بائی نے سازش کر کے تارابائی اور شیواجی دوم کو قید کرادیا اور اپنے بیٹے شمبھاجی دوم کے ساتھ کولہاپور میں مراٹھا سیاست کا دوسرا مرکز بنادیا۔ لیکن 1731 میں واریا کے مقام پر شاہو نے شمبھاجی دوم کو بھی شکست دی اور کل مراٹھا طاقت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ 1749 میں شاہو کی موت واقع ہوئی۔

5.3 پیشواؤں کا عروج (Rise of the Peshwas)

5.3.1 پیشواؤں کے عروج کے اسباب (Causes for the Rise of Peshwas)

جب شاہو نے اقتدار سنبھالا تو مراٹھا سیاست پیچیدہ صورتحال سے دوچار تھی۔ خانہ جنگی کو ختم کرنا، نظم ونسق قائم کرنا، ریاست میں امن بحال کرنا اور علاقے میں سیاسی بالادستی کے لیے مختلف طاقتوں میں ہونے والی جدوجہد میں اپنی جگہ مضبوط کرنا وغیرہ ایسے چیلنج تھے جن سے نبرد آزما ہونا نہ تو امن پسند شاہو کے بس کی بات تھی اور نہ ہی سخت مزاج و کمزور قوت ارادی والی تارا بائی یہ کام انجام دے سکتی تھی۔ شیواجی نے انتظام وانصرام کے نقطہ نظر سے جو وزیروں کی کونسل اشٹ پردھان قایم کی تھی وہ کمزور ساخت پر مبنی تھی اور اورنگزیب کے حملوں کے دوران اس کا وجود تقریباً مٹ چکا تھا۔اب صورتحال یہ تھی کہ مراٹھا سردار آپس میں متصادم تھے، حکمراں کمزور اور انتظامی صلاحیتوں سے عاری تھا، سیاسی اور فوجی دونوں اعتبار سے انتشار کی سی کیفیت تھی ایسے میں برہمن خاندان کا باصلاحیت، حوصلہ مند اور دوراندیش فرد بالاجی وشوناتھ، شاہو کا وزیراعظم یعنی پیشوا بنا۔اس میں وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جن کی مراٹھا ریاست کو سخت ضرورت تھی۔ شاہو کے دیگر تمام سرداروں کے مقابلے میں اولین تینوں پیشوا ہر اعتبار سے زیادہ لائق اور باصلاحیت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مکمل اقتدار اپنے ہاتھوں میں مرکوز کرنے میں انہیں کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ ایسے وقت میں جب مراٹھا علاقوں میں لالچ، مفادپرستی، خودغرضی اور دھوکا دہی عام بات بن گئی تھی، انہوں نے عوام کے سامنے سوراجیہ کی شکل میں اعلی مقصد کا حصول رکھا جس کے ذریعے امن وامان اور نظم و نسق قائم کیا جاسکتا تھا۔ جب حکمران اور اس کے وزرا کی کونسل، مسائل حل نہیں کر سکی تو پیشوا کی شکل میں وہ قیادت ابھری جس کے پاس ان تمام پریشانیوں کا حل تھا اور جن کے ہاتھوں مراٹھا طاقت کو عروج حاصل ہونا تھا۔

5.3.2 بالاجی وشوناتھ (Balaji Vishwanath)

1707 میں اورنگ زیب کی موت کے بعد پیدا ہوئی سیاسی صورتحال نے مراٹھوں میں نئی جان ڈال دی۔ اٹھارویں صدی میں شمال وجنوب دونوں سمتوں میں مراٹھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور وسیع ہوتی ہوئی ریاست کو تسلیم کیا گیا۔ مراٹھوں کو ایک عظیم سیاسی قوت بنانے کا سہرا ان پیشواؤں کو جاتا تھا جو عہدے کے اعتبار سے وزیراعظم تھے لیکن بہت جلد کل اختیارات کے مالک بن گئے۔ پیشوا کے عہدہ کو سب سے پہلے جس نے مضبوط اور بااختیار بنانے میں کامیابی حاصل کی وہ بالاجی وشوناتھ تھا۔

بالا جی وشوناتھ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ وہ کونکن کے ایک برہمن خاندان سے تھا جو اپنی دیانت اور صلاحیتوں کے لیے معروف تھا۔ ان کے اجداد جنجیرا میں لگان وصول کرنے کے پشتینی عہدہ سے متعلق تھے۔ لیکن جنجیرا کے سدِیوں کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے بالا جی وشوناتھ اپنا علاقہ چھوڑ کر سارواڑ میں بس گیا۔ مراٹھوں کے زیر انتظام اس نے ٹیکس وصول کرنے کا کام کیا۔ 1699 سے 1703 تک وہ پونا کا صوبیدار اور پھر 1704 سے 1707 تک دولت آباد کا سرصوبیدار رہا۔ اورنگ زیب 1699 سے 1704 تک پونا میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ اس وقت بالا جی وشوناتھ نے اورنگ زیب کے لیے رسد مہیا کرنے کا کام کیا جس کی وجہ سے اورنگ زیب نے اسے کچھ نہیں کہا۔ اورنگ زیب جب تک دکن میں رہا، شاہو اس کی قید میں رہا۔ شاید اسی زمانہ میں بالا جی وشوناتھ اور شاہو کے درمیان کسی قسم کا رابطہ قائم ہوا۔ 1705 میں وشوناتھ نے شاہو کو آزاد کرانے کی کوشش بھی کی۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ شاہو اور تارا بائی کے اختلاف میں بالا جی نے شاہو کا ساتھ دیا تھا اور یہ ساتھ ہر حال میں برقرار رہا۔ یہاں تک کہ جب شاہو کے کئی بڑے افسر اور سپہ سالار تارا بائی سے مل گئے تھے، یہ بالا جی ہی تھا جس نے نہ صرف شاہو کا ساتھ دیا بلکہ اپنی حکمت عملی اور ذہانت سے اس کی حیثیت کو بھی مضبوط بھی کیا۔ شاہو نے 27 نومبر 1713 کو بالا جی وشوناتھ کو پیشوا کا عہدہ دیا۔ اس نے مختلف مراٹھا سرداروں کو شاہو کے زیر نگیں لانے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر بالا جی کی اصل کامیابی وہ سمجھوتہ ہے جو 1719 میں مغلوں اور مراٹھوں کے درمیان ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب عظیم الشان مغلیہ سلطنت بہت تیزی سے روبہ زوال تھی۔ حکمرانوں کی نااہلی اور امرا کی مفاد پرستی نے عجب صورتحال پیدا کر دی۔ ہر طرف سازشوں کے جال بنے جا رہے تھے۔ شہنشاہ بے دست و پا تھے اور امرا کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن گئے تھے۔ اس وقت مغل سلطنت کی باگ ڈور فرخ سیر کے ہاتھوں میں تھی، جب کہ حقیقی اقتدار، تاریخ میں بادشاہ گر کے خطاب سے مشہور، دو سید بھائیوں حسین اور عبداللہ کے ہاتھوں میں تھا۔ فرخ سیر نے جب سید برادران سے چھٹکارا پانے کی کوشش شروع کی، اس وقت حسین علی جنوب میں تھا۔ اس کے بھائی عبداللہ نے اس کو فوراً دلی بلایا۔ اس وقت حسین علی نے بھی اپنی طاقت مضبوط کرنے کے لیے مراٹھوں سے مدد مانگی اور ان سے ایک سمجھوتہ کیا جسے دونوں بھائیوں کی کامیابی کے بعد مغل بادشاہ نے منظوری عطا کر دی۔ اس کے تحت مندرجہ ذیل اہم نکات طے پائے گئے۔

1. مغل بادشاہ شاہو کو وہ سبھی قلعے اور علاقے دے دے گا جو کبھی شیواجی کے سوراجیہ میں ہوا کرتے تھے۔
2. شاہو کو خاندیش برار، گونڈوانہ، حیدرآباد اور کرناٹک کے وہ علاقے بھی ملیں گے جو اس نے ماضی قریب میں جیتے تھے۔
3. شاہو کو جنوب کے کچھ صوبوں سے سردیش مکھی اور چوتھ وصول کرنے کا حق بھی ملے گا۔
4. جنوبی ہند کے مذکورہ صوبوں میں امن قائم کرنے کی ذمہ داری بھی شاہو پر ہو گی۔
5. شاہو، کولہاپور میں شمبھاجی دوم کو پریشان نہیں کرے گا۔
6. شاہو مغل بادشاہ کو 10 لاکھ روپیہ سالانہ ٹیکس دے گا
7. بادشاہ شاہو کے خاندان اور متعلقہ لوگوں کو جو ابھی تک مغل قید میں تھے، آزاد کر دے گا۔

8. ضرورت پڑنے پر شاہو مغلوں کو 15000 گھوڑ سوار فوج مہیا کرائے گا۔

اس عہد نامہ نے شاہو اور مراٹھوں کی قوت اور اقتدار میں زبردست اضافہ کیا۔ اور پہلی بار 15000 مراٹھا فوج، بالا جی اور کھانڈے راؤ کی قیادت میں دہلی گئی جس کی مدد سے سید برادران نے فرخ سیر کو تخت سے ہٹانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح بالا جی وشوناتھ نے شاہو کی طاقت میں اضافہ کیا۔ مراٹھا اقتدار کو وسعت دی اور ساتھ ہی پیشوا کی حیثیت سے اپنے عہدے کو اتنا بااختیار بنا دیا کہ بالآخر مراٹھا حکمراں بھی اس کے زیر دست ہونے لگے۔

بالاجی وشوناتھ کی شخصیت: بالاجی نے اپنی شخصیت کی تعمیر خود کی تھی۔ کامیابی کی پہلی سیڑھی سے لے کر پیشوا بننے اور مراٹھا اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینے تک کے سارے مراحل اس نے خود ہی طے کیے تھے۔ بہادری کے ساتھ ساتھ سیاسی دور اندیشی بھی اس میں بہ درجہ اتم موجود تھی۔ وہ مراٹھوں کے حالات سے بخوبی واقف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے تارا بائی یا یشو بائی کو چھوڑ کر شاہو کے ساتھ کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہ اسی کی سیاسی سوجھ بوجھ اور مدبرانہ صلاحیتیں تھیں جس کے سبب دھناجی جادو، کھانڈے راؤ دبھاڑے، پرشوجی اور کانہوجی آنگڑے جیسے سرکردہ مراٹھا سردار شاہو کی حمایت میں کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے مراٹھا ریاست کو خانہ جنگی سے بچایا اور مادھاجی کرشن جوشی جیسے ساہوکاروں کی مدد سے ریاست کے مالی مسائل حل کیے۔ یہ بالاجی وشوناتھ ہی تھا جس کے سبب سید برادران سے سمجھوتہ ہوا اور ریاست کو 30 لاکھ روپیہ ملا اور باقاعدگی سے چوتھ اور سردیش مکھی کی شکل میں 35 فیصد سالانہ ٹیکس ملنے لگا۔

5.3.3 باجی راؤ اول (Baji Rao–I)

1720 میں اپنے باپ کی موت کے بعد باجی راؤ اول (1720 تا 1740) پیشوا بنا۔ کئی تجربہ کار سرداروں کی موجودگی میں 20 سال سے بھی کم عمر کے اس نوجوان کو شاہو نے فوقیت دی اور اس کا انتخاب وقت نے صحیح ثابت کیا۔ وہ ایک باہمت فوجی باصلاحیت سپہ سالار اور دور اندیش سیاست داں تھا۔ باجی راؤ نے مراٹھا اقتدار کو داخلی طور پر مضبوط بنانے کے لیے جاگیروں کو سرداروں میں اس طرح تقسیم کیا کہ کوئی بھی سردار کسی جاگیر پر خود مختار نہ ہو سکے۔ اور وہ ایک دوسرے پر منحصر رہیں۔ خارجی طور پر اس نے مغلیہ سلطنت کے کھوکھلے ہوتے ہوئے درخت پر دار کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑا۔ اس کے دورِ اقتدار کے مختلف پہلوؤں کو ہم اس طرح سمجھ سکتے ہیں۔

نظام سے تعلقات: نظام الملک آصف جاہ دکن کا وائسرائے رہ چکا تھا، وہ پھر واپس آیا۔ اس کا ارادہ اپنے لیے ایک آزاد خود مختار ریاست قائم کرنے کا تھا، اس لیے مراٹھوں سے ٹکراؤ لازمی تھا۔ 1726 میں اس نے کولہاپور میں سمبھاجی دوم کی مدد کی اور شاہو کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ باجی راؤ اول کی غیر موجودگی میں شاہو کی حیثیت خراب ہو گئی لیکن باجی راؤ اول نے کرناٹک سے واپس لوٹ کر فروری 1728 میں پالکھیڑ کے مقام پر نظام کو اس طرح گھیر لیا کہ اسے مجبوراً 16 مارچ 1728 کو منگی شوگاؤں کا معاہدہ کرنا پڑا۔ اس سمجھوتے کی شرائط مندرجہ ذیل تھیں۔

1. نظام نے شاہو کو مہاراشٹر کا بلا شرکت غیرے حکمراں تسلیم کر لیا۔
2. اسے باقی رہ گئی چوتھ اور سردیس مکھی کی رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

3. اس نے منکی شوگاواں کے مراٹھا سرداروں کو اپنی حدود میں رہنے دینا قبول کر لیا۔

نظام اور مراٹھوں کا یہ ٹکراؤ یہیں ختم نہیں ہوا۔ 1737 میں دلی کی ہدایت پر نظام نے ایک بڑی فوج بھوپال کے قریب جمع کر لی۔ مگر اس کی ذرا سی غلطی کے سبب اس کی فوج میں رسد کی کمی اور بھگدڑ پھیل گئی، جس کی وجہ سے بنا جنگ کیے ہی جنوری 1738 میں دُرائی سرائے کا معاہدہ قبول پڑا۔ معاہدہ کے مطابق مالوہ اور نرمدا اور چنبل ندیوں کے درمیان کا پورا علاقہ باجی راؤ اول کو حاصل ہو گیا۔ علاوہ ازیں 50 لاکھ روپیہ کا تاوان جنگ بھی نظام نے دینا قبول کر لیا۔

دلی پر حملہ: مراٹھوں کے دوآب، راجستھان اور دہلی کے آس پاس کے مغل علاقوں پر لگاتار حملے اور لوٹ مار جاری تھی جس کے سبب مغل بادشاہ نے مراٹھوں کو چمبل ندی کے جنوبی علاقے کے لیے 13 لاکھ روپیہ، راجستھان کے لیے 13 لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ اور جنوبی ہندوستان کی آمدنی کا 5 فیصد حصہ سردیش مکھی کی شکل میں دینا قبول کر لیا۔ اس سے حوصلہ پا کر باجی راؤ نے اودھ اور بنگال جیسے صوبوں اور الہ آباد، گیا، بنارس جیسے شہروں کی مانگ کی جسے قبول کرنے سے مغل بادشاہ نے انکار کر دیا۔ اس بات پر ناراض ہو کر باجی راؤ نے اپنے ایک سپہ سالار ملہار راؤ ہولکر کے ذریعے اودھ پر حملہ کر دیا لیکن اودھ کے صوبے دار سعادت علی خان کی گھڑ سوار فوج نے مراٹھوں کو مار بھگایا۔ سعادت علی خان نے اپنی اس فتح کے بعد مغل بادشاہ کو لکھ بھیجا کہ اس نے باجی راؤ کو چنبل ندی کے جنوب میں بھگا دیا ہے۔ اس خط کی خبر پا کر باجی راؤ نے دہلی کا رخ کیا۔ وہ بہت تیزی سے سفر کرتا رہا اور 29 مارچ 1737ء کو دہلی پہنچ گیا۔ اس کے پہنچنے کی خبر سن کر مغل بادشاہ نے دہلی چھوڑنے کی تیاری کر دی۔ مگر باجی راؤ کا مقصد دہلی پر حملہ اور لوٹ مار نہیں تھا، وہ تو صرف سعادت خان کو جھوٹا ثابت کرنا اور مغل بادشاہ کو دہشت زدہ کرنا کرنا چاہتا تھا۔ تین دن دہلی رکنے کے بعد جس تیزی سے وہ آیا تھا اسی تیزی سے واپس لوٹ گیا، کیونکہ سعادت خان، وزیر فخر الدین اور شمس الدولہ کی افواج دلی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ان سے بچنا اس کے لیے ضروری تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے راجستھان کا راستہ اپنایا اور تھار کے ریگستان میں داخل ہو گیا جہاں اس کا تعاقب آسان نہیں تھا۔ اس طرح باجی راؤ دو بڑی مغل افواج سے بنا تصادم کے بچ کر نکل گیا۔

کونکن کی فتح: کونکن میں سدّیوں کو طاقت حاصل تھی اور وہ مراٹھوں کے قابو میں نہیں آتے تھے۔ 1733 تک ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا رہا۔ 1733 میں باجی راؤ خود وہاں گیا اور ایک سال تک وہیں رکا رہا۔ آخر میں ایک سمجھوتہ کر کے واپس ہوا۔ اس سمجھوتے سے مراٹھوں کو کچھ علاقہ تو مل گیا مگر سدیوں کی طاقت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ چنانچہ جنگ دوبارہ چھڑ گئی۔ بالآخر 1736 میں باجی راؤ کے بھائی چیما جی اپا نے سدی سردار کو ایک جنگ میں مار دیا جس کے نتیجے میں ان کی کمر ٹوٹ گئی اور انہوں نے معاہدہ کر کے کونکن پر پیشوا کی برتری قبول کر لی۔

پرتگالیوں سے تصادم: پرتگالیوں سے مراٹھوں کے ٹکراؤ کی شروعات 1731ء سے ہوئی۔ انہوں نے سدیوں کی مدد کی تھی۔ 1732ء میں انہوں نے مراٹھوں سے سمجھوتہ کر لیا لیکن 1737ء میں انہوں نے پھر جنگ چھیڑ دی جس کا اختتام 1739ء میں بسین (Bassein) پر مراٹھوں کے قبضے کے ساتھ ہوا۔ اس کے بعد پرتگالیوں سے مراٹھوں کا سمجھوتہ ہو گیا اور انہوں نے کونکن علاقے میں مراٹھوں کی بالادستی کو تسلیم کر لیا۔ 28 اپریل 1741ء کو اپنی مرنے سے پہلے باجی راؤ اول نے مراٹھا ریاست کی شکل و صورت ہی بدل دی۔ مغربی ساحل کی ایک

چھوٹی سی ریاست سے اسے شمال تک پھیلی ہوئی وسیع سلطنت بنادیا۔ لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ نئے علاقے جیتے گئے مگران کے انتظام و انصرام پر کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔

باجی راؤاول کی شخصیت: باجی راؤ کو پیشواؤں میں بلند مقام حاصل ہے۔اسے عظیم پیشواؤں میں گنا جاتا ہے۔ یہ باجی راؤ ہی تھا جس نے مراٹھوں کو ہندوستان کی اہم ترین طاقت بنادیا۔ مورخین کے مطابق اس نے مراٹھوں میں ایک نئی امید جگادی۔اس کی فوجی لیاقت اور قیادت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نظام جو ایک باصلاحیت سپہ سالار تھا اور جس نے سو سے زیادہ جنگوں میں حصہ لیا تھا، وہ باجی راؤ کے سامنے دوبار آیا اور دونوں ہی بار بنا جنگ کیے اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔سیاسی تدبر میں بھی نظام جیسے زیرک حکمراں کی اس کے سامنے کچھ نہیں چلی۔ مغلوں کے زوال سے ہندوستان میں جو سیاسی خلا پیدا ہورہا تھا، باجی راؤ نے اسے مراٹھا طاقت سے پُر کرنے کی کوشش کی۔اس کے زیر قیادت مراٹھا شہ سواروں کے گھوڑوں کی ٹاپیں پورے ہندوستان میں گونج رہی تھیں۔

5.3.4 بالاجی باجی راؤ (Balaji Baji Rao)

باجی راؤ کی موت کے بعد شاہو نے اس کے 19 سالہ بیٹے بالاجی باجی راؤ(1740تا1761ء) کو پیشوا بنادیا۔ یہاں تک آتے آتے پیشوا کا عہدہ نہ صرف موروثی بن گیا تھا بلکہ اصل طاقت واختیار کا مرکز بھی وہی تھا۔ بالاجی باجی راؤ اپنے باپ کی طرح عظیم سپہ سالار تو نہیں تھا لیکن وہ میدان عمل کا آدمی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ باجی راؤاول نے دشمن زیادہ بنائے، دوست کم اور بالاجی باجی راؤ نے دوست زیادہ بنائے، دشمن کم۔ بالاجی نے بھی آغاز سے ہی مراٹھا ریاست کی توسیع کی پالیسی کو جاری رکھا۔ بالاجی کے عہد میں 1749 میں چھترپتی شاہو کی موت واقع ہوئی۔اس کے آخری دن پریشانی اور مشکل میں گزرے۔تارابائی حکومت حاصل کرنے کے لیے ایک بار پھر سرگرم عمل ہوگئی۔ مختلف مراٹھا سردار ایک دوسرے کی مخالفت کرنے لگے۔ حالات اتنے خراب ہوئے کہ کچھ وقت کو پیشوا نے بھی اپنا عہدہ چھوڑ دیا۔ شاہو کی صحت دن بہ دن گرتی جارہی تھی اس کا کوئی وارث نہیں تھا۔ جیل میں بند تارابائی نے ایک لڑکے کے بارے اعلان کیا کہ یہ اس کے بیٹے شیواجی دوم کا بیٹا ہے۔اس نے شاہو سے درخواست کی کہ وہ اس لڑکے کو گود لے لے۔دوسری طرف کولہاپور کا شمبھاجی دوم بھی شاہو کا جانشین بننے کے لیے بے چین تھا۔ان حالات میں 25 دسمبر 1749 کو اپنی موت سے قبل شاہو نے تارابائی کے پیش کردہ لڑکے راجہ رام دوم کو اپنا وارث بنانے کا اعلان کیا۔ جنوری 1750 میں راجہ رام دوم چھترپتی بنا۔تارابائی اس کو پوری طرح اپنے قابو میں رکھتی۔جب اس نے تارابائی کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی تو تارابائی نے یہ راز کھولا کہ راجہ رام دوم، شیواجی کے نسب سے نہیں ہے۔ یہ صورتحال جان کر پیشوا بالاجی باجی راؤ نے راجہ رام دوم کو پونا بلایا جسے وہ اپنی راجدھانی بنا چکا تھا۔ یہاں اس نے راجہ رام دوم سے سنگھ میلا کا سمجھوتہ کیا جس کے مطابق چھترپتی نے اپنے سبھی اختیار پیشوا کو سونپ دیے جس کے بعد پیشوا اصل حکمراں بن گیا اور مراٹھا چھترپتی ستارا میں نام کا حکمراں اور حقیقت میں ایک قیدی بن گیا۔اس سمجھوتے کے بعد بھی تارابائی نے اقتدار حاصل کرنے کی اپنی کوشش جاری رکھی۔ جب پیشوا، نظام پر حملے کی غرض سے ریاست سے باہر تھا تو اس نے دماجی گائکواڑ اور کچھ دوسرے سرداروں کی مدد سے پونا پر حملہ کردیا۔ لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ راجہ رام قید میں ڈال دیا گیا اور پیشوا کی طاقت کو للکارنے کرنے والے سبھی شکست کھا گئے۔

بالاجی باجی راؤ کی فتوحات: سب سے پہلے بالاجی نے 1740ء میں مالوہ پر حملہ کی تیاری کی لیکن درمیان میں جے پور کے حکمراں راجہ جے سنگھ نے مغل بادشاہ اور پیشوا کے درمیان صلح و معاہدہ کرادیا۔ جس کی رو سے مالوہ، پیشوا کو مل گیا۔ اس کے بدلے پیشوا نے 500 مستقل فوجی اور ضرورت پڑنے پر 400 فوجی مہیا کرانے کا وعدہ کیا۔ معاہدہ کے مطابق شہزادا احمد مالوہ کا صوبیدار اور پیشوا نائب صوبیدار مقرر ہوئے اور مالوہ پر پیشوا کو قانونی حق حاصل ہوگیا۔ کرناٹک پر پہلا حملہ 1739ء میں راگھوجی بھونسلے نے کیا تھا 1741ء میں وہاں کے نواب دوست علی کو قتل کردیا اور اس کے داماد چندا صاحب کو قید کرلیا لیکن 1743ء میں نظام نے کرناٹک پر قبضہ کرلیا۔ چنانچہ 1745ء میں بابوجی کرناٹک کو بھیج کر پیشوا نے کرناٹک کو مکمل طور سے اپنے قبضے میں لے لیا۔ پیشوا کی طرف سے رگھوجی بھونسلے نے اڑیسہ پر حملہ کردیا اور بنگال کے نواب علی وردی خاں کو 1751ء میں 12 لاکھ روپیہ سالانہ چوتھ کی شکل میں دینے پر مجبور کردیا۔ نظام حیدرآباد اور پیشوا بالاجی میں دوستی دشمنی کے مختلف موڑ آتے جاتے رہے۔ نظام نے اپنے باغی بیٹے ناصر جنگ کے خلاف مراٹھوں کی مدد کے بدلے انہیں 15 لاکھ روپیہ دیا۔ 1743 میں نظام نے کرناٹک جیت لیا لیکن 1757 کی سندکھڑ جنگ میں شکست کھا کر 25 لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی والے علاقے پیشوا کو دینے پڑے۔ 1760 میں ادے گیر کی جنگ میں پیشوا نے پھر نظام کو شکست دی اور بدلہ میں ایک بڑا علاقہ حاصل کیا۔ پیشوا نے راجپوتوں اور جاٹوں سے بھی اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔

5.3.5 پانی پت کی تیسری جنگ (The Third Battle of Panipat)

اسباب: مغل اور بالاجی راؤ مغل بادشاہ کے نواب وزیر صفدر جنگ سے 1752 میں ہوئے معاہدے کے مطابق انہوں نے پورے ہندوستان سے چھوتھ وصول کرنے کا اختیار حاصل کرلیا تھا اور اس کے بدلے ضرورت پڑنے پر مغل بادشاہ کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس معاہدہ نے مراٹھوں کو شمالی ہندوستان کی سیاست میں ملوث کردیا۔ دراصل مراٹھوں نے 1752 میں عمادالدولہ کو وزیر بننے میں مدد کی جس کے بدلے وہ ان کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن گیا۔ اس سے شمالی ہند میں ان کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ دلی کے بعد پنجاب میں بھی مراٹھوں نے احمد شاہ ابدالی کے نمائندے کو نکال کر اپنا قبضہ کرلیا۔ شمالی ہند میں قبضہ واقتدار کی اس کشمکش نے صورتحال میں بڑی تبدیلیاں کیں۔ مغل بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ امراء کی خودغرضی اور مفادپرستی نے انہیں دو حصّوں میں منقسم کردیا تھا۔ ایک ہندوستانی مسلمانوں کا گروپ اور دوسرا باہر سے آئے مسلمانوں کا گروپ۔ باہر سے آئے مسلمانوں کا گروہ مراٹھوں کے خلاف کسی قسم کی روک تھام نہ ہونے اور مغل بادشاہ کے ان کے ماتحت چلے جانے سے ناراض ہوگیا۔ انہوں نے ملک سے باہر سے مدد کی کوشش شروع کردی۔ سلطنت کا مضبوط ستون کہے جانے والے اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور روہیل کھنڈ کے نجیب الدولہ نے افغانستان کے حکمران احمد شاہ ابدالی کو مراٹھوں کی لوٹ مار سے بچانے کے لیے بلایا۔ چنانچہ افغان حکمراں احمد شاہ ابدالی اپنی فوج لے کر ہندوستان کی طرف چل پڑا اور اسے پانی پت کے میدان میں مراٹھوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مراٹھوں نے بھی مقابلے کی تیاریاں شروع کردیں مگر مراٹھوں کو ان کی پچھلی کارگزاریوں، بےجا مداخلت اور ظلم و بربریت کے سبب کوئی ساتھی نہیں ملا۔ یہاں تک کے غیر مسلم راجپوتوں، سکھوں اور جاٹوں کو بھی ان پر بھروسہ نہیں تھا۔

جنگ: چنانچہ 16 جون 1761 کو پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کی فوجوں اور مراٹھوں کے درمیان جو خونریز جنگ ہوئی اس میں

مراٹھوں کو شکستِ فاش ہوئی۔ بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ کوئی مراٹھا گھر ایسا نہیں تھا جہاں سوگ نہ منایا گیا ہو۔اس جنگ نے مراٹھا قوت کو ختم تو نہیں کیا مگر مغلوں کی جگہ لینے کا خواب ہمیشہ کے لیے چور چور کر دیا۔

مراٹھوں کی شکست کے اسباب: ابدالی کے ہاتھوں مراٹھوں کی اس شکست فاش کے کچھ بنیادی اسباب تھے۔

- مراٹھوں میں جاگیر دارانہ نظام قائم ہو چکا تھا۔جو ایک قیادت،ایک عمومی تربیت اور ایک جنگی پالیسی کے خلاف تھا۔
- مراٹھوں کی لوٹ مار کی سرشت نے ہندوراجاؤں کو بھی ان کے مخالف بنادیا تھا۔جس کے نتیجہ میں راجستھان میں بھی انہیں کوئی مدد نہیں ملی۔سورج مل جاٹ نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔
- وقت کے ساتھ مراٹھوں میں سادگی،جفاکشی اور ڈسپلن کم ہوتا جارہا تھا۔
- فوج کے ساتھ عورتیں بھی چلنے لگی تھیں۔ان کی بڑھتی ہوئی تعداد نے فوج پر منفی اثرات مرتب کیے۔اس جنگ میں عورتوں اور نوکروں کی کثیر تعداد نے پریشانیاں پیدا کر دیں۔
- پیشواؤں کے عروج نے دیگر سرداروں میں حسد ور قابت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور ان میں آپسی اختلاف بڑھ گئے تھے۔
- شکست کا ایک فوری سبب بھی تھا اور وہ تھا ابدالی کے مقابلہ میں سداشوراؤ بھاؤ کی کمزور قیادت۔مراٹھا سپہ سالار تدبر اور جنگ دونوں میں اپنے حریف سے کمزور پڑا۔بھاؤ نے گوریلا جنگ کا طریقہ استعمال نہیں کیا۔توپ خانے پر بھروسہ کر کے مدافعانہ جنگ لڑی،جو غلط فیصلہ ثابت ہوی۔اس کے علاوہ ابدالی کے پاس آتشی اسلحہ بھی زیادہ تھا۔اس کی گھڑ سوار اور شتر سوار فوج بھی مراٹھوں سے بہتر تھی۔

جنگ کے نتائج: اس جنگ کے نتائج کے موضوع پر مورخین میں بہت اختلاف ہے۔کچھ کی رائے میں اس جنگ نے مراٹھوں کو جانی ومالی نقصان تو بہت پہنچایا لیکن اس شکست سے نہ توان کی طاقت ختم ہوئی اور نہ ہی ان کے مقاصد تبدیل ہوئے۔وہیں کچھ دوسرے مورخین کے مطابق یہ جنگ مراٹھوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ان کے بڑے بڑے لائق و باصلاحیت سرداروں کے مارے جانے سے کمزور اور سازشی سرداروں کو آگے آنے کا موقع ملا۔مراٹھا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔شمالی ہند میں ان کی پیش رفت تھم گئی۔انگریزوں اور فرانسیسیوں کو قدم جمانے کا موقع مل گیا۔بلاشبہ اس جنگ نے مراٹھا قوت واقتدار اور ان کے وقار کو زبردست نقصان پہنچایا۔مراٹھا فوج کی ناقابل شکست حیثیت ختم ہو گئی اور انہیں دوبارہ اپنی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں وسائل اور قوت خرچ کرنی پڑی۔لیکن پھر بھی اس مقام تک نہیں پہنچ سکے کہ انگریزوں کو شکست دے سکیں۔

بالاجی باجی راؤ کی شخصیت: پیشوا بالاجی باجی راؤ،وجیہ اور خوش گفتار تھا۔اپنے پیش روؤں کے برعکس وہ فنون کا رسیا اور سست و کاہل مزاج تھا لیکن ساتھ ہی ایک لائق فوجی اور قابل منتظم بھی تھا۔اس کے عہد میں مراٹھا سلطنت وسیع ہوئی۔اس کے دور حکومت میں مراٹھا گھوڑوں نے کنیا کماری سے لے کر ہمالیہ کی جھرنوں تک اپنی پیاس بجھائی۔مختلف صلاحیتوں کا حامل ہوتے ہوئے بھی بالاجی باجی راؤ میں کچھ کمیاں تھیں ۔عصری تقاضوں کے مطابق نہ تو اس میں فوجی قیادت کی اہلیت تھی،نہ ہی وہ اعلیٰ درجہ کا منتظم تھا۔بحیثیت مدبر بھی وہ وقت اور حالات کی کسوٹی

پر کھرا نہیں اترا۔ مراٹھا سرداروں کے آپسی اختلافات اور مخالفین کی سرگرمیوں پر بھی وہ کوئی قدغن نہیں لگا سکا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک طرف تو اس کا دور حکومت کامیابیوں کی کہانیاں سناتا ہے تو دوسری طرف ناکامی اور زوال کا راستہ بھی وہیں سے شروع ہوتا ہے۔

5.3.6 مادھوراؤ اول (Madhavrao I)

پانی پت کی تیسری جنگ میں مراٹھوں کی شکست کے بعد 23 جون 1761 کو بالاجی باجی راؤ کا انتقال ہوا۔ اس کا بیٹا مادھوراؤ اول صرف 17 سال کی عمر میں پیشوا بنا۔ مادھوراؤ پانی پت کی جنگ سے ہونے والے نقصان پر قابو پانے کے بعد مراٹھا سلطنت کا اثر دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ نومبر 1772 میں تپ دق کی وجہ سے ان کی موت ہوگئی۔

5.4 اینگلو مراٹھا جنگیں (Anglo-Maratha Wars)

5.4.1 مراٹھا وفاق (Maratha Confederacy)

پیشوا مادھوراؤ اول کی موت کے بعد اس کا بھائی نارائن راؤ پیشوا بنا لیکن ایک سال بعد ہی اس کے چچا رگھوناتھ راؤ نے اسے قتل کروادیا اور خود پیشوا کا عہدہ حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس اندرونی اختلاف اور پیشوا کے عہدے کے حصول کی جدوجہد نے انگریزوں کو مداخلت کا موقع فراہم کیا۔ رگھوناتھ راؤ (رگھوبا)، پیشوا کا عہدہ حاصل کرنے میں ناکام رہا کیونکہ بڑے مراٹھا سردار، اس کے خلاف قتل کے الزام کی وجہ سے اس سے ناراض تھے۔ اسی دوران نارائن راؤ کی بیوہ گنگا بائی نے 18 اپریل 1774 کو ایک بیٹے کو پیدا کیا۔ مراٹھا سرداروں کی کونسل نے 28 مئی 1774 کو گنگا بائی کے بیٹے کو سوائی مادھوراؤ نارائن راؤ دوم کے نام سے پیشوا کے طور پر قبول کیا۔ مختصر مدت کے بعد پیشوا مادھو نارائن راؤ دوم کی مدد کے لیے مراٹھا سرداروں کی ایک 12 رکنی کونسل تشکیل دی گئی، جسے 'بار بھائی پریشد' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کونسل میں سکھارام باپو، مہادجی سندھیا اور نانا فڑنویس جیسے ممتاز مراٹھا سردار شامل تھے، وہیں دوسری طرف مراٹھا سرداروں کی کونسل نے رگھوناتھ راؤ کے قتل کی تحقیقات کی سفارش بھی کی۔ اپنی جان کو خطرہ میں دیکھ کر رگھوناتھ راؤ نے انگریزوں کی پناہ لی اور ان سے اسے پیشوا بنانے کی اپیل کی۔ اس طرح پیشوا کے عہدہ کو لے کر مراٹھوں میں جاری اندرونی کشمکش کھل کر سامنے آگئی ہے۔

5.4.2 معاہدہ سورت (Treaty of Surat)

6 مارچ 1775 کو رگھوناتھ راؤ عرف راگھوبا اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے بمبئی پریزیڈنسی کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ جو معاہدہ سورت کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدے کی بنیادی شرائط کے مطابق:

- ایسٹ انڈیا کمپنی، رگھوناتھ راؤ کو پیشوا کا عہدہ حاصل کرنے میں مدد فراہم کرے گی۔
- رگھوناتھ راؤ، باسین (Bassein)، سالسیٹ (Salsette) اور گجرات میں جمبوسر (Jambusar) کے علاقے کمپنی کی بمبئی پریزیڈنسی کو دے گا اور سورت اور بھڑوچ کی مالگزاری بھی انگریزوں کو ادا کرے گا۔
- بدلے میں رگھوناتھ کی مدد کے لیے 2500 برطانوی فوجی پونا (Pune) میں رکھے جائیں گے، جس کے اخراجات کے طور پر رگھوناتھ

کمپنی کو سالانہ 1.25 لاکھ روپے ادا کرے گا۔

- رگھوناتھ راؤ انگریزوں کو شامل کیے بغیر کوئی معاہدہ نہیں کرے گا۔

قابل ذکر حقیقت یہ ہے کہ 1773 میں برطانوی پارلیمنٹ میں ریگولیٹنگ ایکٹ پاس کیا گیا تھا، جس کے ذریعے بمبئی اور مدراس پریزیڈنسیوں پر بنگال کے گورنر جنرل اور ان کی کونسل کا کنٹرول قائم کیا گیا تھا، جب کہ بمبئی پریزیڈنسی نے بغیر اجازت کے معاہدہ سورت کیا تھا اور صرف ایک خط لکھ کر اس کے بارے میں معلومات گورنر جنرل کو بھیج دی تھیں۔اس کے بعد بمبئی سرکار نے فوجی مداخلت کا فیصلہ کر لیا۔ کرنل کیٹنگ (Col. Keating) کی سربراہی میں برطانوی فوجیں 15 مارچ 1775 کو سورت سے پونے کے لیے روانہ ہوئیں۔ لیکن گجرات میں اڈاس (Adas) کے مقام پر ہری پنت پھڑکے نے ان کی پیش قدمی روک دی اور 18 مئی 1775 کو انہیں مکمل طور پر شکست دی۔ رگھوناتھ راؤ کے ساتھ آنے والی کیٹنگ کی فوج میں 96 افراد ہلاک ہوئے، جب کہ اس جنگ میں مراٹھوں کا نقصان 150 افراد کا تھا۔

5.4.3 معاہدہ پورندر (Treaty of Purandar)

وارن ہیسٹنگز نے اندازہ لگایا کہ پونے کے خلاف براہ راست اقدامات نقصان دہ ہوں گے چونکہ امریکہ میں جنگ آزادی عروج پر تھی اور ہندوستان میں بھی مراٹھا، نظام اور میسور انگریزوں کے خلاف کسی بھی وقت متحد ہو سکتے تھے۔ لہٰذا، بنگال کی سپریم کونسل نے معاہدہ سورت کی مذمت کی اور کرنل اپٹن (Col. Upton) کو پونے بھیج کر اسے منسوخ کر کے مراٹھا وفاق کے ساتھ ایک نیا معاہدہ کیا۔ 1 مارچ 1776 کو دونوں فریقوں نے پورندر میں بات چیت کی۔ اس معاہدے کی شرائط طے کرنے کے لیے مراٹھوں کی طرف سے سکھارام باپو اور انگریزوں کی طرف سے کرنل اپٹن سرکاری طور پر متعین کیے گئے تھے۔ اسے Treaty of Purandar (صلح نامہ پرندار) کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی بنیادی شرائط درج ذیل تھیں۔

- کمپنی نے مادھو راؤ نارائن راؤ دوم کو مراٹھا پیشوا اور نانا فڑنویس کو اس کا سرپرست تسلیم کیا۔
- جنگ میں رگھوناتھ راؤ (رگھوبا) کی مدد کے لیے انگریزوں نے جو رقم خرچ کی تھی اس کے لیے مراٹھے، انگریزوں کو 12 لاکھ روپے دیں گے۔
- سورت کا معاہدہ کالعدم قرار دیا گیا۔
- مراٹھوں نے راگھوبا کو 3 لاکھ 15 ہزار روپے سالانہ پنشن دینا قبول کیا۔
- راگھوبا کوئی فوج نہیں رکھے گا اور مہاراشٹر کے کوپر گاؤں (Kopargaon) میں رہے گا۔
- سالسیٹ، بسین اور بھڑوچ جو کمپنی نے مراٹھوں سے حاصل کیے تھے، کمپنی کے پاس ہی رہیں گے۔

اس طرح مراٹھوں کے باہمی جھگڑوں، انگریزوں کے عزائم اور معاہدہ سورت کی وجہ سے اینگلو-مراٹھا تنازعہ کی بنیاد پڑ گئی۔

5.4.4 پہلی اینگلو-مراٹھا جنگ (First Anglo-Maratha War, 1775-82)

پہلی اینگلو-مراٹھا جنگ تقریباً 7 سال تک جاری رہی۔ یہ 18 مئی 1775 کو 'اراس' نامی جگہ سے شروع ہوئی، جہاں مراٹھا اور انگریزی فوجوں کے درمیان ہونے والی جنگ میں مراٹھوں کو شکست ہوئی اور انگریزوں نے سالسیٹ پر قبضہ کر لیا۔ البتہ اسی دوران بنگال کے گورنر جنرل کی کونسل نے معاہدہ سورت کو مسترد کر دیا اور مراٹھوں کے خلاف جاری جنگ کو روکنے کا حکم دیا کیونکہ یہ معاہدہ ریگولیٹنگ ایکٹ کے خلاف تھا اور اس کی وجہ سے کمپنی کو غیر ضروری جنگ میں حصہ لینا پڑا۔ اس کے باوجود یہ جنگ نہیں رکی۔ بنگال کونسل نے کرنل اپٹن (Col. Upton) کو مراٹھوں کے ساتھ مذاکرات کے لیے بھیجا لیکن رگھوناتھ راؤ کے بارے میں آپٹن اور مراٹھوں کے درمیان اختلاف تھا۔ مراٹھوں کی خواہش تھی کہ کمپنی، رگھوناتھ راؤ کو ہمارے حوالے کر دے، جب کہ اپٹن اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی اپٹن بھی سالسیٹ اور باسین پر کنٹرول برقرار رکھنا چاہتا تھا، اس لیے مذاکرات ناکام ہو گئے۔ اسی دوران مراٹھوں نے فرانسیسیوں کے ساتھ فوجی اتحاد بنانے کی کوشش کی۔ سینٹ-لوبن (Saint-Lubin) اور ایم. مونٹیگنی (M. Montigny) نامی دو فرانسیسیوں نے فرانس اور پونا ریجنسی کے درمیان ثالثی کے فرائض انجام دیے۔ تاہم، اتحاد کی تجاویز کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکی، جب کہ انگریزوں کو ایک عالمی برطانیہ مخالف محاذ کو لے کر شکوک وشبہات پیدا ہو گئے، کیونکہ اسی دور میں امریکی جنگ آزادی بھی عروج پر تھی۔

اس پس منظر میں بمبئی حکومت نے پونا پر حملہ کرنے اور راگھوبا کو پیشوائی کے عہدے پر بحال کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے کرنل ایجرٹن (Col. Egerton) کی قیادت میں ایک فوج بھیجی جو پہلے 'کھوپولی' پہنچی اور اس کے بعد مغربی گھاٹوں سے ہوتے ہوئے 'بھور گھاٹ' اور اس کے بعد 4 جنوری 1779 کو کرلا پہنچی۔ اس دوران اس پر لگاتار مراٹھوں کے حملے ہوتے رہے۔ مجبور ہو کر انگریز وڈگاؤں کی طرف پلٹے، لیکن تب تک وہ گھر چکے تھے۔ انگریزوں نے ہتھیار ڈال دیے اور 16 جنوری 1779 کو وڈگاؤں کے معاہدے (Treaty of Wadgaon) پر دستخط کرنے پر مجبور ہوئے، یہ مرہٹوں کی ایک بڑی فتح تھی۔ اس معاہدے کے مطابق:

- کمپنی راگھوبا کو مراٹھوں کے حوالے کرے گی۔
- کمپنی نے اب تک جن مراٹھا علاقوں پر قبضہ کیا تھا، وہ مراٹھوں کے حوالے کر دیے جائیں گے۔
- جب تک کمپنی شرائط پوری نہیں کرتی دو اعلیٰ برطانوی افسران یرغمال کے طور پر مراٹھوں کی قید میں رہیں گے۔

کرنل گوڈارڈ (Colonel Goddard) کی قیادت میں بامبے کی افواج کو بچانے کے لیے شمالی ہندوستان سے کمک بہت دیر سے پہنچی۔ بنگال میں برطانوی گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) نے اس ذلت آمیز معاہدے کو اس بنیاد پر مسترد کر دیا کہ بمبئی کے حکام کو اس پر دستخط کرنے کا کوئی قانونی اختیار نہیں تھا اور گوڈارڈ کو حکم دیا کہ وہ اس علاقے میں برطانوی مفادات کو محفوظ رکھے۔ گوڈارڈ نے 6000 فوجیوں کے ساتھ بھدرا قلعہ پر دھاوا بولا اور 15 فروری 1779 کو احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔ وہاں 6000 عرب اور سندھی پیادہ اور 2000 گھوڑ سواروں کی ایک چھاؤنی تھی۔ لڑائی میں مجموعی طور پر 108 لوگ مارے گئے، جن میں دو برطانوی بھی شامل تھے۔ گوڈارڈ نے 11 دسمبر 1780 کو باسین پر بھی قبضہ کر لیا۔ کیپٹن پوپہم (Captain Popham) کی قیادت میں اور گہا

د(Gohad) کے رانا کی مدد سے بنگال فوج ایک اور دستہ نے 4اگست 1780 کو مہاد جی سندھیا کے کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے گوالیار پر قبضہ کر لیا۔ گجرات میں مہاد جی سندھیا(Mahadji Scindia)اور جنرل گوڈارڈ کے درمیان جھڑپیں ہوئیں جو اکثر غیر فیصلہ کن ہی رہیں۔ ہیسٹنگز نے مہاد جی شندے کو ہراساں کرنے کے لیے میجر کاماک(Major Camac) کی قیادت میں ایک اور فوج بھیجی۔ کرنل گوڈارڈ، احمد آباد اور باسین پر قبضہ کرتے ہوئے، 1780 میں بڑودہ پہنچا اور پونا کی طرف بڑھا، لیکن اپریل 1781 میں بھور گھاٹ کی لڑائی میں پرشورمبھا، ہری پنت پھڑکے اور تکوجی ہولکر نے اسے بری طرح شکست دی۔

وسطی ہندوستان میں، مہاد جی نے کاماک کو چیلنج کرنے کے لیے مالوہ میں خود کو مضبوط کیا۔ ابتدائی طور پر مہاد جی کو بالادستی حاصل تھی اور کاماک کے ماتحت برطانوی افواج کو ہراساں اور کم ہونے کی وجہ سے، ہادور(Hadur) کی طرف پیچھے ہٹنا پڑا۔ فروری 1781 میں جنرل کاماک نے سندھیا کو سپری(Sipri) کے قصبے میں شکست دی، لیکن پھر بھی وہاں سے نکلنے میں انہیں اپنے کافی دقت پیش آئی اور کافی سارے سامان جنگ سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مقابلہ اب بھی اتنا ہی متوازن تھا۔ جہاں مہاد جی نے سرونج (Sironj) میں کاماک پر ایک اہم فتح حاصل کی، انگریزوں نے 24مارچ 1781 کو دردہ(Durdah) کی جنگ کے ذریعے اس شکست کا بدلہ لیا۔

اپریل 1781 میں پوپھم اور کاماک کی مدد کے لیے کرنل مرے(Col. Murre)تازہ دم دستوں کے ساتھ پہنچا۔ سپری میں اپنی شکست کے بعد مہاد جی سندھیا ہوشیار ہو گیا۔ اس لیے سندھیا نے پیشواؤں اور انگریزوں کے درمیان ایک نیا معاہدہ تجویز کیا جو 'معاہدہ سلبائی' کے نام سے مشہور ہوا۔ دوسری طرف نانافڑنویس نے جنگ کی خبر ملتے ہی حیدرآباد کے نظام اور میسور کے حیدر علی کو اپنے ساتھ شامل کر لیا، لیکن وارن ہیسٹنگ نے نظام کو نہایت ہوشیاری سے اپنے ساتھ ملا لیا۔ حیدر علی نے کرناٹک پر حملہ کیا۔ اس کے بعد انگریز مسلسل ہارنے لگے جس کی وجہ سے ان کے حوصلے گرنے لگے۔ ایسی صورتحال دیکھ کر وارن ہیسٹنگز نے اینڈرسن کو مراٹھوں کے ساتھ معاہدہ کرنے کے لیے بھیجا۔ ہیسٹنگز کی طرف سے اینڈرسن اور نانافڑنویس کو لکھے گئے خط سے واضح ہوتا ہے کہ ہیسٹنگز معاہدہ کرنے کے لیے بہت بے چین تھا۔

5.4.5 معاہدہ سلبائی (Treaty of Salbai, 1782)

17 مئی 1782 کو انگریزوں اور مراٹھوں کے درمیان سلبائی کے معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ اس کی اہم شرائط درج ذیل ہیں۔

- انگریزوں نے رگھوبا کو چھوڑنے کا یقین دلایا۔
- مراٹھادربار نے رگھوبا کو 25000 روپے ماہانہ پنشن دینا قبول کیا۔
- کمپنی نے سالسیٹ اور بھروچ کے علاوہ تمام مقبوضہ مراٹھا علاقوں پر اپنا کنٹرول چھوڑنے پر اتفاق کیا۔
- کمپنی نے مادھوراؤ نارائن راؤ دوم کو پیشوا اور فتح سنگھ گائیکواڑ کو بڑودہ کا حکمران تسلیم کیا۔
- انگریزوں کی تجارتی مراعات بدستور جاری رہیں۔
- پیشوا کسی یوروپی طاقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔

- اس معاہدے کی منظوری کے 6 ماہ کے اندر میسور کا حکمران حیدر علی مفتوحہ علاقوں کو واپس کر دے گا۔
- مہاد جی سندھیا دونوں طرف سے اس صلح نامے کے شرائط کا ضامن اور نگراں قرار پایا۔

اس معاہدے پر مہاد جی سندھیا اور نانا فڑنویس کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے کیونکہ نانا فڑنویس کا دوست حیدر علی ابھی تک انگریزوں کے خلاف میدان جنگ میں تھا۔ لہٰذا انگریزوں سے معاہدہ کرنا حیدر علی سے غداری کے مترادف تھا۔ لیکن جب 7 دسمبر 1782 کو حیدر علی کا انتقال ہو گیا تو نانا فڑنویس نے 20 دسمبر 1782 کو اس معاہدے پر دستخط کر دیے۔

5.4.6 پہلی اینگلو-مراٹھا جنگ کے نتائج (Consequences of First Anglo-Maratha War)

عام طور پر سلبائی کے معاہدے کی شرائط مراٹھوں کے حق میں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے بعد مراٹھوں اور انگریزوں کے درمیان تقریباً 20 سال تک امن رہا۔ اس معاہدے سے پیشوا اور مہاد جی سندھیا کی اہمیت بڑھ گئی، یہاں تک کہ انگریزوں نے مہاد جی سندھیا کو یقین دلایا کہ وہ مغل بادشاہ شاہ عالم کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ اس معاہدے کے ذریعے انگریزوں نے مراٹھوں اور میسور کی دوستی ختم کر دی۔ میسور کے حکمران کو مراٹھوں کی مدد نہ مل سکی، حالانکہ حیدر علی کی موت کے بعد بھی اس کے بیٹے ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھی لیکن اسے مراٹھوں کی طرف سے کوئی مدد نہیں دی گئی۔ انگریزوں نے میسور کو شکست دی اور جنوبی ہند میں کمپنی کا تسلط قائم کر لیا، چنانچہ معاہدہ سلبائی کے ذریعے انگریزوں نے ہندوستانی طاقتوں کی اجتماعی مخالفت سے خود کو بچا لیا اور دوسری طرف ہندوستانی طاقتوں میں پھوٹ ڈالنے میں بھی کامیابی حاصل کی۔

5.4.7 دوسری اینگلو-مراٹھا جنگ (Second Anglo-Maratha War, 1798-1805)

لارڈ ویلزلی (1798-1805) کو بنگال کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ اس وقت انگریز، فرانسیسیوں سے بھی خوفزدہ تھے جنہوں نے امریکہ کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف مدد کی تھی۔ ویلزلی نے ماتحت اتحاد کا نظام تیار کیا، جس کے ذریعے وہ تمام ہندوستانی ریاستوں پر کمپنی کا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا اور اسی سلسلے میں وہ مراٹھوں کو بھی ماتحت اتحاد کے جال میں پھنسانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف پیشوا مادھو راؤ نارائن راؤ دوم کا انتقال 1796 میں ہوا۔ جس کے بعد راگھوناتھ راؤ کا بیٹا باجی راؤ دوم (1796-1818) مراٹھا سلطنت کا آخری پیشوا بنا۔ پیشوا کی جانشینی کے تنازعہ نے پوری مراٹھا سلطنت کو الجھا دیا۔ اس وقت مراٹھا وفاق میں پانچ طاقتیں شامل تھیں۔ پونا میں پیشوا (وزیر اعظم)، بڑودہ میں گائکواڑ، گوالیار میں سندھیا، اندور میں ہولکر اور ناگپور میں بھونسلے۔

باجی راؤ دوم، پیشوا نانا فڑنویس کو پسند نہیں کرتا تھا اور ان سے آزادی چاہتا تھا۔ اسی دوران 1800ء میں نانا فڑنویس کا بھی انتقال ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ نانا کی موت کے ساتھ ہی مراٹھوں میں قیادت اور حکمت ختم ہو گئی۔ باجی راؤ دوم نے خود مراٹھا سرداروں کے درمیان لڑائیاں اور سازشیں کیں لیکن وہ خود اس میں الجھ گیا۔ دولت راؤ سندھیا اور یشونت / جسونت راؤ ہولکر دونوں پونا میں اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کشمکش میں سندھیا کامیاب ہوا اور باجی راؤ دوم کی حمایت میں آ گیا اور یشوونت راؤ اس چپقلش سے بیزار ہو کر شمالی ہندوستان کی طرف

نکل کھڑا ہوا۔ اپنی علاقائی توسیع کے لیے، یشونت راؤ ہولکر نے شمال کی طرف مہم شروع کی تو وتھوجی راؤ نے جنوب کی طرف مہم شروع کی۔

یشونت راؤ ہولکر کے بھائی، وتھوجی راؤ ہولکر نے اعلان کیا کہ وہ امرت راؤ کے لیے کام کرے گا جو باجی راؤ دوم سے زیادہ پیشوا بننے کے قابل ہے۔ باجی راؤ دوم نے بالاجی کنجیر اور باپو راؤ گھوکلے کو وتھوجی راؤ ہولکر کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجا اور اپریل 1801 میں وتھوجی راؤ کو گرفتار کر کے پونا لے جایا گیا۔ بالاجی کنجیر کے مشورے پر اسے ہاتھی کے پاؤں تلے موت کی سزا سنائی گئی۔ اس کی بیوی اور بیٹے ہری راؤ کو قید کر دیا گیا۔ مراٹھا وفاق کے خیر خواہوں نے پیشوا کو خبردار کیا کہ وہ ایسا سخت قدم نہ اٹھائے، کیونکہ یہ مراٹھا وفاق کے خاتمے کا باعث بن سکتا ہے۔ لیکن پیشوا باجی راؤ دوم نے اسے نظر انداز کر دیا۔ جب یشونت راؤ ہولکر کو یہ معلوم ہوا تو اس نے بدلہ لینے کی قسم کھائی۔ یشونت راؤ نے پونا پر حملہ کیا اور سندھیا اور پیشوا کو مشترکہ طور پر شکست دے کر پونا کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ اس نے امرت راؤ کے بیٹے وِنائک راؤ کو پونا کے تخت پر بٹھایا۔ کسی طرح باجی راؤ دوم نے پونا سے بھاگ کر بسین (Bassein) میں پناہ لی اور انگریزوں سے مدد طلب کی۔ 13 دسمبر کو پیشوا باجی راؤ دوم اور انگریزوں کے درمیان ایک ماتحت امدادی معاہدہ ہوا۔ جسے معاہدہ بسین (Treaty of Bassein) کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے ہی کمپنی حیدر آباد کے نظام کے ساتھ ماتحت امدادی معاہدہ کر چکی تھی اور میسور کو مکمل طور پر بے اختیار بنا چکی تھی۔ اس معاہدے کے مطابق پیشوا مندرجہ ذیل شرائط ماننے کے لیے تیار تھا۔

- پیشوا کی مدد کے لیے 6000 انگریز فوجی تعینات کیے جائیں گے، جن کے سالانہ خرچ 26 لاکھ روپے کے لیے پیشوا، سالانہ آمدنی والے اتنے ہی علاقہ انگریزوں کو دے گا۔ ساتھ ہی وہ اپنے دربار میں ایک انگریز ریذیڈنٹ بھی مقرر کرے گا۔
- پیشوا انگریزوں کی اجازت کے بغیر نہ تو کسی یورپی کو اپنی ریاست میں تعینات کرے گا اور نہ ہی رہنے کی اجازت دے گا۔
- پیشوا حیدر آباد کے نظام اور بڑودہ کے گائیکواڑ کے ساتھ اپنے تنازعات میں کمپنی کی ثالثی کو قبول کرے گا۔
- پیشوا نظام کے علاقوں سے چوتھ کے تمام اختیارات سے دستبردار ہو جائے گا۔
- پیشوا سورت سے اپنا اختیار چھوڑ دے گا۔
- پیشوا کمپنی کی اجازت کے بغیر کسی مقامی ریاست کے ساتھ کوئی جنگ یا معاہدہ نہیں کرے گا۔

بسین کے معاہدے کے ذریعے کمپنی کو مراٹھوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا حق ملا۔ پیشوا نے مراٹھوں کی عزت اور آزادی کو کمپنی کے ہاتھوں گروی رکھ دیا۔ مراٹھوں کے لیے یہ کسی قومی توہین سے کم نہیں تھا۔ دوسری طرف اس معاہدے نے برطانوی سلطنت کی توسیع کے لیے سازگار حالات پیدا کر دیے۔ کمپنی نے باجی راؤ دوم کو فوج کی حفاظت میں پونا بھیجا اور اسے تخت پر بٹھایا لیکن مراٹھا سردار ماننے کو تیار نہ ہوئے۔ مراٹھا سرداروں نے آپس میں اتحاد کی کوشش شروع کر دی۔ گائیکواڑ انگریزوں کا دوست تھا، اس لیے اس نے انگریز مخالف اتحاد میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ ہولکر بھی سندھیا سے ذاتی دشمنی کی وجہ سے اس میں شامل نہیں ہوا۔ صرف سندھیا اور بھونسلے متحد ہو سکے۔ سندھیا اور بھونسلے نے انگریزوں کے خلاف جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ دوسری طرف لارڈ ویلزلی نے ایک فوج اپنے بھائی آرتھر ویلزلی کی قیادت میں اور دوسری فوج جنرل لیک کی قیادت میں مراٹھوں کے خلاف بھیجی۔ آرتھر ویلزلی نے احمد نگر کو فتح کرتے

ہوئے سندھیا اور بھونسلے کی مشترکہ فوج کو اجنتا اور ایلورا کے قریب 'آسائی' نامی جگہ پر شکست دی اور پھر 'اسیر گڑھ' اور 'ارگاؤں' میں مراٹھوں کو شکست دی۔ آخر کار 17 دسمبر 1803 کو رگھوجی بھونسلے اور انگریزوں کے درمیان 'معاہدہ دیوگاؤں' (Treaty of Deogaon) پر دستخط ہوئے۔اس معاہدے کی شرائط کے مطابق-

- بھونسلے نے اڑیسہ میں کٹک اور بالاسور کو کمپنی کے حوالے کر دیا،اس طرح کلکتہ اور مدراس کے درمیان برطانوی علاقے ایک دوسرے سے جڑ گئے۔
- بھونسلے نے دریائے واردھا کے مغرب میں تمام برار حیدرآباد کے نظام علی خان کو دے دیا۔ اپنے دارالحکومت میں ایک برطانوی ریزیڈنٹ رکھنے پر راضی ہو گیا۔
- بھونسلے نے تمام غیر ملکیوں کو اپنی خدمت سے ہٹا دیا۔
- نظام اور پیشوا کے ساتھ اختلافات کو دور کرنے کے لیے کمپنی کی ثالثی کو قبول کیا۔

بھونسلے نے برطانوی ماتحت امدادی معاہدے کی تمام شرائط مان لیں، لیکن کمپنی کی فوج کو ریاست میں رکھنے کی شرط کو ماننے سے انکار کر دیا، ویلزلی نے بھی اس پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالا۔ دوسری طرف جنرل لیک نے شمالی ہندوستان میں علی گڑھ سے اپنی مہم کا آغاز کیا اور دہلی اور پھر بھرت پور پر حملہ کیا۔ بھرت پور کے بعد اس نے آگرہ پر حملہ کیا اور آخر کار دولت سندھیا کو 'اسائے' اور 'لاسواڑی' کی جنگوں میں شکست دی اور 30 دسمبر 1803 کو سندھیا کے ساتھ سرجی-انجن گاؤں (Treaty of Surji-Anjangaon) کے معاہدے پر دستخط کر وائے۔اس معاہدے کی شرائط کے مطابق-

- گنگا اور جمنا کے درمیان کا علاقہ کمپنی کو دیا گیا۔ ساتھ ہی حصار، پانی پت، روہتک، ریواڑی، گڑگاؤں بھی انہیں مل گئے۔
- دہلی-آگرہ علاقہ، بندیل کھنڈ اور احمد نگر قلعہ، بھروچ، اجنتا گھاٹ بھی کمپنی کو دے دیے گئے۔
- اپنے دربار میں ایک برطانوی ریزیڈنٹ کو قبول کر لیا۔
- سندھیا کو 6 بٹالین فوج دی گئی، جس کے اخراجات ان کے لیے دی گئی اراضی کی مالگزاری سے پورے کیے جائیں گے۔
- برطانیہ کی اجازت کے بغیر کسی یورپی کو نہیں رکھا جائے گا۔

اس طرح سندھیا اور بھونسلے نے بھی معاہدہ بسین کو قبول کر لیا۔اس کامیابی سے حوصلہ پا کر کمپنی نے اعلان کیا کہ جنگ کے تمام مقصد حاصل کر لیے گئے ہیں، لیکن یشونت راؤ ہولکر جو آخر تک ان واقعات سے الگ رہا،اس نے اپریل 1804 میں راجستھان میں کمپنی کی دوست ریاستوں پر حملہ کیا۔ اگرچہ ہولکر کو شروع میں کچھ کامیابی ملی، لیکن بعد میں ویلزلی کی ہدایت پر آرتھر ولزلی کی قیادت میں جنوب سے اور کرنل میر کی قیادت میں گجرات سے حملہ کیا۔ ہولکر کے علاقوں پر حملہ کیا گیا۔ بعد میں، کرنل مینسن کی قیادت میں راجپوتانہ سے بھی ایک فوج بھیجی گئی اور بالآخر ہولکر کو شکست کھانی پڑی اور 25 دسمبر 1805 کو ایک سمجھوتے پر دستخط کرنا پڑے۔اس معاہدے کو 'معاہدہ راج گھاٹ' (Treaty of Rajghat) کہا جاتا ہے۔اس کی شرائط کے مطابق ہولکر نے:

- دریائے چنبل کے شمالی علاقوں اور بندیل کھنڈ کمپنی کے لیے چھوڑ دیے۔
- اپنی خدمت میں کسی یورپی کو مقرر نہ کرنے پر اتفاق کیا۔
- بدلے میں مالوا اور میواڑ پر ہولکر کا اختیار قبول کر لیا گیا۔

اس طرح دوسری اینگلو مراٹھا جنگ کا خاتمہ ہوا۔ ویلزلی بھی واپس انگلینڈ چلا گیا اور جارج بارلو (George Barlow) کو اس کی جگہ بھیج دیا گیا۔ اس جنگ کے اختتام تک کمپنی ہندوستان میں سب سے غالب طاقت کے طور پر مستحکم ہو گئی۔

5.4.8 تیسری اینگلو مراٹھا جنگ (Third Anglo-Maratha War, 1817-18)

تیسری اینگلو مراٹھا جنگ ،لارڈ ہیسٹنگز کے دور میں شروع ہوئی، جسے 1813 میں کمپنی کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا تھا۔ ہیسٹنگز نے مراٹھوں کے بے قاعدہ سپاہیوں کے خلاف مہم شروع کی، جنہیں پنڈاری کہا جاتا تھا۔ پنڈاری مالوہ اور راجستھان کے گاؤں کو لوٹتے تھے۔ مراٹھوں کی بالادستی کو ہیسٹنگز کی مہم نے چیلنج کیا تھا۔ ہیسٹنگز نے بھونسلے کو 1816 میں، پیشوا کو 1817 میں اور سندھیا کو 1817 میں انتہائی ذلت آمیز معاہدے کرنے پر مجبور کیا۔ اس سے مجبور ہو کر پیشوا نے بغاوت کر دی، تمام مراٹھے ذلت کی آگ میں جل رہے تھے۔ پیشوا نے کرکی کی برطانوی ریزیڈنسی پر حملہ کیا اور اسے جلا دیا لیکن بالآخر اسے شکست ہوئی اور پیچھے ہٹنا پڑا۔ پیشوا، بھاگ کر ستارہ پہنچا لیکن وہاں بھی چین نہیں ملا اور 20 فروری 1818 کو پہلے 'کورے گاؤں' اور پھر 'آستھی' میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جون 1818 میں اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد کمپنی نے پیشوا کا عہدہ ختم کر دیا اور پوری مراٹھا ریاست پر قبضہ کر لیا۔ پیشوا کو 8 لاکھ روپے سالانہ پنشن دے کر کانپور کے قریب بٹھور نامی جگہ بھیج دیا گیا۔ پیشوا کے معاون ترمبک جی کو بھی پکڑ لیا گیا اور ان کو ساری زندگی کے لیے چنار قلعے میں قید کر دیا گیا۔

ایک ایک کر کے تمام مراٹھا سردار بھونسلے اور ہولکر بھی جنگ میں ہار گئے اور بے اختیار ہو گئے۔ سندھیا اور گائیکواڑ جنگ میں کودنے کی ہمت بھی نہیں کر سکے۔ مراٹھا وفاق کا خاتمہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں انگریزوں کی طاقت سے مقابلے کی آخری طاقت بھی ختم ہو گئی۔ انگریزوں نے برائے نام پرتاپ سنگھ کو جو شیواجی کی اولاد سے تھا، ستارہ میں اپنا کٹھ پتلی بادشاہ بنا دیا۔ اس طرح تمام ہندوستان پر حکمرانی کا انگریزوں کا خواب پورا ہو گیا۔ پرنسپ کے مطابق، 'انگریزی اثر و رسوخ اور طاقت ہندوستان میں جادو کی طرح پھیل گئی۔'

5.4.9 مراٹھوں کے زوال کی وجوہات (Causes for the Decline of the Marathas)

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مراٹھوں نے تیزی سے ہندوستان میں تسلط قائم کرنے کی کوشش کی۔ مراٹھے پورے ہندوستان پر حکومت قائم نہیں کر سکے لیکن پورا ہندوستان ان کی دہشت میں مبتلا تھا۔ وہ ہندوستان کے تمام حصوں سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرتے تھے۔ بنگال اور پنجاب کے علاوہ راجستھان، اودھ، حیدرآباد، کرناٹک، میسور وغیرہ کے حکمران انہیں ٹیکس ادا کرتے تھے اور گجرات، مالوا، بندیل کھنڈ، مہاراشٹر وغیرہ ان کے ماتحت تھے۔ مغل بادشاہ بھی ان کا وظیفہ خوار تھا۔ اس وقت ہندوستان میں مراٹھوں کو سب سے زیادہ طاقتور سمجھا جاتا تھا۔ مراٹھوں کی یہ طاقت جس نے پورے ہندوستان کو کچل دیا تھا، انگریزوں کے سامنے کمزور پڑ گئی۔ پہلی اینگلو-مراٹھا جنگ

وارن ہیسٹنگ کے دور میں ہوئی، دوسری اینگلو-مراٹھا جنگ لارڈ ویلزلی کے دور میں اور تیسری لارڈ ہیسٹنگز کے دور میں ہوئی۔ تیسری اور آخری جدوجہد کے نتیجے میں پیشوا کا عہدہ ختم کر کے اسے کمپنی کا وظیفہ خوار بنا دیا گیا۔ مراٹھا ریاستوں میں انگریزی فوجیں تعینات کر دی گئیں۔ داخلی اور خارجہ پالیسیوں کا فیصلہ کمپنی کے حکام نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس طرح مراٹھے، جنہوں نے پورے ہندوستان میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا تھا، انگریزوں کی ماتحتی میں آ گئے۔

مراٹھا سلطنت کے زوال کے بارے میں مورخین کے درمیان مختلف آراء ہیں۔ معروف مورخ ڈاکٹر تاراچند کے مطابق مراٹھوں کے زوال کی وجوہات 1761 میں پانی پت کی تیسری جنگ سے بہت پہلے موجود تھیں۔ جہاں ڈاکٹر جادوناتھ سرکار نے پانی پت کی تیسری جنگ کی شکست کو مراٹھوں کے زوال کی بنیادی وجہ قرار دیا، ڈاکٹر ایم این سین کے مطابق، اس کے زوال کی وجوہات مراٹھا سلطنت کی ترقی میں مضمر ہیں۔ مراٹھوں کی تیز رفتار ترقی نے انہیں آپس میں تقسیم کر دیا جو ان کے زوال کی بنیادی وجہ بن گئی۔ گرانٹ ڈف اور سر دیسائی بھی پانی پت کی تیسری جنگ میں شکست کو مراٹھوں کے زوال کی بڑی وجہ سمجھتے ہیں۔ سر دیسائی کے مطابق، مراٹھوں کا زوال پیشوا مادھو راؤ اول کی موت کے وقت سے شروع ہو گیا تھا۔ مزید برآں اینگلو مراٹھا جنگ میں مراٹھوں کی شکست کی اہم وجوہات درج ذیل ہیں:

مراٹھوں کے درمیان اندرونی اختلافات: مراٹھا سلطنت ایک ریاست نہیں بلکہ ایک وفاق تھی، جس میں طاقتور مراٹھا سردار آزادانہ برتاؤ کرتے تھے، ان میں اتحاد کا مکمل فقدان تھا۔ جیسے جیسے پیشوا کمزور ہوتا گیا، مراٹھا کنفیڈریسی بکھر گئی۔ سندھیا، ہولکر، گائیکواڑ اور بھوسلے جیسے مراٹھا سردار آپس میں لڑتے رہے اور ضرورت پڑنے پر ایک دوسرے کے خلاف انگریزوں کی مدد لینے سے باز نہ آئے۔ اس لیے انگریزوں کو مراٹھوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے اور انہیں کمزور کرنے کا موقع مل گیا۔ پونا دربار کے جھگڑے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے پہلی اینگلو مراٹھا جنگ میں حصہ لیا۔ اس لیے باہمی کشمکش، اتحاد کا فقدان اور مرکزی ریاست کا فقدان مراٹھوں کی سب سے بڑی کمزوریاں تھیں۔

مراٹھا انتظامی نظام کے نقائص: مراٹھا ریاست کے سیاسی اور انتظامی نظام میں سنگین خامیاں تھیں۔ مراٹھوں نے کبھی تعلیم، دفاع، کمیونٹی کی ترقی یا عام شہریوں کی مادی ترقی کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے عوام کو متحد کرنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی۔ ان کا کام صرف دولت لوٹنا اور اپنا اقتدار قائم کرنا تھا، لوٹ مار اور شمالی ہند سے حاصل ہونے والی دولت نے انہیں عیش و عشرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کے سردار بھی اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو چکے تھے۔ سول سوسائٹی جس نے مغلیہ سلطنت کے خلاف جدوجہد میں خصوصی کردار ادا کیا تھا، وہ اینگلو مراٹھا تنازعہ سے لاتعلق رہی۔

سیاسی دوراندیشی کا فقدان: مراٹھا سرداروں میں سیاسی دوراندیشی کی واضح کمی ہے۔ مراٹھوں نے زوال پذیر مغل سلطنت پر کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ اگر وہ چاہتے تو مغل بادشاہ کو ہٹا کر چھترپتی یا پیشوا کو ہندوستان کا شہنشاہ بنا سکتے تھے، اس صورتحال میں مراٹھوں کی قیادت میں ہندوستان کا اتحاد ممکن تھا، لیکن مراٹھوں نے ایک سیاسی گروہ کے طور پر صرف اپنی کامیابی سمجھا۔ مغل بادشاہ ان کی کٹھ پتلی لے چکے تھے۔ اگر مرہٹہ دہلی

کا شہنشاہ بن جاتا تو وہ انگریزوں کے خلاف تمام شہنشاہوں اور ریاستوں کو اکٹھا کر سکتا تھا۔

نااہل قیادت: کسی بھی سیاسی نظام میں اس کی قیادت کا کردار سب سے اہم ہوتا ہے۔ 18ویں صدی کے آخر تک، مہادجی سندھیا، اہلیا بائی ہولکر، پیشوا مادھو راؤ، توکوجی ہولکر اور نانا فڑنویس جیسے قابل مراٹھا سردار فوت ہو چکے تھے۔ پیشوا باجی راؤ دوم، دولت راؤ سندھیا اور جسونت راؤ ہولکر جیسے سرداروں کی قیادت مکمل طور پر کمزور اور خود غرضی سے بھری ہوئی تھی۔ آپس میں لڑتے تھے، اخلاقی طور پر گر چکے تھے۔ عوام ان کی لوٹ مار، غلط حکمرانی اور جبر سے تنگ آ چکے تھے، دوسری طرف انگریزوں کے پاس ایلفنسٹن، میلکم، آرتھر ویلزلی، جنرل لیک، لارڈ ویلزلی جیسی قابل سیاسی اور عسکری قیادت موجود تھی۔ مراٹھوں کے نااہل لیڈر سفارت کاری، مہارت اور جنگ میں انگریزوں کے سامنے ٹک نہ سکے۔

مراٹھا فوجی نظام: انگریزی فوجی نظام مراٹھوں سے زیادہ نظم و ضبط، تربیت یافتہ اور تکنیکی طور پر لیس تھا۔ انگریزی عسکری قیادت بھی مراٹھا قیادت سے زیادہ کارآمد تھی۔ دوسری بات یہ کہ مراٹھوں کے گوریلا جنگی نظام سے چھیڑ چھاڑ کر کے یورپی طرز پر لڑائی شروع کرنا بہت بڑی غلطی تھی۔ الفریڈ شیر نے اپنی کتاب *Rise and Expansion of British power in India* میں اس رائے کی تائید کی ہے لیکن یہ جنگ شمالی ہندوستان میں گوریلا جنگی نظام سے نہیں لڑی جا سکتی تھی۔ درحقیقت کمزوری کی وجہ یورپی طریقوں کو اپنانے کے بعد فیکٹریوں میں مناسب مقدار میں ہتھیاروں کی تیاری کا نہ ہونا بھی تھا۔ توپ اور بارود کے کارخانے لگ گئے لیکن وہ ضرورت کے مطابق صحیح وقت پر تیار کی گئیں۔ مراٹھے یورپی طریقوں اور ہتھیاروں کے استعمال کے لیے اکثر فرانسیسیوں پر انحصار کرتے تھے جو ضرورت کے وقت استعمال نہیں ہو سکتے تھے۔

انگریزوں کی بہترین سفارت کاری اور انٹیلی جنس نظام: انگریزوں کی سفارت کاری بہترین طبقے کی تھی۔ جنگ شروع کرنے سے پہلے، وہ اکثر دوسری ریاستوں سے دوستی کرتے تھے اور انہیں الگ تھلگ کر دیتے تھے۔ اس نے مراٹھا سرداروں کے درمیان اندرونی تقسیم پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ اکثر کامیاب ہوتا تھا۔ دوسری اور تیسری مراٹھا جنگ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اپنی سفارت کاری کی وجہ سے انگریزوں نے مختلف ہندوستانی حکمرانوں کو ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رکھا۔ دوسری طرف مراٹھوں کو یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان کا سب سے طاقتور دشمن کوئی اور نہیں بلکہ انگریز ہے۔ مراٹھے باقی ہندوستانی حکمرانوں جیسے مسلمانوں یا راجپوتوں پر بھی فتح حاصل نہیں کر سکے۔ انگریزوں کا انٹیلی جنس نظام بھی مراٹھوں سے بہتر تھا۔ وہ مراٹھوں کے اندرونی معاملات اور اختلافات کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا تھا۔ انگریزوں نے بھی مراٹھی زبان کا مطالعہ کیا۔ بہت سے انگریز افسر مراٹھی زبان اچھی طرح بولتے اور سمجھتے تھے۔ جب کہ مراٹھے انگریزوں کی طاقت، پالیسی اور منصوبوں سے بے خبر رہے۔ اس طرح درست اور درست اندرونی معلومات بھی انگریزوں کی فتح میں مددگار ثابت ہوئیں۔ جب کہ مراٹھوں تک انگریزوں سے ایسی کوئی اطلاع نہ پہنچ سکی۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انگریز سامراجی نظریات سے متاثر ہو کر اپنی طاقت کو تکنیکی اور سائنسی ذرائع سے استعمال کرتے ہوئے نوآبادیاتی توسیع میں مصروف تھے، وہیں مراٹھا، عہد وسطی کے روایتی

نظریات میں پھنسے ہوئے تھے۔ اینگلو- مراٹھا جنگ سے پہلے ہی مراٹھوں کی بے حسی اور اندرونی کمزوری واضح تھی، جو انہیں شکست کی طرف لے جانے میں مددگار ثابت ہوئی۔

5.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ سترہویں صدی کے نصف آخر میں مراٹھا، جنوبی ہندوستان میں ایک بڑی طاقت بن کر ابھرے۔ شیواجی نے ایک کامیاب قائد اور لائق منتظم کی حیثیت سے اپنی سلطنت قائم کی جس نے نہ صرف ہمعصر علاقائی طاقتوں بلکہ عظیم مغلوں سے بھی اپنا لوہا منوایا۔ شیواجی کے جانشینوں کے اختلافات اور کمزوری نے پیشواؤں کو جو وزیر کی حیثیت رکھتے تھے، اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینے کا موقع دیا۔ شیواجی کے بعد اولین تین پیشواؤں کا دور مراٹھا اقتدار کا عہد زریں ثابت ہوا۔ اسی تناظر میں پہلے تین عظیم پیشواؤں بالاجی وشوناتھ، باجی راؤ اول اور بالاجی باجی راؤ نے مراٹھا اقتدار کو عظیم بلندیوں تک پہنچایا۔ انہوں نے اس عہد میں جنوب کے علاوہ شمالی ہند میں بھی اپنے بازوں پھیلائے۔ جنوب میں حیدرآباد، میسور اور انگریزوں کے علاوہ دیگر چھوٹی ریاستوں کے ساتھ علاقائی سیاست میں کامیاب کردار ادا کیا اور نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ مراٹھوں نے کمزور مغل بادشاہ اور آپسی رسہ کشی میں مصروف امرا پر مسلسل اپنی بالادستی ثابت کی۔ شمالی اور جنوبی ہند کے مختلف علاقوں سے انہوں نے چوتھ اور سردیش مکھی کی شکل میں ٹیکس وصول کیا۔ ان کی فوجی کامیابیوں نے ایسی صورت پیدا کر دی جسے دیکھ کر یہ لگتا تھا کہ مغلوں کے زوال کے بعد ہندوستان کی قسمت انہیں کے ہاتھوں لکھی جائے گی۔ لیکن ملک کی پیچیدہ سیاسی صورتحال میں ان کی راہ آسان نہیں تھی۔ مغل بادشاہ، اس کے امراء اور مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کی آپسی کھینچ تان نے افغان حکمراں احمد شاہ ابدالی کو یہ موقع فراہم کیا کہ ہندوستان میں حملہ آور ہو۔ ابدالی کی باصلاحیت قیادت اور مراٹھوں کی کمزور جنگی حکمت عملی نے پانی پت کے میدان میں جنگ کا نتیجہ طے کر دیا۔ پانی پت کی تیسری جنگ میں شکست، پیشوا مادھوراؤ کی موت اور مراٹھا سرداروں کے اندرونی اختلافات نے مراٹھا کی طاقت کو کمزور کر دیا، انگریزوں نے ایسے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی توسیع کے لیے مراٹھوں پر حملہ کیا، پہلی اینگلو مراٹھا جنگ۔ انگریزوں کے حق میں تھا لیکن دوسری اینگلو مراٹھا جنگ نے انگریزوں کو ایک اہم مقام پر پہنچا دیا۔ تیسری اور آخری اینگلو مراٹھا جنگ (1817-18) میں انگریزوں نے فیصلہ کن طور پر مراٹھوں کو شکست دی جو کہ ان کے لیے ایک بڑا خطرہ تھا۔ برطانوی چیلنج ختم کر دیا گیا۔

5.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

چوتھ	:	چوتھ، مراٹھوں کی لوٹ مار سے بچنے کے لیے مراٹھوں کے ذریعے وصول کیا جانے والا ایک حفاظتی محصول تھا اور کل مقررہ محصول کا چوتھائی حصے پر مشتمل تھا۔
سردیش مکھی	:	سردیش مکھی محصول کا 10 فیصد اضافی محصول تھا جس کا دعویٰ شیواجی نے سردیش مکھ (سردار) ہونے کے طور پر کیا تھا۔
پیشوا	:	مراٹھا وزیر اعظم

اشٹ پردھان	:	آٹھ وزیروں کی کونسل
سوراجیہ	:	شواجی کی قائم کردہ سلطنت
چھترپتی-	:	مراٹھا حکمران کا شاہی لقب
گوریلا جنگ	:	بالواسطہ جنگ کی ایک تکنیک، چھاپہ مار حملہ جس میں مراٹھا ماہر تھے۔
پنڈاری	:	مراٹھوں کے عارضی سپاہی

5.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. چوتھ کسے کہتے ہیں؟
2. سردیش مکھی کسے کہتے ہیں؟
3. پیشوا کون تھا؟
4. راگھوبا کسے کہتے تھے؟
5. 1775 میں سورت کا معاہدہ کس کے درمیان ہوا؟
6. پہلی اینگلو مراٹھا جنگ کا خاتمہ کس جنگ سے ہوا؟
7. سلبائی معاہدہ سے کس اینگلو مراٹھا جنگ کا خاتمہ ہوا؟
8. پہلی اینگلو مراٹھا جنگ کے دوران کمپنی کا گورنر جنرل کون تھا؟
9. مراٹھا سلطنت کا آخری پیشوا کون تھا؟
10. واڈگاؤں کی جنگ میں کس نے انگریزوں کو شکست دی؟

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. پورندر کی صلح کی کیا شرائط تھیں؟ بیان کیجیے۔
2. سلبائی معاہدے پر نوٹ لکھیے۔
3. باجی راؤ اول کے دہلی پر حملے اور پرتگالیوں سے تصادم پر نوٹ لکھیے۔
4. پہلی اینگلو مراٹھا جنگ کے اسباب بیان کیجیے۔
5. بسین کی صلح کے نتائج پر روشنی ڈالیے۔

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پیشواؤں کے دور میں مراٹھا سلطنت کی وسعت پر اظہارِ خیال کیجیے۔
2. پانی پت کی تیسری جنگ کے اسباب و نتائج کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. مراٹھوں کے زوال کے اسباب کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

5.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Gordon, Stewart, *The Marathas*, *1600–1818*, Cambridge University Press, New Delhi, 2005 (first published in 1998).
2. Gordon, Stewart, *Marathas, Marauders and State Formation in Eighteenth-Century India*, OUP, New Delhi, 1994.
3. Hardas, Balshastri, *Chatrapati Shivaji*, Vols. 1–4, Kale Prakashan, Pune, 1984.
4. Kadam, V.S., *Maratha Confederacy* (*A Study in its Origin and Development*), Munshiram Manoharlal, Delhi, 1993.
5. Karandikar, S.L., *Rise and Fall of the Maratha Power*, S.S. Karandikar, Pune, 1969.
6. Majumdar, R.C., and V.G. Dighe (eds.), *Maratha Supremacy*, Bharatiya Vidya Bhavan, Bombay, 1977.
7. Nadkarni, R.V., *Rise and Fall of the Maratha Empire*, Popular Prakashan, Bombay, 1966.
8. Ranade, M.G., *Rise of the Maratha Power*, Bombay University, Bombay, 1963 (first published in 1900).
9. Sen, Surendranath, *Administrative System of the Marathas*, K.P. Bagchi, Calcutta, 1976.

اکائی 6۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان—اینگلو میسور جنگ

(Hyder Ali and Tipu Sultan, and the Anglo-Mysore Wars)

اکائی کے اجزاء

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 حیدر علی اور مسیور ریاست

6.3 پہلی اینگلو میسور جنگ

6.4 دوسری اینگلو میسور جنگ

6.5 ٹیپو سلطان

6.6 تیسری اینگلو میسور جنگ

6.7 چوتھی اینگلو میسور جنگ

6.8 اکتسابی نتائج

6.9 کلیدی الفاظ

6.10 نمونہ امتحانی سوالات

6.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

6.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

6.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

6.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید (Introduction)

18 ویں صدی کے وسط میں حیدر علی (82-1722) اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان (99-1749) کی ماتحتی میں میسور کی ریاست نے بڑی طاقت اور اہمیت حاصل کر لی تھی۔ حیدر علی نے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا، پھر قسمت کی یاوری اور اس کی ذہنی استعداد نے مسند سلطانی تک پہنچا دیا۔ جنوبی ہند کے ان دونوں حکمرانوں نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا ایسے وقت میں مقابلہ کیا جب مغل سلطنت تیزی کے ساتھ زوال پذیر تھی اور سارے ملک میں سیاسی افراتفری کا عالم تھا۔ حیدر علی کسان کا لڑکا تھا۔ اپنی صلاحیت کی بنیاد پر 1755ء میں ڈنڈی گل کا فوجدار مقرر ہو گیا اور بتدریج ترقی کے منازل طئے کرتا رہا۔ یہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن بے حد ذہین تھا۔ دکن کی تمام زبانوں سے واقف تھا۔ اپنی ذہانت اور بہادری کی بناء پر اس نے بہت ترقی کی اور 1761ء تک ریاست میسور پر اس کا پورا کنٹرول ہو گیا اور 1766ء میں اس نے اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ چند ہی سال میں اس نے مراٹھوں اور نظام سے کئی علاقے چھین لیے اور جب اس کا انگریزی فوجوں سے سامنا ہوا تو نظام نے انگریزوں کی مدد کی، لیکن اس کے باوجود 1769ء اور 1780ء میں اس نے انگریز فوجوں کو شکست دی۔ لیکن 1781ء میں آخر اسے مدراس کے قریب انگریزوں سے شکست کھانی پڑی۔ اس شکست کے ایک ہی سال بعد حیدر علی کا 1782ء میں انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کے بیٹے ٹیپو سلطان نے انگریزوں سے جنگ جاری رکھی۔ ٹیپو سلطان بہادر، طاقتور اور دلچسپ شخصیت کا حامل سلطان تھا۔ جنوبی ہند میں اٹھارہویں صدی کے آخر میں انگریزوں سے جو جنگیں لڑی گئیں ان میں وہ بہت مشہور ہوا۔ ٹیپو سلطان ایک منفرد ہندوستانی حکمراں تھا جس نے ہمیشہ انگریزوں سے مصالحت کرنے سے انکار کر دیا۔ ٹیپو نے 1767ء میں انگریز اور مراٹھوں کے حملے کے مقابلے میں سوار فوج کی کمان سنبھالی۔ دوسری جنگ میسور (84-1780) میں اس نے کرنل جان براٹ ویٹ (John Brathwet) کو کولیرون (Coleroon) ندی کے کنارے شکست دی۔ 1782ء میں وہ اپنے والد کا جانشین ہوا۔ 1784ء میں اس نے انگریزوں سے عہد نامہ منگلور (Treaty of Mangalore) کے ذریعے مصالحت کی اور سلطان کا لقب اختیار کیا۔ اس نے تین میں سے دو مہموں میں جن کی کمان خود گورنر جنرل لارڈ چارلس کارنوالس کر رہا تھا، انگریزوں کو شکست دی۔ لیکن بالآخر 1792ء میں اسے معاہدہ سری رنگا پٹنم کے ذریعے ریاست کے آدھے علاقے سے ہاتھ دھونا پڑا اور تین کروڑ روپیے اور اپنے دو لڑکوں کو بطور یرغمال دینا پڑا۔ گورنر جنرل ویلزلی نے نظام حیدرآباد اور مراٹھوں کی مدد سے جب 1799ء میں سری رنگا پٹنم پر حملہ کیا تو ٹیپو نے بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا اور بڑی محنت سے مدافعت کی لیکن آخر کار مئی 1799ء میں شہید ہوا۔ میسور کو لے کر حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان سے انگریزوں کی چار جنگیں ہوئیں جنہیں اینگلو میسور جنگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس اکائی کے مطالعہ کے دوران حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی شخصیت اور ان کے ذریعے لڑی گئی اینگلو میسور جنگ کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- حیدر علی کا عروج کیسے ہوا؟ جان سکیں گے۔

- میسور ریاست کے عروج میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے کردار کا علم حاصل کر سکیں گے۔
- میسور اور انگریزوں کے ٹکراؤ پر تبصرہ کر سکیں گے۔
- اینگلو میسور جنگ کے اسباب و نتائج کا جائزہ لے سکیں گے۔
- چوتھی اینگلو میسور جنگ اور ٹیپو سلطان کی شہادت کا تجزیہ کر سکیں گے۔

6.2 حیدر علی اور میسور ریاست (Hyder Ali and the State of Mysore)

18ویں صدی کے نصف آخر میں سلطنت خداداد میسور کا بانی حیدر علی 1721ء یا 1722ء میں ضلع کولار کے ایک چھوٹے سے گاؤں بدلی کوٹ میں پیدا ہوا۔ اس کے والد فتح محمد جنوبی ہند کے مغل صوبے سرا کے منصب دار تھے۔ حیدر علی پانچ سال کی عمر میں ہی پدری سایۂ شفقت سے محروم ہو گیا۔ اس کی پرورش اس کے چچازاد بھائیوں نے کی اور اسے فن سپہ گری سکھائی۔ حیدر علی نے سب سے پہلے کرناٹک کے نواب محمد علی والا جاہ کے بھائی عبدالوہاب کی ملازمت اختیار کی اور اپنی قابلیت و صلاحیت کی بنیاد پر میسور کے راجہ ننج راج کے عہد میں سرنگا پٹنم میں ریاستی فوج کے ایک چھوٹے سے دستے کی کمان سنبھالی۔ حیدر علی نے ریاست کے اندر کی شورشوں کو فرو کرنے اور کرناٹک کی جنگوں میں ایسی جانبازی اور فوجی صلاحیت کا ثبوت دیا کہ ننج راج نے اسے 1755ء میں ڈنڈی گل کا گورنر مقرر کر دیا۔ جس زمانے میں میسور کی فوجیں کرناٹک میں لڑائی میں مصروف تھیں، مراٹھا پیشوا بالا جی باجی راؤ نے میسور پر حملہ کر دیا۔ راجہ نے ایک کروڑ روپیے دینے کا اقرار کیا اور بطور ضمانت ریاست کا بیشتر حصہ مراٹھوں کی کفالت میں دے دیا۔ جب ایک عرصہ گزر جانے کے بعد رقم ادا نہ کی گئی تو مراٹھے ان علاقوں پر 1755ء میں باضابطہ قبضہ کرنے لگے۔ حیدر علی نے اطراف و جوانب کے علاقوں سے مطلوبہ رقم جمع کر کے راجہ کے سامنے پیش کر دی تو اس نے خوش ہو کر فتح حیدر بہادر کا خطاب دے دیا اور سپہ سالار افواج مقرر کر کے مراٹھوں سے معاملات طئے کرنے کے لیے کلی اختیارات سونپ دیے۔ حیدر علی نے صلح کے بجائے جنگ کو ترجیح دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مراٹھا فوج بھاگ گئی۔

1758ء اور 1759ء میں ننج راج سیاست سے کنارہ کش ہو گیا تو راجہ نے حیدر کے مشورے سے کھنڈے راؤ برہمن کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ اسی زمانے میں حیدر علی نے مراٹھوں کے خلاف نظام دکن کے بھائی بصالت جنگ کو فوجی مدد دی اور ھوسکوٹ کا قلع فتح کیا۔ اس کے علاوہ کولار، دیوان ہائی پر بھی قبضہ کر لیا، یہاں تک کہ چناپٹنہ جو سرنگا پٹنم سے لگ بھگ 40 میل دور تھا ان کے قبضے میں آگیا۔ چناپٹنہ پر قبضہ کر کے حیدر علی نے بنگلور کو کمک پہنچائی۔ مذکورہ علاقوں کی فتح کے عوض میں بصالت جنگ کی سفارش پر دہلی کے بادشاہ نے صوبہ سرا کا صوبہ دار حیدر علی کو بنا دیا۔ اگست 1760ء کو کھنڈے راؤ نے راجہ کے ساتھ مل کر حیدر علی کو بے دخل کرنے کی کوشش کی مگر حیدر علی نے اس کو شکست دے کر سرنگا پٹنم پر قبضہ کر لیا۔ کھنڈے راؤ کو گرفتار کر کے قید کر دیا گیا اور راجہ کے مصارف کا انتظام کر کے حکومت کے تمام اختیارات خود سنبھال لیے۔ حیدر علی نے مقبوضات کی توسیع کے لیے کوشش کی۔ اس نے نندی، بدنور اور منگلور کو فتح کر کے گوا پر چڑھائی کی اور پرتگالیوں نے کاروار کا علاقہ دے کر جان بچائی۔ حیدر علی نے اسی زمانے میں ایک بحری بیڑا بھی تیار کیا اور علی راجہ کو امیر البحر مقرر کیا جس نے جزیرۂ مالدیپ پر قبضہ کر لیا، لیکن چونکہ اس نے وہاں کے راجہ کی آنکھیں نکلوا دیں تھیں اس لیے حیدر علی نے اسے معزول کر دیا۔ اس پر نائروں

نے بغاوت کردی۔ حیدر علی انہیں شکست دیتا ہوا کالی کٹ تک پہنچ گیا۔ کالی کٹ کی تسخیر کے بعد کوچین کے راجہ نے بھی اطاعت قبول کرلی۔ 1763ء میں مراٹھوں نے پھر میسور کا رخ کیا اور بدنور پر قبضہ کرلیا، لیکن حیدر علی کے آتے ہی واپس ہوگئے۔ حیدر علی کی لگاتار فتوحات سے خوف زدہ ہو کر انگریزوں نے نظام اور مراٹھوں سے اتحاد کرلیا۔ کرناٹک کا نواب محمد علی والا جاہ پہلے ہی سے ان کی سرپرستی قبول کرچکا تھا، ان سب کی متحدہ فوجوں نے بغیر کسی وجہ کے میسور پر حملہ کردیا۔ یہی پہلی اینگلو میسور جنگ (1767-69) کہلاتی ہے۔

1770ء میں پیشوا مادھو راؤ نے میسور پر حملہ کیا۔ حیدر علی نے انگریزوں سے مدد طلب کی مگر انگریزوں ے مدد دینے سے انکار کردیا، چنانچہ حیدر علی کو تنہا مراٹھوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مراٹھوں کی یورش اتنی زبردست تھی کہ انہوں نے تمام مشرقی اور شمالی اضلاع فتح کرلیے۔ حیدر علی پیچھے ہٹتا ہوا تمام جگہوں کو تہس نہس کرتا گیا تاکہ حملہ آور فوج کو رسد نہ مل سکے۔ اس نے جہاں موقع ملا ان پر شب خون مارا۔ ان لڑائیوں میں دونوں فریق کا نقصان ہوا۔ 1772ء میں پیشوا مر گیا تو اس کی جانشینی کے لیے کشمکش شروع ہوگئی۔ چنانچہ مراٹھا سپہ سالار نے حیدر علی سے صلح کرلی۔ مراٹھوں کے واپس ہونے کے بعد حیدر علی نے نئی فتوحات کا سلسلہ شروع کردیا اور 1772ء میں کورگ، 1773ء میں مالا بار، کوچین اور نیلگری، 1774ء میں بلاری اور گتی، 1775ء میں بادامی، دھارواڑ اور چیتل درگ اور 1779ء میں کڑپہ فتح کرکے جنوبی ہند میں ایک وسیع اور مستحکم ریاست قائم کرلی۔ گو مراٹھوں کے میسور پر تین حملوں (1764-72) کی وجہ سے اسے شکست بھی کھانی پڑی، مگر 1778-79 تک وہ ایک وسیع سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ 1780ء میں حیدر علی کو انگریزوں سے جنگ لڑنی پڑی۔ دراصل حیدر علی کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اثر سے انگریز بے حد خائف تھے۔ انگریزوں کو حیدر علی اور فرانسیسیوں کے درمیان تعلقات بھی پسند نہیں تھے۔ وہ میسور کی ریاست کو مراٹھوں کی مدد سے بفر اسٹیٹ میں بدلنا چاہتے تھے۔ حیدر علی نے مراٹھوں کو 40 لاکھ روپے سالانہ چوتھ دینا منظور کیا اور انہیں غیر جانبدار بنادیا۔ حیدر علی کو فرانسیسی پوری مدد دے رہے تھے۔ جب جنگ چھڑی تو حیدر علی نے انگریزوں کو کئی مورچوں پر شکست دی۔ اس نے ایک مورچے پر اپنے بیٹے ٹیپو کو بھی بھیجا تھا۔ اسی جنگ میں 1782ء میں حیدر علی کا انتقال ہوگیا۔

6.3 پہلی اینگلو میسور جنگ (The First Anglo-Mysore War, 1767–69)

حیدر علی کی ماتحتی میں میسور کی تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی طاقت اور اہمیت مراٹھا، انگریزوں اور نظام حیدر آباد کی پریشانی اور توجہ کا مرکز بنی۔ میسور کا عروج ان تینوں کے لیے مستقبل میں خطرے کا سبب بن سکتا تھا، لہٰذا اس صورتحال سے خوف زدہ ہو کر مراٹھے میسور پر حملہ آور ہوئے۔ حیدر علی کو شکست ہوئی لیکن مراٹھوں کو کچھ علاقے اور 35 لاکھ روپیے دے کر حیدر علی نے اپنی سلطنت کو محفوظ رکھا۔ 1767ء میں نظام اور انگریزی فوج نے حیدر علی پر حملہ کردیا، مگر جلد ہی کرناٹک کا نواب محمد علی کا بھائی محفوظ خان حیدر علی کا حمایتی ہوگیا۔ اس نے نظام کو حیدر کے ساتھ کردیا۔ اس طرح انگریزوں کو اکیلے حیدر سے جنگ لڑنی پڑی۔ انگریزوں نے ایک طرف تو منگلور کے ساحل پر اپنی فوجیں اتار دیں اور دوسری طرف پیش قدمی کرتے ہوئے بالا گھاٹ پر قبضہ کرلیا، جہاں محمد علی نے کولار کو اپنا صدر مقام قرار دیا۔ حیدر علی اور نظام کی فوج اور کرنل اسمتھ کے بیچ چنگما، ترنومالی، ونیام باڑی میں کئی جنگ ہوئی جس میں حیدر کو شکست ہوئی۔ اسی اثناء میں نظام نے 27 مارچ 1768ء میں انگریزوں سے صلح کرلی۔ حیدر علی کے بیٹے ٹیپو سلطان نے منگلور کا محاصرہ کرلیا۔ چند روز بعد حیدر علی بھی آگیا۔ ان کا

حملہ ایسا شدید تھا کہ انگریزی فوج سراسیمگی کی حالت میں سارا سامان چھوڑ کر کے اپنے جہازوں میں سوار ہوئی اور بمبئی واپس ہو گئی۔اس کے بعد حیدر علی مشرقی محاذ کی طرف متوجہ ہوا۔اس نے کرنل اسمتھ کو شکست دے کر نرسی پور اور ہوسکوٹ کے قلعے ان سے دوبارہ چھین لیے اور مختلف مقامات پر شب خون مارنے کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ پہلے مراٹھا اور پھر نظام دونوں نے حیدر علی سے سمجھوتہ کیا اور جنگ سے الگ ہو گئے۔حیدر علی نے نومبر 1768ء میں کاویری پٹنم اور دوسرے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور تنجور پر حملہ کرکے وہاں کے راجہ سے چار لاکھ روپیے وصول کیے۔حیدر علی نے پائیں گھاٹ میں محمد علی کے علاقے بھی فتح کیے۔انگریز سپہ سالار کرنل اوڈ منگلور کی طرف بڑھا تو حیدر علی نے اس کو شکست دے کر اس کے اسلحہ اور بھاری توپوں پر قبضہ کر لیا۔پھر کپتان نکسن کو ہزیمت دے کر ایروڈ بھی فتح کر لیا۔حیدر علی کی فوج ٹیپو سلطان کے ساتھ قلعہ سینٹ جارج تک پہنچ گئی اور 1769ء میں گولہ باری کے ساتھ مدراس پر شدید حملہ کیا۔بالآخر مدراس کونسل نے 4 اپریل 1769ء میں حیدر علی سے صلح کر لی۔اسے مدراس معاہدہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس صلح کے ذریعے پہلی اینگلو میسور جنگ ختم ہوئی اور درج ذیل شرطیں طئے ہوئیں۔

1. فریقین آئندہ ایک دوسرے کے مددگار رہیں گے۔
2. مقبوضہ علاقے اور قیدی واپس کر دیے جائیں گے۔
3. کروڑ کا علاقہ جو محمد علی کی ملکیت تھا وہ حیدر علی کے قبضے میں رہے گا۔
4. حیدر علی کو کثیر رقم بطور تاوان جنگ ملی۔

اس صلح نامہ سے انگریزی وقار مجروح ہوا۔میسور پر کنٹرول کرنے کا ان کا خواب پورا نہیں ہو سکا۔حیدر کی طاقت اور وقار میں اضافہ ہوا۔

6.4 دوسری اینگلو میسور جنگ (The Second Anglo-Mysore War, 1780–84)

میسور کی پہلی جنگ نے حیدر اور انگریزوں کے مابین مدراس صلح نامہ 1769 کی رو سے کچھ برسوں کے لیے جنگ بندی تو کر دی لکن یہ پوری طرح ختم نہیں ہوئی اور 1780 میں دوسری اینگلو میسور جنگ شروع ہو گئی۔اس کے بہت سے اسباب تھے۔شروع ہی سے مدراس کونسل 1769ء کے صلح نامہ کی شرائط کی خلاف ورزی کر رہی تھی۔جب مراٹھوں نے میسور پر دوبارہ حملے کیے تو مراٹھوں کے خلاف انگریزوں نے حیدر علی کی مدد نہ کر کے معاہدہ مدراس کی خلاف ورزی کی تھی۔اس سے حیدر علی ناراض ہوا۔اسی دوران یورپ میں فرانس اور انگریزوں (برطانیہ) کے بیچ جنگ شروع ہو گئی۔ہندوستان بھی اس سے متاثر ہوا۔انگرزوں نے بہت سی فرانسسی بستیوں پر کنٹرول کر لیا اور پانڈیچری فتح کر کے فرانسیسیوں کی دوسری بندرگاہ ماہی پر بھی قبضہ کر لیا جو حیدر علی کے مقبوضہ علاقے مالا بار میں واقع تھی۔اس پر حیدر علی نے پوری قوت کے ساتھ کرناٹک پر حملہ کر دیا اور آرنی، ترونور، کاویری پٹن، محمود بندر اور نومبر 1780 میں ارکاٹ فتح کر لیا۔انگریزی فوج کے کپتان سہ ہیکٹر منرو اور کرنل بیلی کو مدراس بھاگ جانا پڑا۔اس ہتک آمیز شکست کی اطلاع جب کلکتہ پہنچی تو وارن ہیسٹنگ نے حالات کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا۔اس نے سر آئر کوٹ کو بنگال سے مدراس بھیجا۔ہیسٹنگ نے اپنی سیاسی حکمت عملی سے نظام، برار کے راجہ اور مہادجی سندھیا کو لالچ دے کر اپنی طرف کر لیا اور انہیں جنگ سے باز رکھا۔حیدر علی نے ان حالات کا بہادری سے مقابلہ کیا مگر جولائی 1781 میں پورٹونووو کی

جنگ میں وہ آئر کوٹ سے ہار گیا۔ اس ہار سے اس نے حوصلہ نہیں کھویا بلکہ جب تک حیات رہی انگریزوں سے لگاتار لڑتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈسمبر 1782ء میں ارکاٹ کے قرب اس کا انتقال ہوگیا۔ حیدر علی کی وفات کے بعد ٹیپو سلطان نے جنگ جاری رکھی اور کئی مقامات پر انگریزوں کو شکست دی۔ لیکن دونوں فریق کسی فیصلہ کن فتح حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے، اس لیے دونوں فریق نے 7 مارچ 1784 کو منگلور کی صلح کے ذریعے جنگ ختم کردی۔

7 مارچ 1784ء کی منگلور کی صلح ٹیپو اور کمپنی کے بیچ ہوئی جس کے شرائط درج ذیل ہیں :

- دونوں فریق نے ایک دوسرے کے مفتوحہ علاقے واپس کرنے کا فیصلہ لیا۔
- دونوں نے ایک دوسرے کے قیدیوں کے رہا کرنے کا فیصلہ لیا۔
- انگریزوں نے میسور کے معاملے میں دخل نہ دینے کا وعدہ کیا۔

اس صلح نامہ کی رو سے میسور اور ٹیپو کی عزت و وقار میں اضافہ ہوا جب کہ انگریزوں کا وقار مجروح ہوا، لیکن اس کے باوجود ان جنگوں کے نتیجے میں جنوب سے ان کا صفایانہ ہو سکا اور وہ ہندوستان کی تین اہم طاقتوں میں سے ایک کی شکل میں پروان چڑھے۔

6.5 ٹیپو سلطان (Tipu Sultan)

ٹیپو سلطان 20 نومبر 1750ء کو بروز جمعہ دیون ہلی میں پیدا ہوا۔ اس کا دوسرا نام فتح علی بھی تھا جو اس کے دادا فتح محمد کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اس کی فوجی تعلیم و تربیت اچھی ہوئی تھی۔ ٹیپو اسلامی علوم کے ساتھ عربی و فارسی پر عبور رکھتا تھا۔ انگریزی اور فرانسیسی کا بھی اسے علم تھا۔ اس کے علاوہ وہ اردو اور کنڑ سے بھی واقف تھا۔ فنون سپہ گری، شمشیر زنی وغیرہ میں مہارت حاصل تھی۔ اس کی فوجی تعلیم و تربیت غازی خاں کی زیر نگرانی ہوئی تھی جو حیدر علی خان کے فوجی افسروں میں سب سے بہتر تھا۔ ولکس (Wilks) کے مطابق شہسواری میں سلطان کو خاص برتری حاصل تھی۔ حیدر علی خان جب فوج کا معائنہ کرتا تو ٹیپو سلطان کو ساتھ رکھتا تھا تاکہ اس کو عسکری نظم و نسق اور فنون حرب خصوصاً مغربی فنون حرب کی تربیت ملتی جائے۔ 1765ء میں مالا بار پر جب حیدر علی نے حملہ کیا تو ٹیپو سلطان ساتھ تھا۔ یہ جنگ کے عملی تجربہ کا پہلا موقع تھا۔ اس وقت ٹیپو کی عمر صرف 15 سال تھی مگر حوصلہ مندی اور گرم جوشی کا یہ عالم تھا کہ صرف دو ن تین ہزار سپاہی لے کر دشمن کا تعاقب کرتا ہوا گھنے جنگل میں جا گھسا اور دشمن کو حوالگی پر مجبور کر دیا۔ حیدر علی نے بہادر فرزند کو 500 سواروں کا کمانڈر بنا کر اپنی محافظ فوج میں شامل کر لیا اور موزوں جاگیر عطا کی۔ پہلی جنگ میسور میں حیدر علی خان نے ٹیپو سلطان کو غازی خان اور بعض دوسرے سالاروں کے ساتھ 19 جون 1767 میں مدراس کی جانب بھیج دیا تھا تاکہ انگریزوں کی جنگی سرگرموں کے مرکز میں خوف پیدا کیا جائے۔ ٹیپو نے میسوری رسالے کے چھاپوں سے مدراس کے مضافات میں تہلکہ مچادا اور شہر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ عین اسی موقع پر حیدر علی خان کی طرف سے تاکیدی بلاوا آگیا اور سلطان کو لوٹنا پڑا۔ 1767ء میں حیدر علی خان نے نظام کے پاس ایک وفد گراں بہا تحائف کے ساتھ بھیجا تھا جس کا امیر شہزادہ ٹیپو سلطان ہی تھا۔ ترپاتور اور وانم باڑی کی تسخیر میں وہ حیدر علی کے ساتھ تھا۔ آمبور کے محاصرہ میں بھی شریک تھا۔ کرنل اسمتھ سے لڑائی ہوئی تو ٹیپو سلطان رسالے کے ساتھ دائیں بازو پر متعین تھا۔ اس نے انگریزوں پر اس طرح حملہ کیا جیسے شہر ہرنوں پر حملہ کرتا

ہے۔ سینکڑوں موت کے گاٹ اتار دیے گئے اور بہت سے انگریز گرفتار کر لیے گئے۔

جب انگریز فوج کے بارے میں یہ اطلاع ملی کہ اس نے مالا بار کی جانب بندر کوڑ پال (منگلور) پر قبضہ کر لا ہے اور بدنور کی طرف بڑھ رہی ہے تو ٹیپو سلطان کو ادھر بھیج دیا گیا۔ وہ یلغار کرتا منگلور پہنچا پھر حیدر علی خان بھی وہاں پہنچ گیا۔ انگریزوں سے مقابلہ ہوا، انگریز بھاگے۔ حیدر علی اور ٹیپو نے ان کا تعاقب کیا اور میسور کی فوج نے انہیں قتل کا یا قیدی بنالیا۔ اس پورے محاذ میں ٹیپو سلطان نے اہم کردار ادا کیا۔ 4 اپریل 1769ء حیدر علی اور حکومت مدراس کے مابین صلح ہوئی۔ اس کے مطابق فریقین نے ایک دوسرے کی بوقت ضرورت مدد کا وعدہ کیا۔

انگریزوں سے جنگ بندی کے بعد مراٹھوں نے میسور پر حملہ کر دیا۔ حیدر علی نے ٹیپو کو اس کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ مراٹھا سرنگاپٹم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مراٹھوں نے حیدر علی سے جنگ شروع کر دی۔ اس جنگ میں ٹیپو سلطان حیدر علی سے افراتفری پھیل جانے کی وجہ سے بچھڑ گیا اور بعد میں پنڈاروں کے بھیس میں وہ حیدر علی سے جاملا۔ 33 دن تک سرنگاپٹم کا محاصرہ جاری رہا۔ جولائی 1772ء میں حیدر علی نے پچاس لاکھ روپے اور کچھ علاقے دے کر مراٹھوں سے صلح کر لی۔ 1772ء میں مادھوراؤ پیشوا کی وفات کے بعد حیدر علی نے مہم چلا کر وہ تمام علاقے دوبارہ مسخر کر لیے جو مراٹھوں نے چھینے تھے۔ ٹیپو سلطان ان تمام مہموں میں حیدر علی کے ساتھ رہا۔ 1780ء میں انگریزوں سے جو جنگ چھڑی اس میں بھی ٹیپو سلطان ساتھ تھا۔ اس میں بھی حیدر علی کو فتح ملی۔ جب حیدر علی نے ارکاٹ کا محاصرہ کیا تو ٹیپو سلطان کی کوششوں سے یہاں بھی فتح ملی۔ فروری 1782ء میں ٹیپو کو تنجور بھیجا گیا، جہاں اس نے کرنل بریتھویٹ (Braithwait) کو شکست دی۔ اسی اثناء میں مالا بار کی طرف سے تشویشناک اطلاع ملی تو ٹیپو کو مالا بار بھیج دیا گیا جہاں ٹیپو انگریزوں سے جنگ میں مشغول ہی تھا کہ 7 دسمبر 1782ء کو حیدر علی کی وفات ہو گئی، جس کی اطلاع ٹیپو کو 11 دسمبر 1782 کو مالا بار میں ملی۔

26 دسمبر 1782ء کو ٹیپو سلطان مسند نشین ہوا۔ اسے وراثت میں وسیع اور شاندار سلطنت ملی تھی۔ ٹیپو سلطان نے منان حکومت سنبھالتے ہی فوج کی بقایا تنخواہ ادا کی اور اعلان کیا کہ آئندہ ہر فرد کو تیس روز کے بعد باقاعدہ تنخواہ ملتی رہے گی۔ ٹیپو نے فرانسیسی افسر کو فوج کو نئے نمونے پر مرتب کرنے کا حکم دا۔ توپ خانے کی تنظیم نو بھی اس کے ذمہ کر دی اور خود مستعدی کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ حیدر علی کی وفات کے بعد انگریزوں نے جنرل میتھیوز (Mathews) کی سرکردگی میں مالا بار پر حملہ کر دیا تھا۔ ان کی سرکوبی کے لیے ٹیپو 23 جولائی 1783ء کو مالا بار پہنچا۔ مختلف قلعوں پر قبضہ کیا اور سمندر سے انگریزی فوج کا سلسلۂ ربط کاٹ دیا اور ایک ہی حملے میں بڈنور شہر لے لیا۔ رسد' بارود اور گولہ باری کی قلت کی وجہ سے انگریزی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ بڈنور سے ٹیپو سلطان بنگلور پہنچا جہاں انگریزی فوج کا سالار کیمبل (Campbell) موجود تھا وہ قلعہ بند ہو گیا۔ 20 مئی سے قلعہ کا محاصر کر لیا گیا اور یہ محاصرہ 2 اگست 1783ء کو اٹھالیا گیا۔ 11 مارچ 1784 کو انگریز اور ٹیپو کے مابین ایک معاہدہ ہوا۔ اس کے مطابق فریقین نے مفتوحہ علاقے واپس کر دیے۔ اسیرانِ جنگ رہا کر دیے گئے۔ لارڈ میکارٹنی (Macartney) نے اعتراف کیا کہ ہمارے لیے صلح ضروری تھی، کیونکہ جنگ چند ماہ اور باقی رہتی تو ہم اپنے مصارف کے بوجھ سے دب کر ڈوب جاتے۔ انگریزوں سے جنگ ختم ہونے کے بعد مراٹھا مد برنانا فرنویس نے نظام سے ساز باز شروع کر کے ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ کا ماحول بنادیا اور نظام نے مراٹھوں کا ساتھ دیا۔ ٹیپو سلطان نے مقابلہ کیا اور ادھونی (Adoni) کی طرف پیش قدم کی جب

مراٹھااور نظام کی متحدہ فوج ادھونی کی طرف بڑھی تو ٹیپو سلطان نے یہ مقام چھوڑ دیا۔ اتحادیوں نے ادھونی سے مہابت جنگ کے اہل و عیال کو ہٹااور اسے خالی کر دیا۔ اس طرح ٹیپو سلطان اس پر قابض ہو گیا۔ ٹیپو سلطان نے تنگ بھدرا عبور کیا اور دھاڑواڑ میں مراٹھوں پر کئی مرتبہ چھاپے مارے۔ فروری 1787ء میں صلح ہوئی۔ اس کی رو سے ٹیپو سلطان نے اپنے کچھ علاقے چھوڑ دیے اور کچھ نئے علاقے لے لیے، نیز مراٹھوں اور نظام کے ساتھ دفاعی اور جارحانہ اتحاد کر لیا۔

جب لارڈ کارنوالس 1786ء میں گورنر جنرل بن کر آیا تو اسے ہندوستان کے سیاسی حالات دیکھ کر یہ یقین ہو گیا کہ اگر یہاں انگریزی قوت کو برتر بنانا ہے تو ٹیپو سلطان سے جنگ ضروری ہے۔ اس کے لیے کارنوالس نے فوجی تیاریاں کیں، نظام اور مراٹھوں کو ساتھ ملانے کے لیے گفت و شنید جاری کر دی۔ ٹیپو نے بھی مراٹھوں اور نظام سے رابطہ استوار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ نظام اور مراٹھوں سے انگریزوں کی بات چیت جاری تھی کہ اسی دوران ٹراونکور کا واقعہ پیش آیا۔ ٹراونکور کے راجہ نے انگریزوں سے دوستی کا معاہدہ کر کے سلطنت میسور کے خلاف سرگرمیاں جاری کر رکھی تھیں۔ ٹیپو سلطان 14 دسمبر 1789ء کو ٹراونکور کی دفاعی لائن سے کوئی پچیس میل کے فاصلے پر پہنچا اور اس نے راجہ کو ایک خط بھیجا اور اس میں درج ذیل مطالبات کیے۔

- یہاں مالابار کے جو رئیس پناہ گزیں ہیں انہیں حوالے کر دیا جائے۔
- جیا کوٹہ اور گرنگانور چھوڑ دیے جائیں۔
- دفاعی لائن کا جتنا حصہ کوچین کی زمین پر ہے اسے ڈھا دیا جائے۔

مذکورہ باتوں کا راجہ نے اطمینان بخش جواب نہیں دیا۔ اسی اثناء میں ٹیپو سلطان نے کچھ فوج بعض باغیوں کے تعاقب میں بھیج دیں جو ٹراونکور سے ملی ہوئی پہاڑیوں میں پناہ گزیں تھے۔ ٹراونکوریوں نے اس فوج پر گولیاں چلائیں۔ میسوریوں نے جوابی کارروائی کی، حالانکہ اس جھڑپ کے بعد میسور کی فوج نے کوئی قدم نہ اٹھایا، لیکن اسے ہوا دے کر جنگ کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ جولائی 1790ء میں مدراس کے گورنر نے کارنوالس کی ہدایت کے مطابق ٹیپو سلطان کو لکھا کہ جھگڑے کے تصفیے کے لیے کمشنر مقرر کر دیے جائیں۔ ٹیپو سلطان نے اس سے اتفاق کیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد ہی میڈوز (Meadows) گورنر بن گیا اور گفت و شنید کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور میڈوز کی طرف سے ٹیپو سلطان سے یہ کہا گیا کہ اگر صلح چاہتے ہو تو تاوان ادا کرو۔ اس اثناء میں ٹراونکور فوج مارچ/اپریل 1790ء میں دوبارہ میسور کا علاقے پر حملہ کر چکی تھی اور دونوں مرتبہ شکست کھا کر لوٹی تھی۔ آخر کار سلطان نے تنگ آکر 2 اپریل 1790ء سے دفاعی لائن پر گولہ باری شروع کر دی۔ ٹراونکور کا معمولی سا واقعہ تیسری اینگلو میسور جنگ کا سبب بنا۔

6.6 تیسری اینگلو میسور جنگ (The Third Anglo-Mysore War, 1790–92)

صلح نامہ منگلور (1784) نے کمپنی اور ٹیپو کے مابین جو جنگ بندی کی تھی وہ قائم نہ رہ سکی۔ دونوں فریق یہ سمجھتے تھے کہ دوبارہ جنگ ہونا ضروری ہے۔ ٹیپو کو یہ یقین تھا کہ موقع ملتے ہی انگریز اس پر دوبارہ حملہ کریں گے، اس لیے اس نے اپنے کو داخلی طور پر مضبوط کیا۔

اس کے بعد اس نے انگریزوں کے دشمن فرانسیسیوں کو اپنی طرف کرنے کی کوشش کی، اس کے لیے جولائی 1787ء میں اس نے اپنا سفیر فرانس بھیجا جہاں سے اسے مدد کا بھروسہ دلایا گیا۔ قسطنطنیہ کے سلطان نے بھی اسے مدد کا یقین دلایا۔ ٹیپو نے نظام پر حملہ کرکے اس سے گنٹور کا علاقہ بھی چھین لیا۔ اس کے ان کاموں سے انگریز خوفزدہ ہو گئے۔

ان حالات میں لارڈ کارنوالس گورنر جنرل بن کر 1786ء میں ہندوستان آیا۔ اگرچہ پٹس انڈیا ایکٹ 1784 کے مطابق اس نے دیسی ریاستوں کے معاملات میں جہاں تک ممکن ہو سکا تھا دخل نہ دینے کی پالیسی پر عمل کا۔ مگر ٹیپو اور فرانسیسیوں کے بڑھتے اثرات کے سبب اس نے ٹیپو کے خلاف نظام کو مدد دینے کا یقین دلایا۔ اس سے کمپنی اور ٹیپو میں ایک بار پھر جنگ کے بادل چھاگئے۔ جنگ کی فوری وجہ یہ تھی کہ ٹیپو نے انگریزوں کی ریاست ٹراونکور پر دسمبر 1789ء میں حملہ کر دیا۔ سلطان ٹیپو کی فوج نے تمام پائیں گھاٹ مسخر کرلیا اور انگریزی فوج مدراس میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئی۔ تمام کرناٹک کو ٹیپو کے قبضے میں جاتا دکھ حیدر آباد کے وزیر اعظم مشیر الملک نے ابوالقاسم خاں عرف میر عالم کو کلکتہ بھیجا کہ وہ گورنر جنرل کو ٹیپو سے جنگ پر آمادہ کرے۔ کارنوالس نے ایک معاہدے کے ذریعے نظام اور مراٹھوں کو اپنے ساتھ لے کر ٹیپو کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ٹیپو اس سے خوفزدہ نہیں ہوا بلکہ بڑی بہادری سے اس نے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ انگریزوں نے جنرل میڈوز کو 1790ء میں میسور پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا، مگر ٹیپو نے انگریزی فوج کو مار بھگایا اور کرناٹک کے کچھ علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ میڈوز کی شکست کے بعد کارنوالس نے خود مورچہ سنبھالا۔ مارچ 1791ء میں کارنوالس نے بنگلور پر قبضہ کرلیا۔ ٹیپو نے بھی نومبر 1791ء میں کوئمبٹور پر فتح حاصل کی۔ آخری فیصلہ کن جنگ سرنگاپٹم کی قریب ہوئی۔ اس میں ٹیپو نے اپنی شکست کو بھانپتے ہوئے صلح مصالحت کی کوشش کی اور مارچ 1792ء میں سرنگاپٹم کے معاہدے پر اس جنگ کا خاتمہ ہوا۔

تیسری میسور جنگ کمپنی کے علاقے کی توسیع کے لیے لڑی گئی تھی۔ اس کے چند ادوار ہیں جو درج ذیل ہیں:

- پہلے دور میں مدراس کے گورنر جنرل میڈوز نے فوج کی کمان سنبھالی۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ کوئمبٹور پر قبضہ کرکے اسے مرکز بنائے اور جنوبی سمت سے میسور پر حملہ کرے۔ ٹیپو سلطان نے زبردست مزاحمت کی۔ کئی مقامات پر انگریزوں کو شکست دی۔ مئی تا دسمبر 1790ء انگریزی منصوبہ ناکام رہا۔ کارنوالس نے خود لکھا ہے کہ 'ہم نے وقت ضائع کیا اور غنیم نے شہرت حاصل کرلی۔ جنگ میں یہ دونوں چیزیں حد درجہ بیش قیمت ہیں۔'
- کارنوالس نے خود فروری 1791ء میں فوج کی کمان سنبھالی، وہ سیدھا بنگلور گیا۔ کارنوالس نے شہر کو لوٹا، قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ بہت سامان جنگ اس کے ہاتھ لگا۔ پھر وہ نظام کی فوج کے ساتھ متحد ہونے کے لیے 84 میل شمال کی جانب چلا گیا۔ دونوں فوجوں نے مل کر مئی 1791ء میں سرنگاپٹم کا محاصرہ کرلیا، لیکن رسد کے نہ پہنچنے، جانوروں میں بیماری پھیلنے اور چیچک کی وباء پھوٹنے کے باعث محاصرہ اٹھالیا گیا۔
- لڑائی کے تیسرے دور میں کارنوالس کو مراٹھوں کا ساتھ ملا۔ ان کے ساتھ رسد کے وسیع ذخائر تھے اور انہوں نے اتحادیوں کی ضرورت سے فائدہ اٹھا کر بھاری رقمیں وصول کیں۔ فروری 1792ء میں دوبارہ سرنگاپٹم کا محاصرہ کرلیا جو صلح کے بعد اٹھالیا گیا۔

سرنگاپٹم کے معاہدے میں درج ذیل شرطیں ہوئیں:

- ٹیپو سلطان نصف سلطنت اتحادیوں کو واپس کردے۔
- تین کروڑ تیس لاکھ تاوان دے۔اس میں سے ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ کی رقم فی الفور ادا کردی جائے اور باقی رقم چار چار مہینے کی قسطوں میں دی جائے۔
- تمام اسیرانِ جنگ رہا کردیے جائیں۔
- معاہدے کی شرطیں پوری ہونے تک سلطان کے دو بیٹے بطور یرغمال اتحادیوں کے پاس رہیں۔

میڈوز، ہیکٹر منرو وغیرہ اس صلح سے مطمئن نہیں تھے۔ کارنوالس بھی کچھ حد تک ناخوش تھا۔ نصف ملک دے دینے سے سلطان کو سیاسی، اقتصادی اور انتظامی اعتبار سے سخت دھچکا لگا تھا مگر وہ مستعدی سے اصلاح احوال میں مصروف ہوگیا۔اس جنگ کی اہمیت پر کارنوالس نے کہا تھا 'We have effectively crippled our enemy, without making our friends too formidable.' (ترجمہ: اپنے ساتھیوں کو طاقتور بنائے بغیر ہم نے اپنے دشمن کو مفلوج کردیا۔) بپن چندرا کے لفظوں میں 'The Third Anglo-Mysore destroyed Tipu's dominant position in the south and firmly established British Supremacy there' (ترجمہ: تیسری اینگلو میسور جنگ نے جنوبی ہندوستان میں ٹیپو کی طاقت کو تباہ کرکے وہاں انگریزوں کا اقتدار قائم کردیا۔)

6.7 چوتھی اینگلو میسور جنگ (The Fourth Anglo-Mysore War, 1799)

ویلزلی کے مطابق 'ٹیپو سلطان نے تاوان کا بقایا باقاعدگی سے ادا کیا، اور جنگ کے نقصان کی تلافی میں لگ گیا، رسالے اور پیادہ فوج کو درست کیا، پایہ تخت کے استحکامات مکمل کیے، سرکشوں کو سزا دی، زراعت کی حوصلہ افزائی کی اور ملک کی سابقہ خوشحالی بحال کردی۔' ٹیپو نے فرانسیسیوں کی مدد سے اپنی فوج کو تربیت دلائی اور فوج کی تنظیم نو کی۔اس نے فرانسیسی سرکار کے پاس اور عرب، کابل، قسطنطنیہ اور ماریشس اپنے سفیر بھیج کر ان کی دوستی اور تعاون حاصل کرکے اپنی طاقت مضبوط کرلی۔ ٹیپو کے ان کاموں سے انگریز دوبارہ خطرہ محسوس کرنے لگے اور دونوں میں ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرنے کے لیے آخری اور فیصلہ کن جنگ ضروری ہوگئی۔

سرنگاپٹم کے معاہدے کے چھ سال بعد 1798 ویلزلی گورنر جنرل بن کر ہندوستان آیا۔اس نے ہندوستان پہنچتے ہی جنگی تیاریاں شروع کردی اور مراٹھوں اور نظام سے تعلقات استوار کرنے شروع کردیے۔ نظام اور مراٹھوں سے عہد و پیمان ہوجانے کے بعد اس نے خطوں میں تہدید آمیز انداز اختیار کرلیا اور ایک سفیر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ٹیپو سلطان اپنی آزادی بحال رکھتے ہوئے ہر شرط قبول کرنے پر آمادہ تھا، مگر نظام کی طرح فرانسیسی دستے کو توڑ کر اس کی جگہ انگریزی فوج قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔اسی اثناء میں ویلزلی نے جنرل ہیرس (Gen. Harris) کو حکم دیا کہ سلطان سے گفت و شنید ختم کردی جائے اور میسور پر حملے کرکے سرنگاپٹم کا محاصرہ کرلیا جائے۔سلطان ٹیپو سفیر سے بات چیت کرنے کو تیار تھا مگر جواب ملا کہ اب صرف ہیرس سے بات چیت ہوسکتی ہے، چنانچہ اچانک میسور پر دو انگریزی فوجیں مشرق و

مغرب سے بڑھیں۔ مراٹھا الگ تھلگ رہے اور نظام نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ویلزلی نے ہیرس کو مصالحت کے دو مسودے دیے تھے اور ہدایت کی تھی کہ سرنگاپٹم پر گولہ باری سے پہلے پہلا مسودہ اور گولہ باری کے بعد دوسرا مسودہ سلطان کے سامنے پیش کیا جائے۔ ہیرس نے 22 اپریل 1799ء کو سرنگاپٹم پر گولہ باری سے پہلے صلح نامہ کا دوسرا مسودہ سلطان کے سامنے پیش کیا جس کی شرطیں بہت سخت تھیں:

- نصف سلطنت چھوڑ دی جائے۔
- 2 کروڑ تاوان دیا جائے جس میں ایک کروڑ فوراً ادا ہو۔
- بیٹے اور چار جرنیل بطور یرغمال دیے جائیں اور ان کا انتخاب ہیرس کی صوابدید پر ہوگا۔
- چوبیس گھنٹے کے اندر جواب دیا جائے اور اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر یرغمال اور روپیے حوالے کر دیے جائیں۔

سلطان نے مذکورہ شرطوں کو قبول نہیں کیا۔ زیادہ تر لوگ چپکے سے انگریزوں سے جا ملے، ان میں اندر پورنیا، قمر الدین خان اور میر صادق بھی تھے۔ 20 فروری 1799ء کو دونوں فریقوں کے مابین جنگ شروع ہو گئی۔ نظام اور مراٹھا ویلزلی کے ساتھ تھے۔ انگریزوں نے میسور پر حملہ کر کے راجدھانی سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا۔ ٹیپو سلطان نے بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا اور قلعہ کی حفاظت کرتا ہوا 4 مئی 1799ء کو شہید ہو گیا اور اس کے بیٹوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ چوتھی اینگلو میسور جنگ کا اس وقت کی سیاست پر گہرا اثر پڑا۔ اس نے ایک ہی ساتھ انگریزوں کے دو اہم دشمنوں ٹیپو اور فرانسیسیوں کے اقتدار کو ختم کر دیا۔ سرکار اور دت کے لفظوں میں 'Thus fell one of the leading Indian powers whose thoughts were perpetually intent upon the ruin of the British power. This was itself a great relief for the English.' (ترجمہ: اس طرح ایسی ہندوستان طاقت کا زوال ہوا جو برابر برطانوی طاقت کے زوال و بربادی کے بارے میں سوچتی رہتی تھی، یہ انگریزوں کے لیے بہت بڑی راحت تھی۔) انگریزوں نے آسانی سے ٹیپو کی ریاست کا بٹوارہ کر لیا۔ مراٹھوں نے اس تقسیم میں حصہ لینے سے انکار کر دیا مگر نظام نے گرم کونڈہ، اور چیتل درگ کے ضلع لے لیے انگریزوں کو کنارا، ديناژ، کوئمبٹور، دشپورم اور سرنگاپٹم ملے۔ بقیہ علاقے میسور کے شاہی خاندان کے کم عمر شہزادوں کے حصے میں آئے اور ان کے ساتھ ویلزلی نے فوجی امداد کا سمجھوتہ (Subsidiary Alliance) کر لیا۔ اس طرح میسور پر برطانوی اقتدار قائم ہو گیا۔ ڈین ہٹن (Dean Hutton) کے لفظوں میں 'As a military, financial and pacificatory settlement, the conquest of Mysore was the most brilliant success of the British power since the days of Clive.' (ترجمہ: فوجی، معاشی اور امن کے قیام کے نقطۂ نظر سے میسور کی فتح، کلائیو کے عہد کے بعد برطانوی طاقت کی سب سے اہم فتح تھی۔)

6.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

حیدر علی نے اپنی ابتدائی زندگی ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے شروع کی اور بتدریج ترقی کی منزلوں سے گزرتا ہوا میسور کا مالک بن گیا۔ وہ ان پڑھ ضرور تھا لیکن بہت ذہین تھا۔ بے باکی، مضبوط قوت ارادی اور بلند حوصلگی اس کی خاصیت تھی۔ حیدر علی ننج راج کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ اس کی بہادری سے خوش ہو کر ننج راج نے اسے 500 سپاہیوں کا کمانڈر مقرر کیا تھا۔ 1748ء میں ناصر

جنگ کی جانشینی کے موقع پر میسور کی طرف سے حیدر علی نے دربار میں حاضری دی۔ حیدر کو ننج راج نے ڈنڈی گلگا دیوان مقرر کیا۔ پولیگاروں نے جب ننج راج کے خلاف بغاوت کی اور لگان دینے سے انکار کیا تو حیدر علی نے ان پر حملہ کر دیا اور انہیں شکست دی۔ حیدر علی نے دیو راج اور ننج راج کے بیچ صلح کرائی۔ اس کی وجہ سے میسور سلطنت کا پورا انتظام حیدر کے حوالے کر دیا گیا۔ 1761ء تک ریاست میسور پر اس کا پورا کنٹرول ہو گیا اور 1766ء میں اس نے اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔ چند ہی سال میں اس نے مراٹھوں اور نظام سے کئی علاقے چھین لیے اور جب اس کا انگریزی فوجوں سے سامنا ہوا تو نظام نے انگریزوں کی مدد کی لیکن اس کے باوجود 1769 اور 1780 میں اس نے انگریز فوجوں کو شکست دی۔ لیکن 1781ء میں اسے مدراس کے قریب انگریزوں سے شکست کھانی پڑی اور اس شکست کے ایک ہی سال بعد 1782ء میں حیدر علی کا انتقال ہو گیا۔

1749ء میں پیدا ہونے والا ٹیپو سلطان طاقت اور دلچسپ شخصیت کا حامل سلطان تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں جنوبی ہند میں جو جنگیں لڑی گئیں ان میں وہ بہت مشہور ہوا۔ اس نے ہمیشہ انگریزوں سے مصالحت کرنے سے انکار کیا۔ ٹیپو نے 1767ء میں انگریزوں اور مراٹھوں کے حملے کے مقابلے میں سوار فوج کی کمان سنبھالی۔ دوسری جنگ میسور میں (1780-84) اس نے کرنل جان براٹ ویٹ کو کولیرون ندی کے کنارے شکست دی۔ 1782ء میں وہ اپنے والد کا جانشین ہوا۔ 1784ء میں اس نے انگریزوں سے عہد نامہ منگلور کیا۔ اس نے دو مہموں میں جن کی قیادت کارنوالس کر رہا تھا' انگریزوں کو شکست دی۔ 1792ء میں اسے سرنگاپٹم کے معاہدے کے ذریعے آدھی ریاست سے ہاتھ دھونا پڑا اور تین کروڑ روپے اور دو لڑکوں کو بطور یرغمال دینا پڑا۔ ویلزلی نے نظام اور مراٹھوں کی مدد سے سرنگاپٹم پر حملہ کیا اور مئی 1799ء میں ٹیپو انگریزوں سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔

پہلی اینگلو میسور جنگ میں (1767-1779) مراٹھوں' انگریزوں اور نظام حیدرآباد کی اتحادی طاقتوں نے حیدر علی کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے لڑی۔ ابتداء میں تو حیدر علی کو مرہٹوں اور نظام حیدرآباد کی وجہ سے شکست ہوئی، لیکن 1769ء میں حیدر علی نے مدراس کے قلعہ تک پہنچ گیا۔ انگریز کمپنی نے حیدر علی سے صلح کی، لیکن یہ صلح زیادہ وقت تک نہ چل سکی۔ اور دوسری اینگلو میسور جنگ شروع ہو گئی۔ حیدر علی نے نظام اور مراٹھوں سے مل کر کرناٹک پر حملہ کر دیا اور نومبر 1780ء میں ارکاٹ فتح کر لیا۔ جولائی 1781ء میں انگریزوں اور حیدر علی کے مابین جو جنگ ہوئی اس میں حیدر علی ہار گیا اور 1782ء میں اس کی وفات ہو گئی۔ ٹیپو سلطان نے جنگ جاری رکھی اور دونوں فریقوں کے بیچ 7 مارچ 1784ء منگلور کا سمجھوتہ ہو گیا جس کی رو سے جنگ ختم ہو گئی۔ تیسری اینگلو میسور جنگ کارنوالس اور ٹیپو کے مابین ہوئی۔ مارچ 1791ء میں کارنوالس نے بنگلور پر قبضہ کر لیا۔ ٹیپو نے نومبر 1791ء میں کوئمبٹور پر فتح حاصل کر لی۔ آخری اور فیصلہ کن جنگ سرنگاپٹم میں ہوئی لیکن بغیر کسی نتیجے پ پہنچے۔ مارچ 1792ء میں سرنگاپٹم کے معاہدے کے ذریعے جنگ ختم ہو گئی۔ چوتھی اینگلو میسور جنگ ویلزلی اور ٹیپو کے بیچ 20 فروری 1799ء میں شروع ہوئی اور 4 مئی 1799ء میں ٹیپو کی شہادت پر ختم ہوئی اور انگریز ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے ہندوستان میں مضبوط ہو گئے اور جنوبی ہندوستان میں ان کا اقتدار قائم ہو گیا۔

6.9 کلیدی الفاظ(Keywords)

کُمک	:	مزید فوج، جنگی ساز و سامان جو میدانِ جنگ میں سپاہی کی مدد کے لیے بھیجی جائے۔
یورش	:	یہ ترکی لفظ ہے جس کے معنی یلغار کے ہیں، دشمن کی فوج پر چڑھائی کرنا، حملہ کرنا۔
شب خون مارنا	:	رات میں حملہ کرنا
عسکری	:	لشکری، فوجی، فوج کا سپاہی
عنان حکومت	:	باگ ڈور، اختیار
غنیم	:	دشمن

6.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

6.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. حیدر علی کے والد کا نام کیا تھا؟
2. سلطنت خداداد میسور کا بانی کون تھا۔
3. حیدر علی کا انتقال کب ہوا؟
4. حیدر علی آئر کوٹ سے کس جنگ میں ہارا؟
5. پہلی اینگلو میسور جنگ کب سے کب تک ہوئی؟
6. پیشوا مادھو رائے نے میسور پر کس سن میں حملہ کیا؟
7. عہد نامہ منگلور کس سن میں ہوا؟
8. دوسری اینگلو میسور جنگ کب ختم ہوئی؟
9. ٹیپو سلطان کس سن میں پیدا ہوا؟
10. ٹیپو سلطان کس سن میں شہید ہوا؟

6.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. حیدر علی کے عروج کو مختصراً بیان کریں۔
2. پہلی اینگلو میسور جنگ کے اسباب و نتائج کا جائزہ لیں۔
3. دوسری اینگلو میسور جنگ کب اور کس کے بیچ ہوئی؟ بیان کریں۔

4. ٹیپو سلطان کی شخصیت پر ایک نوٹ لکھیں۔

5. ٹیپو کے تئیں کارنوالس کی پالیسی کا جائزہ لیں۔

6.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. تیسری اینگلو میسور جنگ کا تجزیہ پیش کریں۔

2. سلطنت میسور کے بانی کی حیثیت سے حیدر علی کی شخصیت کا جائزہ لیں۔

3. چوتھی اینگلو میسور جنگ کے اسباب و نتائج تحریر کریں۔

6.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

---

1. Brittlebank, Kate, *Tiger*: *The Life of Tipu Sultan*, Juggernaut, New Delhi, 2016.
2. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
3. Gandhi, Rajmohan, *A History of Modern South India*: *A History from the 17th Century to Our Times*, Aleph book Company, New Delhi, 2018.
4. Habib, Irfan ed., *State and Diplomacy under Tipu Sultan*: *Documents and Essays*, Indian History Congress and Tulika, New Delhi, 2001.
5. Hasan, Mohibbul, *History of Tipu Sultan*, Aakar Books, Delhi, 2006 (first pub. 1951).
6. Metcalf, Barbara D. and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).
7. Shaik Ali, B., *Tipu Sultan*, National Book Trust, India, 1972.
8. Nair, Janaki, *Mysore Modern*: *Rethinking the Region under Princely Rule*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2012.
9. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707–1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.

اکائی 7۔اینگلو-سکھ جنگیں

(The Anglo–Sikh Wars)

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 سکھوں کا عروج وارتقاء

7.3 رنجیت سنگھ اور سکھ ریاست کا قیام

7.3.1 رنجیت سنگھ

7.3.2 سکھ مسلیں

7.3.3 انگریز اور رنجیت سنگھ

7.3.4 امر تسر معاہدہ

7.3.5 رنجیت سنگھ کے بعد پنجاب

7.4 پہلی انگریز- سکھ جنگ

7.4.1 پس منظر

7.4.2 خالصہ

7.4.3 جنگ کے اسباب

7.4.4 جنگ کے واقعات

7.4.5 جنگ کے نتائج

7.5 دوسری انگریز- سکھ جنگ

7.5.1 جنگ کے اسباب

7.5.2 جنگ کا فوری سبب

7.5.3 واقعات

7.5.4 جنگ کے نتائج

7.6 اکتسابی نتائج

7.7 کلیدی الفاظ

7.8 نمونہ امتحانی سوالات

7.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید (Introduction)

سکندر لودی کے زمانے میں گرونانک نے ایک اصلاحی تحریک کی بنیاد ڈالی جس نے آگے چل کر ہندوستان کی تاریخ میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ یہی تحریک آگے چل کر سکھ مذہب کی بنیاد بنی۔ گرونانک کے انتقال کے بعد ان کے پیشروؤں نے اس اصلاحی تحریک کو آگے بڑھایا۔ ان کے یہ جانشین گرو کہلائے اور انہوں نے سکھ مذہب کو اس کی موجودہ شکل فراہم کی۔ خاص طور پر اس سلسلے میں دسویں گرو گوبند سنگھ کا اہم کردار رہا۔ گرو گوبند سنگھ نے ایک واضح فرقے کے طور سکھ مذہب کو پہچان دلائی بلکہ اس کے پیروکاروں کو بھی مذہبی اور سیاسی طور پر مسلوں اور جتھوں میں منظم کیا۔ حالانکہ ایسا کرنے کے پیچھے کئی سیاسی اور سماجی عوامل موجود تھے جن میں سب سے اہم مغلوں کے ہاتھ سے گرو ارجن اور گرو تیج بہادر کے قتل کی وجہ سے پیدا ہونے والی مغل سکھ دشمنی تھی۔ گرو گوبند سنگھ حالانکہ اورنگزیب سے خطوط کے ذریعے اس دشمنی کو ختم کرنا چاہتے تھے اور اورنگ زیب نے بھی دکن سے واپس آنے کے بعد اس مسئلہ کو حل کرنے کا یقین دلایا تھا، لیکن بدقسمتی سے اس سے پہلے ہی دکن میں مغل شہنشاہ کا انتقال ہوگیا اور کچھ دن بعد گرو بھی راہی ملک عدم ہوئے۔ گرو گوبند کے بعد بندہ بہادر نام کے ایک شخص نے سکھوں کو منظم کیا اور مغلوں سے جنگ جاری رکھی۔ نتیجتاً تھوڑے ہی عرصے میں پورا پنجاب (موجودہ ہریانہ، پنجاب اور پاکستان میں مغربی پنجاب) ان کے تصرف میں آگیا۔ کچھ عرصے کے لیے دہلی پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا تھا۔ افغان حکمراں احمد شاہ ابدالی سے لاہور پر قبضے کو لے کر بھی سکھوں کی جنگیں ہوئیں جو کہ غیر فیصلہ کن ہی رہیں۔ اس طرح پورے پنجاب پر مختلف سکھ جتھوں اور سرداروں کا قبضہ برقرار رہا جو کہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی میں رنجیت سنگھ نے انہیں متحد کرکے ایک سکھ ریاست کی بنیاد ڈالی۔

رنجیت سنگھ 18 ویں صدی کے آخر میں سوکرچاکیہ مسل کا ایک ممتاز اور مشہور حکمراں ہوا۔ یہ طاقتور، دلیر، قابل منتظم اور مدبر تھا۔ اس نے 1799ء میں لاہور اور 1802ء میں امرتسر فتح کیا اور جلد ہی دریائے ستلج کے مغربی علاقے کے سکھ سرداروں کو زیر کرکے، پنجاب میں اپنی ریاست قائم کی۔ کچھ عرصے بعد کشمیر، پشاور اور ملتان بھی فتح کرلیا اور پرانے سکھ سرداروں کو بڑی بڑی جاگیروں کا جاگیردار اور زمیندار مقرر کردیا۔ سکھوں کی ابھرتی ہوئی طاقت انگریزوں کو راس نہیں آتی تھی۔ انگریز سکھوں کو ہر حال میں محکوم بنانا چاہتے تھے جس میں بالآخر وہ کامیاب ہوئے۔ آنے والے صفحات میں ہم سکھوں اور انگریزوں کی باہمی رسا کشی و مقابلہ آرائی پر روشنی ڈالیں گے کہ کس طرح باہر سے آنے والی اس طاقت نے سکھوں کے اقتدار کو زمین بوس کردیا اور ان جنگوں سے ہندوستان اور اس میں بسنے والے لوگوں پر

کیا اثرات مرتب ہوئے۔

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- سکھوں کے زیر اقتدار علاقوں کی شناخت کر سکیں گے۔
- سکھوں کے عظیم رہنماؤں کی معرفت حاصل کر سکیں گے۔
- سکھوں اور انگریزوں کے مابین ہونے والی جنگوں کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- سکھوں اور انگریزوں کے درمیان جنگوں کے نتائج جان سکیں گے۔
- ہندوستان اور ان میں بسنے والے لوگوں پر جنگوں کے کیا اثرات مرتب ہوئے بتا سکیں گے۔

7.2 سکھوں کا عروج وارتقاء (Rise and Growth of the Sikhs)

روایتی طور پر سکھ مذہب کی ابتدا گرونانک سے مانی جاتی ہے، جنہوں نے 15 ویں صدی میں ایک مذہبی اصلاحی تحریک کا آغاز کیا جو بعد کے گروؤں کے زمانے میں ایک باقاعدہ مذہب میں تبدیل ہو گیا۔اپنی سادگی اور برابری کے اصول کی وجہ سے سکھ مذہب جلد ہی پنجاب کے جاٹ کسانوں اور دوسری چھوٹی ذات والوں میں پھیل گیا۔ سکھوں کو ایک جنگجو جتھا بنادینے کی مہم گروہر گوبند سنگھ (45-1606) نے شروع کی، جب کہ انہیں ایک بھرپور فوجی، آخری گرو گرو گوبند سنگھ (1708۔1666) کے تدبر اور رہبری نے بنایا۔ گروہر گوبند سنگھ 1699ء سے مسلسل طور پر اورنگ زیب کی فوجوں اور پہاڑی راجاؤں کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے۔اورنگ زیب کی موت کے بعد گرو گوبند سنگھ پانچ ہزاری منصب دار امیر کی حیثیت سے بہادر شاہ کے درباریوں میں داخل ہوئے اور ان کے ساتھ دکن گئے، جہاں ان کے ایک پٹھان ملازم نے دھوکے سے انہیں قتل کر دیا۔

گرو گوبند سنگھ کی موت کے بعد گروؤں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور سرداروں کی رہنمائی کا کام ایک بہادر سردار بندا بہادر نے اپنے ذمے لیا۔اس انے پنجاب میں دہلی سے لاہور تک کے علاقے کے کسانوں اور نچلی ذات کے شہریوں کو اپنے جھنڈے تلے منظم کیا۔اور آٹھ سال تک نہایت شدت کے ساتھ مغل فوجوں سے جنگ کی۔ 1715ء میں اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ان کی ناکامی کی کئی وجوہات تھیں۔ مثلاً یہ کہ مغل سلطنت میں ابھی دم خم باقی تھا، پنجاب کے اونچے طبقے اور اعلی ذات والے سب لوگ بندا بہادر کے خلاف ایک ہو گئے تھے کیونکہ وہ نچلی ذاتوں اور دیہات کے غریبوں کے رہنما تھا اور وہی زیادہ تر اس کے حمایتیوں میں شامل تھے۔اس کے علاوہ بندا بہادر اپنے مذہبی تعصب کی وجہ سے ہر مذہب وملت کے مغل دشمن عناصر کو متحد کرنے میں ناکام رہا۔

قیادت سے محروم ہونے کے بعد سکھوں کی سیاست ایک بار پھر آزاد خیال بندائی (Bandai) اور روایتی تت خالصہ (Tat

(Khalsa) گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ 1721 میں، بھائی منی سنگھ (Mani Singh) سکھوں کے درمیان اس تقسیم کو دور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد میں، 1784 میں، کپور سنگھ فیض اللہ پوریا نے سکھوں کو سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی سطح پر متحد کرنے کے ارادے سے دل خالصہ (Khalsa) قائم کیا۔ خالصہ کے پورے افرادی قوت کا استعمال ترونا دل (Taruna Dal) یعنی نوجوانوں کی فوج اور بڈھا دل (Budha Dal) یعنی تجربہ کاروں کی فوج کی تشکیل کے لیے کیا جاتا تھا۔ پنجاب نے مغلوں کے زوال اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے نتیجے میں بہت زیادہ بدامنی اور عدم استحکام دیکھا۔ ان سیاسی حالات نے منظم دل خالصہ کو اپنے استحکام کو مزید گہرا کرنے میں مدد دی۔ سکھ مسلوں میں متحد ہو گئے، جو جمہوری طور پر حکومت کی جانے والی فوجی برادری تھی۔ عربی اصطلاح مسل، جس کے معنی 'برابر' یا 'یکساں' استعمال ہوتے ہیں۔ مسل 'ریاست' کے بھی مترادف لفظ ہے۔ مشرق میں سہارنپور سے لے کر مغرب میں اٹک تک، شمال میں پہاڑی علاقوں سے لے کر جنوب میں ملتان تک، 1763 سے 1773 کے درمیان پنجاب کے علاقے پر متعدد سکھ سرداروں کے تحت کئی مسلوں نے حکومت قائم کی۔

نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے نیز پنجاب کے نظم و نسق کے منتشر ہو جانے کی وجہ سے سکھوں کو ایک دفعہ پھر سر اٹھانے کا موقع ملا۔ حملہ آور فوج کے حملوں اور لوٹ مار کے بعد انہوں نے بھی خوب لوٹ مار کی اور دولت اور فوجی طاقت دونوں ہی جمع کر لی اور جب ابدالی پنجاب سے واپس گیا تو انہوں نے سیاسی خلا کو پر کر دیا۔ 1765ء سے 1800ء تک کے دور میں انہوں نے پنجاب اور جموں کو اپنے اقتدار میں لے لیا۔ سکھ قوم 12 مسلوں یعنی بارہ جتھوں میں بٹی ہوئی تھی جو صوبے کے مختلف علاقوں میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے تھے۔ ان کی بنیاد مساوات کے اصولوں پر تھی اور مسل کے ہر ممبر کو مسل کے معاملات اور سردار وغیرہ کے انتخاب میں رائے دینے کا یکساں حق تھا۔ مسل کا جمہوری اور عوامی کردار رفتہ رفتہ غائب ہو گیا اور ان پر طاقتور جاگیرداروں اور زمینداروں کا تسلط بڑھتا چلا گیا۔ یہ سردار مسلسل ایک دوسرے سے جھگڑا کرتے رہتے تھے اور خود کو برتر اور خود مختار ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خالصہ برادری اور یکجہتی کا رجحان دیکھتے دیکھتے ختم ہو گیا۔

7.3 رنجیت سنگھ اور سکھ ریاست کا قیام

(Ranjit Singh and the Establishment of the Sikh State)

7.3.1 رنجیت سنگھ (Ranajit Singh)

سکھ سلطنت کا پہلا مہاراجہ، جس نے انیسویں صدی کے پہلے نصف میں شمال مغربی برصغیر پر حکومت کی، رنجیت سنگھ تھا، جسے شیر پنجاب بھی کہا جاتا ہے۔ وہ پاکستانی پنجاب میں 2 نومبر 1780 کو سکھ وفاق کی سوکرچاکیا مسل کے سربراہ مہان سنگھ کے یہاں پیدا ہوئے۔ 1801 میں اس نے 12 سکھ مسلوں کو متحد کیا اور کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ختم کر کے خود کو 'پنجاب کے مہاراجہ' کے طور پر قائم کیا۔ اس نے متعدد افغان چھاپوں کو کامیابی کے ساتھ ناکام بنا کر لاہور، پشاور اور ملتان جیسے شہروں کو فتح کیا گیا۔ اس کا دارالحکومت لاہور تھا۔

شمال مغرب میں اس کی سکھ سلطنت ہمالیہ کے جنوب اور دریائے ستلج کے شمال تک پھیلی ہوئی تھی۔اس کی سلطنت میں لاہور، ملتان، سری نگر (کشمیر)،اٹک، پشاور، راولپنڈی، جموں، سیالکوٹ، امرتسر اور کانگڑا شامل تھے۔اس نے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ روابط رکھے۔رنجیت سنگھ کی انتظامیہ کی نمایاں خصوصیات، اصلاحات، جدید کاری، بنیادی ڈھانچے پر سرمایہ کاری، اور عام خوشحالی تھی۔اس کی خالصہ فوج اور حکومت میں سکھ، ہندو، مسلمان اور یورپی شامل تھے۔اس کی میراث میں امرتسر میں ہر مندر صاحب کے ساتھ ساتھ دیگر قابل ذکر گرودواروں کی تعمیر نو شامل ہے، جیسے بہار میں تخت سری پٹنہ صاحب اور مہاراشٹر میں حضور صاحب نانديڑ وغیرہ۔اس کی میراث میں سکھ ثقافتی اور تخلیقی نشاۃ ثانیہ کا دور بھی شامل ہے۔اس کی فوج میں مختلف نسلی اور مذہبی پس منظر کے سپاہی تھے اور جنگ، رسد اور بنیادی ڈھانچے کے لحاظ سے اس کی فوج کافی موثر تھی۔

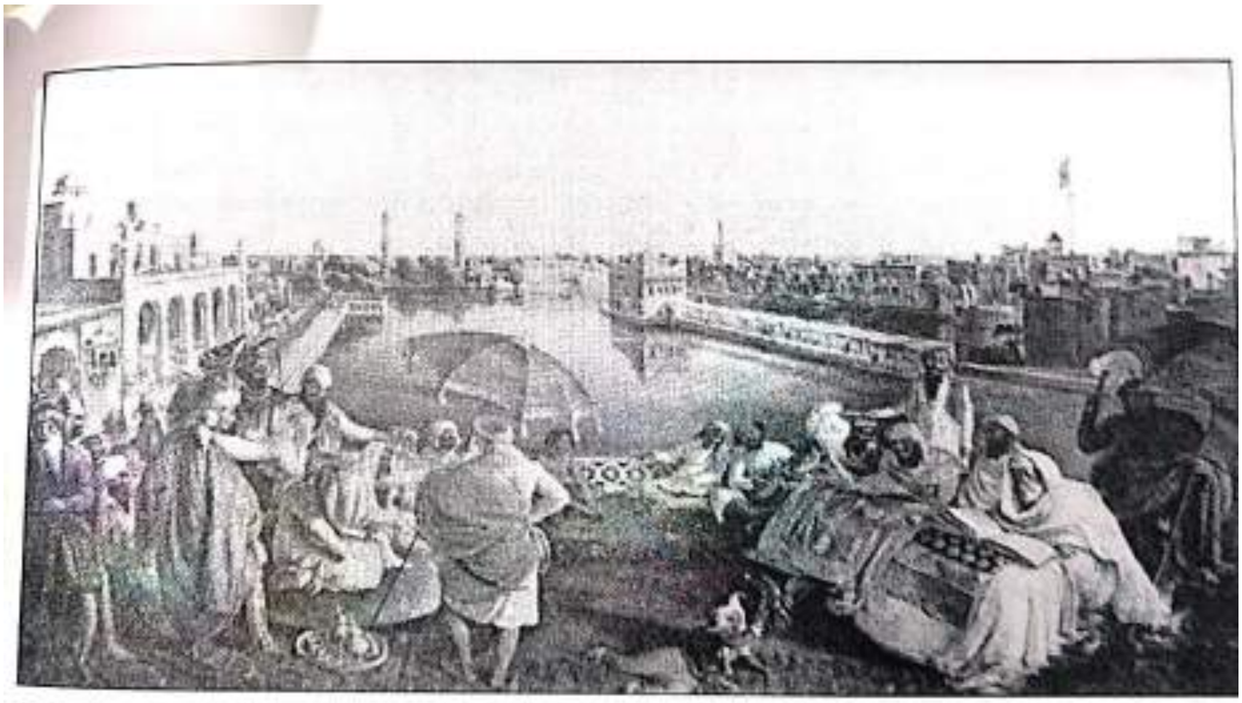

5. Maharaja Ranjit Singh listening to the Guru Granth Sahib being recited near the Golden Temple, Amritsar. Oil painting by August Schoefft, Vienna, c. 1850, based on sketches made earlier in Amritsar

SOURCE: PATWANT SINGH, THE SIKHS, RUPA, NEW DELHI, 2002.

7.3.2 سکھ مسلیں (Sikh Misls)

رنجیت سنگھ کی پیدائش کے وقت 12 اہم سکھ مسلیں تھیں اہلوو الیہ (Ahluwaliya)، دلے والیہ (Dallewalia)، بھنگی (Bhangi)، فیض اللہ پوریہ (Faizullapuria)، کنہیا (Kanhaiya)، کرورا سنگھیا (Krorasinghia)، نکئی (Nakkai)، نشانیہ (Nishaniya)، پھولکیا (Phulakiya)، رام گڑھیا (Ramgarhiya)، شہید (Shaheed) اور سکھر چکیا (Sukharchakiya)۔ مسل کی بنیادی حکومت 'گرومت سنگھ' کے ہاتھ میں تھی جو کہ بنیادی طور پر ایک سیاسی، سماجی اور

اقتصادی ادارہ تھا۔ مہان سنگھ، ایک سو کر چکیا مسل کا حکمران اور رنجیت سنگھ کا باپ تھا۔ جب مہان سنگھ کا انتقال ہوا تو رنجیت سنگھ کی عمر صرف 12 سال تھی۔ تاہم، رنجیت سنگھ نے ابتدائی دور سے سیاسی تدبر کا مظاہرہ کیا۔ سو کر چاکیا کے علاوہ 18 ویں صدی کے آخر تک تمام بڑی مسلیں ٹوٹ چکی تھیں۔

18 ویں صدی کے آخر میں رنجیت سنگھ سو کر چاکیہ مسل کا سردار بنا۔ اس نے 1799ء میں لاہور اور 1802ء میں امرتسر فتح کیا اور جلد ہی دریائے ستلج کے مغربی علاقے کے سکھ سرداروں کو زیر کر کے پنجاب میں اپنی ریاست قائم کی۔ کچھ عرصے بعد کشمیر، پشاور اور ملتان بھی فتح کر لیے اور پرانے سکھ سرداروں کو بڑی بڑی جاگیروں کا جاگیر دار اور زمین دار مقرر کر دیا۔ رنجیت سنگھ نے زرعی مالگزاری کے مغل ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ زمین کا محصول کل پیداوار کے پچاس فیصدی کے حساب سے جمع کیا جاتا تھا۔ رنجیت سنگھ نے یورپ کے فوجی ماہرین کی مدد حاصل کر کے یوروپی فوجوں کی طرز پر ایک طاقت ور تربیت یافتہ اور جدید ہتھیاروں سے لیس فوج تیار کی۔ ان کی یہ نئ فوج صرف سکھوں تک محدود نہیں تھی۔ رنجیت سنگھ نے اس فوج میں گورکھوں، بہاریوں، اڑیسہ کے شہریوں، پٹھانوں، ڈوگروں اور پنجابی مسلمانوں کو بھی بھرتی کیا۔ بندوق سازی کے لیے لاہور میں کارخانے قائم کیے اور ان میں کام کرنے کے لیے مسلمان بندوق سازوں کو ملازم رکھا۔ کہتے ہیں کہ ان کی فوج ایشیا بھر میں دوسرے نمبر پر تھی۔ صرف برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج ان کی فوج سے بہتر تھی۔

اپنے وزیروں حاکموں اور صوبیداروں وغیرہ کے انتخابات کے سلسلے میں رنجیت سنگھ کی نظر بہت گہری تھی۔ ان کے دربار میں غیر معمولی شخصیتوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ مذہبی معاملات میں وہ آزاد خیال اور روادار تھے۔ وہ نہایت پختہ عقیدے کے سکھ تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے تخت سے اتر کر اپنی سفید داڑھی سے مسلمان فقیروں کے قدموں کی گرد صاف کرتے تھے۔ ان کے اکثر اہم وزیر اور کمان دار ہندو اور مسلمان تھے۔ ان کے سب سے ممتاز اور قابل اعتماد وزیر فقیر عزیزالدین اور وزیر مالیات دیوان ویناناتھ تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں پنجاب کی ریاست کسی طرح بھی سکھ ریاست نہیں تھی سیاسی اقتدار صرف سکھوں کے مفاد کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ سکھ سردار اور زمینداروں کا برتاؤ سکھ کسانوں کے ساتھ بھی ویسا ہی ظالمانہ تھا جیسا مسلمان یا ہندو کسانوں کے ساتھ تھا۔ دراصل رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں ریاست پنجاب کا ڈھانچہ ویسا ہی تھا جیسا کہ 18 ویں صدی کی دوسری ہندوستانی ریاستوں کا تھا۔

7.3.3 انگریز اور رنجیت سنگھ (The British, and Ranajit Singh)

زمینی راستے سے ہندوستان پر متحدہ فرانسیسی-روسی حملے کے خیال نے انگریزوں کو سرگرداں کر دیا۔ 1807 میں لارڈ منٹو نے چارلس میٹکاف کو لاہور بھیجا تھا۔ اس شرط پر کہ سکھ-افغان تصادم کے معاملے میں انگریز غیر جانبدار رہیں گے اور رنجیت سنگھ کو سیس-ستلج صوبوں(Cis-Sutlej States) سمیت پورے پنجاب کا حکمران تسلیم کریں گے۔ رنجیت سنگھ نے جارحانہ اور دفاعی کارروائی کے لیے میٹکاف کی اس معاہدہ کی تجویز کو قبول کیا۔ تاہم مذاکرات ناکام ہوئے۔ رنجیت سنگھ نے معاہدہ امرتسر (25 اپریل 1809) کی کمپنی کے ساتھ توثیق کرنے کا فیصلہ ایک نئے سیاسی ماحول کے درمیان کیا جس میں انگریزوں نے زیادہ غلبہ حاصل کر لیا تھا اور نپولین کا خطرہ کم ہو گیا تھا۔

7.3.4 امر تسر معاہدہ (Treaty of Amritsar, 1809)

امر تسر معاہدہ اپنے فوری اور ممکنہ اثرات کے لیے اہم تھا۔ اس نے رنجیت سنگھ کو اپنے سب سے قیمتی اہداف میں سے ایک کو حاصل کرنے سے روک دیا، جو کہ دریائے ستلج کو اس کے اور کمپنی کے علاقے کے درمیان حد کے طور پر مقرر کر کے پوری سکھ آبادی پر اپنی حکمرانی قائم کرنا تھا۔ اس نے پشاور (1819)، کشمیر (1819) اور ملتان (1818) کو لے کر اپنی توجہ مغرب کی طرف موڑ دی۔ جون 1838 میں انگریزوں کے ساتھ سہ فریقی معاہدے کی توثیق کرنے کے لیے سیاسی دباؤ پر مجبور ہونے کے باوجود، رنجیت سنگھ نے برطانوی فوجیوں کو افغان امیر دوست محمد کے علاقے میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ رنجیت سنگھ اور کمپنی کے درمیان 1809 اور 1839 کے درمیان ہونے والے معاملات واضح طور پر مؤخر الذکر کی نازک صورتحال کو ظاہر کرتے ہیں۔ اپنی خطرناک پوزیشن سے آگاہ ہونے کے باوجود اس نے دوسرے ہندوستانی حکمرانوں کے ساتھ اتحاد بنانے یا طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ 1809ء میں برطانوی فوجوں نے رنجیت سنگھ پر ستلج پار کرنے کی پابندی لگادی اور دریا کے مشرق کی ریاستوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ رنجیت سنگھ خاموش رہے کیونکہ انہیں اندازہ تھا کہ وہ برطانیہ کی طاقت کے سامنے ٹک نہیں سکیں گے۔ اس طرح اپنے سیاسی تدبر، حقیقت پسندی اور فوجی طاقت کی وجہ سے انہوں نے اپنی ریاست کو وقتی طور پر انگریزوں کے چنگل سے بچا لیا۔ لیکن غیر ملکی خطرے سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ یہ خطرہ توان کے جانشینوں کو جیسے ورثے میں ملا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کی موت کے بعد، ریاست میں اقتدار کے لیے رسہ کشی اور لڑائیاں شروع ہوئیں تو انگریز اندر گھس آئے اور پنجاب فتح کر لیا۔ 1839 میں اس کے انتقال کے بعد، اس کے مختلف رشتہ داروں کے درمیان اقتدار کے لیے جدوجہد شروع ہو گئی۔ اس سے سلطنت کے زوال کا آغاز ہوا۔ جون 1839 میں جب رنجیت سنگھ کا انتقال ہو گیا تو اس کی سلطنت کا تیزی سے زوال شروع ہو گیا۔ اس کے قانونی وارث بڑے بیٹے، کھڑک سنگھ نے جانشین کے طور پر عہدہ سنبھالا۔ رنجیت سنگھ کا اکلوتا بیٹا اور وارث کھڑک سنگھ، رنجیت سنگھ کے بعد حالات کو نہیں سنبھال سکا اور اس کے مختصر دور میں، شاہی دربار میں پھوٹ نظر آنے لگی۔

7.3.5 رنجیت سنگھ کے بعد پنجاب (Punjab after Ranajit Singh)

1839 میں کھڑک سنگھ کی قبل از وقت موت اور اس کے بیٹے شہزادہ نونہال سنگھ کے حادثاتی قتل کے نتیجے میں پنجاب بدامنی کا شکار ہو گیا۔ تخت لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے کئی تنظیموں کی سازشوں اور جوابی منصوبوں نے انگریزوں کو زبردستی حملہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ انگریزی کمپنی کے ساتھ اپنی دوستی کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے، لاہور حکومت نے برطانوی افواج کو دو بار اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت دی: ایک بار افغانستان جاتے ہوئے اور ایک بار پھر اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے واپسی پر۔ پنجاب میں ان فوجی آمدورفت نے بدامنی اور معاشی مشکلات کو جنم دیا۔ نونہال سنگھ کے انتقال کے بعد، رنجیت سنگھ کے دوسرے بیٹے شیر سنگھ نے اقتدار سنبھالا، لیکن وہ 1843 کے آخر میں مارا گیا۔ اس کے فوراً بعد، رنجیت سنگھ کے نابالغ بیٹے دلیپ سنگھ کو مہاراجہ کے طور پر تاج پہنایا گیا، جس میں ہیرا سنگھ ڈوگرہ نے وزیر اور رانی جنداں نے ریجنٹ کے طور پر خدمات انجام دیں۔ محلاتی سازش کے نتیجے میں ہیرا سنگھ کو 1844 میں قتل کر دیا گیا۔ رانی جنداں کے بھائی اور نئے وزیر جواہر سنگھ نے فوری طور پر فوج کو غصہ دلا دیا اور اسے 1845 میں معزول کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اسی سال، تیجا سنگھ کو

فوج کا کمانڈر نامزد کیا گیا، جب کہ رانی جنداں کے خیر خواہ لال سنگھ نے اپنے مقصد کے لیے فوج کو اپنے ساتھ ملا لیا اور وزیر کا عہدہ حاصل کر لیا۔

7.4 پہلی انگریز-سکھ جنگ (The First Anglo–Sikh War, 1845–46)

7.4.1 پس منظر (Background)

رنجیت سنگھ ایک ماہر سیاست دان تھا، جس نے انگریزوں کے ساتھ ایک مشکل اتحاد برقرار رکھا، جب کہ کسی بھی ممکنہ جارحیت کو روکنے کے لیے اپنی فوج کی طاقت میں اضافہ کیا۔ تاہم، جب 1839 میں ان کا انتقال ہو گیا تو پنجاب افراتفری کا شکار ہو گیا، جس کا سبب کمزور اور قلیل مدتی حکمرانوں کا پے در پے تخت نشین ہونا تھا اور جن میں سے کچھ کو قتل بھی کر دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی دوسرا اہم سبب خالصہ فوج اور شاہی دربار کے درمیان بڑھتا ہوا تناؤ تھا۔ بالآخر کمسن دلیپ سنگھ کو مہاراجہ کے طور پر تخت نشین کیا گیا اور اس کی ماں رانی جند کور کو ریجنٹ کے طور پر مقرر کیا گیا۔ رانی کے بھائیوں نے ایک اہم فوجی افسر کو قتل کرنے کی کوشش کی جو کہ ناکام رہی نتیجتاً رانی کے بھائی کو دربار میں سب کے سامنے قتل کر دیا گیا۔ رانی نے انتقام کی قسم کھائی اور لڑائی کی تیاری شروع کر دی۔ اس خرابی کو تشویش کے ساتھ دیکھتے ہوئے، انگریزوں نے پنجاب کی سرحدوں پر اپنی فوجیں بھیجنا شروع کر دیا اور فیروزپور میں اپنی چھاؤنی کو مضبوط کیا۔ کچھ برطانوی حکام جنگ کی امید رکھتے تھے اور یہ مانتے تھے کہ سکھ ہی واحد باقی ماندہ طاقت ہیں جو ہندوستان پر ان کے قبضے کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔

7.4.2 خالصہ (Khlasa)

سکھ فوج، خالصہ (لفظی طور پر 'خالص')، غالباً برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں کی سب سے زیادہ طاقتور مخالف تھی۔ یہ یورپی تربیت یافتہ باقاعدہ دستوں کے ساتھ روایتی ہندوستانی بے قاعدہ گھڑ سوار اور پیادہ فوج پر مشتمل تھی۔ مؤخرالذکر نے برطانوی فوج اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں کی طرح سرخ کوٹ بھی پہن رکھے تھے۔ سکھ توپ خانہ خاص طور پر اعلیٰ معیار کا تھا، لیکن اس کے سوار دستوں میں اکثر نظم و ضبط کا فقدان تھا۔ اگرچہ اس میں ہندو اور مسلم پنجابی اور کشمیری فوجیوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت تھی، لیکن اس کے فوجیوں کی اکثریت سکھوں کی تھی جو خود کو سکھ قوم اور مذہب کا حقیقی علمبردار سمجھتے تھے۔ خالصہ کے اندر کچھ دھڑے، جو کہ تصادم کو ناگزیر سمجھتے تھے، انہیں پہلی افغان جنگ (1839-42) میں حالیہ برطانوی ہزیمت اور اس کے خلاف افغان مزاحمت سے حوصلہ ملا۔

7.4.3 جنگ کے اسباب (Causes of the Battle)

خالصہ فوج کی بڑھتی ہوئی طاقت بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ پہلی سکھ جنگ کی بڑی وجہ خالصہ فوج تھی۔ رانی جند کور اور لال سنگھ کو خوف تھا کہ کہیں خالصہ فوج سکھ طاقت کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لے۔ یہ بات تھی بھی بالکل درست۔ پورے چھ سال تک خالصہ فوج اپنی مرضی کے مطابق راجہ کو مقرر کرتی رہی۔ کوئی بھی اس پر قابو نہ رکھ سکا۔ یہ فوج وہ فوج تھی جس نے رنجیت سنگھ کے زمانے میں مکمل پنجاب پر فتح حاصل کی تھی۔ لیکن اب جب کہ اس پر کوئی کنٹرول کرنے والا نہیں تھا۔ اس نے جس کو چاہا اس کو مارنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ اس نے کئی فرانسیسی افسروں کو نکال کر باہر کر دیا۔ اس پر قابو رکھنے کے لیے کئی طریقے سوچے گئے۔ لیکن کوئی حل نہ مل سکا۔ اب رانی جنداں اور لال

سنگھ کے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا تھااور وہ یہ کہ خالصہ فوج کو انگریزوں کے خلاف لڑایا جائے۔انہوں نے ایسااس لیے سوچا کہ اگر خالصہ فوج نے انگریزوں پر فتح حاصل کرلی تو یہ ہندوستان کے دیگر علاقوں کو فتح کرنے کے لیے آگے بڑھے گی،اور اگر ہار گئی تو اس کی طاقت خود بخود کم ہو جائے گی۔

خالصہ فوج کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے رانی جندان اور لال سنگھ نے ایک تجویز بنائی۔انہوں نے خالصہ فوج کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ انگریزوں نے اب پنجاب پر آنکھیں لگارکھی ہیں۔انہوں نے کہا کہ سندھ تو انگریزوں نے اپنی سلطنت میں ملا ہی لیا تھا اس لیے اب وہ پنجاب کو اپنی سلطنت مین ضرور ملائیں گے۔اس بات سے خالصہ فوج میں کچھ جوش آگیا۔ان دنوں انگریزوں نے ستلج دریا کے اس پار اپنی افواج کو جمع کرنا شروع کردیا تھا۔لدھیانہ کی فوجی چوکی میں انہوں نے 35000 سے بھی زیادہ فوجی سپاہی رکھ لیے تھے۔اتنے ہی سپاہی انہوں نے فیروزپور اور انبالہ میں رکھے ہوئے تھے۔انہوں نے سندھ میں بھی اپنی فوج میں اضافہ کرلیااور ستلج پار کرنے کے لیے کشتیوں کا ایک پل بنالیا۔ان سب باتوں سے خالصہ فوج کے افسروں کو یقین ہوگیا کہ انگریز پنجاب کو ہڑپ جانا چاہتے ہیں۔غصہ میں آکر خالصہ فوج نے 1845ء میں دریائے ستلج کو پار کرلیااور اس طرح پہلی سکھ جنگ شروع ہوگئی۔

7.4.4 جنگ کے واقعات (Events of the Battle)

سکھوں کی پہلی جنگ مدکی،فیروزشاہ،علی وال اور سبراؤن میں لڑی گئیں۔

مدکی کی لڑائی: مدکی کی لڑائی میں سکھوں کو شکست ہوئی۔اس کا بڑا سبب لال سنگھ کی دغابازی تھی۔وہ ٹھیک اس وقت میدان جنگ سے بھاگ نکلا جب کہ خالصہ فوج فتح یاب ہونے ہی والی تھی۔اس کے بھاگتے ہی سکھوں کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔اس لڑائی میں سکھوں کی شکست کی دوسری وجہ یہ تھی کہ انہوں نے سرجان لٹل کی زیر نگرانی لڑنے والے سات سو سپاہیوں کا خاتمہ نہ کیا جب کہ وہ ایسا کرسکتے تھے۔

فیروزشاہ کی لڑائی: 21دسمبر 1845ء کو لڑی گئی۔اسبار سکھوں نے بڑسخت مقابلہ کیا لیکن اس بار تیجا سنگھ میدان جنگ سے بھاگ نکلااور اس طرح سکھ اپنی جیتی ہوئی بازی پھر ہار گئے۔

بدھی وال کی لڑائی: فیروزشاہ کی لڑائی کے بعد خالصہ فوج کی رہنمائی کرنے والا کوئی اور سردار نہ رہا تھا۔اس لیے ایک ماہ تک لڑائی بند رہی لیکن پھر رنجھوڑ سنگھ کی رہنمائی میں انہوں نے 21جنوری 1846ء کو سرہنری اسمتھ کو بدھی وال کے مقام پر شکست دی۔رنجھوڑ سنگھ نے بدھی وال سے ڈیرہ تو اٹھالیا۔لیکن اس نے اپنے دشمن کا بھی پیچھا نہ کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ ہنری اسمتھ نے دوبارہ بدھی وال پر اپنا قبضہ کرلیا۔

علی وال کی لڑائی: علی وال کی لڑائی میں سکھ ہار گئے اور رنجھوڑ سنگھ مارا گیا۔

سبراؤن کی لڑائی: سبراؤن کی لڑائی ایک خونی لڑائی تھی۔کہتے ہیں کہ اس لڑائی میں سکھ سپاہیوں کے خون سے دریائے ستلج کا پانی بھی لال ہوگیا تھا۔اگرچہ سکھ بڑی بہادری سے لڑے۔لیکن یہاں بھی انہیں اپنے ہی لوگوں نے دھوکہ دیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس بار بھی انہوں نے شکست کھائی۔انگریز فوجیں لاہور کی طرف بڑھیں۔اور 20فروری 1846ء کو اسے اپنے قبضہ میں لے لیا۔مارچ 1846ء کو لاہور کے عہد نامہ پر دستخط ہوئی اور لڑائی ختم ہوگئی۔

7.4.5 جنگ کے نتائج (Consequences of the Battle)

لاہور صلح نامہ کی رو سے جو شرائط طے ہوئیں انہیں کو پہلی سکھ جنگ کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔اس عہد نامہ کی رو سے

1. دوآبہ بست جالندھر پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔
2. دلیپ سنگھ کو مہاراجہ بنایا گیا اور ایک کونسل بنائی گئی جس میں آٹھ سردار تھے۔
3. سر ہنری لارنس کو لاہور کا ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا
4. سکھوں کو ڈیڑھ کروڑ ہرجانہ کے طور پر دینا پڑا۔لیکن ان کے خزانہ میں 50 لاکھ روپیہ تھا۔باقی روپیہ انہوں نے جموں اور کشمیر کا علاقہ گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ کر پورا کیا۔
5. لاہور میں ایک انگریزی فوج رکھنے کا انتظام کیا گیا۔اس فوج کے 22 لاکھ روپیہ سالانہ خرچ کے لیے خالصہ دربار ذمہ دار تھا۔
6. سکھ فوج پہلے سے کم کر دی گئی۔اب صرف بیس ہزار پیدل سپاہی رہ گئے۔

7.5 دوسری انگریز-سکھ جنگ (The Second Anglo–Sikh War, 1848–49)

انگریزوں کے ساتھ سکھوں کی دوسری جنگ 1848ء میں ہوئی۔اس میں سکھ ہار گئے اور پنجاب کو انگریزی سلطنت میں ملا لیا گیا۔

7.5.1 جنگ کے اسباب (Causes of the Battle)

لاہور اور بھیرو وال کے عہد نامے سکھوں کی عزت پر ایک کراری چوٹ تھی ان عہد ناموں کے بعد سکھ ذلت کا احساس کرنے لگے تھے۔اس لیے اب اس موقعہ کی تلاش میں تھے جب اپنی بے عزتی کا بدلہ چکا سکیں۔1847ء اور 1848ء میں کچھ ایسی اصلاحات کی گئیں جو سکھوں کے فائدے کے منافی تھیں۔اس بات سے بھی سکھ بڑے جوش میں تھے۔جن سکھ فوجیوں کو فوج سے نکال دیا گیا تھا وہ اپنی تنخواہ اور دیگر بھتوں سے محروم ہو گئے تھے۔اس لیے وہ بھی انگریزوں سے بدلہ لینے کا موقع ڈھونڈتے تھے۔انگریزوں کے کچھ ایجنٹ سرحد کے کچھ قبیلوں سے بات چیت چلا رہے تھے۔سکھوں کو یہ بات اچھی نہ لگی۔انگریزوں نے مسلمانوں کو گائے کشی، نماز وغیرہ کی کئی سہولتیں دے رکھی تھیں۔سکھ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے۔رانی جنداں پر الزام لگا کر انگریزوں نے اسے جلاوطن کر دیا۔سکھوں نے اسے اپنی اور اپنی قوم کی بے عزتی خیال کیا۔رانی جنداں کو اپنے اختیارات کے چھن جانے کا بہت غصہ تھا۔وہ بھی اس بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔سکھوں کو اب بھی اپنی طاقت پر پورا بھروسہ تھا۔ان کا خیال تھا کہ پہلی وہ جنگ میں اپنے ساتھیوں کو غداری کے باعث ہارے تھے اس لیے وہ ایک بار پھر اپنے بازو آزمانا چاہتے تھے۔

7.5.2 جنگ کا فوری سبب (Immediate Reason for the Battle)

ملتان کے گورنر دیوان مولراج کی بغاوت تھی۔ایک چھوٹی سی بغاوت سارے ملک کی بغاوت کی شکل اختیار کر گئی۔انگریزوں نے ملتان کے گورنر دیوان سے پچھلے دس سالوں کا حساب مانگا۔لیکن وہ صرف پچھلے چار سالوں سے ملتان کا گورنر تھا۔اس سے دس سالوں کا حساب

مانگنا اسے تنگ کرنے والی بات تھی۔غصے میں آکر اس نے استعفی دے دیا۔انگریز ریذیڈنٹ نے سردار کاہن سنگھ کو مولراج سے حکومت سنبھالنے کے لیے بھیجا اس کے ساتھ دو انگریز افسر (اگنیو اور انڈرسن) بھی گئے۔مولراج نے 19۔اپریل 1848ء کو ملتان کا قلعہ ان کے حوالے کر دیا۔انگریز افسروں کو دیکھ کر ملتان کے عوام بھڑک اٹھے۔بیس اپریل کو عوام نے بغاوت کر دی۔اور انگریز افسروں کو قتل کر دیا۔اگر انگریز گورنمنٹ چاہتی تو اسی وقت کوئی نہ کوئی قوم اٹھا سکتی تھی۔لیکن اس نے مہینوں تک کوئی کاروائی نہ کی۔اس دوران سارا پنجاب بغاوت کی لپیٹ میں آگیا۔بغاوت کی آڑ لے کر 16 نومبر 1848ء کو انگریزی فوج میدان میں آڈٹی۔سکھ پہلے ہی سے تیار تھے۔اس طرح فریقین میں لڑائی شروع ہو گئی۔

7.5.3 واقعات (Events)

اس جنگ کے مشہور واقعات مندرجہ ذیل ہیں۔

رام نگر کی لڑائی: 16 اکتوبر 1848ء کو لارڈ گف نے دریائے راوی کو پار کیا اور 22 نومبر کو رام نگر کی لڑائی ہوئی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

ملتان کا محاصرہ: دسمبر 1848ء کو انگریزوں نے ملتان کا محاصرہ کر لیا۔بہادر سکھ ایک ماہ تک قلعہ کی حفاظت کرتے رہے۔لیکن جنوری میں انہیں جھکنا پڑا۔

چلیانوالہ کی لڑائی: 13 جنوری 1849ء کو چلیانوالہ میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔اگرچہ اس جنگ میں انگریزوں کی فتح ہوئی پھر بھی ان کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا اور ڈلہوزی نے خود کہا تھا 'ہمیں ایک بڑی بھاری فتح حاصل ہوئی ہے،ایک اور ایسی فتح ہماری کمر توڑ دے گی۔'

گجرات کی لڑائی: فروری 1849ء میں لڑی گئی۔اس کو توپوں کی لڑائی بھی کہتے ہیں کیونکہ اس لڑائی میں توپوں کا استعمال کھل کر کیا گیا۔ سکھ ہار گئے اور آخر کار 13 مارچ 1849ء کو جنگ ختم ہو گئی۔

7.5.4 جنگ کے نتائج (Consequences of the Battle)

25 مارچ 1849ء کو پنجاب انگریزی سلطنت میں ملا لیا گیا۔اور اس کے انتظام حکومت کے لیے تین افسروں کا ایک بورڈ قائم کیا گیا۔دلیپ سنگھ کی پچاس ہزار پونڈ سالانہ پنشن مقرر کی گئی اور اسے انگلینڈ بھیج دیا گیا۔مولراج پر مقدمہ چلا کر اسے کالے پانی بھیج دیا گیا۔

7.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ سکھوں کی پہلی جنگ 1845ء میں ہوئی اس جنگ کی بڑی وجہ خالصہ فوج تھی۔رانی جندان اور لال سنگھ کو خوف تھا کہ کہیں خالصہ فوج سکھ طاقت کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لے۔پورے چھ سال تک خالصہ فوج اپنی مرضی کے مطابق راجہ کو مقرر کرتی رہی۔کوئی بھی اس پر قابو نہ رکھ سکا۔خالصہ فوج کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے رانی جندان اور لال سنگھ نے ایک تجویز بنائی۔انہوں نے خالصہ فوج کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انگریزوں نے اب پنجاب پر آنکھیں لگا رکھی ہیں۔انہوں نے کہا کہ سندھ تو انگریزوں نے اپنی حکومت میں ملا ہی لیا تھا اس لیے اب وہ پنجاب کو اپنی سلطنت میں ضرور ملائیں گے۔اس بات سے خالصہ فوج میں کچھ جوش

آگیا تھا۔ سکھوں کی پہلی جنگ کی مشہور لڑائیاں مدکی، فیروز شاہ، علی وال اور سبراؤن میں لڑی گئیں۔ لاہور کے صلح نامہ کی رو سے جو شرائط طے ہوئیں انہیں کو پہلی سکھ جنگ کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کو مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ سکھوں کی دوسری جنگ 1848ء میں ہوئی۔ یہ جنگ سکھوں اور انگریزوں کے درمیان ہوئی۔ اس میں سکھ ہار گئے اور پنجاب کو انگریزی سلطنت میں ملا لیا گیا۔ دوسری اینگلو سکھ جنگ کی فوری وجہ یہ تھی کہ ملتان کے گورنر دیوان مولراج کی بغاوت تھی۔ ایک چھوٹی سی بغاوت سارے ملک کی بغاوت کی شکل اختیار کر گئی انگریزوں نے ملتان کے گورنر دیوان مولراج سے پچھلے دس سالوں کا حساب مانگا۔ لیکن وہ صرف پچھلے چار سالوں سے ملتان کا گورنر تھا۔ اس سے دس سال کا حساب مانگنا اسے تنگ کرنے والی بات تھی۔ اس جنگ کے واقعات میں رام نگر کی لڑائی، چلیانوالہ کی لڑائی اور گجرات کی لڑائی وغیرہ شامل ہیں بالآخر مولراج پر مقدمہ چلا کر اسے کالے پانی بھیج دیا گیا۔

7.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

جتھا	:	گروہ، جماعت
مساوات	:	برابری
خالصہ	:	سکھ فوج یا جنگجوؤں کا گروہ
بندئی	:	(Bandai) خالصہ میں آزاد خیال گروہ
تت خالصہ	:	(Tat Khalsa) خالصہ میں روایتی اور قدامت پسند گروہ
ترونا دل	:	(Taruna Dal) نوجوانوں کی فوج
بڈھا دل	:	(Budha Dal) تجربہ کاروں کی فوج

7.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

7.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. رنجیت سنگھ کس مسل کے سردار تھے؟
2. سکھ کس مذہبی رہنما کے پیروکار تھے؟
3. سکھوں کی پہلی جنگ کب ہوئی؟
4. سکھوں کی پہلی جنگ کس انگریز لارڈ کے عہد میں ہوئی؟
5. رانی جندان کون تھیں؟
6. دوسری سکھ جنگ کب ہوئی؟
7. دیوان مولراج کون تھا؟

8. لاہور صلح نامہ کب ہوا؟

9. رام نگر کی لڑائی کب ہوئی؟

10. گجرات کی لڑائی کا دوسرا نام کیا ہے؟

7.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سکھ قوم کے عروج کے بارے میں بتائیے۔
2. سکھوں کی پہلی جنگ پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. لاہور صلح نامہ کو بیان کیجیے۔
4. سکھوں کی دوسری جنگ پر روشنی ڈالیے۔
5. سکھوں کی دوسری جنگ کی فوری وجہ بیان کیجیے۔

7.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سکھوں کے عروج کے بارے میں تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. سکھوں کی پہلی جنگ کے بارے میں بالتفصیل جائزہ لیجیے۔
3. سکھوں کی دوسری جنگ کو مفصل لکھیے۔

7.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Cunningham, Joseph Davey, *History of the Sikhs*, Rupa, New Delhi, 2002 (first pub. in 1848).
2. Malcolm Lieutenant-Colonel, *Sketch of the Sikhs*, Prithipal Singh Kapur ed., Satvic Books, Amritsar, 2007 (first pub. in 1812).
3. Singh, Khushwant, *A History of the Sikhs*, 1469–1839, Vol. I, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. in 1963).
4. Singh, Khushwant, *A History of the Sikhs*, 1839–2004, Vol. II, Oxford University Press, New Delhi, 2022 (first pub. in 1963).
5. Singh, Khushwant, *The Fall of the Kingdom of the Punjab*, Penguin, New Delhi, 2014 (first pub. in 1962).
6. Singh, Khushwant, *The Sikhs*, HarparCollins, Noida, 2019 (first pub. in 2006).
7. Singh, Patwant, *The Sikhs*, Rupa, New Delhi, 2002 (first pub. in 1999).

اکائی 8۔ دوہرا نظام حکومت اور دیوانی اختیارات کی تفویض

(Dual System of Government and the Assumption of the Diwani Rights)

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 بنگال پر برطانوی قبضہ

8.3 بنگال کے نظم و نسق کا دوہرا نظام

8.4 اکتسابی نتائج

8.5 کلیدی الفاظ

8.6 نمونہ امتحانی سوالات

8.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

8.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

8.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

8.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید (Introduction)

3 مارچ 1707ء کو اورنگ زیب نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کے وفات کے فوراً بعد مغلیہ سلطنت نہایت تیزی سے زوال پذیر ہو گئی اور ملک کے مختلف حصوں میں گورنروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مراٹھوں اور سکھوں کے طور پر نئی سیاسی طاقتیں بھی ہندوستان کے سیاسی افق پر ابھر آئیں۔ اسی دوران ہندوستان میں ایک نئی طاقت نے اپنے قدم جمانے شروع کر دیے۔ یہ کوئی باہر سے آنے والے حملہ آور حکمراں نہیں تھے، بلکہ برطانیہ کی ایک تجارتی کمپنی تھی جو ملکہ برطانیہ سے ایک چارٹر یا قانون نامے کے ذریعے مشرق سے مسالوں کی تجارت کی اجارہ داری حاصل کر چکی تھی۔ ایسا بھی نہیں کہ یہ اکلوتی یورپی کمپنی تھی جو ایسا کر رہی تھی بلکہ وہاں اس وقت کئی اور تجارتی کمپنیاں جیسے ڈچ، فرانسیسی، پرتگالی وغیرہ بھی موجود تھیں جو مشرق کی تجارت کی اجارہ داری کے لیے آپس میں برسرپیکار تھیں۔ پھر ایسا کیا ہوا کہ 1800 آتے آتے برطانوی کمپنی سارے ہندوستان کی حکمراں بن گئی۔

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ حالات کا صحیح تجزیہ اور اس کے مطابق بروقت مناسب فیصلہ کرنے میں ماہر تھی، دوسری طرف دوسری کمپنیاں یا تو دوسری جگہوں میں زیادہ مصروف تھیں، یا پھر صرف تجارت ہی محدود رہیں یا پھر بروقت درست فیصلہ لینے کے بجائے اپنے ملک سے حکم نامے آنے کا انتظار کرتی رہیں۔ بہر کیف 1757 تک کمپنی سمجھ چکی تھی کہ صرف تجارت سے ہی اس کی دولت کی ہوس پوری نہیں کی جاسکتی کیونکہ رقیب کمپنیوں کی موجودگی میں انگریزوں کے پاس کوئی ایسا مال نہیں تھا جسے وہ ہندوستانیوں کو بیچ کر تجارت کا توازن اپنے حق میں کر سکتے۔ نتیجتاً انہوں نے انتظامی کمزوریوں کا فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ 1717 میں مغل شہنشاہ فرخ سیر سے کافی بیش قیمتی تحفے تحائف کے بدلے بنگال میں بناچنگی تجارت کا فرمان، کمپنی نے حاصل کیا، لیکن اس کا کمپنی کے ملازمین اور ان کے ہندوستانی نمائندوں نے ذاتی تجارت کے لیے غلط استعمال کیا۔ بنگال کے خزانے پر اس کا اثر پڑا اور بنگال کے نوابوں، جو اب خود مختار حکمراں بن چکے تھے، کو یہ بات قطعاً گوارا نہ تھی کہ سیاسی طور پر غیر اہم صرف ایک مرحوم مغل بادشاہ کے فرمان کے نام پر بنگال میں اس طرح کی دھوکہ دھڑی چلتی رہے۔ نوابوں کی طرف سے اسے روکنے کے نتیجے میں پلاسی کی جنگ وقوع پذیر ہوئی۔ انگریز کمزور تھے اور اپنی کمزوری کو انہوں نے غداری سے دور کیا۔ نواب بننے کا لالچ اتنا بڑا تھا کہ میر جعفر اور میر مدن خود کو روک نہ پائے اور نتیجتاً نواب سراج الدولہ کہ طرف سے بہت تھوڑی سی فوج ہی جنگ میں اتر سکی جسے انگریزوں نے آسانی سے ہرا دیا۔ اگلی جنگ بکسر کی تھی جب تک کمپنی بنگال کی لوٹ سے اتنی طاقتور ہو چکی تھی کہ اس نے روایتی ہندوستانی فوجیوں پر مشتمل بنگال اور اودھ کے نواب اور مغل بادشاہ کی مشترکہ فوجوں کو شکست فاش دی۔

اسی فتح کے بعد بنگال میں دوہرے طرز کی حکومت کی بنیاد پڑی۔ دوہری حکومت کا نظام بنگال میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے رابرٹ کلائیو نے متعارف کرایا تھا۔ یہ 1765 سے 1772 تک جاری رہا۔ اس نظام کے تحت بنگال کا نظم و نسق، نظامت اور دیوانی میں تقسیم تھا۔ دیوانی کمپنی کی طرف سے اور نظامت یا انتظامیہ کٹھ پتلی نواب کے سپرد کی گئی تھی۔ 1772 میں وارن ہیسٹنگز نے اس نظام کو ختم کر دیا۔ بنگال کو انگریزوں کے براہ راست کنٹرول میں لایا گیا اور بنگال کے نواب ایسٹ انڈیا کمپنی کے محض وظیفہ خوار بن کر رہ گئے۔ اس لوٹ کھسوٹ والے نظام سے کس طرح ہمارا ہندوستان متاثر ہوا۔ آئندہ صفحات میں ہم اس کا مطالعہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

8.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- اٹھارہویں صدی کی سیاسی تبدیلیوں کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- بنگال کی سیاسی صورتحال کے بارے میں بتا سکیں گے۔
- بنگال پر برطانوی قبضے کا جائزہ لے سکیں گے۔
- کمپنی کے ذریعے دیوانی حقوق کے حصول کو بیان کر سکیں گے۔
- بنگال میں دوہرے نظام حکومت پر روشنی ڈال سکیں گے۔

8.2 بنگال پر برطانوی قبضہ (British Occupation of Bengal)

ہندوستان پر برطانیہ کی سیاسی بالادستی کی ابتدا ایک طرح سے 1757ء کی پلاسی کی لڑائی سے ہوئی جس میں انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں نے بنگال کے نواب سراج الدولہ کو ہرادیا۔اس سے پہلے جنوبی ہند میں برطانیہ اور فرانس کی جھڑپیں اور لڑائیاں تو گویا فوجی مشقیں تھیں ،ان لڑائیوں سے جو سبق انگریزوں نے سیکھے تھے ان کا پورا فائدہ بنگال کی لڑائیوں میں اٹھایا۔

بنگال ہندوستان کی سب سے زیادہ زرخیز اور دولتمند ریاست تھی۔ یہاں صنعت اور تجارت نے بھی ترقی کی کافی منزلیں طے کی تھیں۔ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے ملازم اس ریاست میں تجارت سے بہت منافع حاصل کر رہے تھے۔ کمپنی نے 1717ء میں مغل سلطان کے ایک شاہی فرمان کے تحت یہاں بہت سی اہم اور کارآمد سہولتیں حاصل کرلی تھیں۔اس فرمان کے تحت کمپنی کو کھلی آزادی تھی کہ وہ بنگال میں کسی قسم کا ٹیکس ادا کیے بغیر تجارتی مال کی درآمد اور برآمد کرے اس قسم کے مال کی نقل وحمل کے لیے اسے دستک یعنی پاس جاری کرنے کی بھی اجازت تھی لیکن انہیں اس فرمان میں درج سہولتیں نہیں تھیں۔انہیں ہندوستانی تاجروں جتنا لگان دیناپڑتا تھا۔یہ فرمان کمپنی کے اور بنگال کے نوابوں کے درمیان جھگڑے اور کشیدگی کی ایک مستقل وجہ بن گیا تھا۔ کیونکہ اس کی بدولت بنگال سرکار کو لگان کا نقصان ہوتا تھا یہ نہیں بلکہ کمپنی کے سامان کی نقل وحرکت کے لیے اسے دستک (تجارتی لائسنس) جاری کرنے کا حق مل گیا تھا جس کا غلط استعمال ہو رہا تھا۔اس کی آڑ میں کمپنی کے ملازم بھی اپنی تجارت کو ٹیکس سے بچالیتے تھے۔ مرشد قلی خان سے لے کر علی وردی خان تک بنگال کے سبھی نوابوں کو 1717ء کے فرمان کی اس تشریح پر اعتراض تھا جو انگریز کیا کرتے تھے۔انہوں نے کمپنی کو مجبور کیا کہ وہ ان کے خزانوں کو یکمشت روپے ادا کرے اور دستک کے غلط استعمال پر بھی سختی سے روک لگائی۔اس سلسلے میں کمپنی کو نوابوں کے آگے جھکنا ہی پڑا، لیکن کمپنی کے ملازم نوابوں کے اقتدار اور احکام کی خلاف ورزی کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ اور جب 1756ء میں نوعمر اور تنک مزاج سراج الدولہ نے اپنے دادا علی وردی خان کی گدی سنبھالی تو حالات نے پلٹا کھایا اور سراج الدولہ نے مطالبہ کیا کہ انگریز انہیں شرائط پر تجارت کریں جن پر مرشد قلی خان کے زمانے میں کرتے تھے۔ لیکن انگریزوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ دکن میں فرانسیسیوں پر فتح پانے کے بعد اب انہیں اپنی

قوت کا بھرپور احساس ہو گیا تھا۔اپنے تجارتی مال واسباب پر نوابوں کو لگان دینے پر رضامند ہونے کا تو سوال ہی کیا انہوں نے تو کلکتہ پر ان کا قبضہ تھا۔ظاہر ہے ان تمام باتوں سے نو عمر نواب کی جھنجھلاہٹ اور غصہ مزید بڑھ گیا،یوں بھی انہیں شبہ تھا کہ کمپنی ان کے خلاف ہے اور بنگال کے تخت کے لیے ان کے دشمنوں اور رقیبوں کی پشت پناہی کر رہی ہے اور جب چندر نگر میں مقیم فرانسیسیوں سے لڑائی کے پیش نظر کمپنی نے نواب سے اجازت حاصل کیے بغیر کلکتہ کی قلعہ بندی شروع کر دی تو گویا پانی سر سے اونچا ہو گیا۔سراج الدولہ نے بجا طور پر کمپنی کے اس قدم کو اپنی خود مختاری اور اقتدار کے خلاف ایک حملہ تصور کیا۔ایک خود مختار حکمراں تاجروں کی ایک کمپنی کو یہ اجازت کیسے دے سکتا تھا کہ وہ خود اس کی سرزمین پر پرائیوٹ لڑائیاں لڑیں اور قلعہ بندی کریں۔مختصر یہ کہ سراج الدولہ یورپی لوگوں کو تاجروں کی حیثیت سے رہنے کی اجازت دینے کو تیار تھے لیکن مالک بن کر رہنے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتے تھے انہوں نے انگریزوں اور فرانسیسیوں دونوں کو حکم دیا کہ وہ کلکتہ اور چندر نگر میں اپنی قلعہ بندی کو مسمار کر دیں اور ایک دوسرے سے لڑنے سے باز رہیں۔فرنچ کمپنی نے ان کے حکم کے آگے سر جھکا دیا لیکن انگلش کمپنی نے حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ کرناٹک کی فتوحات نے اس خود اعتمادی کو دوچند کر دیا تھااور ان کی حرص وہوس بہت بڑھ چکی تھی۔اب کمپنی نے خود نواب کی مرضی کے خلاف بنگال میں قدم جمائے رکھنے کا اٹل فیصلہ کر لیا تھااور طے کر لیا تھا کہ وہ خود اپنی مرضی کے مطابق وہاں تجارت کرے گی۔کمپنی نے سلطنت برطانیہ کے اس حق کو تسلیم کر لیا تھا کہ وہ اس کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرے گی۔خاموشی سے ان تمام پابندیوں کو تسلیم کر لیا تھا جو اس کی تمام سرگرمیوں کو کنٹرول کرے گی۔خاموشی سے ان تمام پابندیوں کو تسلیم کر لیا تھا جو اس کی تجارت اور اقتدار کے سلسلے میں سلطنت برطانیہ نے انگلینڈ میں اس پر عائد کی تھیں۔1693ء میں برطانیہ کی پارلیمنٹ نے چارٹر واپس لے کر،مشرق میں تجارت کرنے کے اس کے حق کو چھین لیا حالانکہ اس نے تاج برطانیہ،پارلیمنٹ اور سیاست دانوں کو بے تحاشہ رشوت دی تھی(صرف ایک ہی سال میں کمپنی کو 80 ہزار پاؤنڈ رشوت میں دینا پڑے تھے۔لیکن اسی انگلش کمپنی نے نواب بنگال کے احکام کی پروانہ کرتے ہوئے بنگال میں پوری آزادی سے تجارت کرنے کے حق کا مطالبہ کیا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ کمپنی بنگال کے نواب کی خود مختاریت کو چیلنج کر رہی تھی۔اس صورتحال کو کون برداشت کر سکتا تھا۔سراج الدولہ ایک اعلی مدبر تھے اور وہ انگریزوں کی چال کے دور س نتائج کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ انگریزوں کو اپنی ریاست کے قوانین کا پابند بنا کر ہی دم لیں گے۔

سراج الدولہ نے ضروری تیاریاں کیے بغیر جلد بازی سے کام لیتے ہوئے نہایت جوش اور تندہی سے قاسم بازار میں انگریزوں کی فیکٹری پر قبضہ کر لیااور کلکتے کی طرف بڑھے،جہاں 20 جون 1756ء کو انہوں نے فورٹ ولیم پر قبضہ کر لیا لیکن اپنی اس آسان فتح کے نشے میں چور وہ اپنی فتح کا جشن منانے کلکتے سے چلے گئے۔اس طرح انگریزوں کو موقعہ مل گیااور وہ اپنے جہاز لے کر بچ نکلے۔یہ نواب کی غلطی تھی وہ دشمن کی طاقت کا صحیح اندازہ لگانے میں غلطی کر گئے۔انگریز افسروں نے سمندر کے نزدیک فلتا کے قریب پناہ لی جوان کی بحری فوج کی برتری کی وجہ سے پوری طرح محفوظ تھا۔یہاں رک کر انہوں نے ایک طرف تو مدراس سے آنے والی کمک کا انتظار کیا اور دوسری طرف نواب کے دربار کے خاص خاص لوگوں کے ساتھ مل کر سازشوں اور غداریوں کا جال بچھانا شروع کر دیا۔ان لوگوں میں مخصوص درباری میر جعفر،میر بخشی،کلکتے کے افسر انچارج مانک چند،ایک امیر تاجر امی چند،بنگال کا سب سے بڑا ساہوکار جگت سیٹھ اور نواب کی فوجوں کی ایک بڑی تعداد کے

کماندار خادم خان شامل تھے۔ مدراس سے بھی اڈمیرل واٹ سن اور کرنل کلائیو کی کلائیو کی کمان میں ایک بڑی بحری فوج پہنچ گئی۔ کلائیو نے 1757ء کے اوائل میں کلکتے کو دوبارہ فتح کیا اور نواب کو مجبور کیا کہ وہ انگریزوں کے تمام مطالبات کو مان لیں۔

بہر حال انگریز اب بھی مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے سراج الدولہ کے ہاں ایک کارآمد مہرہ پہنچانے کا منصوبہ بنایا۔ نو عمر نواب کے کچھ دشمن میر جعفر کو بنگال کے تخت پر بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انگریزوں نے بھی اس گروہ سے ساز باز کی اور کم عمر نواب کے سامنے ناقابل قبول مطالبوں کی لمبی فہرست رکھی۔ دونوں فریق جانتے تھے کہ اب ان کے درمیان فیصلہ کن لڑائی ہونا یقینی اور لازمی ہے۔ دونوں فوجیں 23 جون 1757ء کو مرشد آباد سے تقریباً تیس کلو میٹر دور پلاسی کے میدان میں آمنے سامنے ہوئیں۔ پلاسی کی فیصلہ کن لڑائی محض نام کی لڑائی تھی۔ انگریزوں کا کل ملا کر صرف 29 جانوں کا نقصان ہوا جب کہ نواب کے تقریباً 5 سو سپاہی میدان جنگ میں مارے گئے۔ نواب کی فوج کے بڑے حصے نے جس کی کمان غدار میر جعفر اور رائے درلبھ کے ہاتھ میں تھی جنگ میں حصہ لیا۔ نواب کی فوج کی صرف ایک چھوٹی سی ٹکڑی میر مدان اور موہن لال کی کمان میں بے جگری سے لڑی۔ نواب میدان جنگ سے بھاگنے پر مجبور ہوئے پکڑے گئے اور میر جعفر کے بیٹے میران کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔

پلاسی کی لڑائی کے بعد بنگالی شاعر نوین چندر سین کے لفظوں میں 'ہندوستان بھر میں ابدی اداسی کی اندھیاری رات چھا گئی۔' انگریزوں نے میر جعفر کے بنگال کا نواب بننے کا اعلان کیا اور اپنے انعامات حاصل کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ کمپنی کو بنگال، بہار اور اڑیسہ میں قطعی غیر مشروط تجارت کی مکمل آزادی دے دی گئی اور کلکتے کے نواح میں چوبیس پرگنا کی جاگیر بھی عطا ہوئی۔ میر جعفر نے کلکتے پر حملے کی تلافی کے طور پر کمپنی اور شہر کے تاجروں کو ایک کروڑ 77 لاکھ روپے کا ہرجانہ بھی دیا۔ اس کے علاوہ کمپنی کے اعلیٰ افسروں کو تحفوں اور رشوت کی شکل میں بڑی بڑی رقمیں ادا کیں۔ مثلاً کلائیو نے 20 لاکھ روپے سے زیادہ، اور واٹسن نے دس لاکھ سے زیادہ روپے وصول کیے۔ بعد میں کلائیو نے اندازا بتایا کہ کمپنی اور اس کے ملازموں نے سب ملا کر کچھ نہیں تو تین کروڑ روپے کٹھ پتلی نواب سے حاصل کیے ہوں گے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی طے ہو گیا کہ برطانوی تاجروں اور افسروں کو اب ذاتی تجارت پر کوئی ٹیکس نہیں دینا پڑے گا۔

پلاسی کی لڑائی کی تاریخی اہمیت بہت ہے اس لڑائی نے بنگال پر اور رفتہ رفتہ پورے ہندوستان پر برطانوی اقتدار اور قبضہ کا راستہ کھول دیا۔ اس نے برطانیہ کے رسوخ کو بہت اونچا اٹھایا اور گویا ایک ہی وار میں انہیں سلطنت ہند کے ایک اہم دعویدار کے رتبے پر لا کھڑا کیا۔ بنگال سے وصول ہونے والے بے حساب لگان کی بدولت انہوں نے ایک مضبوط فوج بنائی، اور ملک کے باقی علاقوں کو فتح کرنے کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل ہو گئے۔ بنگال پر اقتدار نے اینگلو، فرانسیسی لڑائیوں کے سلسلے میں بھی بہت اہم رول ادا کیا۔ مختصر یہ کہ پلاسی کی لڑائی میں فتح کی بدولت کمپنی اور اس کے ملازمین نے، بنگال کے بے سہارا عوام کا خون چوس کر بے حساب دولت کمائی۔ خود برطانوی مورخوں ایڈورڈ تھامسن اور جی۔ ٹی گاریٹ نے لکھا ہے:

> یہ بات واضح ہو گئی کہ ایک انقلاب کا خاکہ تیار کرنا دنیا کا سب سے زیادہ دلچسپ اور ثمر آور کھیل ہے۔ انگریز کے دماغوں پر سونا اور سونے کا ناقابل یقین لالچ بری طرح چھا گیا تھا، اس قسم کی طمع کی مثال صرف کورٹس اور پیزارو کے دور کے

ہسپانیوں کے ہاں نظر آتی ہے اور بنگال کو تو اس کے بعد امن اور چین کا سانس لینا اس وقت تک نصیب ہی نہیں ہوا جب تک کہ اس کی دولت و ثروت کو اچھی طرح لوٹ نہ لیا گیا۔

حالانکہ میر جعفر آج جو کچھ بھی بنا تھا انگیریزوں کے بدولت بنا تھا لیکن جلد ہی اسے اپنی سودے بازی پر پچھتاوا ہونے لگا۔ کمپنی کے افسروں کے انعامات اور رشوت کے مستقل مطالبوں کی وجہ سے میر جعفر کا خزانہ تیزی سے خالی ہو رہا تھا۔ یہ مطالبے کرنے والوں میں آگے آگے کلائیو خود تھا۔ کرنل مالیسن کے الفاظ میں کمپنی کے افسران کا واحد مقصد تھا:-زیادہ سے زیادہ دولت قبضے میں کرنا اور میر جعفر کو سونے کا ایسا خزانہ سمجھنا کہ جب چاہو زیادہ سے زیادہ سونا اور دولت اگلوالو۔ کمپنی پر خود ہی حرص و ہوس کا بھوت سوار تھا۔ کمپنی کو تو جیسے یقین ہو گیا تھا کہ ان کے ہاتھ تو کام دھینو گائے لگ گئی جس سے جتنی دولت چاہو بٹور لو کیونکہ بنگال کی دولت کا تو کوئی اختتام ہی نہیں ہے چنانچہ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے احکام صادر کیے کہ مدراس اور بمبئی کے صوبوں کے بھی تمام اخراجات کی ذمہ داری بنگال اٹھائے اور بطور مالگزاری کے ہندوستان تجارت کرنے کا حق تھا، بلکہ اس کا حق بھی تھا کہ وہ بنگال کے نواب کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر اس صوبے کی تمام تر دولت حاصل کرلے۔ میر جعفر کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ کمپنی اور اس کے افسروں کے تمام تر مطالبات پورا کرنا ناممکن ہے۔ ادھر کمپنی کے افسران بھی نواب پر انگلی اٹھا رہے تھے کہ وہ ان کی ضرورت پوری نہیں کر پا رہا۔ چنانچہ 1760ء میں انہوں نے میر جعفر کو مجبور کیا کہ وہ اپنے داماد میر قاسم کے حق میں تخت سے دست بردار ہو جائے اور میر قاسم نے خوش ہو کر اپنے کرم فرماؤں کو بردوان، میدنا پور اور چٹا گانگ ضلعوں کی زمین داری بھی بخشی اور کمپنی کے اعلیٰ افسروں کو تقریباً 29 لاکھ روپے کی مالیت کے انعامات بھی پیش کیے۔

بہر حال انگریزوں کی امید کے بر خلاف میر قاسم بہت جلد ان کے لیے ایک خطرہ اور بنگال میں ان کی چالوں کی راہ میں ایک رکاوٹ بن گئے۔ وہ ایک قابل، کار گزار اور طاقت ور حکمراں تھے اور غیر ملکی کنٹرول اور اقتدار سے آزادی حاصل کرنے کا پکا ارادہ کر چکے تھے۔ انہیں بخوبی اندازہ تھا کہ اپنی خود مختاری قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کا خزانہ بھرا رہے اور فوج مستعد ہو۔ اس لیے انہوں نے عوام میں افرا تفری کو روکنے، لگان کے انتظامیہ کی بدعنوانیوں کو ختم کر کے آمدنی بڑھانے اور یورپی طرز کی جدید، تربیت یافتہ اور منظم فوج تیار کرنے کے لیے تمام ممکن ضروری اقدام کیے۔ انگریز ان اقدامات سے قطعی خوش نہیں تھے۔ سب سے زیادہ خفا تو وہ اس بات سے تھے کہ نواب 1717ء کے فرمان کے ناجائز استعمال کی روک تھام کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے جب کہ اس فرمان کا ناجائز فائدہ اٹھانے والے کمپنی کے افسروں کا مطالبہ تھا کہ ان کے سامان پر خواہ وہ برآمد کے لیے ہو، خواہ ملک کے اندر فروخت کے لیے ہو، کسی قسم کا لگان یا چنگی نہ لگے۔ اس کی وجہ سے ہندوستانی تاجروں کی کمر ٹوٹ سی گئی تھی، کیونکہ انہیں چنگی ادا کرنا پڑتی تھی جب کہ غیر ملکی تاجر اس سے پوری طرح بری تھے۔ یہی نہیں، بلکہ کمپنی کے ملازم کمپنی کے (پاس) دستک چوری چھپے ان ہندوستانی تاجروں کے ہاتھ بیچ دیتے تھے۔ جن سے ان کی دوستی تھی اور اس طرح وہ تاجر بھی چنگی کی رقم ادا کرنے سے صاف بچ جاتے تھے۔ ان بد عنوانیوں کی وجہ سے ایماندار ہندوستانی تاجر اس لیے نقصان اٹھا رہے تھے کہ وہ مارکیٹ میں مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور ادھر نواب لگان کے ایک بہت ہی اہم وسیلے سے محروم ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ کمپنی اور اس کے افسر ہندوستانی افسروں اور زمینداروں کو مجبور کر کے بڑے بڑے تحفے اور رشوتیں حاصل کرتے تھے۔ وہ ہندوستانی کسانوں، دستکاروں

اور تاجروں پر زبردستی کر کے ان کا سامان کوڑیوں کے مول خریدتے اور اپنی اشیاء انہیں دوگنی قیمت پر دیتے تھے۔انکار کرنے والوں پر سختی اور ظلم کرتے اور اکثر انہیں جیلوں میں ڈال دیتے۔ایک جدید انگریز مورخ پیئرسی دال سپیئر نے اس زمانہ کو کھلے بندوں، شرمناک، لوٹ کھسوٹ کا دور۔کہا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ بنگال کی مشہور دولت کی فراوانی اور خوشحالی آہستہ آہستہ تباہ اور برباد ہو رہی تھی۔

میر قاسم کو اندازہ تھا کہ اگر یہ بدعنوانیاں جاری رہیں تو نہ وہ کبھی بنگال کو مضبوط بنا سکیں گے۔اس لیے انہوں نے ایک انتہا پسندانہ قدم اٹھایا یعنی ملک کی اندرونی تجارت پر سے ہر قسم کی چنگی ہٹالی،اور اس طرح اپنی رعایا کو بھی وہ مراعات دے دیں جو انگریزوں نے زبردستی حاصل کر رکھی تھیں۔لیکن یہ غیر ملکی تاجر اب کسی بھی صورت میں ہندوستانی تاجروں کے مساوی حقوق برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔انہوں نے ہندوستانی تاجروں پر دوبارہ چنگی لگائے جانے کا مطالبہ کیا۔ایک دفعہ پھر لڑائی کی ابتدا ہوا چاہتی تھی۔اصل بات یہ تھی کہ بنگال میں بیک وقت دو مالک کیسے رہ سکتے تھے۔ایک طرف میر قاسم خود کو ایک خود مختار حکمران مانتے تھے۔دوسری طرف انگریز چاہتے تھے کہ وہ ان کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی بن کر رہیں۔کیونکہ آخر انہیں تخت پر انگریز ہی نے تو بٹھایا تھا۔

میر قاسم کو 1763ء میں کئی لڑائیوں میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور آخر انہوں نے بھاگ کر اودھ میں پناہ لی، جہاں انہوں نے اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور مفرور پناہ گزیں مغل سلطان شاہ عالم دوم کے ساتھ اتحاد کیا۔تینوں اتحادیوں نے 22اکتوبر 1764ء کو بکسر میں انگریزی فوجوں سے ٹکرلی اور بری طرح شکست کھائی یہ لڑائی ہندوستانی تاریخ کی سب سے زیادہ فیصلہ کن لڑائیوں میں سے ایک تھی۔کیونکہ اس لڑائی نے ثابت کر دیا کہ انگریزی فوجیں ہندوستان کی دو اہم طاقتوں کی مشترکہ فوجوں سے بھی کہیں زیادہ طاقتور ہیں۔اس جنگ نے انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کا مالک ثابت کر دیا اور اودھ بھی ان کے رحم و کرم کا محتاج ہو گیا۔

کلائیو 1765ء میں گورنر کی حیثیت سے دوبارہ بنگال آگیا تھا۔اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر بنگال پر اپنا قبضہ مضبوط کرنے اور رفتہ رفتہ حکومت کی باگ ڈور نواب کے ہاتھ سے لے کر کمپنی کے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کیا۔1763ء میں انگریزوں نے میر جعفر کو دوبارہ بنگال کا نواب مقرر کیا اور کمپنی کے اور اس کے اعلی افسروں کے لیے بے تحاشہ رقم وصول کی۔میر جعفر کے انتقال کے بعد انہوں نے مرحوم کے دوسرے بیٹے نظام الدولہ کو تخت پر بٹھایا اور اپنے اس کارنامے کے انعام میں 20فروری 1765ء کو نواب سے ایک نئے معاہدے پر دستخط کرائے۔اس معاہدے کے تحت قرار پایا کہ نواب اپنی زیادہ تر فوج کو فوجی خدمت سے سبکدوش کر دیں اور بنگال کا انتظام ایک نائب صوبیدار کے ذریعے ہوا اور جس کا تقرر کمپنی کرے۔نیز جسے نواب کمپنی کی رضامندی کے بغیر ملازمت سے برخواست بھی نہیں کر سکتا تھا۔مختصر یہ کہ اس طرح کمپنی نے بنگال کی انتظامیہ پر پورا کنڑول حاصل کر لیا اور کمپنی کی بنگال کاونسل کے ممبران نے ایک دفعہ پھر نئے نواب کو مجبور کر کے تقریباً پندرہ لاکھ روپے کے نذرانے اور انعامات حاصل کر لیے۔

کمپنی نے شاہ عالم دوم سے جو ابھی تک مغل سلطنت کے برائے نام حکمراں تھے،دیوانی کے یعنی بہار بنگال اور اڑیسہ کا لگان وصول کرنے کے حقوق حاصل کر لیے اور اس طرح بنگال پر ان کے قبضے اور کنٹرول کو قانونی حیثیت حاصل ہو گئی اور ہندوستان کی اس سب سے زیادہ

دولت مند ریاست کا لگان اس کی ملکیت بن گیا۔اس کے عوض میں کمپنی نے انہیں 26 لاکھ روپے کی امداد دی اور کورا اور الہ آباد ضلعوں پر ان کا حق تسلیم کرا دیا اور سلطان چھ سال تک الہ آباد کے قلعے میں گویا انگریزوں کے نظر بند رہے۔ اودھ کے نواب شجاع الدولہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ جنگ کے ہرجانے کے طور پر کمپنی کو 50 لاکھ روپے دیں۔اس کے علاوہ دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت طے پایا کہ اگر کسی باہر کی طاقت نے نواب پر حملہ کیا تو کمپنی نواب پر حملہ کیا تو کمپنی نواب کی حمایت کرے گی اور مدد کے لیے اپنی فوجیں بھیجے گی بشرطیکہ نواب ان فوجوں کے اخراجات کمپنی کو ادا کرے۔اس معاہدے نے نواب کو کمپنی کا ماتحت بنا دیا۔

8.3 بنگال میں دوہرا نظام حکومت (Dual System of Government in Bengal)

پروفیسر بپن چندر اپنی کتاب جدید ہندوستان میں لکھتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کم سے کم 1765ء سے بنگال کی اصل مالک بن گئی تھی۔بنگال کے دفاع پر کمپنی کی فوج کا پورا کنٹرول تھا اور سیاسی اقتدار اعلی اس کے ہاتھ میں تھا۔نواب اپنے اندرونی اور بیرونی تحفظ کے لیے انگریز کے دست نگر تھے۔دیوان کی حیثیت سے کمپنی براہ راست یہاں کا لگان وصول کرتی تھی اور نائب صوبیدار کا تقرر کرنے کی حقدار ہونے کی وجہ سے اس نے ریاست کی نظامت یعنی پولس اور عدالت کو پوری طرح اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا۔اس انتظام کو تاریخ میں دوہرے انتظام یا دوہری حکومت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔یہ نظام انگریز کے لیے بہت فائدے مند تھا،اس طرح انہیں اقتدار بھی مل گیا تھا اور ذمہ داری بھی نہیں تھی۔نواب اور اس کے افسروں پر نظم و نسق کی تمام تر ذمہ داری تھی لیکن اس سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت نہیں تھی۔حکومت کی کمزوریوں کے لیے جواب دہ اور مجرم تھے ہندوستانی۔اور اس کا ثمر سمیٹتا تھا انگریز۔بنگال کے عوام کے لیے اس کے نتائج تباہ کن تھے۔ان کی بہبودی کی فکر نہ نواب کو تھی نہ کمپنی کو۔ کمپنی کے ملازم اب پورے بنگال پر قابض تھے اور عوام پر ان کا ظلم و ستم دن بدن بڑھ رہا تھا۔دیکھئے کلائیو نے خود کیا لکھا ہے؛

> میں تو بس اتنا کہوں گا اتنی مطلق العنانیت ایسا انتشار اور رشوت خوری،ایسی بدعنوانیاں اور استحصال جیسا بنگال میں عام ہو گیا تھا،کسی اور ملک نے نہ کبھی دیکھا ہوگا نہ سنا ہوگا،کسی اور ملک نے نہ کبھی دیکھا ہوگا نہ سنا ہوگا اور اتنی کم مدت میں اس قدر غیر منصفانہ طریقہ سے،اس طرح لوٹ مار کر کے اتنی دولت و جاگیریں بھی شاید ہی کسی اور نے حاصل کی ہوں گی۔بنگال،بہار اور اڑیسہ تینوں صوبوں کا لگان اور چنگی کا سارا انتظام جو تقریبا تیس لاکھ پاؤنڈ سالانہ ہے۔میر جعفر کے دوبارہ صوبیدار بن جانے کے بعد سے مستقل طور پر کمپنی کے ملازموں کے قبضے ہی میں ہے اور وہ خود نواب سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے زمین دار تک غرض ہر صاحب اقتدار ھندوستانی سے،سول اور فوجی ہر قسم کے چندے اور مالگزاری جبراً وصول کر رہے ہیں۔

دوسری طرف کمپنی کے حکام بنگال کی زرخیز زمین کی فصلوں پر قبضہ کرنے اور بنگال کا خون چوس چوس کر اسے بے جان کر دینے پر آمادہ تھے۔اب انہوں نے ہندوستانی سامان کی خرید کے لیے انگلینڈ سے روپیہ بھیجنا بند کر دیا تھا۔یہ سامان وہ بنگال سے جمع کیے ہوئے لگان کے روپے سے خریدتے اور انہیں غیر ملکوں میں بیچتے تھے۔اس روپئے کا کہا جاتا تھا کہ کمپنی نے اتنا سرمایہ لگایا اور اس طرح یہ بھی اس کے منافع کا

حصہ بن جاتا تھا۔اس کے علاوہ برطانیہ کی سرکار بھی اس بھرپور لوٹ میں اپنا حصہ چاہتی تھی۔ چنانچہ 1767ء میں اس نے کمپنی کو حکم دیا کہ وہ برطانیہ کی سرکار کو چالیس لاکھ پاؤنڈ سالانہ ادا کرے۔

1766ء سے 1768ء تک یعنی تین سال کے مختصر عرصے میں ہی بنگال کا خون چوس کر کم و بیش 57لاکھ پاؤنڈ وصول کر لیے۔ دوہری سرکار سے فائدہ اٹھا کر اقتدار کے غلط استعمال،اور دولت کی اس مستقل برآمد نے بنگال کے بد قسمت صوبے کو کنگال کر دیا اور قطعی تھکا دیا۔1770ء میں بنگال میں زبردست قحط پڑا۔انسانیت کی تاریخ میں ایسے خوفناک قحط چند ہی پڑے ہوں گے۔لاکھوں انسان بھوک کا شکار ہوئے اور بنگال کی ایک تہائی آبادی کی کمر اس قحط کی تباہ کاریوں نے توڑ دی۔یوں تو قحط کی وجہ یہ تھی کہ اس سال بارش نہیں ہوئی تھی۔لیکن کمپنی کی پالیسیوں نے اس کے تباہ کن اثرات کو اور بڑھا دیا۔

دوہرے نظام کے اثرات ہمیں یہ بنیادی بات یاد رکھنا چاہئے کہ مغل دور میں صوبوں میں دو اعلیٰ افسر ہوا کرتے تھے۔صوبیدار اور دیوان۔صوبیدار کا کام نظامت یعنی پولس اور قانونی نظم و نسق بنائے رکھنے کا تھا جب کہ دیوان کا کام ٹیکس وصولی کرنا تھا۔برطانوی کمپنی نے 26 لاکھ روپئے سالانہ دے کر شاہ عالم سے دیوانی کا کام اور سالانہ 53 لاکھ روپئے دے کر بنگال کے نواب سے بنگال کی نظامت کا کام ہندوستانیوں سے کرواتی تھی لیکن حقیقی اقتدار کمپنی کے ہاتھ میں تھا۔اس وقت کمپنی براہ راست ٹیکس وصولی کا ذمہ اپنے سر نہیں لینا چاہتی تھی کیونکہ اس کے پاس ٹیکس وصولی کی استطاعت نہیں تھی اور کمپنی کے مخالفت میں آسکتے تھے۔ کمپنی نے بنگال میں محمد رضا خان کو، بہار میں راجہ شتاب رائے کو اور اڑیسہ میں درلبھ رائے کو نائب دیوان مقرر کیا۔ محمد رضا خان نائب ناظم کا کام بھی کرتے تھے۔اس طرح دوہری حکومت میں دو حکمران ہو گئے کمپنی اور نواب۔ کمپنی کے پاس طاقت تھی لیکن ذمہ داری نہیں تھی جب کہ نواب کے پاس ذمہ داری تھی لیکن اقتدار نہیں تھا۔

دوہری حکومت الہ آباد کے معاہدہ سے کلائیو نے قائم کیا تھا،کیونکہ وہ بنگال میں کمپنی کے مختلف طرح کے اقتدار کے قیام سے پیدا ہونے والے ذمہ داریوں سے بچنا چاہتا تھا۔دوہری حکومت کے سبب بنگال میں رشوت بازاری کا ماحول گرم تھا بیوپار تباہ ہو گئے،کارخانے بند ہو گئے اور کسان بھیانک غریبی اور بھکمری کے شکار ہو گئے۔دوہری حکومت کے دوران ہندوستانی ہاتھ سے چلنے والے کارخانے برباد ہو گئے کیونکہ انگریزوں نے مختلف ایکٹ کے ذریعے سے بنگال کی تجارت پر قبضہ جما لیا تھا۔دوہری حکومت (اٹھارہویں صدی میں) بنگال میں قائم ہونے سے کپڑے کے کارخانے برباد ہو گئے تھے کیونکہ انگلینڈ بھیجے جانے والے کپڑوں پر لگائے گئے ٹیکس بہت زیادہ تھے۔

دوہری حکومت کے دوران 1770ء میں بنگال میں زبردست قحط پڑا جس میں ایک کروڑ لوگ بھوک کے سبب مارے گئے اس وقت کرٹیئر بنگال کا گورنر تھا۔کارنوالس نے دوہری حکومت کے بارے میں انگلینڈ کی پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ 84-1765ء کے درمیان ایسٹ انڈیا کمپنی سے زیادہ جھوٹی،مکار اور لالچی گورنمنٹ دنیا کے کسی بھی مہذب ملک میں نہیں تھی۔ کے۔ایم۔پنیکر (K.M. Panikkar) نے 72-1765ء کی دوہری حکومت کو ڈاکوؤں کی حکومت کہا ہے۔ڈڈول نے بنگال کی دوہری

حکومت کو اقتدار اور ذمہ داریوں کے درمیان طلاق کہا ہے۔ کلائیو نے کمپنی کے افسران میں رشوت بازاری کو روکنے کے لیے افسران کو تحائف لینے اور نجی بیوپار کرنے سے روک دیا۔ اس سے ہوئے نقصان کی بھرپائی کرنے کے لیے 1765ء میں کلائیو نے بیوپار سمیتی تشکیل دی جسے نمک، سوپاری اور تمباکو کے بزنس کا حق دیا گیا۔ 1768ء میں بیوپار سمیتی کو ختم کر دیا گیا۔ 1767ء میں کلائیو کو انگلینڈ کی گورنمنٹ نے لارڈ کا لقب دیا۔ یاد رہے دوہری حکومت کو وارن ہسٹنگز نے ختم کر دیا۔

8.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد ہمیں معلوم ہو گا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کم سے کم 1765ء سے بنگال کی اصل مالک بن گئی تھی۔ بنگال کے دفاع پر کمپنی کی فوج کا پورا کنٹرول تھا اور سیاسی اقتدار اعلی اس کے ہاتھ میں تھا۔ نواب اپنے اندرونی اور بیرونی تحفظ کے لیے انگریز کے محتاج تھے۔ دیوان کی حیثیت سے کمپنی براہ راست یہاں کا لگان وصول کرتی تھی اور نائب صوبیدار کا تقرر کرنے کی حقدار ہونے کی وجہ سے اس نے ریاست کی نظامت یعنی پولیس اور عدالت کو پوری طرح اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا۔ اس انتظام کو تاریخ میں دوہرے انتظام یا دوہری حکومت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس اکائی کے پڑھنے کے بعد پتہ چلے گا کہ کمپنی کے حکام بنگال کی زرخیز زمین کی فصلوں پر قبضہ کرنے اور بنگال کا خون چوس چوس کر اسے بے جان کر دینے پر آمادہ تھے۔ اب انہوں نے ہندوستانی سامان کی خرید کے لیے انگلینڈ سے روپیہ بھیجنا بند کر دیا تھا یہ سامان وہ بنگال سے جمع کیے ہوئے لگان کے روپے سے خریدتے اور انہیں غیر ملکوں میں بیچتے تھے۔ اس اکائی کو پڑھنے کے بعد معلوم ہو گا کہ 1766ء سے 1768ء تک یعنی تین سال کے مختصر عرصے میں بنگال کا خون چوس کر کم و بیش 57 لاکھ پاؤنڈ وصول کر لیے۔ دوہری سرکار سے فائدہ اٹھا کر اقتدار کے غلط استعمال اور دولت کی اس مستقل برآمد نے بنگال کے بدقسمت صوبے کو کنگال کر دیا اور قحط تھکا دیا۔

8.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

دستک	:	تجارتی لائسنس
استیصال	:	جڑ سے اکھاڑنا، خاتمہ کرنا
مطلق العنانیت	:	تاناشاہی، من مانی

8.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

8.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. پلاسی کی جنگ کب ہوئی؟
2. سراج الدولہ نے اپنے دادا کی گدی کب سنبھالی؟
3. دستک کیا تھا؟

4. چندر نگر کہاں واقع ہے؟
5. سراج الدولہ نے فورٹ ولیم پر کب قبضہ کیا؟
6. بکسر کی جنگ کب ہوئی؟
7. بکسر کی جنگ کن دو فریقوں کے درمیان ہوئی؟
8. کلائیو کون تھا؟
9. میر جعفر کے بعد کون تخت نشیں ہوا؟
10. شجاع الدولہ کہاں کے نواب تھے؟

8.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. پلاسی کی جنگ پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. بکسر کی جنگ پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. لارڈ کلائیو کے بارے میں بتلائیے۔
4. بنگال کی مختصر روداد لکھیے۔
5. سراج الدولہ کے بارے میں کچھ بتلائیے۔

8.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پلاسی اور بکسر کی جنگوں کے حالات اپنے الفاظ میں لکھیے۔
2. دوہری حکومت کے بارے میں تفصیل سے بیان کیجیے۔
3. دوہرے نظم ونسق کے اثرات ہندوستان پر کیسے مرتب ہوئے بالتفصیل روشنی ڈالیے۔

8.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
3. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
4. Metcalf, Barbara D., and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).

5. Roy, Tirthankar, *The East India Company*: *The World's Most Powerful Corporation*, Allen Lane/ Penguin, New Delhi, 2012.
6. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707–1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.
7. Wilson, Jon, *India Conquered*: *Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon and Schuster, London and New Delhi, 2017.

اکائی 9۔ ریگولیٹنگ ایکٹ 1773 اور پٹس انڈیا ایکٹ 1784

(Regulating Act 1773, and the Pitt's India Act 1784)

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 پس منظر

9.2.1 سرکاری بدانتظامی

9.2.2 کمپنی راج کی تنقید

9.3 ریگولیٹنگ ایکٹ

9.3.1 ایکٹ کی کمزوری

9.4 پٹ کا انڈیا ایکٹ

9.5 اکتسابی نتائج

9.6 کلیدی الفاظ

9.7 نمونہ امتحانی سوالات

9.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

9.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

9.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

9.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید (Introduction)

اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں دوررس تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مغل سلطنت جس نے ڈیڑھ سو برس تک ملک کو ایک مستحکم نظام دیا، اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کے وسائل بہم پہنچائے وہ خود زوال پذیر اور اندرونی خلفشار سے دوچار تھی۔ ملک پر تسلط حاصل کرنے کی کوشش ناکام ہوچکی تھی اور برطانیہ کے تاجر اس برصغیر میں ایک نئی قسم کی حکومت کی بنیادیں استوار کر رہے تھے۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں اس تبدیلی کے پیچھے جو سیاسی، سماجی اور اقتصدای عوامل ہندوستان، ایشیا اور مغربی دنیا میں کارفرما تھے ان کا تفصیلی تجزیہ اور مطالعہ اس صورتحال کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ جب تک کہ ان عوامل اور اس صورتحال کا باقاعدہ اور سنجیدہ مطالعہ نہ کیا جائے۔ صحیح طور پر اس کا ادراک نہیں ہوسکتا۔ سلطنت مغلیہ کا انتشار مرہٹوں کی ایک منظم حکومت قائم کرنے میں ناکامی اور ایک نئے سماج کی تشکیل کے اسباب وعوامل کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ طلبہ کو ریگولیٹنگ ایکٹ اور اس کے پس منظر کو سمجھنا اشد ضروری ہے۔ اس کے اسباب وعوامل کو نظرانداز تاریخ کے طلبہ کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس کے بعد آنے والے ایکٹ خاص طور سے پٹ کے انڈیا ایکٹ کو جاننا بہت ضروری ہے جس کے دائرہ میں رہ کر برطانوی حکومت 1857ء تک قائم رہی۔ آئندہ صفحات میں ان کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

9.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ریگولیٹنگ ایکٹ کے پس منظر کو سمجھ سکیں گے۔
- برطانوی حکومت کے ڈھانچہ کو سمجھ سکیں گے۔
- پٹ کے انڈیا ایکٹ کی شناخت کرسکیں گے۔
- ان ایکٹوں کی وجہ سے ہندوستان پر کس طرح کے اثرات مرتب ہوئے، جان سکیں گے۔
- کس طرح سے برطانوی حکومت نے ہندوستان کے اقتصادی اور سیاسی صورتحال کو کنٹرول میں کیا، جائزہ لے سکیں گے۔

9.2 تاریخی پس منظر (Historical Background)

ہندوستان کی وسیع سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ اس وسیع سلطنت پر کنٹرول رکھے، اور اس کے نظم ونسق کے استحکام کے لیے حکومت کے مناسب طریقے بھی رائج کرے۔ 1757ء سے 1857ء کے طویل دور میں کمپنی کے نظم ونسق کی پالیسی میں کئی دفعہ تبدیلیاں آئیں۔ بہرحال اس پورے عرصے میں کمپنی نے اپنے بنیادی مقاصد کی طرف سے کبھی آنکھ بند نہیں کی اور یہ مقاصد تھے کمپنی کے مفادات کو ترقی دینا، اپنی ہندوستانی دولت اور مقبوضات کو برطانیہ کے لیے زیادہ سے زیادہ سودمند بنانا، ہندوستان پر برطانیہ کے اقتدار کو قائم رکھنا اور مضبوط تر بنانا۔ باقی تمام مقاصد انہیں بنیادی مقاصد کے ضمنی پہلو تھے۔ حکومت ہند کا انتظامی ڈھانچہ انہیں

مقاصد کے حصول کے لیے تیار کیا گیا تھا اور انہیں مقاصد کے حصول کے لیے اسے ایک ترقی یافتہ شکل دی گئی تھی۔ سب سے زیادہ زور نظم ونسق پر تھا۔ نیز اس بات پر تھا کہ ملک میں امن رہے تاکہ ہندوستان کے ساتھ تجارت کسی رکاوٹ اور پریشانی کے بغیر جاری رہے اور ہندوستان کے ذرائع کو بنا روک ٹوک استعمال کیا جاسکے۔

9.2.1 سرکاری بدانتظامی (Mismanagement of the Government)

جب 1765ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں نے بنگال پر اپنا کنٹرول قائم کیا تو اس کے نظم ونسق میں کوئی تبدیلی کرنے کا انگریزوں کا کوئی خاص ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ اپنی منافع بخش تجارت جاری رکھیں اور ٹیکس حاصل کر کے برطانیہ کو بھیجتے رہیں 1765ء سے 1772 تک، یعنی دوہری سرکار کے دور میں ہندوستانی افسروں کو پہلے کی طرح اپنی ذمہ داری نبھاتے رہنے کی آزادی تھی، لیکن برطانیہ کی سرکار اور انگریز افسروں کے کنٹرول میں رہ کر۔ ہندوستانی افسروں کے سر پر ذمہ داریاں تو تھیں لیکن ان کے ہاتھ میں طاقت نہیں تھی جب کہ کمپنی کے افسروں کے ہاتھ میں طاقت تھی اور وہ سب ذمہ داریوں سے بری تھے۔ دونوں ہی قوموں کے افسر حد درجہ بے ایمان، لالچی اور ضمیر فروش تھے۔ 1772ء میں کمپنی نے دوہری سرکار ختم کر دی اور بنگال کا نظم ونسق اپنے ملازموں کے ہاتھ میں دے کر براہ راست اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ لیکن جب محض ایک تجارتی کمپنی کسی ملک کے نظم ونسق کو سنبھالے گی تو اس میں ہر قسم کی کمزوریاں اور بدعنوانیاں ہونا لازمی ہیں، اور یہ کمزوریاں جلد ہی کھل کر سامنے آگئیں۔

یہ وہ دور تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی محض ایک تجارتی تنظیم تھی، جسے مشرق کے ساتھ تجارت کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا یہی نہیں بلکہ اس کی حاکم اعلی سرکار، ہندوستان سے ہزاروں میل دور انگلینڈ میں مقیم تھی۔ اس کے باوجود اس نے لاکھوں انسانوں پر اپنے سیاسی اقتدار کا سکہ جما لیا تھا۔ اس بے تکی اور نامناسب صورتحال کی وجہ سے برطانیہ کی سرکار کئی قسم کے مسائل سے دوچار تھی۔ خود برطانیہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اور اس کی دولت کا برطانیہ کی سرکار سے کیا رشتہ ہوگا۔ برطانیہ میں مقیم کمپنی کے حکام اعلی ان ان گنت سپاہیوں اور افسروں پر کنٹرول اور تسلط کیسے قائم رکھیں گے جو دور دراز ہندوستان میں مقیم تھے۔ انگلینڈ سے ہزاروں میل دور بنگال، مدراس اور بمبئی میں برطانوی مقبوضات اور دولت کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے ایک متحد مرکز قائم کیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

ان میں سے پہلا مسئلہ سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اس کا گہرا رشتہ برطانیہ کی پارلیمانی رقابتوں سے انگریز مدبروں کی سیاسی حرص وہوس اور چالوں سے اور انگریز سوداگروں کی تجارتی ہوس پذیری سے تھا۔ بنگال کے وسیع ذرائع کمپنی کے ہاتھ لگے تو اس کے ڈائرکٹروں نے فوراً یعنی 1767ء میں اس کے منافع کا دس فیصدی لینے کا فیصلہ کیا اور 1771ء میں اس کی شرح کو مزید بڑھا کر 12 فیصد تک پہنچانے کی تجویز رکھی۔ کمپنی کے انگریز افسروں نے اپنی کرسی کا فائدہ اٹھایا اور ہندوستانی افسروں زمین داروں اور جاگیرداروں سے زبردستی تحفے اور رشوتیں لے کر اور غیر قانونی طریقے سے نامناسب شرائط پر تجارت کر کے جلد از جلد دولت سمیٹنے لگے۔ کلائیو صرف 34 سال کی عمر میں انگلینڈ لوٹا تو اس کے پاس اتنی دولت اور جاگیر تھی کہ اس کی آمدنی 40 ہزار پاؤنڈ سالانہ تھی۔

9.2.2 کمپنی راج کی تنقید (Critique of the Company Raj)

جب انگریزی سماج کے دوسرے طبقوں نے کمپنی کے غیر معمولی منافع کا اندازہ لگایا،اور دیکھا کہ اس کے افسران بے تحاشہ دولت لے کر انگلینڈ لوٹتے ہیں تو ان میں کھل بلی مچ گئی اور وہ حسد کی آگ میں جلنے لگے۔ کمپنی کی اجارہ داری کی وجہ سے بہت سے تاجر مشرق سے تجارت کرنے سے قاصر تھے۔ان سب تاجروں ،کارخانے داروں اور کاریگروں کی بڑھتی ہوئی جماعتیں اور برطانیہ میں آزادانہ طور پر سرمایہ لگانے والوں کی بڑھتی ہوئی طاقتیں ،منافع بخش ہندوستان کی منفعت بخش تجارت اور اس تمام دولت میں اپنا حصہ چاہتی تھیں ،جس پر صرف کمپنی اوراس کے ملازمین قبضہ جمائے عیش کر رہے تھے

اس لیے ان سب نے مل کر کمپنی کے نظم ونسق پر بھی تنقیدی حملہ کیا۔اس کے علاوہ ہندوستان سے لوٹنے والے کمپنی کے اعلی افسروں کو اپنا خاص نشانہ بھی بنایا۔ان افسروں کو نابوب یعنی نواب کا طنزیہ لقب دیا جاتا اور پریس اوراسٹیج پر انہیں مذاق اور طنز کا نشانہ بنایا جاتا۔شریف اور امراء کا طبقہ ان کا بائیکاٹ کرتا اور انہیں ہندوستانی عوام کا خون چوسنے والے اور ظالم کہہ کر مطعون کیا جاتا۔کلائیو اور وارن ہسٹنگز پر ان کی خاص نظر تھی۔ کمپنی کے مخالف سمجھتے تھے کہ ان نابوبوں کو اس طرح برا بھلا کہہ کر وہ کمپنی کو غیر مقبول بنادیں گے اور تب ان کے لیے کمپنی کی جگہ لینا ممکن ہو جائے گا۔انگلینڈ کے متعدد وزیر اور پارلیمنٹ کے متعدد ممبر بنگال پر انگریزوں کے قبضے سے فائدہ حاصل کرنے کو بے قرار تھے۔وہ کمپنی کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ حکومت برطانیہ کو بڑے بڑے ہدیے اور نذرانے دے تا کہ ہندوستانی لگان انگلینڈ کے پبلک قرضوں اور انگریز شہریوں پر ٹیکس کم کرنے کے لیے استعمال ہو سکے۔وہ اس طرح عوام کی حمایت حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔

1767ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک ایکٹ پاس کیا جس کی رو سے طے پایا کہ کمپنی چار لاکھ پاؤنڈ سالانہ سلطنت برطانیہ کے خزانہ میں دے گی۔ برطانیہ کے بہت سے سیاسی مدبر کمپنی اوراس کے افسروں کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنا چاہتے تھے،کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ طاقتور کمپنی اور اس کے دولت مند افسران انگریز قوم کے اخلاق اور اس کی سیاست کو قطعی برباد کردیں گے۔18ویں صدی کے دوسرے نصف میں برطانیہ کی پارلیمانی سیاست نہایت ناقص اور بدعنوانیوں کا شکار تھی۔ کمپنی اوراس کے پنشن یافتہ افسروں نے برطانوی دلالوں(ہاؤس آف کامنس) میں اپنے دلالوں کے لیے سیٹیں خرید لی تھیں انگلینڈ کے بہت سے مدبر اس لیے پریشان تھے کہ کمپنی اور اس کے افسران ہندوستان کی لوٹ کھسوٹ سے حاصل کی ہوئی دولت کے سہارے برطانیہ کی حکومت میں بہت گہرا رسوخ حاصل نہ کرلیں ہندوستان میں کمپنی کی وسیع سلطنت اور خود کمپنی کو کنٹرول میں رکھنا ضروری تھا۔ورنہ یہ کمپنی ہندوستان کے مالک کی حیثیت سے جلد ہی برطانوی نظم ونسق کو اپنے کنٹرول میں لے سکتی تھی اور برطانوی عوام کی آزادی کو تباہ وبرباد کر سکتی تھی۔ کمپنی کو بلا شرکت غیرے جو مخصوص سہولتیں حاصل تھیں ان پر بھی ماہرین معیشت کے اس گروہ کو سخت اعتراض تھا۔کلاسیکی معیشت کے بانی ایڈم سمتھ نے اپنی مشہور تصنیف ویلتھ آف نیشن میں بلا شرکت غیرے حقوق رکھنے والی کمپنیوں کی ان الفاظ میں مذمت کی ہے۔

> مخصوص مراعات کی حامل یہ کمپنیاں کئی اعتبار سے ایک عذاب ہیں یہ جن جن ملکوں میں قائم ہوئی ہیں،ان کے لیے عام طور پر کم وبیش پریشانی اور زحمت کا باعث بن گئی ہیں اور جن ملکوں پر بدقسمتی سے ان کی سرکار قائم ہو جائے ان کی تو تباہی

کا سبب بن جاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ برطانوی سرکار اور کمپنی کے حکام کے درمیان تعلقات کی از سر نو تشکیل ضروری ہوگئی تھی اور جب کمپنی کو سرکار سے دس لاکھ پاؤنڈ کا قرضہ مانگنا پڑا تو گویا تعلقات کی از سر نو تشکیل لازمی ہوگئی۔ حالانکہ کمپنی کے دشمن تعداد میں بھی بہت تھے اور طاقتور بھی تھے۔ لیکن پارلیمنٹ میں کمپنی کے دوستوں اور حامیوں کی بھی کمی نہیں تھی اور خود شہنشاہ جارج سوئم اس کے مربی اور سرپرست تھے اس لیے کمپنی نے جم کر مقابلہ کیا اور آخر کار پارلیمنٹ نے ایک ایسا سمجھوتہ کیا، جس کے تحت کمپنی کے مفادات اور برطانوی سماج کے دوسرے بااثر حلقوں کے مفادات میں ایک بہت ہی نازک سہی، لیکن توازن قائم ہوگیا طے یہ ہوا کہ برٹش سرکار کمپنی کے ہندوستانی نظم و نسق کی بنیادی پالیسیوں کو اپنے کنٹرول میں رکھے گی تاکہ ہندوستان میں انگریزی راج برطانیہ کے سب ہی اعلی طبقوں کے مفادات کے مطابق قائم رہے۔ ساتھ ہی یہ بھی طے پایا کہ مشرقی تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری بدستور رہے گی اور ہندوستان میں اپنے افسران کے تقرر کا نہایت سودمند حق بھی اسے حاصل رہے گا۔ ہندوستانی نظم و نسق کی تفصیلات بھی کمپنی کے ڈائرکٹروں پر چھوڑ دی گئی تھیں۔ کمپنی کے معاملات سے متعلق پہلا پارلیمانی ایکٹ 1773ء کا ریگولیٹنگ ایکٹ تھا۔ اس ایکٹ کے تحت کمپنی کے ڈائریکٹروں کے کورٹ کے آئین میں تبدیلیاں کی گئیں اور ان کی سرگرمیوں کو برطانوی سرکار کی نگرانی کا ماتحت قرار دیا گیا۔ 1772ء میں لارڈ نارتھ نے کمپنی کی معاشی حمایت اور پارلیمانی کنٹرول کے لیے ایک جانچ کمیٹی بنائی، اسی جانچ کمیٹی کی رپورٹ کے بنیاد پر یہ ایکٹ بنا۔

9.3 ریگولیٹنگ ایکٹ (Regulating Act, 1773)

---

1. بنگال کے گورنر کو اب بنگال کا گورنر جنرل کہا جانے لگا اور مدراس اور بمبئی کے گورنر کو نئی پالیسی میں بنگال کے گورنر جنرل کے ماتحت کر دیا گیا۔ وارن ہسٹنگز بنگال کا پہلا گورنر جنرل بنا۔
2. چار ممبران کی گورنر جنرل کی ایکزیکیٹو کونسل بنائی گئی۔ یہ چار ممبران تھے، جون کلیورنگ، جورج مانسن، فلپ فرانسس اور ریچرڈ بارول۔ 1776ء میں مانسن کی موت کے بعد ایڈورڈ وہیلر کو بھیجا گیا۔ کونسل کے ممبران کی مدت کار پانچ سال کا تھا اور انہیں ڈائرکٹروں کے سجھاؤ پر صرف شہنشاہ ہٹا سکتا تھا۔ کونسل کا کورم تین ممبران کا تھا ان میں سے بارول، ہسٹنگز کا کٹر حمایتی تھا۔ بنگال کے گورنر جنرل کو ورکنگ کونسل کے اکثریت کے مطابق کام کرنا تھا اور گورنر جنرل کونسل میں ووٹ کی برابری پر ہی اپنا فیصلہ کن سجھاؤ دے سکتا تھا۔
3. کورٹ آف ڈائرکٹرز کا قیام کیا گیا۔ اس ایکٹ کے ذریعے کم از کم ایک ہزار پاؤنڈ کے شئیر والوں کو کمپنی کے ڈائرکٹرز کے چناؤ کے لیے ووٹ کا حق دیا گیا۔ کل 24 ڈائرکٹر تھے جو چار سال کے لیے چنے جاتے تھے، ان میں سے ایک چوتھائی ہر سال معطل ہوتے تھے۔
4. ریگولیٹنگ ایکٹ کے ذریعے کلکتہ میں 1774ء میں ایک سپریم کورٹ کا قیام کیا گیا۔ اس میں ایک چیف جسٹس اور تین دیگر جسٹس ہوتے تھے۔ سر ایلزا امپے اس کے پہلے چیف جسٹس تھے۔ چیمبرز اور ہائڈ وغیرہ جسٹس تھے۔ جسٹس کی تقرری برٹش شہنشاہ کے ذریعے کی جاتی تھی۔ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف پریوی کونسل (برطانیہ) میں اپیل کی جاسکتی ہے۔ اس عدالت کا دائرہ کار انگریز عوام کے لیے

بنگال، بہار اور اڑیسہ تھا اور 1781ء کے ایکٹ کے ذریعے کلکتہ کے تمام بسنے والوں کو سپریم کورٹ کے علاقہ میں شامل کیا گیا۔

5. ریگولیٹنگ ایکٹ کے ذریعے کمپنی کے افسران کو نجی تجارت کرنے، تحفے اور رشوت لینے پر پورے طور سے روک لگادی گئی۔

6. اس ایکٹ کے سجھاؤ کے ماتحت 1774ء میں بہار کے لیے ایک صوبائی مجلس کا قیام ہوا۔

9.3.1 ایکٹ کی محدودات (Limitations of the Act)

جہاں تک اس قانون پر عمل کا سوال ہے تو یہ ریگولیٹنگ ایکٹ جلد ہی ٹوٹ گیا۔اس کے تحت سرکار برطانیہ کو فیصلہ کن اور موثر طریقے سے کمپنی پر کنٹرول کرنے کا حق حاصل نہیں ہوا تھا۔یہ ایکٹ کمپنی اور انگلینڈ میں مقیم اس کے مخالفین کے درمیان تناؤ کو کم کرنے اور مسائل کو حل کرنے میں بھی ناکام رہا تھا۔جب کہ یہ مخالفین دن بدن زیادہ طاقتور ہو رہے تھے اور ان کی آواز دن بدن زیادہ بلند تر ہو رہی تھی۔اس کے علاوہ کمپنی کی ہندوستانی دولت اور جاگیر کا انتظام اب بھی بدعنوانیوں اور ظلم و ستم سے عبارت تھا اور معاشی اعتبار سے تباہ کن بھی تھا۔اس لیے کمپنی اپنے دشمنوں کے حملوں کے سامنے بدستور کمزور اور محفوظ تھی۔

9.4 پٹ کا انڈیا ایکٹ (Pitt's India Act, 1784)

ریگولیٹنگ ایکٹ کی کمزوریوں اور برطانوی سیاست کی ناگہانی ضرورتوں کے پیش نظر 1784ء میں ایک اور اہم ایکٹ جاری کرنا لازمی ہو گیا۔اس کو پٹ کا انڈیا ایکٹ کہا جاتا ہے۔

1. اس کے تحت ہندوستان کے معاملات کے لیے چھ کمشنر مقرر ہوئے جن میں دو کابینہ کے وزیر بھی شامل تھے۔ان کمشنروں کا ذکر عام طور سے بورڈ آف کنٹرول کے نام سے کیا جاتا ہے۔طے یہ پایا کہ کورٹ آف ڈائریکٹرز اور حکومت ہند کے کام کی سربراہی اور اس پر کنٹرول یہی بورڈ کرے گا۔

2. اس ایکٹ کے تحت حکومت ہند کو گورنر جنرل اور تین ممبروں پر مشتمل ایک کونسل کے سپرد کر دیا گیا تاکہ اگر گورنر جنرل کو ایک ممبر کی حمایت بھی حاصل ہو جائے تو وہ بہ آسانی من مانی کر سکے۔اس ایکٹ کے تحت جنگ، ڈپلومیسی، لگان اور چنگی کے سلسلے میں بنگال اور مدراس کی پریزیڈنسیاں واضح طور پر بنگال کے ماتحت آگئیں۔

3. اس ایکٹ نے ہندوستان میں برطانوی فتوحات کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اس ایکٹ کا مقصد برٹش پارلیمنٹ کا کمپنی پر اپنے اثرات کو زیادہ مضبوط کرنا اور برطانوی حکومت کا کمپنی کے انتظامیہ میں مداخلت بڑھانا تھا۔

4. اس ایکٹ کے ذریعے سب سے پہلے کمپنی کی تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا۔

5. اس ایکٹ کے ذریعے تین ممبران کی ایک خفیہ کمیٹی تشکیل دی گئی، جس کا کام ہندوستان میں خفیہ حکم جاری کرنا تھا۔خفیہ فرامین دیگر افراد کو نہیں بتائے جاتے تھے۔

6. اس ایکٹ کے ذریعے ڈبل انتظامیہ کی ابتدا ہوئی۔ایک کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز کی اور دوسری برٹش پارلیمنٹ کے بورڈ آف کنٹرول

کی۔ یہ دہرا انتظامی نظام 1858ء تک جاری رہا۔ 1858ء میں بورڈ آف کنٹرول کا خاتمہ کر کے انڈیا کونسل کا قیام ہوا۔ بورڈ آف کنٹرول کے صدر کو ہی ہندوستان کا سکریٹری بنایا گیا۔ بورڈ آف کنٹرول کا صدر برٹش پارلیمنٹ کا ایک ممبر ہوتا تھا۔

7. اس ایکٹ کے ذریعے گورنر جنرل کی ایکزیکیٹو کے ممبران کی تعداد چار سے گھٹا کر تین کر دی گئی۔
8. مدراس اور بمبئی کی گورنمنٹ کے لیے بنگال کی سرکار کے حکم کا ماننا لازمی کر دیا گیا۔
9. گورنر جنرل اور گورنروں کی تقرری ارکان منتظمہ کے ذریعے کی جاتی تھی لیکن انہیں واپس بلانے کا حق انگلینڈ کے شہنشاہ کو دیا گیا صرف گورنر جنرل کی تقرری کے لیے ارکان منتظمہ کو شہنشاہ سے اجازت لینا ضروری تھا۔ 8۔ یہ بھی یقینی بنایا گیا کہ گورنر جنرل اور اس کی کونسل بورڈ آف کنٹرول کے اجازت کے بغیر کوئی جنگ یا معاہدہ نہیں کر سکے گا۔
10. کمپنی کے افسران پر تحفے لینا سخت ممنوع قرار دیا گیا۔ ایک طرف ایسٹ انڈیا کمپنی برطانیہ کی قومی پالیسی کا آلہ کار بن گئی اور دوسری طرف ہندوستان کو برطانیہ کے برسر اقتدار طبقے کے سبھی حلقوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے آلہ کار بنا لیا گیا۔ کمپنی ہندوستان اور چین سے تجارت کی اپنی اجارہ داری کو بچانے میں کامیاب ہو گئی تھی، اس لیے مطمئن تھی۔ اس کے ڈائرکٹروں کو ہندوستان میں کمپنی کے انگریز افسروں کے تقرری کا اور انہیں نکال باہر کرنے کا منفع بخش اور کارآمد بدستور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ طے یہ ہوا تھا کہ ہندوستانی سرکار کا کام ان کی تنظیموں کے ذریعے جاری رہے گا۔

پرفیسر بپن چندر اپنی کتاب جدید ہندوستان میں لکھتے ہیں کہ 'پٹ کے انڈیا ایکٹ نے یقیناً وہ عام ڈھانچہ تشکیل دے دیا جس کے دائرے میں رہ کر حکومت ہند 1857ء تک قائم رہی۔ لیکن بعد میں وضع کردہ قوانین نے متعدد اہم تبدیلیاں کیں، جن کی بدولت کمپنی کا اقتدار اور سہولتیں رفتہ رفتہ کم ہوتیں گئیں۔' 1786ء میں گورنر جنرل کو یہ حق دے دیا گیا کہ وہ ان تمام اہم معاملات میں اپنی کونسل کے فیصلے کو بدل سکتا ہے جن سے ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کے مفاد، تحفظ اور امن کو خطرہ پیدا ہو سکتا ہو۔ 1833ء میں چارٹر ایکٹ جاری ہوا جس کے تحت ہندوستان میں کمپنی کی تجارتی اجارہ داری ختم کر دی گئی اور ہندوستان سے تجارت کے دروازے تمام برطانوی شہریوں کے لیے کھل گئے لیکن چائے کی تجارت اور چین سے تجارت اب بھی صرف کمپنی کی ملکیت تھی۔ ہندوستان سے حاصل ہونے والے چنگی اور لگان اور ہندوستان کی بدستور کمپنی کے ہاتھ میں رہی اور ہندوستان ہی افسران کا تقرر کرنے کا حق بھی کمپنی کے پاس رہا۔ 1833ء کے چارٹر ایکٹ نے چائے کی تجارت اور چین سے تجارت کی اجارہ داری کو بھی کمپنی کے ہاتھ سے نکال لیا۔ ساتھ ہی کمپنی کے قرضوں کی ذمہ داری ہندوستانی سرکار نے لے لی اور یہ بھی طے پایا کہ سرکار کمپنی کے حصہ داروں کو ان کے سرمائے پر دس فی صدی منافع ادا کرے گی۔ حکومت ہند کا انتظام اب بھی بدستور کمپنی ہی کے ہاتھ میں تھا جس پر بورڈ آف کنٹرول کا پورا کنٹرول تھا۔

شیکھر بندوپدھیائے اپنی کتاب پلاسی ٹو پارٹیشن میں لکھتے ہیں کہ

> مختلف پارلیمانی ایکٹوں نے کمپنی اور اس کے ہندوستانی انتظامیہ کو پورے طور پر برطانوی سرکار کا ماتحت بنا دیا لیکن دوسری طرف یہ بات بھی تسلیم کر لی گئی کہ سرکار ہند کا روزمرہ کا انتظام چھ ہزار کیل دور سے نہیں ہو سکتا۔ اتنی دوری سے تو اس پر

گہری نظر رکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔اس لیے ہندوستان میں اقتدار اعلی گورنر جنرل کو سونپا گیا اور اس طرح اہم مسائل کے سلسلے میں اپنی کونسل کے فیصلوں کو بدلنے کا حق پاکر گورنر جنرل در حقیقت ہندوستان کا اصل حکمراں بن گیا جو برطانیہ کی سرکار کی نگرانی، کنٹرول اور ہدایات کے تحت عمل کرتا تھا۔

انگریزوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے کی خاطر ہندوستان میں نظم ونسق کا ایک نیا نظام شروع کیا۔انگریزوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ ہندوستان کا ہر ممکن معاشی استحکام کرنے پر قادر ہو سکیں تاکہ کمپنی سے لے کر لنکا شائر کے صنعت کاروں تک سبھی کے مفاد زیادہ سے زیادہ بآسانی حل ہو سکیں۔1793ء میں گورنر جنرل لارڈ کارنیوالس نے بنگال سرکار کے دو اہم مقاصد کی وضاحت یوں کی؛

ضرورت اس کی ہے کہ یہ سرکار سیاسی تحفظ کی ضمانت دے اور ملک کی تمام دولت کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے اور پوری انگریز قوم کے لیے زیادہ سے زیادہ سود مند بنادے۔ساتھ ہی ہندوستان کو نہ صرف اپنی سرزمین کی فتح کے تمام تر اخراجات بھی برداشت کرنا تھے۔

9.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ جب 1765ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں نے بنگال پر اپنا کنٹرول قائم کیا تو اس کے نظم ونسق میں کوئی تبدیلی کرنے کا انگریزوں کا کوئی خاص ارادہ نہیں تھا۔وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ اپنی منافع بخش تجارت جاری رکھیں اور ٹیکس حاصل کرکے برطانیہ کو بھیجتے رہیں 1765ء سے 1772ء تک ،یعنی دوہری سرکار کے دور میں ہندوستانی افسروں کو پہلے کی طرح اپنی ذمہ داری نبھاتے رہنے کی آزادی تھی، لیکن برطانیہ کی سرکار اور انگریز افسروں کے کنٹرول میں رہ کر۔ہندوستانی افسروں کے سر پر ذمہ داریاں تو تھیں لیکن ان کے ہاتھ میں طاقت نہیں تھی جب کہ کمپنی کے افسروں کے ہاتھ میں طاقت تھی اور وہ سب ذمہ داریوں سے بری تھے۔اس اکائی کے پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ جب انگریزی سماج کے دوسرے طبقوں نے کمپنی کے غیر معمولی منافع کا اندازہ لگایا اور دیکھا کہ اس کے افسران بے تحاشہ دولت لے کر انگلینڈ لوٹتے ہیں تو ان میں کھل بلی مچ گئی اور وہ حسد کی آگ میں جلنے لگے۔کمپنی کی اجارہ داری کی وجہ سے بہت سے تاجر مشرق سے تجارت کرنے سے قاصر تھے۔ان سب تاجروں، کارخانے داروں اور کاریگروں کی بڑھتی ہوئی جماعتیں،اور برطانیہ میں آزادانہ طور پر سرمایہ لگانے والوں کی بڑھتی ہوئی طاقتیں، منافع بخش تجارت اور اس تمام دولت میں اپنا حصہ چاہتی تھیں جس پر صرف کمپنی اور اس کے ملازمین قبضہ جمائے عیش کر رہے تھے اس لیے ان سب نے مل کر کمپنی کی تجارتی اجارہ داری کو برباد کرنے کے لیے جان توڑ کوششیں کیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے بنگال میں کمپنی کے نظم ونسق پر بھی تنقیدی حملہ کیا۔کمپنی کے معاملات سے متعلق پہلا پارلیمانی ایکٹ 1773ء کا ریگولیٹنگ ایکٹ تھا،اس ایکٹ کے تحت کمپنی کے ڈائریکٹروں کے کورٹ کے آئین میں تبدیلیاں کی گئیں اور ان کی سرگرمیوں کو برطانوی سرکار کی نگرانی کا ماتحت قرار دیا گیا جہاں تک اس قانون پر عمل کا سوال ہے تو یہ ریگولیٹنگ ایکٹ جلد ہی ٹوٹ گیا۔پٹ کے انڈیا ایکٹ نے یقیناً وہ عام ڈھانچہ تشکیل دے دیا جس کے دائرے میں رہ کر حکومت ہند 1857ء تک قائم رہی۔لیکن بعد میں وضع کردہ قوانین نے

متعدد اہم تبدیلیاں کیں، جن کی بدولت کمپنی کا اقتدار اور سہولتیں رفتہ رفتہ کم ہوتی گئیں۔

9.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

اشد	:	سخت، بڑا
لنکاشائر	:	برطانیہ میں ایک جگہ کا نام ہے جہاں کپڑے بنتے تھے
نواب (طنزیہ)	:	ان برٹش افسروں کو بطور طنز کہا جاتا تھا جو ہندوستان سے دولت لوٹ کر مالدار ہو جاتے تھے ان کو مذاق اور طنز کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔

9.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

9.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ریگولیٹنگ ایکٹ کب پاس ہوا؟
2. ریگولیٹنگ ایکٹ کا اہم کام کیا تھا؟
3. کس ایکٹ کے تحت کمپنی چار لاکھ پاؤنڈ برطانیہ کو دے گی؟
4. ایڈم اسمتھ کون تھا؟
5. ایڈم اسمتھ کی کتاب کا نام کیا ہے؟
6. کمپنی کا مربی اور سرپرست کون تھا؟
7. شہنشاہ جارج سوئم کون تھا؟
8. پٹس انڈیا ایکٹ کب پاس ہوا؟
9. پٹس انڈیا ایکٹ کا اہم کام کیا تھا؟
10. نواب کا طنزیہ لقب کن کو دیا جاتا تھا؟

9.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ریگولیٹنگ ایکٹ پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. پٹس انڈیا ایکٹ پر روشنی ڈالیے۔
3. ایڈم اسمتھ کے بارے میں کچھ بتلائیے۔
4. برطانوی حکومت کے ڈھانچہ پر کچھ روشنی ڈالیے۔

5. 1833ء کے چارٹر ایکٹ کے بارے میں کچھ بتلائیے۔

9.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ریگولیٹنگ ایکٹ کو تفصیل سے اپنے الفاظ میں لکھیے۔
2. پٹس انڈیا ایکٹ کے بارے میں وضاحت سے بیان کیجیے۔
3. ان دونوں ایکٹ کے پس منظر اور ان کے نتائج پر شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالیے۔

9.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

---

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
3. Dalrymple, William, *The Anarchy*: *The East India Company*, *Corporate Violence*, *and the Pillage of an Empire*, Bloomsbury, London, 2019.
4. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
5. Metcalf, Barbara D., and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).
6. Roy, Tirthankar, *The East India Company*: *The World's Most Powerful Corporation*, Allen Lane/ Penguin, New Delhi, 2012.
7. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707–1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.
8. Wilson, Jon, *India Conquered*: *Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon and Schuster, London and New Delhi, 2017.

اکائی 10۔استمراری بندوبست

(Permanent Settlement)

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 بنگال میں برطانوی حکومت

10.3 استمراری بندوبست

10.3.1 فوائد

10.3.2 نقصانات

10.4 اکتسابی نتائج

10.5 کلیدی الفاظ

10.6 نمونہ امتحانی سوالات

10.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

10.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

10.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

10.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

10.0 تمہید (Introduction)

1765 میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ملنے کے بعد ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامیہ کا سب سے بڑا مقصد مالگزاری کی رقم میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا تھا۔ زراعت، معیشت کی اصل بنیاد اور آمدنی کا اہم ذریعہ تھی چنانچہ اسی لیے مالگزاری زیادہ سے بڑھانے کے لیے کئی تجربات کیے گئے۔ اگرچہ وصولی کی ذمہ داری مقامی اہلکاروں کی تھی، لیکن کمپنی کے یورپی افسران کو ان پر نگران بنادیا گیا۔ نتیجتاً یورپی افسران کے لالچ اور بدعنوانی کے ساتھ ساتھ مقامی حالات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے چند برسوں کے اندر اندر کمپنی کے زیر انتظام صوبوں میں زرعی معیشت کا ڈھانچہ اور سماج مکمل طور پر بکھر گیا۔ 70-1769 کا تباہ کن قحط، جس میں بنگال کی ایک تہائی آبادی کا صفایا ہو گیا تھا، اس دور کی تباہ کن معاشی پالیسیوں کا صرف ایک اشارہ تھا۔ اپنے حصص مالکان کو منافع دینے سے قاصر کمپنی کے ڈائرکٹرس کم ہوتی مالگزاری اور تباہی کے اسباب کی تلاش کرنے لگے۔ ساری کمیوں اور خامیوں کا الزام انہوں نے کٹھ پتلی نواب کے سرڈال کر اسے برطرف کردیا۔ اب نئے گورنر وارن ہیسٹنگز کی یہ خواہش تھی کہ مالگزاری انتظامیہ کو ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے نکال کر انگریزوں کو صوبے کے وسائل کا واحد منتظم بنا دیا جائے۔ اسی مقصد سے وارن ہیسٹنگز نے 1772 میں، ایک نیا نظام متعارف کروایا جسے 'Farming' یا کاشتکاری کا نظام کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت اب یورپی ضلع کلکٹروں کو مالگزاری اکٹھا کرنے کے ذمہ داری دی گئی جب کہ مالگزاری اکٹھا کرنے کا حق سب سے زیادہ بولی لگانے والوں کو دیا گیا۔ بندوبستوں کی مدت کے بارے میں بھی کئی تجربات کیے گئے، لیکن فارمنگ یا کاشتکاری نظام حالات کو سدھارنے میں ناکام رہا۔ کیونکہ فارمر یا اجارہ دار کاشتکار، پیداواری عمل کی پرواہ کیے بغیر زیادہ سے زیادہ وصولی کی کوششیں کرنے لگے۔ اس کے نتیجے میں کسانوں پر مالگزاری کی طلب کا بوجھ بڑھتا گیا اور اکثر یہ اتنا زیادہ ہو جاتا تھا کہ اسے حاصل ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بنا سوچے سمجھے تجربات کی اس پوری مدت کا مجموعی ماحصل کسانوں کی تباہی تھا۔ 1784 میں، کارنوالس کو مالگزاری انتظامیہ کو بہتر بنانے کے خاص مقصد کے ساتھ ہندوستان بھیجا گیا۔ اس نے ہندوستان میں مالگزاری کے مستقل بندوبست یا دوامی تشخیص کا طریقہ رائج کیا۔ اس میں ہمیشہ کے لیے زمین کے مالکوں سے ایک طے شدہ مالگزاری ادا کرنے کا وعدہ لیا گیا، جس میں گھٹانے بڑھانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ خیال رہے کہ یہ بندوبست صرف بنگال، بہار، اڑیسہ اور اترپردیش کے کچھ حصوں تک ہی محدود تھا۔ اس اکائی میں ہم اسی مالگزاری بندوبست کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں گے اور اس کے فوائد اور نقصانات کا تجزیہ بھی کریں گے۔

10.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- بنگال میں برطانوی دوہرے نظام حکومت کو سمجھ سکیں گے۔
- مالگزاری انتظامیہ میں پھیلی بدنظمی کو روکنے کی کمپنی کی کوششوں کو سمجھ سکیں گے۔

- مالگزاری منظم کرنے کے لیے استمراری یا مستقل بندوبست کے بارے میں جان سکیں گے
- کیا کمپنی اور کمپنی کے اہلکاروں کی بڑھتی ہوئی دولت کی ہوس بنگال کی معاشی بدحالی کی ذمے دار تھی؟ تجزیہ کر سکیں گے۔

10.2 بنگال میں برطانوی حکومت (The British Rule in Bengal)

پلاسی اور بکسر کی جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی 1764ء سے بنگال کی اصل مالک بن گئی تھی۔ بنگال کے دفاع پر کمپنی کی فوج کا پورا کنٹرول تھا اور سیاسی اقتدار اعلی اس کے ہاتھ میں تھا۔ نواب اپنے اندرونی اور بیرونی تحفظ کے لیے انگریز کے دست نگر تھے۔ دیوان کی حیثیت سے کمپنی براہ راست یہاں کا لگان وصول کرتی تھی اور نائب صوبیدار کا تقرر کرنے کی حقدار ہونے کی وجہ سے اس نے ریاستی انتظامیہ یعنی پولس اور عدالت کو پوری طرح اپنے اختیار میں لے لیا تھا۔ اس طرز حکمرانی کو تاریخ میں دو عملی یا دوہری حکومت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جسے 1765 میں الہ آباد کے معاہدہ کے ذریعہ کلائیو نے قائم کیا تھا اور وارن ہیسٹنگز کے ذریعے 1773 میں اس کا خاتمہ ہوا۔ یہ نظام انگریزوں کے لیے بیحد کارآمد تھا، کیونکہ اس سے انہیں اقتدار اعلیٰ بھی حاصل ہو گیا تھا اور کسی بھی انتظامی ذمہ داری اور اس میں کسی بھی طرح کی بدنظمی کے لیے جوابدہی سے بھی وہ صاف بچ گئے تھے۔ نظم ونسق کی تمام تر ذمہ داری نواب اور اس کے افسروں پر تھی لیکن اس سے وہ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ حکومت کی کمزوریوں کے لیے ہندوستانی جوابدہ اور مجرم تو تھے مگر حکمرانی کا اصلی مزا انگریز لوٹ رہے تھے ۔بنگال کے عوام کے لیے اس کے نتائج تباہ کن تھے۔ ان کی بہبودی کی فکر نہ نواب کو تھی نہ کمپنی کو۔ کمپنی کے ملازم اب پورے بنگال پر قابض تھے اور عوام پر ان کا ظلم وستم دن بدن بڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف کمپنی کے حکام بنگال کی زرخیز زمین کی فصلوں پر قبضہ کرنے اور بنگال کا خون چوس چوس کر اسے بے جان کر دینے پر آمادہ تھے۔ اب انہوں نے ہندوستانی سامان کی خرید کے لیے انگلینڈ سے روپیہ بھیجنا بند کر دیا تھا۔ یہ سامان وہ بنگال سے جمع کیے ہوئے لگان کے روپے سے خریدتے اور انہیں غیر ملکوں میں بیچتے تھے۔ اس روپئے کا کہا جاتا تھا کہ کمپنی نے اتنا سرمایہ لگایا اور اس طرح یہ بھی اس کے منافع کا حصہ بن جاتا تھا۔ اس کے علاوہ برطانیہ کی سرکار بھی اس بھرپور لوٹ میں اپنا حصہ چاہتی تھی۔ چنانچہ 1767ء میں اس نے کمپنی کو حکم دیا کہ وہ برطانیہ کی سرکار کو چالیس لاکھ پاؤنڈ سالانہ ادا کرے۔

1766ء سے 1768ء تک یعنی تین سال کے مختصر عرصے میں ہی بنگال کی لوٹ مار سے کمپنی نے تقریباً 57 لاکھ پاؤنڈ وصول کر لیے۔ دوہرے نظام حکومت کے پردے میں اقتدار کے غلط استعمال اور دولت کی اس مستقل برآمد نے بنگال کے بدقسمت صوبے کو کنگال کر دیا اور قطعاً تباہ کر دیا۔ 1770ء میں بنگال میں زبردست قحط پڑا۔ اس وقت جان کرٹیئر بنگال کا گورنر تھا۔ انسانیت کی تاریخ میں ایسے خوفناک قحط چند ہی پڑے ہوں گے۔ لاکھوں انسان بھوک کا شکار ہوئے اور بنگال کی ایک تہائی آبادی کا صفایا ہو گیا۔ یوں تو قحط کی وجہ یہ تھی کہ اس سال بارش نہیں ہوئی تھی لیکن برطانوی افسران نے دوسرے صوبوں سے غلہ نہ منگا کر قحط کو مزید بدترین بنا دیا۔ یوں کمپنی کی پالیسیوں نے اس کے تباہ کن اثرات کو مزید بڑھا دیا۔

ہمیں یہ بنیادی بات یاد رکھنا چاہئے کہ مغل دور میں صوبوں میں دو اعلیٰ افسر ہوا کرتے تھے۔ صوبیدار اور دیوان۔ صوبیدار کا کام

نظامت یعنی پولس اور نظم ونسق بنائے رکھنے کا تھا جب کہ دیوان کا کام ٹیکس وصول کرنا تھا۔ برطانوی کمپنی نے 26 لاکھ روپئے سالانہ دے کر شاہ عالم سے دیوانی اختیارات حاصل کیے۔ نظامت کا کام بھلے ہی بنگال کے نواب اوران کے افسران سنبھالتے تھے لیکن حقیقی اقتدار کمپنی کے ہاتھ میں تھا۔اس وقت کمپنی براہ راست ٹیکس وصولی کا ذمہ اپنے سر نہیں لینا چاہتی تھی کیونکہ اس کے پاس ٹیکس وصولی کے لیے بھرپور عملہ نہیں تھا ساتھ ہی عوام، نواب کے کارندوں کو چھوڑ کر اچانک ایک اجنبی کمپنی کو اپنا ٹیکس کیوں سونپ دیتے۔ کمپنی نے بنگال میں محمد رضا خان، بہار میں راجہ شتاب رائے اور اڑیسہ میں درلبھ رائے کو نائب دیوان مقرر کیا۔ محمد رضا خان نائب ناظم کا کام بھی کرتے تھے۔اس طرح ایک ہی حکومت میں دو حکمران بن گئے؛ کمپنی اور نواب۔ کمپنی کے پاس طاقت تھی لیکن ذمہ داری نہیں تھی جب کہ نواب کے پاس ذمہ داری تھی لیکن اقتدار نہیں تھا۔ دوہری حکومت کے سبب بنگال میں رشوت بازاری کا ماحول گرم ہو گیا۔ بیوپار تباہ ہو گئے، کارخانے بند ہو گئے اور کسان بھیانک غریبی اور بھکمری کے شکار ہو گئے۔اس دوران ہندوستانی دستکاری کے کارخانے برباد ہو گئے کیونکہ انگریزوں نے مختلف حیلوں حوالوں کے ذریعے بنگال کی تجارت پر اجارہ داری قائم کر لی تھی۔

کارنوالس نے دوہری حکومت کے بارے میں انگلینڈ کی پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ میں پورے یقین کے ساتھ کہ سکتا ہوں کہ 1765 سے 1784 کے درمیان ایسٹ انڈیا کمپنی سے زیادہ جھوٹی، مکار اور لالچی حکومت، دنیا کے کسی بھی مہذب ملک میں نہیں تھی۔' کے۔ایم۔ پنیکر نے 1765-1772ء کی دوہری حکومت کو ڈاکوؤں کی حکومت کہا ہے۔ڈڈول نے بنگال کی دوہری حکومت کو اقتدار اور ذمہ داریوں کے درمیان طلاق کہا ہے۔ کلائیو نے کمپنی کے افسران میں رشوت بازاری کو روکنے کے لیے افسران کو تحائف لینے اور نجی بیوپار کرنے سے روک دیا۔اس سے ہوئے نقصان کی بھرپائی کرنے کے لیے 1765ء میں کلائیو نے بیوپار سمیتی تشکیل دی جسے نمک، سوپاری اور تمباکو کے بزنس کا حق دیا گیا۔ 1768ء میں بیوپار سمیتی کو ختم کر دیا گیا۔ 1767ء میں کلائیو کو انگلینڈ کی گورنمنٹ نے لارڈ کا لقب دیا۔اس دوہری حکومت کو وارن ہسٹنگز نے آکر ختم کیا۔ 1784 میں کلائیو واپس آیا اور کئی تجربات کے بعد اس نے 1793 میں استمراری یا مستقل بندوبست نافذ کیا۔

10.3 استمراری بندوبست (The Permanent Settlement)

کارنوالس نے محسوس کیا کہ موجودہ نظام ملک کو غریب اور زراعت کو برباد کر رہا ہے اور وہ بڑی اور اضافی پیداوار بھی نہیں فراہم کر پا رہا ہے جس کی کمپنی کو امید تھی۔ یورپ کو برآمد کے لیے ہندوستانی سامان کے حصول میں دشواری کی وجہ سے کمپنی کی تجارت کو بھی نقصان پہنچا۔ کمپنی کی دو بڑی برآمدات ریشم یا کپاس کی پیداوار بنیادی طور پر زراعت پر مبنی تھیں، جب کہ زراعت میں کمی نے دستکاری کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ یہ سوچا گیا کہ اس صورتحال کو بہتر کرنے کا واحد طریقہ مالگزاری کے مسئلے کو مستقل طور پر طے کرنا ہے۔درحقیقت 1770 سے ہی یعنی کارنوالس کے آنے سے کافی پہلے، کمپنی کے متعدد افسران اور الیگزینڈر رہنری پیٹلو، فلپ فرانسس اور تھامس لا جیسے یورپی مشاہدین استمراری بندوبست کی وکالت کرتے آرہے تھے۔اپنے الگ الگ خیالات کے باوجود اس مادی نظریے میں سب کو یقین تھا جو کسی بھی ملک کی معیشت میں زراعت کو اولیت دیتا ہے۔ یہی نظریات 1793 کے استمراری (مستقل) بندوبست کی بنیاد بنے جس نے بنگال میں 'حتمی

تشخیص' کے اصول کو لاگو کیا۔ اس سے اس بدعنوانی کی گنجائش کم ہو گئی جو افسران اپنی مرضی سے تشخیص میں تبدیلی کر کے کر سکتے تھے۔ زمیندار، منافع کو زمین کو بہتر بنانے میں لگا سکتے تھے، کیونکہ ریاست کا مطالبہ مستقل ہونے کی وجہ سے ان کو ہی پیداوار میں اضافے اور آمدنی میں بڑھوتری کا پورا فائدہ حاصل ہو گا۔ کمپنی کو باقاعدگی سے ٹیکس ملتا رہے گا۔ جیسا کہ کارنوالس کا خیال تھا کہ کمپنی حسب ضرورت کاروبار اور تجارت پر ٹیکس لگا کر اپنی آمدنی بڑھا سکتی تھی۔ 90-1789 کی تشخیص کو معیار مان کر یہ مالگزاری 268 لاکھ روپے (تقریباً 30 لاکھ پاؤنڈ) مقرر کی گئی۔ پی جے مارشل کے مطابق 1793 میں مالگزاری کا مطالبہ 1757 سے پہلے کے مقابلے میں تقریباً 20 فیصد زیادہ تھا۔ وہیں بی۔ بی۔ چودھری کے حساب سے یہ 1765 اور 1793 کے درمیان لگ بھگ دوگنی ہو گئی تھی۔

کمپنی کے لیے دوسرا مسئلہ یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مالگزاری کس سے حاصل کرنی ہے۔ نواب اسے زمینداروں سے وصول کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ بڑے جاگیردار تھے جو بڑے علاقوں کو کنٹرول کرتے تھے اور ان کے پاس خود کے مسلح دستے تھے۔ 1790 میں بنگال کے بارہ بڑے زمینداروں نے مالگزاری کے 53 فیصد سے زیادہ حصے کی ادائیگی کی۔ دوسرے چھوٹے زمیندار، براہ راست ریاست کو یا بڑے زمینداروں کے ذریعے مالگزاری ادا کرتے تھے۔ کسان کھیتی کرتے تھے اور زمینداروں کو روایتی نرخوں پر ادائیگی کرتے تھے، جو اکثر الگ الگ تحصیلوں میں مختلف ہوتی تھی اور بعض اوقات اضافی قانونی رقم بھی وصول کی جاتی تھی جسے ابواب (Abwab) کہا جاتا تھا۔ کمپنی انتظامیہ نے کچھ زمینداروں کو برقرار رکھا اور دیگر کی جگہ نئے مال گزار کسانوں کو دے کر اس صورتحال کو کافی الجھا دیا۔ تشخیص کے معاملے میں بھی روایتی حقوق کو نظرانداز کر دیا گیا اور جب تک کارنوالس کی آمد ہوئی اس خطہ میں مکمل بدنظمی پھیل چکی تھی۔ برطانیہ کے زمیندار طبقے سے تعلق رکھنے کے ناطے کارنوالس فطری طور پر زمینداروں کو ترجیح دیتا تھا۔ زمینداروں سے توقع کی گئی کہ اگر ان کی ملکیت کے حقوق محفوظ کر دیے جائیں گے تو وہ زراعت کی بہتری کے لیے سرمایہ کاری کریں گے۔ بے شمار کسانوں سے آمدنی وصول کرنے کے مقابلے، جس کے لیے ایک بڑی انتظامی مشینری کی ضرورت پڑتی تھی، چنندہ زمینداروں سے مالگزاری وصول کرنا آسان تھا اور بالآخر یہ مقامی آبادی کے ایک طاقتور طبقے کی وفاداری کو یقینی بنا سکتا تھا۔ چنانچہ 1793 میں زمینداروں کے ساتھ استمراری بندوبست کیا گیا۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی انچ انچ زمین اب ایک زمینداری کا حصہ بن گئی اور زمیندار کو اس پر مقرر کردہ مالگزاری ادا کرنا پڑتی۔ اگر وہ ایسا کرتا تو وہ اپنی زمینداری کا مالک رہ سکتا تھا، اسے بیچ سکتا تھا، رہن رکھ سکتا تھا اور منتقل کر سکتا تھا، اور یہ زمین اس کے ورثا کو بھی مل سکتی تھی۔ لیکن مالگزاری کی ادائیگی میں ناکامی کی صورت میں حکومت کی طرف سے زمینداری کو ضبط کر کے نیلامی کے ذریعے فروخت کر دیا جاتا تھا۔ پھر تو اس پر نئے خریدار کا مالکانہ حق ہوتا تھا۔ یہ نام نہاد نجی زمینی ملکیت کی تخلیق تھی۔

استمراری بندوبست نے زمین کی ملکیت کا حق زمینداروں کو دے دیا جو پہلے صرف مالگزاری وصول کرنے کا حق رکھتے تھے۔ اس لیے اس سارے معاملے یا بندوبست میں جن لوگوں کا نقصان ہوا وہ کسان تھے جنہیں زمینداروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان کے روایتی قبضے کے حق (occupancy rights) کو نظرانداز کر دیا گیا اور وہ کرایہ دار (tenants) بنا کر رکھ دیے گئے۔ زمیندار، پٹے (کسان اور زمیندار کے درمیان تحریری معاہدہ جس میں ادا کیے جانے والے لگان کی رقم کا ریکارڈ ہوتا تھا) پر شاذ و نادر ہی عمل کرتے تھے۔ نہ ہی حقوق

اور ذمہ داریوں کے کسی بھی رسمی ریکارڈ کو کسان پسند کرتے تھے کیونکہ اس سے انہیں نقصان کا اندیشہ ہوتا تھا۔ اونچی مالگزاری کے تعین کا بوجھ کسانوں پر ڈال دیا گیا جن سے اکثر غیر قانونی اضافی رقوم ادا کرنے کا مطالبہ بھی کیا جاتا تھا۔ 1799 اور 1812 کے قوانین(regulations) نے زمینداروں کو یہ حق دیا تھا کہ وہ کرایہ دار (کسان) کی جانب سے ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں عدالت کی اجازت کے بغیر ان کی جائیداد ضبط کر سکتے تھے۔

اگرچہ یہ بندوبست زمینداروں کی حمایت کرتا تھا لیکن انہیں بھی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسا کہ ڈینیل تھورنر (Daniel Thorner) نے استدلال کیا ہے، زمین کی نجی ملکیت کی تخلیق ایک غلط لفظ تھا، کیونکہ حقیقی ملکیت تو سامراجی اقتدار اعلیٰ کے ہاتھوں میں تھی۔ زمینداروں کو نام نہاد 'غروب آفتاب قانون' (Sunset Law) کے تحت ایک مخصوص تاریخ تک مالگزاری ادا کرنی پڑتی تھی، جس میں ناکامی کے نتیجے میں ان کی زمینداری نیلام کردی جاتی تھی۔ ان کے لیے اکثر لگان وصول کرنا مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ مطالبات بہت زیادہ تھے اور فطرت کی غیر یقینی صورتحال الگ سے تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زمینداری جائیدادوں کی بڑے پیمانے پر فروخت ہونے لگی۔ 1794 اور 1807 کے درمیان بنگال اور بہار میں تقریباً 41 فیصد مالگزاری والی زمین نیلامی میں فروخت کی گئی۔ اڑیسہ میں 1804 اور 1818 کے درمیان نیلامی کی وجہ سے 51.1 فیصد اصلی زمیندار تباہ ہوگئے۔ یقیناً اس کا مطلب پرانے زمیندار طبقے کا زوال تھا لیکن پرانے مفروضوں کے برعکس جن لوگوں نے یہ زمینیں خریدیں وہ بنگال کے زرعی سماج میں ایک دم نئے نہیں تھے۔ پرانی زمینداریوں کو خود ان کے اپنے عملوں (زمینداری کارندوں)، امیر کسانوں یا پڑوسی زمینداروں نے آپس میں بانٹ لیا۔ بردوان زمینداری جیسے کچھ قدیم گھرانوں نے اپنے آپ کو شکمی زمینداری (Sub-infeudation) کے نئے طریقے کو اپنا کر بچائے رکھا، جس سے پٹے داری کی ساخت بے تکی اور پیچیدہ ہوگئی۔ نئی قانونی اصلاحات غریب کسانوں کو کوئی راحت نہیں دے سکیں۔

دوسری طرف ان اصلاحات نے صرف طاقتور امیر کسانوں کے ایک طبقہ کو مضبوط کیا جنہیں 'جوتدار' کہا جاتا تھا جو کہ حقیقت میں گاؤں کی سطح پر 'جوتوں' پر تسلط رکھتے تھے جیسا کے رجت رے (Rajat Ray) اور رتن لیکھا رے (Ratnalekha Ray) کا ماننا ہے۔ دوسری طرف زمینداروں کو صرف مالگزاری وصول کرنے کا حق حاصل تھا۔ رے کی دلیل یہ ہے کہ نوآبادیاتی پالیسیوں سے آئی تبدیلیوں کے باوجود جوتداروں کی طاقت اور دیہی سماج میں ان کی پکڑ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ساتھ ہی نوآبادیاتی بنگال کے دیہی سماج کا تسلسل اسی بات میں تھا۔ جوت داری مفروضے ('Jotedar Thesis') پر تیکھا حملہ سگاتا بوس (Sugata Bose) کی ایک تخلیق (1986) میں کیا گیا ہے جنہوں نے جوتداروں کے ایسے غلبے کو شمالی بنگال تک ہی محدود پایا۔ باقی علاقوں میں انہوں نے زرعی معیشت کے دو دوسرے واضح نظاموں کا پتہ لگایا ہے: مغربی بنگال میں کسانوں کی جوت اور آزاد مزدوروں کا ایک مربوط نظام، اور مشرقی بنگال میں چھوٹی جوتوں کا نظام. دونوں علاقوں میں انہوں نے 1930 کی دہائی تک زمینداروں کی طاقت کو غیر متاثر پایا اور اس نقطہ نظر کی حمایت اکینوبو کوئی (Akinobu Kawai) اور پارتھ چٹرجی (Partha Chatterjee) کی تصنیفات نے بھی کی ہے۔ جوتدار کے حق میں اپنی بعد کی ایک تحریر میں رجت رے نے یہ بات مانی ہے کہ دیہی بنگال میں زمینداروں کا اثر اور اختیار غالباً 1930 کی دہائی تک بنا رہا۔ ہاں! لیکن

پھر بھی اس پورے دور میں اچھے مالدار کسانوں کا ایک حصہ ایسا بھی رہا جن کو بنگال کے گاؤں میں اچھی خاصی طاقت حاصل تھی۔ بہر کیف زمینداروں کو زمین کا مالک تسلیم کرتے ہوئے 1790 میں ان کے ساتھ دس سال کا معاہدہ کیا گیا۔ 1793 میں دس سالہ بندوبست کو استمراری (مستقل) قرار دے دیا گیا اور زمیندار اور ان کے قانونی وارثین کو اپنی جائیدادیں ہمیشہ کے لیے متعین شدہ ملگزاری پر رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ ریاست کا حصہ 89٪ طے ہوا اور 11٪ حصہ زمیندار کو ان کی ذمہ داری نبھانے کے عوض دے دیا گیا۔

10.3.1 فوائد (Advantages)

- مالی طور پر، استمراری بندوبست نے ریاست کے لیے ایک مقررہ اور مستحکم آمدنی طے کر دی اور ریاست کے لیے یہ آمدنی مستقل تھی چاہے فصل اچھی ہو یا نہ ہو۔ اس نے حکومت کے وہ اخراجات بچائے جو وقتاً فوقتاً تشخیص اور بندوبست کرنے میں خرچ ہوتے تھے۔
- اقتصادی طور پر، استمراری بندوبست سے زراعت کی بازارکاری کی ہمت افزائی ہوئی اور تجارت میں اضافہ ہوا۔ بنجر زمینوں پر بھی کاشتکاری شروع ہوئی اور زیر کاشت زمین کو بہتر بنایا گیا۔ زمینداروں نے کاشت کے نئے طریقے متعارف کروائے جیسے فصلوں کی ادلا بدلی، کھاد کا استعمال وغیرہ۔ اس بندوبست کی بنا پر مٹی کی مکمل صلاحیت کو فروغ دینے کی کوششیں کی گئیں، جس کے نتیجے میں ایک مثبت اور صاحب تدبیر کسان طبقہ پیدا ہوا۔
- سیاسی طور پر، کارنوالس کو توقع تھی کہ استمراری بندوبست سے وفادار زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا ہوگا جو ہر قیمت پر کمپنی کا دفاع کرنے کے لیے تیار ہوں گے کیونکہ کمپنی کی طرف سے ان کے حقوق کی ضمانت دی گئی تھی۔ بنگال کے زمیندار 1857 کی عظیم بغاوت کے دوران کمپنی کے وفادار رہے۔
- سماجی طور پر، زمیندار، کسانوں (ryot) کے فطری رہنما ثابت ہوئے اور تعلیم اور دیگر فلاحی سرگرمیوں کے پھیلاؤ میں مدد کرنے کے لیے اپنے اجتماعی جذبے کا مظاہرہ کیا۔
- بنگال کے استمراری بندوبست نے کمپنی کے قابل ترین ملازمین کو تشخیص کے جھنجھٹ سے آزاد کر دیا جس بنا پر وہ عدالتی خدمات کے لیے اپنا وقت دینے کے قابل ہو گئے۔ مزید یہ کہ اس نے عارضی بندوبست سے منسلک خرابیوں جیسے، کاشتکار کو ہراساں کرنے، کاشتکار کی جانب سے مدت کے اختتام پر زمین کو خراب ہونے کے لیے چھوڑنے تاکہ وہ تشخیص میں خراب ثابت ہو، کے رجحان سے بچایا۔

10.3.2 نقصانات (Disadvantages)

گو کہ استمراری بندوبست اپنے پہلے سالوں میں بہت کارآمد ثابت ہوا لیکن یہ جلد ہی استحصال اور جبر کے آلے میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے 'سب سے اوپر زمین دار اور سب سے نیچے غلام' پیدا کرنے شروع کیے۔ مالی طور پر، طویل مدتی لحاظ سے ریاست کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ جب زمین کے نئے قطعات زیر کاشت لائے گئے اور پہلے سے زیر کاشت زمین کی لگان میں کئی گنا اضافہ کیا گیا تو ریاست اس اضافے میں اپنے جائز حصہ کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔ 1793 میں طے شدہ ریاستی حصہ 1954 میں بھی اتنا ہی رہا۔ استمراری بندوبست نے بنگال کی معاشی ترقی کو روک دیا۔ زیادہ تر زمینداروں نے زمین کی بہتری میں کوئی دلچسپی نہیں لی بلکہ وہ کاشتکاروں سے صرف زیادہ سے زیادہ ممکنہ کرایہ حاصل

کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ کاشتکار، بے دخلی کے مسلسل خوف میں رہتے تھے اور زمین کو بہتر بنانے میں ان کی کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔

زمیندار جاگیروں پر نہیں رہتے تھے بلکہ دور شہروں میں رہتے تھے جہاں وہ عیش و عشرت میں اپنا وقت اور پیسہ ضائع کرتے تھے۔ اس کے علاوہ، ریاست اور اصل کاشتکاروں کے درمیان دلال پروان چڑھے۔ زمین داروں اور کسانوں کے درمیان میں نئے ثالث (بچولیے یا گماشتے) پیدا ہوئے جنہیں اپنے منافع سے مطلب تھا اور کاشتکار کی حیثیت کم ہو کر ایک مزدور کی سی ہو گئی۔ امریکی زرعی سائنسداں جارج کارور (George Carver) لکھتا ہے کہ: 'جنگ، قحط اور وبائی امراض کے بعد، دیہی برادری کے ساتھ سب سے زیادہ خراب جو ہو سکتا تھا وہ غیر حاضر زمینداری تھی۔' سیاسی طور پر، برطانوی انتظامیہ نے عوام کی ناراضگی و بیگانگی کی قیمت پر چند زمینداروں کی وفاداریاں حاصل کیں۔ اس نظام نے دیہی سماج کو زمینداروں اور کرایہ داروں (کاشتکاروں) میں تقسیم کر دیا۔ سماجی طور پر، زمینداروں کی ملکیت کے مطلق حق کو تسلیم کرتے ہوئے، کمپنی نے کسانوں کی جائیداد یا قبضے کے حقوق کو قربان کر دیا۔ ان کے مالکانہ حقوق کو ختم کر کے اور مکمل طور پر زمیندار کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی۔ آبادی میں اضافے کے نتیجے میں زمین پر بے تحاشہ دباؤ پڑا جو کہ زمینداروں کے ہاتھ میں تھی اور اس سے کسان کی حیثیت ایک غلام کی سی ہو گئی۔ زمینداروں کو مالگزاری کے لیے مقرر کردہ آخری دن کے غروب آفتاب تک مالگزاری سرکاری خزانے میں جمع کروانا تھا جس میں ناکامی کی صورت میں زمینیں ضبط کر کے نیلام کر دی گئیں۔ اس غروب آفتاب کے قانون نے بڑی مشکلات پیدا کیں اور بہت سے زمینداروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر دیا، اور اتنا عدم تحفظ پیدا کر دیا کہ ایک وقت ایسا آیا جب کوئی بولی لگانے والا سامنے نہیں آ رہا تھا۔ زمین کی ملکیت میں متواتر تبدیلیوں نے کاشتکاروں کی حالت کو متاثر کیا۔

10.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

کمپنی نے عظیم تر بنگال جس میں اڑیسہ اور بہار بھی شامل تھے، کی دیوانی حاصل کرنے کے بعد سب سے پہلی توجہ زیادہ سے زیادہ مالگزاری وصول کرنے پر لگائی، کیونکہ ہندوستان سے انگلینڈ سامان بھیجنے کے لیے اسی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ بنگال کی فتح سے پہلے کمپنی ذاتی پیسے سے اس سامان کی خرید کرتی تھی، جس سے اس کا منافع کم ہو جاتا تھا۔ اب صورتحال مختلف ہو گئی کیونکہ کمپنی اب خود ہی حکمراں بن چکی تھی۔ اس طرح ہندوستان کی دولت برطانیہ جانے لگی۔ مالگزاری بڑھانے کے لیے اور زراعت میں ترقی کے لیے 1793 میں، کارنوالس نے ہندوستان میں مالگزاری کے مستقل بندوبست یا دوامی تشخیص کا طریقہ رائج کیا۔ اس میں ہمیشہ کے لیے زمین کے مالکوں سے ایک طے شدہ مالگزاری ادا کرنے کا وعدہ لیا گیا، جس میں گھٹانے بڑھانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ خیال رہے کہ یہ بندوبست صرف بنگال، بہار، اڑیسہ اور اترپردیش کے کچھ حصوں تک ہی محدود تھا۔ اس نظام کے کچھ فوائد اور زیادہ تر نقصان تھے۔ مثلاً یہ ہے کہ اس کو یہ سوچ کر لایا گیا کہ اس سے بدعنوانی پر روک تھام لگائی جا سکے گی اور زمیندار اپنے منافع کو زراعت کی بہتری میں لگائیں گے۔ حالانکہ ہوا ٹھیک اس کے بالکل برعکس۔ دائمی ہونے کی وجہ سے مالگزاری کی شرح بہت زیادہ اونچی رکھی گئی جس سے کتنے زمینداروں کی زمینیں بک گئیں۔ غروب آفتاب قانون کی وجہ سے بھی کافی افراتفری پھیلی۔ زمینداروں نے اپنے گماشتوں کے ذریعے اپنی ہی زمین کو دوبارہ خرید کر نیلامی کے اثرات کو کافی حد تک کم دیا۔ زراعت میں اضافہ ہونے کی صورت میں حکومت اس کے فوائد سے محروم ہو جانے لگی۔ دوسری طرف زمیندار منافع کو کھیتوں میں لگانے کے بجائے گاؤں

سے شہر جا کر رہنے لگے اور وہیں اسے خرچ کرنے لگے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس نظام سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا، الٹا عوام برباد ہوتے چلے گئے۔ اسی وجہ سے کمپنی انتظامیہ کو مالگزاری بندوبست کے دوسرے طریقے تلاشنے پڑے جن کے بارے میں آپ آئندہ اکائیوں میں پڑھیں گے۔

10.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

فارمنگ نظام	:	وارن ہیسٹنگز نے 1772 میں، ایک نیا نظام متعارف کروایا جسے 'Farming' یا کاشتکاری نظام کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت اب یورپی ضلع کلکٹروں کو مالگزاری اکٹھا کرنے کے ذمہ داری دی گئی جب کہ مالگزاری اکٹھا کرنے کا حق سب سے زیادہ بولی لگانے والوں کو دیا گیا۔
روایتی قبضے کا حق	:	(Occupancy Rights) جو ایسے لوگوں کا حق مانا جاتا تھا جو برسوں سے ایک زمین کی کاشت کرتے آ رہے تھے۔
Tenants	:	زمینی کرایہ دار
پٹہ	:	کسان اور زمیندار کے درمیان تحریری معاہدہ جس میں ادا کیے جانے والے کرایہ کی رقم کا ریکارڈ ہوتا تھا۔
عملہ	:	زمینداری کارندوں
شکمی زمینداری	:	(Sub-infeudation) اپنی زمین کے ایک حصے میں کسی دوسرے کو متعینہ مالگزاری کے بدلے زمیندار بنانا۔
غروب آفتاب قانون	:	(Sunset Law) ایک ایسا قانون جس کی رو سے مقررہ دن کو سورج ڈوبنے سے پہلے مالگزاری کی عدم ادائیگی کی صورت میں زمیندار کی زمین نیلام کر دی جاتی تھی۔
غیر حاضر زمیندار	:	(Absentee Landlord) ایسے زمین دار جو شہر میں رہتے تھے اور دیہی سماج سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

10.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

10.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. فارمنگ یا کاشتکاری نظام کب لاگو کیا گیا؟
2. نظامت سے کیا مراد ہے؟
3. دوہرا نظام حکومت کس نے شروع کیا؟
4. استمراری بندوبست کس نے لاگو کیا؟

5. استمراری بندوبست میں ملکیتی حق کسے دیا گیا؟
6. عملہ کسے کہتے ہیں؟
7. شکمی زمینداری سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
8. 'غروب آفتاب قانون' کس سے متعلق تھا؟
9. غیر حاضر زمینداری سے کیا مراد ہے؟
10. پٹہ کسے کہتے ہیں؟

10.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بنگال میں دوہری حکومت کے بارے میں متعدد آراء بیان کیجیے۔
2. دوہری حکومت کے نقصانات واضح کیجیے۔
3. استمراری بندوبست کے فوائد بیان کیجیے۔
4. استمراری بندوبست کے نقصانات بیان کیجیے۔
5. استمراری بندوبست نے زمین کی ملکیت کا حق زمینداروں کو دے دیا، وضاحت کیجیے۔

10.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. بنگال میں انگریزی قبضے پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. استمراری بندوبست کس طرح اور کس مطمح نظر سے نافذ کیا گیا؟ تفصیلی وضاحت کیجیے۔
3. استمراری بندوبست کے فوائد اور نقصانات کا تفصیلی تجزیہ کیجیے۔

10.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition and After*: *A History of Modern India*, Orient BlackSwan, 2015.
2. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, 2015.
3. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
4. Gandhi, Rajmohan, *A History of Modern South India*: *A History from the 17th Century to Our Times*, Aleph Book Company, New Delhi, 2018.
5. Metcalf, Barbara D., and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).

اکائی 11۔ رعیت واری اور محل واری بندوبست

(Ryotwari, and Mahalwari Systems)

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 پس منظر

11.3 رعیت واری بندوبست

11.4 محل واری بندوبست

11.5 اکتسابی نتائج

11.6 کلیدی الفاظ

11.7 نمونہ امتحانی سوالات

11.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

11.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

11.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

11.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

11.0 تمہید (Introduction)

1793 میں، کارنوالس نے جو استمراری بندوبست بنگال میں نافذ کیا تھا،اس کے بہتر نتائج برآمد نہ ہونے کی صورت میں اس کے متبادل مالگزاری نظام کی کھوج بین شروع ہوئی۔ انہیں میں سے ایک رعیت واڑی اور دوسرا محل واڑی بندوبست تھا۔ رعیت واری نظام، برطانوی ہندوستان میں ایک زمینی مالگزاری کا نظام تھا جسے تھامس منرو نے متعارف کرایا تھا۔اس نے حکومتی محصولات کی وصولی کے لیے رعیت (کاشتکار) سے براہ راست معاملہ کیا اور کسانوں کو کاشت کے لیے نئی زمین دینے یا حاصل کرنے کی آزادی دی۔ یہ نظام تقریباً 5 سال سے چل رہا تھا اور اس میں مغلوں کے نظام محصول کی بہت سی خصوصیات تھیں۔ اس نظام کو بمبئی، مدراس، آسام اور برما میں نافذ کیا گیا تھا۔ زمینداری اور رعیت واری بندوبست میں فرق یہ ہے کہ جہاں زمین کی آمدنی براہ راست رعیت یا انفرادی کاشتکار جنہوں نے اصل میں زمین پر کام کیا تھا، پر عائد کی جاتی تھی، ایسے تشخیص کے نظام کو رعیت واری کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جہاں زمینی محصول بالواسطہ طور پر زمینداروں سے وصول کیا جاتا تھا، اس نظام کو زمینداری کے نام سے جانا جاتا تھا۔ محل واری نظام کو ہندوستان میں گاؤں کی سطح کی خود مختاری کے تحفظ کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ اسے ہولٹ میکنزی نے 1822 میں متعارف کرایا تھا۔ لفظ 'محل واری' ہندی لفظ 'محال' سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے گاؤں کے ایک گروہ پر مبنی برادری۔ محل واری مین ایسے زمینداروں یا نمبرداروں پر شامل ہوتے تھے جو اپنے اپنے گاؤں یا گاؤں کے کسی گروہ کی نمائندگی کرتے تھے۔ گاؤں کی برادریوں کے ساتھ ساتھ، زمیندار بھی ٹیکس کی ادائیگی کے لیے مشترکہ طور پر ذمہ دار تھے۔ محال کی پیداوار کی بنیاد پر محصول کا تعین کیا جاتا تھا۔ انفرادی ذمہ داری تفویض نہیں کی جاتی تھی۔ دیہات کی تمام زمینیں بشمول جنگلات، چراگاہیں وغیرہ اس نظام کے تحت شامل تھیں۔ یہ نظام گنگا کی وادی، اترپردیش، شمال مغربی صوبہ، وسطی ہندوستان اور پنجاب کے کچھ حصوں میں رائج تھا۔

11.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان میں برطانوی مالگزاری نظام کو سمجھ سکیں گے۔
- مالگزاری منظم کرنے کے لیے متعدد بندوبستوں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- رعیت واری بندوبست کی وضاحت کر سکیں گے۔
- محل واری بندوبست پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- دونوں نظام مالگزاری کے فوائد اور نقصانات سمجھ سکیں گے۔

11.2 پس منظر (Background)

گو کہ استمراری بندوبست اپنے پہلے سالوں میں بہت کارآمد ثابت ہوا لیکن یہ جلد ہی استحصال اور جبر کے آلے میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے 'سب سے اوپر زمین دار اور سب سے نیچے غلام' پیدا کرنے شروع کیے۔ مالی طور پر، طویل مدتی لحاظ سے ریاست کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔

جب زمین کے نئے قطعات زیر کاشت لائے گئے اور پہلے سے زیر کاشت زمین کی لگان میں کئی گنا اضافہ کیا گیا تو ریاست اس اضافے میں اپنے جائز حصہ کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔ 1793 میں طے شدہ ریاستی حصہ 1954 میں بھی اتنا ہی رہا۔ استمراری بندوبست نے بنگال کی معاشی ترقی کو روک دیا۔ زیادہ تر زمینداروں نے زمین کی بہتری میں کوئی دلچسپی نہیں لی بلکہ وہ کاشتکاروں سے صرف زیادہ سے زیادہ ممکنہ کرایہ حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ کاشتکار، بے دخلی کے مسلسل خوف میں رہتے تھے اور زمین کو بہتر بنانے میں ان کی کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔

زمیندار جاگیروں پر نہیں رہتے تھے بلکہ دور شہروں میں رہتے تھے جہاں وہ عیش و عشرت میں اپنا وقت اور پیسہ ضائع کرتے تھے۔ اس کے علاوہ، ریاست اور اصل کاشتکاروں کے درمیان دلال پروان چڑھے۔ زمین داروں اور کسانوں کے درمیان میں نئے ثالث (بچولیے یا گماشتے) پیدا ہوئے جنہیں اپنے منافع سے مطلب تھا اور کاشتکار کی حیثیت کم ہو کر ایک مزدور کی سی ہو گئی۔ امریکی زرعی سائنسداں جارج کارور (George Carver) لکھتا ہے کہ: 'جنگ، قحط اور وبائی امراض کے بعد، دیہی برادری کے ساتھ سب سے زیادہ خراب جو ہو سکتا تھا وہ غیر حاضر زمینداری تھی۔' سیاسی طور پر، برطانوی انتظامیہ نے عوام کی ناراضگی و بیگانگی کی قیمت پر چند زمینداروں کی وفاداریاں حاصل کیں۔ اس نظام نے دیہی سماج کو زمینداروں اور کرایہ داروں (کاشتکاروں) میں تقسیم کر دیا۔ سماجی طور پر، زمینداروں کی ملکیت کے مطلق حق کو تسلیم کرتے ہوئے، کمپنی نے کسانوں کی جائیداد یا قبضے کے حقوق کو قربان کر دیا۔ ان کے مالکانہ حقوق کو ختم کر کے اور مکمل طور پر زمیندار کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی۔ آبادی میں اضافے کے نتیجے میں زمین پر بے تحاشہ دباؤ پڑا جو کہ زمینداروں کے ہاتھ میں تھی اور اس سے کسان کی حیثیت ایک غلام کی سی ہو گئی۔ زمینداروں کو مالگزاری کے لیے مقرر کردہ آخری دن کے غروب آفتاب تک مالگزاری سرکاری خزانے میں جمع کروانا تھا جس میں ناکامی کی صورت میں زمینیں ضبط کر کے نیلام کر دی گئیں۔ اس غروب آفتاب کے قانون نے بڑی مشکلات پیدا کیں اور بہت سے زمینداروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر دیا، اور اتنا عدم تحفظ پیدا کر دیا کہ ایک وقت ایسا آیا جب کوئی بولی لگانے والا سامنے نہیں آ رہا تھا۔ زمین کی ملکیت میں متواتر تبدیلیوں نے کاشتکاروں کی حالت کو متاثر کیا۔

11.3 رعیت واری بندوبست (Ryotwari Settlement)

کارنوالس کو توقع تھی کہ اس کا استمراری بندوبست یا زمینداری نظام ہندوستان کے دیگر حصوں تک بھی پھیل جائے گا۔ جب ویلزلی ہندوستان آیا تو اس نے 1798 میں مدراس پریزیڈنسی تک اس کی توسیع کا حکم دیا۔ یہاں مسئلہ بنگال کی طرح قابل قدر زمینداروں کی تلاش کا تھا۔ مدراس انتظامیہ نے بڑے پیمانے پر مقامی پولیگروں کا تعارف زمیندار کے طور پر کرایا جنہیں مدراس پریزیڈنسی میں زمیندار کے طور پر تسلیم بھی کر لیا گیا۔ ایسے علاقوں میں جہاں ایسے لوگ نہیں مل سکے، دیہی جائیدادوں کو جمع کر کے سب سے زیادہ بولی لگانے والوں کو نیلامی میں فروخت کر دیا گیا۔ برطانوی سرکاری حلقوں میں استمراری بندوبست کے بارے میں مایوسی بڑھ رہی تھی کیوں کہ اس کی وجہ سے حکومت کے پاس آمدنی بڑھانے کا کوئی ذریعہ نہیں بچا تھا۔ تھامس منرو (Thomas Munro) جس نے کمپنی کے مالگزاری نظام میں تبدیل لانے کی پہل کی تھی، ہندوستان میں حکومتی منصوبہ بندی کی پالیسی کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ ڈیوڈ ریکارڈو (David Ricardo) کا کرائے کا نظریہ موجودہ نظام پر نظر ثانی کا اشارہ دے رہا تھا۔ کرایہ زمین سے حاصل ہونے والا فاضل تھا یعنی اس کی آمدنی میں سے پیداوار پر آنے والی

لاگت اور مزدوری کو الگ کرنے کے بعد بچنے والی رقم اور ریاست کے پاس اس اضافی رقم پر دعویٰ جائز تھا بجائے اس کے کہ انہیں غیر پیداکاروں (ثالثوں، بچولوں، گماشتوں) کے حوالے کیا جاتا، جن کا واحد دعویٰ ان کے ملکیتی حق کی وجہ سے تھا۔ نئے بندوبست کی ایک زیادہ طاقتور وجہ مدراس پریزیڈنسی کا ہمہ وقت رہنے والا مالی بحران تھا جو جنگ کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی وجہ سے مزید گہرا ہو گیا تھا۔ یہ مدراس پریزیڈنسی میں رعیت واری بندوبست کی ابتدا تھی۔

رعیت واری کا تجربہ الیگزینڈر ریڈ(Alexander Reed) نے 1792 میں بارہ محل میں شروع کیا تھا اور اسے تھامس منرو نے 1801 سے جاری رکھا جب اسے ملحقہ اضلاع کے محصول انتظامیہ کا چارج سنبھالنے کو کہا گیا۔ زمینداروں کے بجائے اس نے براہ راست گاؤوں سے مالگزاری اکٹھا کرنا شروع کیا، اور ہر گاؤں کے ذمے ادائیگی کی رقم طے کر دی۔ اس کے بعد اس نے ہر کاشت کار یا رعیت کا الگ الگ

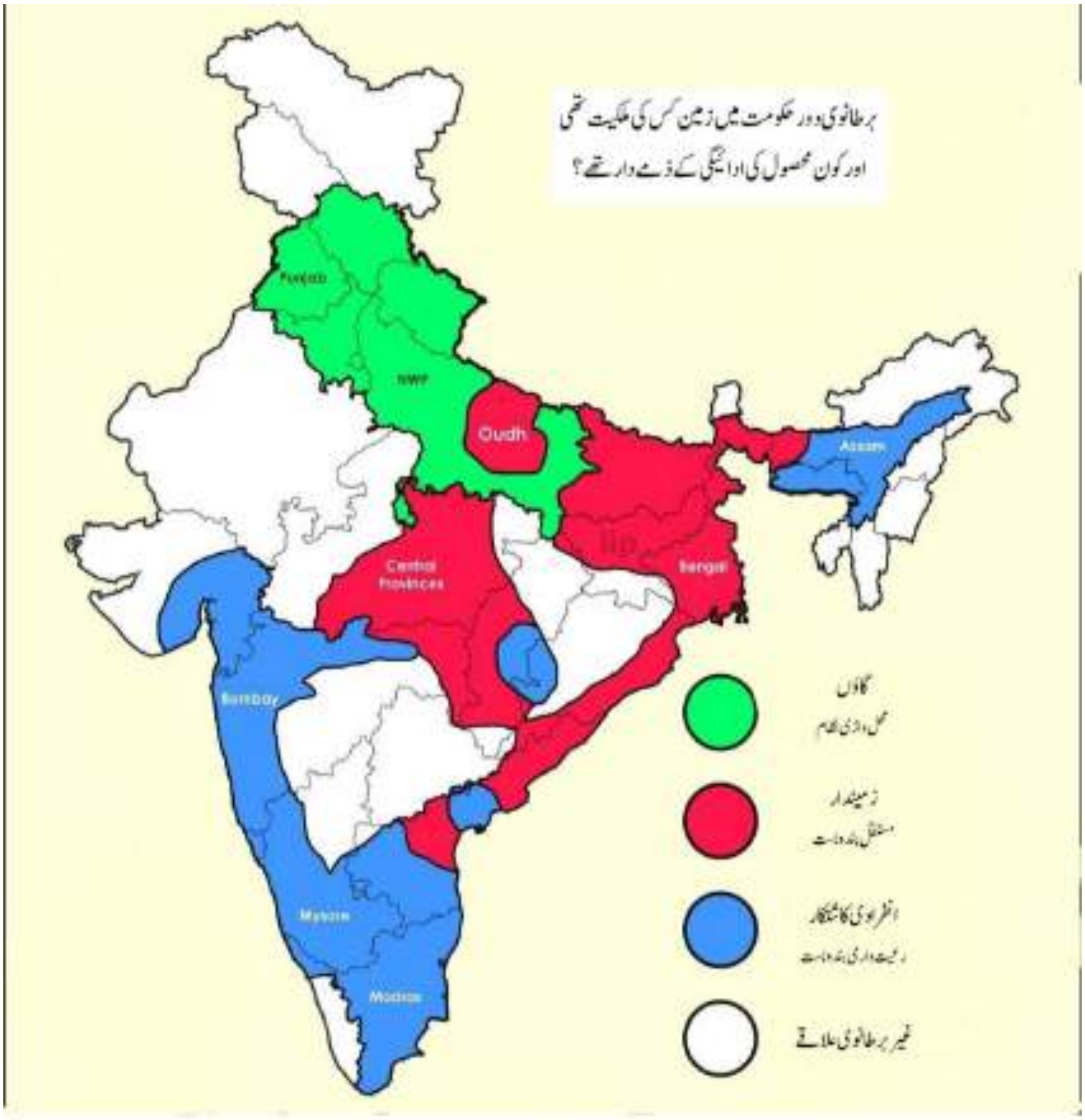

(Source: Abhijeet Banerjee, and Lakshmi Iyer, *History, Institutions, and Economic Performance: The Legacy of Colonial Land Tenure Systems in India* Credits:- india.in.pixels)

جائزہ لیا اور اس طرح رعیت واری نظام تیار کیا۔ اس نے زمین کی ذاتی ملکیت کی تخلیق کی اور یہ زمیندار کے بجائے کسانوں کے ہاتھ میں تھی۔ منرو نے 'چار یا پانچ سو بڑے مالکان کے مقابلے میں چالیس سے پچاس ہزار چھوٹے مالکان کے ہاتھ میں' ہونے کو ترجیح دی۔ ہر کھیت پر قابل ادائیگی لگان کا فیصلہ کرنے کے لیے (Field-Assessment System) یا ایک کھیت جائزہ نظام تیار کیا گیا جس میں مستقل طور پر تمام زمینوں کے عمومی سروے کے ذریعے تخمینہ لگایا جاتا تھا۔ حکومت اور کاشتکار کے درمیان سالانہ معاہدے کیے جاتے تھے، اور کاشتکار معاہدے کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ اگر کاشتکار راضی ہوتا تو اسے ایک پٹہ ملتا، جو اسے نجی ملکیت کا حق دیتا اور اگر کوئی کاشتکار نہ ملتا تو زمین ویسی ہی پڑی رہتی۔ لہٰذا پر کشش اور قابل لحاظ ہونے کے لیے زمین کے تفصیلی سروے کی ضرورت تھی یعنی مٹی کا معیار، کھیت کا رقبہ اور زمین کے ہر ٹکڑے کی اوسط پیداوار کا تخمینہ لگا کر اس کی بنیاد پر مالگزاری کی مقدار طے کی جاتی تھی۔ لیکن عملی طور پر تخمینہ، اندازے کی بنیاد پر لگایا جاتا اور حکومتی طلب اکثر اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ وہ بڑی مشکل سے حاصل ہو پاتی تھی یا بالکل ہی ناقابل حصول تھی۔ چنانچہ 1807 میں منرو کی لندن روانگی کے فوراً بعد رعیت واری نظام تقریباً ترک کر دیا گیا۔

1820 کے آس پاس جب تھامس منرو مدراس کے گورنر کے طور پر ہندوستان واپس آیا تو صورتحال بدلنا شروع ہو گئی، کیونکہ اس نے دلیل دی کہ رعیت واری قدیم ہندوستانی مالگزاری نظام تھا اور ہندوستانی حالات کے لیے بہترین طور پر موزوں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ برطانوی سلطنت کو خود مختاری کے ایک متفقہ تصور کی ضرورت ہے اور رعیت واری نظام اس کے لیے ایک بنیاد فراہم کر سکتا ہے۔ وہ یہ دلیل دے کر اپنے موقف کا جواز پیش کرتا ہے کہ ہندوستان میں تاریخی طور پر زمین ریاست کی ملکیت تھی اور ریاست نے انفرادی کسانوں سے مالگزاری وصول کرنے کے لیے افسران کے ایک سلسلے کا استعمال کیا جنہیں انعام میں زمینیں دی جاتی تھی۔ منرو نے زور دیا کہ یہ نظام کسانوں کے لیے مالگزاری کے بوجھ کو کم کرے گا جب کہ اس سے ریاست کے لیے زمینی محصولات کی بڑی مقدار حاصل ہو گی کیونکہ اس میں کوئی بچولیہ (ثالث یا گماشتہ) نہیں ہو گا جو اضافی رقم کا حصہ دار بنے گا۔ اگرچہ اس سے حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوا، لیکن اس نے کاشتکاروں کو شدید پریشانی میں ڈال دیا۔ بہت سے علاقوں میں کوئی سروے نہیں کیا گیا تھا اور رعیت کے ٹیکس کا تخمینہ، پچھلی ادائیگیوں کے اندازے سے گاؤں کے کھاتوں کی بنیاد سے کیا جانے لگا، جسے پٹ کٹ بندوبست (Put-cut Settlement) کہا جاتا تھا۔ رعیت کی طرف سے ادا کی جانے والی آمدنی ہر کھیت پر نہیں پورے فارم پر مقرر کی گئی تھی جس میں آبپاشی کی سہولیات اور پیداواری صلاحیت مختلف سطحوں کی ہو سکتی تھیں۔ کسان روز بروز مقروض ہو رہے تھے اور کھیتی کی توسیع کے لیے سرمایہ کاری نہیں کر سکتے تھے۔

رعیت واری نظام نے گاؤں کے اشرافیہ کو حکومت اور کسانوں کے درمیان بچولیے کے طور پر ختم نہیں کیا۔ چونکہ مراعات یافتہ میراثی داروں کے خصوصی حقوق کو تسلیم کیا گیا تھا اور برہمنوں کی ذات کے مراعات کا احترام کیا گیا تھا، موجودہ گاؤں کی طاقت کا ڈھانچہ شاید ہی بدلا تھا بلکہ درحقیقت نئے نظام سے اور بھی مضبوط ہوا تھا۔ میراثی دار زرعی ذاتیں تھیں جیسے کہ تامل علاقے میں ویلال۔ مالگزاری حکام نے اپنے آپ میں مالگزاری اور وصولی اور پالیسی ڈیوٹی کو یکجا کر دیا تھا جس کا نتیجہ ماتحت اہلکاروں کی جانب سے رشوت اور بدعنوانی کی صورت میں نکلا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موثر اصلاحات کی ضرورت تھی۔

مدراس کے زرعی سماج پر رعیت واری نظام کے اثرات کو مختلف طریقوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نے جائیداد کے حقوق کی تعریف کی، اس نے درحقیقت گاؤں کے طاقتور افراد کی طاقت کو اور مضبوط کیا اور اس طرح سماجی تنازعات میں شدت آئی۔ مدراس حکومت نے میراثی داری طاقت کے خلاف کرایہ داروں کی فعال لیکن بے نتیجہ مزاحمت کے باوجود ان کے حقوق کے تحفظ میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ تنجاور (تنجور) ضلع میں کاویری ڈیلٹا میراثی داروں کے 'سنہری دور' کو ظاہر کرتا ہے، جنہوں نے زمین اور مزدوروں پر اپنا تسلط جما لیا اور اس طرح 'مقامی سماج کی واضح تفریق کو تیز تر کر دیا'۔ مدراس پریزیڈنسی کے آندھرا اضلاع میں رعیت واری نظام نے کسانوں کے اندر تفریق کو فروغ دیا۔ بڑے زمینداروں کا ایک امیر گروپ تھا جسے 'کسان بورژوا' کہا جاتا تھا جو بڑے کھیتوں کو کنٹرول کرتا تھا اور اضافی زمین بے زمین کرایہ داروں اور بٹائی پر کاشت کرنے والوں کو لیز (Lease) پر دیتا تھا۔ ایک طرف بچو لیے طبقہ کے معاشی حالات مستحکم تھے تو دوسری طرف غریب کسان جو کہ دیہی آبادی کی اکثریت تھی، ناسازگار حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ امیر کسانوں اور قرض داروں کے ہاتھوں ان کا استحصال کیا گیا اور وہ نامساعد حالات کے باوجود مزدوری کرنے پر مجبور ہوگئے اور زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بندھے رہے۔

بمبئی پریزیڈنسی میں رعیت واری نظام کا آغاز 1803 میں اس کے گجرات میں الحاق کے بعد ہوا تھا، اور پھر جب 1818 میں پیشوا کے علاقوں کو فتح کیا گیا تھا، تو اسے منرو کے شاگرد ماؤنٹ اسٹوارٹ ایلفنسٹن (Mount Stuart Elphinstone) کی نگرانی میں ان علاقوں تک بڑھا دیا گیا تھا۔ ابتدائی طور پر، ان علاقوں میں انگریز، دیش مکھوں اور گاؤں کے سرداروں یا پٹیلوں کے ذریعے مالگزاری وصول کرتے تھے۔ لیکن اس سے اتنی آمدنی نہیں ہوئی جتنی ان کو توقع تھی۔ اسی لیے انہوں نے 14-1813 سے کسانوں سے براہ راست مالگزاری وصول کرنا شروع کیا۔ چونکہ مقرر کردہ محصولات کی شرحیں غیر معمولی طور پر زیادہ نکلیں۔ بار بار فصل کی ناکامی اور قیمتوں میں کمی کے باعث، کسانوں کو یا تو اپنی زمینیں ساہوکاروں کے پاس گروی رکھنی پڑیں یا پھر کاشت چھوڑ کر پڑوسی ریاستوں میں ہجرت کرنا پڑی جہاں قیمتیں کم تھیں۔ یہ اسکیم، جو پہلی بار 1830 میں اِنداپور تعلقہ میں متعارف کرائی گئی تھی، جلد ہی ناقص پائی گئی اور اسے ترک کر دیا گیا۔ اسے 1835 میں دو افسران جی ونگیٹ (G. Wingate) اور گولڈاسمتھ (Goldsmith) کے ذریعہ وضع کردہ ایک اصلاح شدہ 'بامبے سروے سسٹم' (Bombay Survey System) کے ذریعہ تبدیل کر دیا گیا۔

مغربی ہندوستان کے زرعی سماج پر رعیت واری بندوبست کا اثر ایک تاریخی بحث کا موضوع ہے، کیونکہ اس نے 1875 میں بامبے اور دکن میں دیہی بغاوت کو جنم دیا تھا۔ اس نے گاؤں کے پاٹل (پٹیل) کی حیثیت کو ایک عام کسان اور حکومتی ملازم تک محدود کر دیا تھا۔ بندوبست نے تمام زمینداروں کو بھی بے گھر نہیں کیا تھا۔ گجرات میں بھاگے داروں، نرواداروں اور احمد آباد کے تعلقہ داروں کے اعلیٰ حقوق کا احترام کیا گیا، اور اس کے نتیجے میں، ان خطوں میں 'زیادہ سے زیادہ سیاسی اور سماجی استحکام کو یقینی بنایا گیا۔' صرف وسطی دکن ہی میں طاقت کا خلا پیدا ہوا، جس نے مارواڑی اور گجراتی بنیوں کے لیے زیادہ فعال کردار کے مواقع فراہم کیے۔ یہاں جو بات شاید دیکھی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ مدراس اور بمبئی دونوں میں رعیت واری نظام کے سماجی اثرات، استمراری بندوبست کے مقابلے کم تباہ کن تھے۔ لیکن اس کے 'تسلسل' کے، موضوع پر بحث کرنا مشکل ہے، کیونکہ پرانی شکلیں جو رائج تھیں، 'سامراج کے ذریعے مختلف انداز میں ترتیب دی جا چکی تھیں۔'

11.4 محل واری بندوبست (Mahalwari Settlement)

'گاؤں کی برادری'، جس کے بارے میں کچھ ابتدائی مغربی مبصرین نے اتنی وضاحت سے بات کی، نہ تو اس کا خیال استمراری بندوبست میں رکھا گیا اور نہ ہی رعیت واری نظام میں۔ تاہم، جب ان دو نظاموں پر کام کیا جا رہا تھا، شمال اور شمال مغربی ہندوستان کے وسیع علاقے جو ایک زمانے میں مغل سلطنت کا مرکز تھے، جو ہمالیہ کے دامن سے لے کر وسطی ہندوستانی پٹھار تک بشمول گنگا جمنا دوآب پھیلے ہوئے تھے۔ اس علاقے کی زرعی ساخت میں، ایک طرف، زمینداروں کا ایک چھوٹا گروہ تھا، جسے تعلقہ دار کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سید نورالحسن(Saiyid Nurul Hasan) نے انہیں 'درمیانی زمیندار' کہا ہے، جنھوں نے 'دیے گئے علاقہ کی مالگزاری کی وصولی کے لیے ریاست کے ساتھ معاہدہ کیا۔' دوسری طرف، 'بنیادی زمینداروں' کا ایک بڑا گروہ تھا، جو 'زرعی اور رہائشی زمینوں پر ملکیتی حقوق' رکھتے تھے۔ اس گروپ میں چھوٹے مالک کسان اور کئی گاؤں کے بڑے زمیندار بھی شامل تھے۔ بنگال طرز کو ذہن میں رکھتے ہوئے، انگریز مالگزاری کی وصولی کے لیے ابتدائی طور پر تعلقہ داروں سے رجوع ہوئے، جن میں اٹھارویں صدی کے آخر تک دو الگ الگ سماجی گروہ شامل ہو گئے تھے۔ ایک طرف مقامی طور پر 'پشتینی ریاستوں کے حکمران' تھے اور دوسری طرف مغل جاگیردار، مالگزاری حکام اور ٹیکس دینے والے مالدار کسان جنھوں نے خود کو 'اصل راجا یا تعلقہ دار' بنا رکھا تھا۔

بہت سے بڑے تعلقہ داروں نے نئی حکومت اور اس کی اونچی مالگزاری کی مانگ کے خلاف مزاحمت کی تاہم انہیں انتہائی بے رحمی کے ساتھ کچل دیا گیا۔ بہت سے لوگوں کو بھگا دیا گیا اور ان کے کچے قلعوں کو زمین بوس کر دیا گیا۔ دیگر معاملات میں حکومت کی طرف سے محصول نہ چکا پانے کی صورت میں جائیدادیں فروخت کر دی گئیں۔ نتیجے کے طور پر، 1820 تک، ان میں سے بہت سے لوگ 'یا تو اپنی حیثیت مکمل طور پر کھو چکے تھے یا پھر حقیر ہو کر رہ گئے تھے۔' نیلامی میں فروخت ہونے والی زمین اکثر عملہ اور تحصیلداروں کے ذریعہ خریدی جاتی تھی، جنھوں نے اپنی مقامی جانکاری اور علاقے میں کچھ بہترین جائیدادیں خریدنے کے لیے اپنی طاقت کا استعمال کیا۔ بنارس کے علاقے میں انیسویں صدی کے وسط تک زمین کے مالک بدل چکے تھے۔ وہ 'سرکاری ملازمین، ان کی اولادوں، تاجروں اور مہاجنوں' کے قبضے میں چلی گئی۔ ان لوگوں نے 'زمینداروں کا ایک نیا طبقہ' تشکیل دیا، جو دیہی برادری سے باہر تھے اور زمین کے بارے میں مختلف رویہ رکھتے تھے۔ تاہم اس صورتحال سے ایک خوف پیدا ہوا کہ زمین غیر کسان طبقوں کے ہاتھ میں جا رہی ہے۔

چنانچہ تعلقہ داروں سے انگریزوں کی ترجیح اب 'بنیادی زمینداروں' اور گاؤں کی برادریوں کی جانب منتقل ہو گئی۔ میکنزی کی سفارشات(Mackenzie's Recommendations) کو 1822 کے ضابطہ نمبر VII میں شامل کیا گیا تھا، جس میں آمدنی کے جائزہ کے لیے ایک تفصیلی کھیت در کھیت سروے فراہم کیا گیا تھا۔ بندوبست، دیہی برادری کے ساتھ کیا جانا تھا یا جہاں ممکن ہو کسی تعلقہ دار کے ساتھ۔ مالکان کے حقوق کے علاوہ، رہائشی کاشتکاروں کی طرف سے ادا کیے جانے والے لگان کا بھی پتہ لگانا اور ریکارڈ کرنا تھا۔ اس طرح تعلقہ داروں کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا، لیکن جہاں ممکن ہوا زمین پر مشترکہ ملکیتی حق، گاؤں کی برادریوں کو دیا گیا۔ مالگزاری کو زیادہ سے زیادہ

بڑھانے کے ساتھ ساتھ کسان مالکان کے حقوق کے تحفظ کے لیے زراعت کی بہتری کو یقینی بنانے کی ضرورت تھی۔اس کے بجائے 'ریکارڈین تھیوری آف رینٹ'(The Ricardian Theory of Rent) کے اثر ورسوخ نے محل واری بندوبست کے قیام کی ترغیب دی۔

رابرٹ مرٹنس برڈ(Robert Merttins Bird, 1853-1788) نے ایک بہتر اور نظر ثانی شدہ محل واری نظام پیش کیا، جس میں ایک پورے محل یا مالیاتی اکائی کی مالگزاری کا تخمینہ لگانے کے لیے تفصیلی سروے کیا جاتا تھا، جو کھیت کی ممکنہ پیداوار کی نقد قدر پر مبنی تھا۔اس طرح طے شدہ کل مالگزاری کو مشترکہ ملکیت کے ممبران میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ریاست کو زمین کی خالص آمدنی کا دو تہائی حصہ دینا تھااور بندوبست تیس سال کے لیے کیا جاتا تھا۔یہ دیہی طبقوں کے لیے ایک اچھا موقع تھا، جو کہ زیادہ محصول کی طلب، بڑھتے ہوئے قرضوں کے بوجھ، پچھلے محصول کے بقایاجات اوراس کے نتیجے میں ان کی جائیدادوں کی فروخت اور شہری عدالتوں کے احکام کے ذریعے ملکیت کی محرومی کی وجہ سے برباد ہوگئے تھے۔بہت سے معاملات میں زمین ساہوکاروں اور سوداگروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔1857 کی بغاوت میں شمالی ہندوستان کے دیہی سماج کی شکایات کااظہار کہیں زیادہ زوروشوراور پرتشدد طریقے سے ہوا۔

11.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس طرح انیسویں صدی کے وسط تک کمپنی کی انتظامیہ نے مالگزاری بندوبست کے تین نظام وضع کیے تھے، جس میں زمین میں ذاتی ملکیت پیدا کی گئی اور وہ ملکیتی حق تین مختلف گروہوں کو دیا گیا۔استمراری بندوبست میں یہ زمینداروں کے ہاتھ میں رکھا گیا، کیوں کہ اس کا بنیاد گذار کارنوالس خود انگلینڈ کے زمیندار طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔رعیت واری بندوبست میں یہ حق رعیت (کسانوں) کو یا کسان مالکان کو سونپا گیا، کیونکہ اس کے بانی ریڈ اور منرو زمین پراس کے جوتنے والے کے حق کو اولیت دیتے تھے اور کسی بھی بچولیے کو درمیان سے ہٹا کر سرکاری آمدنی میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔دوسری طرف محل واری بندوبست میں گاؤں کے طبقات کو زمین کا مشترکہ مالک سمجھا گیا۔ایک موٹے اندازے کے مطابق، 29-1928 میں ہندوستان میں قابل کاشت زمین کا تقریباً 19 فیصد استمراری بندوبست، 29 فیصد محل واری بندوبست اور 52 فیصد رعیت واری بندوبست کے تحت تھا۔تمام بندوبست کی ایک مشترکہ خصوصیت حد سے زیادہ تشخیص تھی، بھلے ہی وہ کمپنی کے اہلکاروں کی لاپرواہی اور بدعنوانی کی وجہ سے اکثر جگہ پر سطحی یا اندازے پر مبنی ہوتی تھی، کیونکہ کمپنی کی حکومت کا بنیادی مقصد مالگزاری کی آمدنی کو زیادہ سے زیادہ کرنا تھا۔

اس کے نتائج ادائیگی کے بقایہ جات، بڑھتے ہوئے قرض، زمین کی فروخت میں اضافہ اور ملکیت سے محرومی تھے۔جدید تحقیق نے ثابت کیاہے کہ ان تبدیلیوں کے اثرات اس سے کہیں زیادہ نتیجہ خیز تھے جیسا کہ انہیں شروع میں تصور کیا گیا تھا۔ان میں اہم علاقائی تغیرات تھے کیونکہ زمین کی منتقلی ہر جگہ زمین کی ملکیت کے ڈھانچے کو بنیادی طور پر تبدیل نہیں کرسکی تھی۔متعدد جگہوں پر زمینداروں نے زمین کی نیلامی میں اپنی ہی زمین کو کسی کے ذریعے دوبارہ خرید لیا تھا۔

11.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

روایتی قبضے کا حق : (Occupancy Rights) جو ایسے لوگوں کا حق مانا جاتا تھا جو برسوں سے ایک زمین کی کاشت کرتے آرہے تھے۔

رعیت : انفرادی کاشتکار یا عام کسان

محال : ایک گاؤں یا گاؤں کا ایک گروہ

پٹہ : کسان اور زمیندار کے درمیان تحریری معاہدہ جس میں ادا کیے جانے والے کرایہ کی رقم کا ریکارڈ ہوتا تھا۔

11.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

11.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. رعیت کسے کہتے ہیں؟
2. محل کسے کہتے ہیں؟
3. رعیت واری مالگزاری نظام کس نے نافذ کیا؟
4. رعیت واری مالگزاری نظام کب نافذ کیا گیا؟
5. محل واری مالگزاری نظام کس نے نافذ کیا؟
6. رعیت واری نظام میں پٹی کس کے ساتھ کیا جاتا تھا؟
7. تعلقہ دار کون تھے؟
8. جوتدار کسے کہا جاتا تھا؟
9. کھیت جائزہ نظام (Field-Assessment System) کس نے لاگو کیا؟
10. پٹہ کسے کہتے ہیں؟

11.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. رعیت واری بندوبست کے فوائد بیان کیجیے۔
2. رعیت واری بندوبست کے نقصانات بیان کیجیے۔
3. محل واری بندوبست کے فوائد بیان کیجیے۔
4. محل واری بندوبست کے نقصانات بیان کیجیے۔
5. رابرٹ مرٹنس برڈ کے ایک بہتر اور نظرثانی شدہ محل واری نظام پر نوٹ لکھیے۔

11.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. رعیت واری اور محل واری بندوبست کے پس منظر پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. رعیت واڑی بندوبست پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. محل واڑی بندوبست پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

11.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition and After*: *A History of Modern India*, Orient BlackSwan, 2015.
2. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, 2015.
3. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
4. Gandhi, Rajmohan, *A History of Modern South India*: *A History from the 17th Century to Our Times*, Aleph Book Company, New Delhi, 2018.
5. Metcalf, Barbara D., and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).

اکائی 12۔دولت کی نکاسی

(The Drain of Wealth)

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید
12.1 مقاصد
12.2 ماقبل برطانوی دور: مالگزاری اور زراعت
12.3 ہندوستان میں نوآبادیات کے مراحل
12.3.1 تجارتی سرمایہ داری کا مرحلہ
12.3.2 صنعتی سرمایہ داری کا مرحلہ
12.3.3 مالیاتی سرمایہ داری کا مرحلہ
12.4 دولت کی نکاسی کا نظریہ
12.4.1 ابتدا اور ارتقا
12.4.2 دولت کی نکاسی کے اسباب
12.4.3 دولت کی نکاسی کے نتائج
12.4.4 دولت کی نکاسی کے طریقے
12.4.5 دولت کی نکاسی سے متعلق مؤرخین کے خیالات
12.4.6 نکالی گئی دولت کی مقدار اور نوعیت
12.5 جدید صنعتوں کا ارتقا
12.6 زرعی معیشت اور زراعت کی تجارت کاری
12.6.1 دیہی مقروضیت
12.6.2 زرعی مزدوروں میں اضافہ
12.7 اکتسابی نتائج

12.8 کلیدی الفاظ
12.9 نمونہ امتحانی سوالات
12.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان کی دو تہائی آبادی کی ضروریات زندگی زراعت پر منحصر ہے ۔ برطانوی راج کے قائم ہونے کے بعد 1860اور1920کے درمیان قابلِ کاشت اراضی میں 50فیصد کا اضافہ ہوا۔تاہم اس سے دیہی معیشت اور کسانوں کی حالت میں کچھ زیادہ سدھار نہیں آیا۔انیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان میں اراضیات اور زراعت کا دو بڑی بیرونی طاقتوں سے واسطہ پڑا جس نے دیہی معیشت پر اثر ڈالا۔ریاست اپنی زیادہ تر فوجی ضروریات کو پورا کرنے کیلیے دیہی معیشت کے وسائل کو ہی استعمال کرتی۔ نتیجتاً ہندوستان میں نئے اراضی محصولات کا نظام رائج کیا گیا جس میں مالکانہ حقوق میں تبدیلی کی گئی اور جنہیں نئے قوانین اور جدید عدالتوں کا تحفظ حاصل تھا۔مالکانہ حقوق سے متعلق احکام ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں مختلف تھے۔مثال کے طور پر' بنگال میں مستقل بندوبست یا زمینداری بندوبست (1793)کے ذریعہ ثانوی ملکیت فراہم کی گئی۔دیگر بندوبست میں مدراس پریزیڈنسی کیلیے رعیت واری بندوبست اور محل واری نظام برائے شمالی علاقہ جات متعارف کیے گئے۔ہندوستان کے طول و عرض میں ان زرعی و اراضی محصولات کی پالیسیوں نے دیہی علاقوں میں زرعی پیداوار' روزگار' تجارتی فصلوں میں وسعت' اور کسانوں کی طرز زندگی پر کافی گہرا اثر ڈالا۔

12.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- ما قبل برطانوی راج کے مالگزاری نظام اور معاشی حالات کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ہندوستان میں نوآبادیات کے مراحل کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ہندوستان سے دولت کی نکاسی کے نظریہ کا جائزہ لے سکیں گے۔
- جدید صنعتوں کے ارتقا کو سمجھ سکیں گے۔
- زراعت کی بازارکاری کے نتائج کے بارے میں جان لیں گے۔
- دیہی مقروضیت کے بارے میں وضاحت کر سکیں گے۔
- زرعی مزدوروں میں اضافہ کا تجزیہ کر سکیں گے۔

12.2 ما قبل برطانوی دور میں نظام مالگزاری اور زراعت

(Agriculture and Revenue System in Pre-British India)

سامراجی نظام سے پہلے، زرعی پیداوار بازار میں بڑے پیمانے پر فروخت ہوا کرتیں۔ بازار زیادہ تر ایک علاقہ تک محدود ہوتے اور اوزان و پیمائش کے آلے ہر علاقہ میں الگ الگ ہوتے۔ حمل و نقل زیادہ تر بیل گاڑیوں پر ہوتا کیونکہ طویل فاصلہ میں تجارت کرنا کشتیوں کے ذریعہ ممکن نہیں تھا۔ تاہم انیسویں صدی میں بازار کی توسیع کافی الگ تھی۔ ریلوے لائن کے قیام نے ان رکاوٹوں کو دور کر دیا تھا۔ ہندوستان، عالمی تجارتی نظام کا ایک اہم حصہ بن گیا۔ برطانیہ صنعتی پیداوار میں تجربہ کار اور رہنما ملک بن گیا جب کہ غذائی اجناس وہ یوروپ کے باہر ملکوں سے خرید رہا تھا۔ سال 1870 اور 1914 کے درمیان ہندوستان سے برآمدات میں 500 فیصد کا اضافہ ہوا۔ غیر صنعتی اشیا کی برآمدات جملہ برآمدات کا 70 تا 80 فیصد تھیں۔ زرعی اشیا کی قیمتیں صنعتی اشیا سے بھی زیادہ ہو گئیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں زیر کاشت اراضی میں بھی اضافہ ہوا۔ اقتصادی فصلیں جیسے گیہوں، کپاس، تیل کے بیج، گنا اور تمبا کو اس سارے نظام کا اہم حصہ بن گئیں۔ ان تبدیلیوں کے علاوہ اراضیات کے کرائے و قیمتیں، قرضہ جات، اراضیات کی منتقلی، اور زرعی مزدوروں کی گنتی میں اضافہ ہوا۔

زراعت، ہندوستان کی ایک بڑی اکثریت کا ذریعہ روزگار بن گیا۔ چھوٹے کسانوں کیلیے زراعت ہی سب سے اہم کام ہوا کرتا جس میں ان کے افراد خاندان بھی کام کرتے۔ ہندوستان کے روایتی انتظام میں زمین، کسان کی ملکیت ہوتی۔ اور حکومت کسانوں سے ان کی فصل کا کچھ حصہ حاصل کرتی۔ زرعی پیداوار کا یہ نظام جو دیہی ہندوستان کے زیر انتظام تھا صدیوں سے بنا کسی تبدیلی کے چلا آرہا تھا۔ ریاست کسی بھی اراضی کی فصل میں کچھ حصہ لیا کرتی نہ کہ زمین کی ملکیت میں اور اس سے روایتی حقوق کو کوئی نقصان نہیں پہونچا۔ یوروپ میں دیہی اراضیات بھی کسی زمیندار کی ملکیت ہوتے ہیں اور اس کے برعکس ہندوستان میں صدیوں سے کسی بھی طرح کی سیاسی تبدیلیوں کا کسانوں کے حق ملکیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ انگریزوں کی آمد سے ملک میں زمینداری نظام رائج ہوا اور انہیں چند دیہاتوں کے محصولات وصول کرنے کا اختیار دیا گیا۔ بادشاہ یا ریاست ان اراضیات کی مالک نہیں تھی لیکن زمینوں سے حاصل ہونے والی آمدنی پر کچھ حصہ ٹیکس وصول کرتی۔ اس وجہ سے کسان دیہی اراضیات کی ملکیت سے محروم ہوتے گئے۔ ریاست کی جانب سے دیہی اراضیات پر نئے سود لیے جانے لگے اور دیہی معیشت میں پیسے کا نفوذ شروع ہو گیا۔ نئے اراضی محصولی نظاموں جیسے مستقل (زمینداری)، رعیت واری اور محال واری اراضی مالیہ نظام کی وجہ سے روایتی طریقہ کار ختم ہوتے چلے گئے۔

12.3 ہندوستان میں برطانوی نوآبادیات کے مراحل (Stages of British Colonialism in India)

ہندوستان میں نوآبادیات کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا گیا ہے، یہ مراحل درج ذیل ہیں۔

1. تجارتی سرمایہ داری کا مرحلہ (1757 سے 1813 تک)
2. صنعتی سرمایہ داری کا مرحلہ (1813 سے 1857 تک)

3. مالیاتی سرمایہ داری کا مرحلہ (1858 سے 1947 تک)

12.3.1 تجارتی سرمایہ داری کا مرحلہ (Stage of Mercantile Capitalism)

نو آبادیاتی نظام کے پہلے مرحلے میں انگریزوں نے معاشی لوٹ مار پر توجہ مرکوز کی۔ کمپنی ہندوستان کے ساتھ تجارت پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی اور برطانوی یا یورپی تاجر یا تجارتی کمپنی نہ ہو۔ کمپنی کو دیگر یورپی اقوام کو ہندوستان سے دور رکھنے کے لیے فرانسیسی اور ولندیزیوں کے ساتھ شدید جنگ لڑنی پڑی۔

12.3.2 صنعتی سرمایہ داری کا مرحلہ (Stage of Industrial Capitalism)

یہ مرحلہ 1813 کے منشور (ایکٹ) کے ذریعے ہندوستان کے ساتھ تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری کے خاتمے کے ساتھ شروع ہوا۔ 1813ء کے منشور (ایکٹ) سے پہلے ہندوستان کی تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری تھی۔ کمپنی کے علاوہ یورپ کا کوئی اور تاجر ہندوستان کے ساتھ کاروبار نہیں کر سکتا تھا۔ اس اجارہ داری کو قائم کرنے کے لیے کمپنی نے فرانسیسیوں، پرتگالیوں اور ولندیزیوں کو شکست دی اور انہیں ہندوستان سے نکال دیا گیا اور جو باقی رہ گئے وہ انتہائی محدود علاقوں میں رہنے پر مجبور ہو گئے۔ برطانوی پارلیمنٹ میں 1813ء کے منشور (ایکٹ) کے ذریعے ایک قانون پاس کیا گیا، اسے 1813ء کا منشور (ایکٹ) کہا جاتا ہے۔ منشور (ایکٹ) ہر 20 سال کے وقفے سے جاری کیا جاتا تھا۔ اس سے پہلے 1793ء کا منشور (ایکٹ) تھا۔ منشوروں کو پاس کرنے کا مقصد برطانوی حکومت کی طرف سے علیحدہ قانون سازی کے ذریعے کمپنی پر اپنا کنٹرول قائم کرنا تھا۔ 1813ء میں منظور کیے گئے منشور (ایکٹ) کے ذریعے برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے کمپنی کی اجارہ داری ختم کر دی گئی۔ 1813ء میں منظور ہونے والے منشور (ایکٹ) کے مطابق اب کمپنی کی یہ اجارہ داری صرف دو شعبوں تک محدود تھی جو درج ذیل ہیں۔

1. چائے کی تجارت پر
2. چین کے ساتھ تجارت پر

برطانیہ میں صنعتی کارخانوں میں بڑے پیمانے پر پیداوار شروع ہوئی۔ وسائل کی تکنیکی دریافتوں کی وجہ سے بڑے پیمانے پر پیداوار کی وجہ سے اب برطانوی کمپنیوں کے سامنے دو طرح کے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ (1) تیار کردہ سامان کو کس طرح استعمال کیا جائے۔ (2) پیداوار میں اضافے کی وجہ سے خام مال کی سپلائی کو کیسے بڑھایا جائے۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر 1813 کے منشور (ایکٹ) کے ذریعے ہندوستان کی تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری کو سب سے پہلے ختم کر دیا گیا اور ہندوستانی منڈیاں تمام تاجروں کے لیے کھول دی گئیں۔ اس طرح ہندوستان کو برطانوی کارخانوں میں تیار ہونے والی اشیا کی بازار کے لیے تیار کیا گیا۔ ہندوستان کو برطانوی صنعتوں کے لیے خام مال کی فراہمی کا ذریعہ بھی بنایا گیا تھا۔ 1813 میں، ہندوستانی بازار برطانوی فیکٹریوں میں تیار ہونے والے سستے کپڑوں سے بھر گیا، کارخانوں میں بنی چیزیں موثر اور سستی تھیں۔ ہندوستان میں ہاتھ سے بنے کپڑے

برطانوی کپڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔اس طرح ہندوستانی کپڑے اور دستکاری کی صنعتوں کو بڑا دھچکالگااور ہندوستان میں بے روزگاری بڑھنے لگی۔ یہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری 1857ء کے انقلاب کا پس منظر بن گئی۔1813 کے ہندوستان میں غذائی اجناس کی پیداوار کی حوصلہ شکنی کی گئی کیونکہ اگراناج پیدا ہوگا تو کارخانوں کے لیے خام مال کیسے پیدا ہوگا؟کارخانوں اور نقد فصلوں کے لیے خام مال کی فراہمی کے لیے ان اناج کی پیداوار کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ جو کھیتوں میں اگائی جاتی تھی۔اور کپاس،انڈگو،چائے،ربڑ وغیرہ کی پیداوار کو فروغ دیا گیا۔ہندوستان میں ان نقد فصلوں کی پیداوار کی وجہ سے غذائی اجناس کی پیداوار گرنے لگی،غذائی اجناس کی قیمتوں میں کمی کے باعث ہندوستان کی منڈیوں میں غذائی اجناس کی قیمتیں بڑھنے لگیں،اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں غذائی قلت بھی بڑھ گئی۔ہندوستان میں خام مال کی پیداوار میں اضافہ ہوا، اس کے ساتھ ساتھ سوتی کپڑوں کی درآمد میں بھی اضافہ ہوا،ہندوستان میں خام مال کی برآمد میں اضافے کے ساتھ ہندوستان میں غیر ملکی کپڑوں کی درآمد میں بھی اضافہ ہوا۔

ہندوستانی باغانوں سے تیار ہونے والا خام مال بندرگاہوں پر بھیجا جاتا تھااور بندرگاہوں کے ذریعے یہ خام مال لوڈ کر کے برطانیہ بھیجا جاتا تھا،اب ہندوستان میں پیدا ہونے والے خام مال کو تیزی سے بندرگاہوں تک بھیجنے کے لیے نقل و حمل کے ذرائع تیار کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی جس کی وجہ سے ہندوستان میں 1853 میں ریلوے کی ترقی شروع کی گئی تاکہ ہندوستانی باغانوں سے خام مال کو برطانیہ کی اندرونی منڈیوں تک پہنچایا جاسکے۔ہندوستان میں ریلوے کی ترقی کے بنیادی طور پر تین مقاصد تھے۔

1. ہندوستان سے بندرگاہوں تک خام مال کی نقل و حمل۔
2. انگلینڈ کے تیار کردہ سامان کو بندرگاہوں سے ہندوستان کی اندرونی منڈیوں تک پہنچانا۔
3. کسی بھی بغاوت کی صورت میں ملک کے کسی بھی حصے میں فوج کی تیز رفتار نقل و حرکت۔

12.3.3 مالیاتی سرمایہ داری کا مرحلہ (Stage of Finance Capitalism)

برطانیہ میں صنعتی پیداوار کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ کمپنی کی جانب سے ہندوستانی منڈیوں کے استحصال سے برطانیہ میں بہت بڑا سرمایہ جمع ہو گیا۔ محنت کش طبقہ اپنے فائدے کے لیے منظم ہو گیا،رفتہ رفتہ برطانوی سرمایہ دار طبقہ خوف زدہ ہونے لگا،چنانچہ صنعت کاروں نے سوچا کہ برطانوی سرمایہ کو برطانیہ میں لگانا سود مند نہیں ،اس لیے اب انہوں نے برطانوی سرمایہ کو ہندوستان میں لگانے کا منصوبہ بنایا۔ہندوستان میں برطانوی حکومت کو ریلوے کی ترقی کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی،اس لیے برطانوی سرمایہ داروں نے عوامی قرضوں کے ذریعے ہندوستان کو سرمایہ دیا۔اس عوامی قرض پر نہ صرف سود ادا کرنا تھا بلکہ حکومت ہند کو ریلوے کے منافع کا حصہ بھی دینا تھا۔سال 1939 تک حکومت ہند پر عوامی قرضوں کا بوجھ 88 ملین پاؤنڈ تک پہنچ چکا تھا۔ برطانوی سرمائے کی سب سے بڑی سرمایہ کاری ہندوستان میں ریلوے کی ترقی میں کی گئی۔ہندوستان میں ریلوے کے بعد برطانوی سرمائے کی دوسری بڑی سرمایہ کاری،چائے،کافی،ربڑاور نیل کی پیداوار میں کی گئی،یہی وجہ تھی کہ مالیاتی سرمایہ داری کے دور میں ہندوستان میں ربڑ،چائے،کافی اور نیل کے بڑے بڑے باغات لگائے گئے۔

12.4 دولت کی نکاسی کا نظریہ (Theory of the Drain of Wealth)

12.4.1 ابتدا اور ارتقا (Origin and Development)

برطانوی ہندوستان میں، ہندوستانی مصنوعات سیاسی وجوہات کی بنا پر انگلینڈ کی طرف جارہی تھی، اور اس کے عوض میں ہندوستان کو کچھ نہیں ملتا تھا، اسے دولت کی نکاسی (Drain of Wealth) کے نظریے کا نام دیا گیا تھا۔ دولت کی نکاسی کا تصور، تجارتی فکر کے دوران پروان چڑھا۔ اس وقت کے بہت سے معاشی مؤرخین نے دولت کی نکاسی کے اصول پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں سب سے پہلے دادابھائی نوروجی (Dadabhai Naoroji) نے دولے کی نکاسی کا تصور اپنی کتاب *Poverty and Un-British Rule in India* میں پیش کیا۔ انہوں نے دولت کی نکاسی کو تمام برائیوں کی جڑ کہا ہے۔ 1905 میں انہوں نے کہا تھا کہ 'دولت کا بہاؤ تمام برائیوں اور ہندوستانی غربت کی جڑ ہے۔' رمیش چندر دت، مہادیو گووند راناڈے اور گوپال کرشن گوکھلے جیسے قوم پرست مفکرین نے بھی دولت کی نکاسی کے اس عمل پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق حکومت آبپاشی کے منصوبوں پر خرچ کرنے کے بجائے ایسی چیزوں پر خرچ کرتی ہے جس کا براہ راست تعلق سامراجی حکومت کے مفادات سے پُر ہے۔ دولت کی نکاسی کے اہم عناصر میں برطانوی انتظامیہ اور فوج کے افسران کی تنخواہ اور بھتے، ہندوستان کے بیرونی ملک سے لیے گئے قرضوں پر سود، شہری اور فوجی محکمے کے لیے برطانوی اسٹوروں سے خریدی گئی اشیا، جہازرانی کمپنیوں اور غیر ملکی بینکوں کو ادائیگیاں اور بیما کے منافع شامل تھے۔ ہندوستانی دولت انگلینڈ کی طرف بہاؤ کی وجہ سے ہندوستان میں سرمایہ کی تشکیل اور اس کا ارتقاء نہیں ہوسکا، جب کہ اس دولت سے انگلینڈ میں صنعتی ترقی کے ذرائع میں اضافہ ہوا ترقی کی رفتار میں بہت تیزی آئی۔ دولت سے برطانوی معیشت کو جو منافع ملا وہ سرمائے کی صورت میں ہندوستان میں دوبارہ لگایا گیا اور یوں ہندوستان کا استحصال بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس طرح ہندوستان سے دولت کے نکاسی کی وجہ سے روزگار اور آمدنی کے امکانات پر بہت برا اثر پڑا۔ دولت کا یہ بے تحاشا بہاؤ ہندوستان کو اندر سے کمزور بھی بنا رہا تھا۔

تجارتی نظام کے تحت، دولت کی نکاسی اس صورتحال کو کہا جاتا ہے جب سونا، چاندی جیسی قیمتی دھاتیں (Bullion) منفی تجارتی توازن کی وجہ سے ملک سے باہر چلی جاتی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پلاسی کی جنگ سے 50 سال قبل برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانی اشیا کی خریداری کے لیے دو کروڑ روپے کی قیمتی دھات ہندوستان لائی تھی۔ کمپنی کے اس اقدام پر برطانوی حکومت نے تنقید کی لیکن کرناٹک کی جنگوں اور پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں کے بعد صورتحال ڈرامائی طور پر بدل گئی۔ برطانوی کمپنی کو بنگال کی دیوانی کے حصول کے ساتھ، کمپنی نے اپنی سرمایہ کاری کا مسئلہ حل کر لیا۔ اب اندرونی تجارت سے حاصل ہونے والی دولت کا ایک حصہ، بنگال کی لوٹ مار سے حاصل ہونے والی دولت اور بنگال کی دیوانی سے حاصل ہونے والی دولت کو ہندوستانی سامان کی خریداری میں لگایا جانے لگا۔ اس طرح ہندوستان نے برطانیہ کو جو کچھ برآمد کیا اس کے بدلے ہندوستان کو کوئی معاشی، جسمانی یا مالی فائدہ نہیں ملا۔ لیکن بنگال کی دیوانی سے حاصل ہونے والی آمدنی کا ایک حصہ سامان تجارت کی شکل میں ہندوستان سے برطانیہ منتقل ہوتا رہا۔ اسے برطانیہ کے حق میں ہندوستان سے دولت کی منتقلی کہا جاسکتا ہے۔ یہ سلسلہ 1813 تک جاری رہا لیکن 1813 کے منشور کے تحت کمپنی کا مالگزاری کھاتا اور کمپنی کا کاروباری کھاتا الگ کر دیا گیا۔

1813 کے منشور کے تحت برطانوی سامان کے لیے ہندوستان کا راستہ کھول دیا گیا اور ہندوستان میں کمپنی کی تجارتی اجارہ داری ختم کر دی گئی۔ اسے ایک اہم تبدیلی کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ صورتحال اس وقت مزید تشویشناک ہو گئی جب کمپنی کی جانب سے ہندوستان سے تیار مال کی برطانیہ اور یورپ کو برآمد (export) کی بھی حوصلہ شکنی کی گئی۔ نتیجے کے طور پر، کمپنی کو اب اپنے حصص مالکان کو ادا کیے جانے والے منافع کے مسئلے کا سامنا ہوا۔ ابتدائی طور پر کمپنی نے نیل اور روئی کو برآمد کر کے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی لیکن کیمیائی مصنوعات اور سستی مزدوری کی وجہ سے ہندوستانی نیل اور کپاس کم قیمت امریکی مصنوعات کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ اس لیے برآمدی اداروں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ یہی وجہ تھی کہ کمپنی نے متبادل کے طور پر ہندوستان میں افیون کی پیداوار پر اصرار کیا۔ پھر بڑی مقدار میں افیون چین کو برآمد کی گئی۔ افیون کی برآمد کمپنی کی تجارتی صحت کے لیے اتنی ہی ضروری تھی جتنی چینی لوگوں کی صحت کے لیے وہ خراب تھی۔ افیون کی تجارت کی مخالفت کے بعد بھی برطانوی کمپنی نے زبردستی یہ مہلک زہر چین پر مسلط کر دیا۔ برطانیہ ہندوستان سے چین کو افیون برآمد کرتا تھا اور اس کے بدلے میں ریشم اور چائے جمع کرتا تھا اور منافع کماتا تھا۔ اس طرح ہندوستان سے برآمدات تو ہوتی رہیں لیکن درآمدات اس تناسب سے تبدیل نہ ہو سکیں۔

یہ مسئلہ اپنی بدلی ہوئی شکل کے ساتھ 1858ء کے بعد بھی جاری رہا۔ 1858 میں ہندوستان کا انتظام انگریزوں نے کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس تبدیلی کے تحت، ہندوستان کی انتظامیہ کے لیے Secretary of State for India (سیکریٹری برائے ہندوستانی ریاست) کا عہدہ تشکیل دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے سکریٹری اور ان کی کونسل کے اخراجات ہندوستانی کھاتے میں منتقل کر دیے گئے۔ جو دولت 1857ء کی بغاوت کو دبانے میں خرچ کی گئی تھی، وہ بھی ہندوستانی کھاتے میں منتقل کر دی گئی۔ اس سے بھی زیادہ قابل غور حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی حکومت ہر سال ایک مخصوص دولت گھریلو اخراجات (Home Charges) کے طور پر برطانیہ بھیجتی تھی۔ اخراجات کی اس مد میں بہت سی چیزیں شامل تھیں، جیسے کہ ریلوے پر ضمانت شدہ سود، سرکاری قرضوں پر سود، برطانیہ میں ہندوستان کے لیے فوجی سامان کی خریداری، ہندوستان سے ریٹائر ہونے والے برطانوی افسران کی پنشن وغیرہ۔ اس طرح گھریلو اخراجات کی رقم بھی، دولت کی نکاسی کے طور پر شمار کی گئی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ 19ویں صدی میں دولت کی نکاسی میں نہ صرف گھریلو اخراجات شامل تھے بلکہ اس میں کچھ دیگر اشیاء بھی شامل کی گئیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں کام کرنے والے انگریز افسروں کی تنخواہ کا وہ حصہ جو ہندوستان سے بچا کر برطانیہ بھیجا گیا اور نجی برطانوی تاجروں کا منافع جو ہندوستان سے برطانیہ بھیجا گیا۔ پھر، جب 1870 کی دہائی میں برطانوی پاؤنڈ کے مقابلے میں روپے کی قدر میں کمی ہوئی تو ترسیلات زر کی اصل دولت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔

12.4.2 دولت کی نکاسی کے اسباب (Causes of the Drain of Wealth)

دادابھائی نوروجی نے دولت کی نکاسی کے نظریہ کو تقویت پہنچانے کی جو وجوہات بتائی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

1. ہندوستان میں غیر ملکی حکمرانی اور انتظامیہ۔
2. معاشی ترقی کے لیے جو پیسہ اور محنت درکار تھی وہ غیر ملکی لائے تھے۔ لیکن پھر غیر ملکیوں نے ہندوستان پر زیادہ توجہ نہیں دی۔

3. تمام برطانوی شہریوں کی انتظامیہ اور فوج کے اخراجات ہندوستان ادا کرتا تھا۔
4. ہندوستان اندر اور باہر تعمیر کا بوجھ اٹھا رہا تھا۔
5. ہندوستان کی طرف سے ملک کی آزاد تجارت کو کھولنے کا زیادہ فائدہ برطانیہ کو تھا۔
6. برطانوی دور حکومت میں ہندوستان میں بڑے سرمایہ کار غیر ملکی تھے۔انہوں نے ہندوستان سے جتنا بھی پیسہ کمایا، وہ کبھی کچھ خریدنے کے لیے ہندوستان میں سرمایہ کاری نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ اس دولت کے ساتھ ہندوستان چھوڑ جاتے تھے۔

12.4.3 دولت کی نکاسی کے نتائج (Consequences of the Drain of Wealth)

معیشت پر اثر

1. دولت کی نکاسی کے نتیجے میں ہندوستان میں سرمایہ جمع نہیں ہو سکا۔ سرمایہ جمع نہ ہو سکا تو صنعتی ترقی بھی نہیں ہوئی۔
2. عوام کا معیار زندگی مسلسل گرتا رہا اور غربت میں اضافہ ہوا۔
3. دولت کی نکاسی سے عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ بہت بڑھ گیا۔
4. دستکارانہ اور گھریلو صنعتیں تباہ ہو گئیں اور زراعت پر دباؤ بڑھتا گیا جس سے بے زمین زرعی مزدوروں کی تعداد بڑھتی گئی۔

سیاست پر اثر

دولت کی نکاسی کے نظریہ کی تائید کرتے ہوئے، قوم پرست مفکرین نے سامراج اور قوم پرستی کے تضاد کو تسلیم کیا اور اس طرح معاشی قوم پرستی کا تصور پیدا ہوا۔ اس سے برطانوی حکومت کے تمام دعووں کو مسترد کرنے میں مدد ملی، جیسے افادیت پسندی، جدیدیت کی علامتیں، مقامی خود حکومتی، تعلیم وغیرہ۔ معاشی قوم پرستی کا یہ شعور 1906 میں سودیشی تحریک میں ابھرنا شروع ہوا جب غیر ملکی اشیاء کے بائیکاٹ اور دیسی اشیا کے فروغ اور اسکے استعمال کا نعرہ بلند ہوا۔

سماج اور ثقافت پر اثر

دولت کی کمی سے ریشم کی صنعت، تجارت، زراعت وغیرہ میں سرمایہ کاری نہیں ہوئی۔ نتیجتاً عوام کی فی کس آمدنی کم ہونے لگی۔ قحط کے تسلسل نے ان کی زندگی کو مزید خوفناک بنا دیا۔ اس طرح یورپ کی دیگر ریاستوں کے مقابلے میں ہندوستان کے لوگوں کا معیار زندگی اور بہتر زندگی کی توقع دونوں میں کمی واقع ہوئی اور یہی استحصال شدہ لوگ بعد میں ہندوستانی قوم پرستی کی سماجی بنیاد بن کر ابھرے۔

12.4.4 دولت کی نکاسی کے طریقے (Methods of the Drain of Wealth)

جب ہم دولت کی نکاسی کے طریقے پر غور کرتے ہیں تو درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں۔

1. کاروباری اجارہ داری سے حاصل کردہ منافع

2. کمپنی کے ملازمین کی تنخواہ اور پنشن

3. کمپنی کے سرمایہ کاروں کو ادا کردہ منافع

4. کمپنی کے لندن آفس اور اس سے متعلقہ ملازمین پر اٹھنے والے اخراجات

5. کمپنی کے فوجی اور شہری امور سے متعلق سامان ہندوستان کے بازار سے نہیں بلکہ لندن کے بازار سے خرید اجاتا تھا جسے 'اسٹور پر چیز' کہا جاتا تھا، تاکہ وہاں کے تاجروں کو فائدہ ہو۔

6. عوامی اخراجات کے لیے لندن سے لیے گئے قرض پر سود کی ادائیگی، جیسے: نہری اسکیم، قحط انتظامیہ، فوج، ریلوے وغیرہ سے متعلق اخراجات۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عوامی قرض کا بہت کم حصہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا گیا۔ تقریباً 40 فیصد حصہ فوج اور ریلوے پر خرچ ہوا۔ اور یہ فوج سلطنت کی حفاظت کے لیے استعمال کی جاتی تھی اور ہندوستان کا ریلوے کے ذریعے معاشی طور پر استحصال بڑھ گیا۔ بیرونی سرمایہ کاری پر ادا کردہ سود اور اس سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والے منافع دونوں کا اخراج، جیسے: ہندوستان میں برطانوی حکومت، ہندوستانی ریلوے کی ترقی میں سرمایہ لگانے والی برطانوی کمپنیاں۔ ان کے کل سرمائے کے 5 فیصد سود کی حقدار تھیں۔ جب کہ برطانیہ میں یہ منافع کی شرح صرف 2 فیصد تھی۔

12.4.5 دولت کی نکاسی کے بارے میں مورخین کے خیالات

(Various Historians' Views on the Drain of Wealth)

سامراجی اور قوم پرست مورخین دولت کی نکاسی کے حوالے سے مختلف آراء پیش کرتے ہیں۔

سامراجی مورخین

سر جان اسٹریچی نے اپنے 1888ء کے خطبات میں دولت کے بہاؤ (Drain of Wealth) کے طریقے کار کی بڑی صفائی کے ساتھ اور کسی لاگ لپیٹ کے بغیر وضاحت کی تھی جو اس طرح ہے 'سیکریٹری آف اسٹیٹ بلوں کی ادائیگی ہندوستان میں سرکاری خزانے سے کراتے ہیں اور ہندوستان میں عوامی مالیہ سے ادا کیے جانے والے ان بلوں کے ذریعہ سوداگر وہ رقم حاصل کرلیتا ہے جس کی اسے ہندوستان میں ضرورت ہوتی ہے اور سیکریٹری آف اسٹیٹ کو وہ رقم حاصل ہو جاتی ہے جس کی انگلینڈ میں ضرورت ہوتی ہے'۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں برآمداتی سامان کی خریداری کا ارادہ رکھنے والے انگریز تاجر اسٹرلنگ کے بدلے میں سیکریٹری آف اسٹیٹ سے کاؤنسل کے بلوں کو خریدتے تھے اس کے بعد ان کاؤنسل بلوں کو حکومت ہند کے مالیہ سے روپے میں تبدیل کرالیا جاتا تھا اور اس روپے سے ہندوستان کے برآمداتی سامان کی خریداری کا کام لیا جاتا تھا۔ سر جان اسٹریچی جیسے سامراجی مورخین کا کہنا ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان کی دولت نہیں لوٹی بلکہ برطانیہ نے ہندوستان میں اچھی انتظامیہ، سیکورٹی اور بنیادی ڈھانچہ تیار کیا اور اس کے بدلے میں معاوضہ (دولت) حاصل کیا۔ اس سلسلے میں مورس ڈی مورس کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا کردار ایک چوکس چوکیدار جیسا ہے جس نے ہندوستان میں ترقی کے امکانات کو تحفظ فراہم کیا۔

قوم پرست مورخین

دولت کی نکاسی کے عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے قوم پرست دانشوروں نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ برطانوی حکومت کی استحصالی معاشی پالیسیاں ہندوستان کی پسماندگی اور صنعتی، ثقافتی، پسماندگی کی براہ راست ذمہ دار ہیں۔ قوم پرست مصنفین کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی غربت اور پسماندگی نہ تو خدائی غضب ہے اور نہ ہی کوئی تاریخی ورثہ۔ان کے نزدیک جس سماجی، سیاسی، ثقافتی اور معاشی عمل نے برطانیہ میں صنعتی انقلاب کو جنم دیا، ثقافتی ترقی کی راہ ہموار کی،اسی عمل نے پسماندگی، غربت، قحط، تجارت اور صنعتوں کی تباہی وغیرہ کی ہندوستان میں راہ ہموار کی۔

دادابھائی نوروجی پہلے قوم پرست رہنما تھے جنہوں نے دولت کی نکاسی کے عمل کی نشاندہی کی اور بتایا کہ برطانوی حکومت کس طرح آمدنی، صنعت، تجارت وغیرہ کے ذرائع سے ہندوستانی دولت کو نکالتی ہے۔ نوروجی کے مطابق اس سامراجی حکومت کی معاشی پالیسیوں کا سب سے مکروہ پہلو یہ ہے کہ یہاں کا پیسہ باہر نکل کر برطانیہ چلا گیااور وہی دولت ہمیں قرض کی صورت میں دستیاب کرائی گئی جس کے لیے ہمیں بھاری دولت ادا کرنی پڑی۔ نوروجی کے مطابق، برطانوی حکومت نہ صرف ہندوستانی دولت کو ضبط کرتی ہے بلکہ اخلاقیات کو بھی ضبط کرتی ہے کیونکہ یہ ہندوستانی عوام کو ان کے حقوق سے محروم کرتی ہے۔اس تناظر میں عالم سلیوان کا بیان سامراجی ذہنیت کو بے نقاب کرتا ہے۔:'برطانوی حکومت کا نظام اسفنج کی طرح ہے جو گنگا کے پانی کو جذب کر کے دریائے ٹیمز میں نچوڑ دیتا ہے۔' سمت سرکار کے مطابق 'دولت کے بہاؤ کے نظریہ کو شروع ہی سے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے اور اس سلسلے میں قوم پرستوں کے بعض فارمولے اب کسی قدر تشنہ اور مبالغہ آمیز معلوم ہونے لگے ہیں' سمت سرکار یہ بھی کہتے ہیں کہ 'دولت کے بہاؤ کے سلسلے میں قوم پرستوں نے مبالغہ سے کام لیا ہے کیونکہ غیر ملکی تجارت اور برآمداتی توفیر (Surplus) ہندوستان کی قومی آمدنی کا ایک معمولی حصہ رہی ہوگی، مگر نوروجی کی بات میں یقینا بہت وزن تھا جب انہوں نے 1895ء میں Welby Commission کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان سے ہماری دولت باہر لے جائی جارہی ہے وہ ایک ایسا توفیر (Surplus) ثابت ہوسکتی ہے جو ملک میں مناسب سرمایہ کاری کی صورت میں ہندوستان کی آمدنی قابل لحاظ اضافہ کا باعث ہوتی،اس سلسلے میں سامراجی حلقوں کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے اسٹریچی کا کہنا تھا کہ 'ہندوستان میں انجام دی گئی انگریزی خدمات کے معاوضہ یاانگلینڈ کے سرمایہ میں توسیع کے علاوہ برطانیہ سے ہندوستان کو کچھ اور نہیں ملتا'

12.4.6 نکالی گئی دولت کی مقدار اور نوعیت (Amount and Nature of the Wealth Extracted)

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی ولی عہد کی طرف سے ہندوستان سے نکالی گئی دولت کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ مختلف مؤرخین اور دانشوروں نے مختلف اعداد و شمار بیان کیے ہیں۔

1. صوبہ بنگال میں موصول ہونے والی آمدنی اور اخراجات کی تفصیلات کے مطابق، کمپنی نے پہلے 6 سالوں (1765 سے 1771) کے دوران 1,30,66,991 پاؤنڈ خالص آمدنی حاصل کی، جس میں سے 90,27,609 پاؤنڈ خرچ ہوئے۔ بقیہ 40,39,152 پاؤنڈ کا سامان انگلینڈ بھیج دیا گیا۔

2. ولیم ڈگبی کے مطابق 1757 سے 1815 تک ہندوستان سے 50 سے 100 ملین پاؤنڈ کی دولت انگلینڈ بھیجی گئی۔
3. 1828 میں مارٹن منٹگمری نے اندازہ لگایا کہ ہر سال 30 ملین پاؤنڈ ہندوستان سے باہر جاتے ہیں۔
4. جارج ونسنٹ کے 1859 میں لگائے گئے تخمینے کے مطابق 1834 سے 1851 تک ہر سال تقریباً 42 لاکھ پاؤنڈ ہندوستان سے باہر گئے۔

12.5 جدید صنعتوں کا ارتقا (Evolution of Modern Industries)

ہندوستان میں جدید صنعتی ترقی کا آغاز بمبئی (1854) میں پہلی سورت کپڑا مل کے قیام سے ہوا۔ اس فیکٹری کے قیام میں ہندوستانی سرمایہ اور ہندوستانی انتظام اہم عوامل تھے۔ جوٹ صنعت کا آغاز 1855 میں کولکتہ کے قریب وادی ہگلی میں ایک جوٹ مل کے قیام سے ہوا، جس میں سرمایہ اور انتظامی کنٹرول دونوں غیر ملکی تھے۔ کوئلے کی کان کنی کی صنعت سب سے پہلے 1772 میں رانی گنج (مغربی بنگال) میں شروع ہوئی۔ پہلی ٹرین 1854 میں شروع ہوئی۔ ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل پلانٹ 1907 میں جمشید پور (ریاست جھارکھنڈ) میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سیمنٹ، شیشہ، صابن، کیمیکل، جوٹ، چینی اور کاغذ وغیرہ جیسے کئی درمیانے اور چھوٹے صنعتی یونٹس قائم ہوئے۔ آزادی سے پہلے کی صنعتی پیداوار نہ تو کافی تھی اور نہ ہی متنوع۔ آزادی کے وقت، ہندوستان کی معیشت پسماندہ تھی، ہندوستان کی جی ڈی پی میں زراعت کا حصہ 60 فیصد سے زیادہ تھا اور ملک کی برآمدات کی زیادہ تر آمدنی زراعت سے آتی تھی۔ آزادی کے 60 سال بعد ہندوستان نے ایک اہم اقتصادی طاقت بننے کے آثار ضرور دکھائے ہیں۔ ہندوستان میں صنعتی ترقی کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے مرحلے (1947-80) کے دوران، حکومت نے آہستہ آہستہ مختلف اقتصادی شعبوں پر اپنا کنٹرول بڑھایا۔ دوسرے مرحلے میں (1980-97)، معیشت کو مختلف اقدامات کے ذریعے (1980-1992 کے درمیان) آزاد کیا گیا۔ ان اقدامات کے ذریعے لبرلائزیشن فوری اور عارضی بنیادوں پر کی گئی۔ اس لیے 1992 کے بعد لبرلائزیشن کے عمل پر زور دیا گیا اور نقطہ نظر کی نوعیت میں بھی بنیادی فرق لایا گیا۔

12.6 زرعی معیشت اور زراعت کی تجارت کاری

(Agrarian Economy, and Commercialisation of Agriculture)

برطانوی دور اقتدار میں تجارتی فصلوں کی داغ بیل پڑی۔ برطانوی صنعتوں کے لیے خام مال اور غذا کی طلب کی بدولت ہندوستانی زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ ہندوستانی صنعتوں کے لیے زراعت کو بطور تجارت نہیں بنایا گیا بلکہ برطانوی صنعتوں کی ضروریات کی تکمیل کے لیے یہ وقوع ہوا۔ یورپی بازار میں ہندوستانی زرعی اشیا جیسے کپاس، شکر، چائے اور جوٹ وغیرہ برطانیہ کے تجارتی منافع کا سبب بنے۔ برطانیہ کی صنعتوں کی جانب سے بھی ہندوستانی خام اشیا کے لیے دباو پایا جاتا۔ مانچسٹر سوت سپلائی ایسوسی ایشن کا بطور تحریک ہندوستان میں کپاس کی کاشت کو توسیع دینے سے یہ صاف ظاہر ہے۔ جسکے نتیجہ میں برطانیہ کے حکمراں ہندوستان میں زرعی شعبہ کے قیام کے لیے کوشاں ہوگئے۔ جسکے پیش نظر رائل کمیشن برائے زراعت نے تجارتی فصل کے مسائل کے حل اور اس کی پیداوار میں اضافہ کے اقدامات کی تجویز کے لیے 1869 میں

ہندوستان میں ایک سروے منعقد کیا۔ ہر صوبہ میں ایک علیحدہ زرعی شعبہ قائم کیا گیا تاہم یہ زرعی شعبے برطانیہ کی ضروریات کو پورا کرتے اور تجارتی فصل کے فروغ میں معاون ہوتے۔ برطانیہ کے حکام کپاس کی کاشت پر خصوصی توجہ دیتے چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے یہ ایک نہایت اہم فصل تھی۔ 1788 کے ابتدامیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائیریکٹرس نے بھی اس پیداوار کی حوصلہ افزائی پر زور دیا۔ حکومت نے بارہ امریکی ماہرین نباتات کو مقامی کاشت کاروں کو کپاس اگانے اور اس کی صفائی کی تربیت کیلیے روانہ کیا۔ ان تمام اقدامات کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ برطانوی ٹیکسٹائیلس کو بہترین کوالٹی کا کپاس فراہم کیا جائے۔ بتدریج ہندوستان میں کپاس کی کاشت اور اس کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ نیل۔ چائے اور کافی کی کاشت کاری کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی کیونکہ ان اشیا کی خوب مانگ تھی۔ جوٹ ایک اور تجارتی فصل تھی جس پر برطانوی آقاؤں کی نظر لگ گئی کیونکہ جوٹ کی اشیا کیلیے امریکہ اور یوروپ میں کافی بڑی بازار تھی۔ برطانیہ نے ان زرعی اشیا کی پیداوار پر خوب توجہ دی کیونکہ انہیں اپنی صنعتوں کو چلانا تھا اور اس کے ذریعہ زبردست منافع بھی ہو رہا تھا۔

ہندوستان میں زرعی شعبہ کی اقتصادیات نے برطانوی کاشت کاروں، ساہوکاروں اور دیگر تاجرین کو فائدہ پہنچایا۔ اس کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ دیگر تغذیہ سے متعلق فصلوں کی کاشت کم ہوگئی۔ اقتصادی مفادات کو آگے بڑھایا گیا۔ مثال کے طور پر 1892 تا 1893 اور 1919 تا 1920 تغذیاتی فصلوں کی کاشت کا علاقہ صرف سات فیصد تھا جب کہ اقتصادی فصلیں 43 فیصد علاقہ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ سال 1934 تا 1935 اور 1939 تا 1940 اقتصادی فصلوں کی کاشت کا علاقہ 1.6 ملین ایکڑ تک پھیل گیا اور تغذیاتی فصلوں کا علاقہ 1.5 ملین ایکڑ تک سکڑ گیا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت اقتصادی فصلوں کی بے دریغ پیداوار کی گئی اور انہیں برآمد کیا گیا۔ کپاس کی برآمدات میں سال 1900-اور 1901 کے درمیان میں 1,78,000 ٹن سے سال 1936-37 میں 7,62,133 ٹن کا اضافہ ہوا جو کہ 328 فیصد کا اضافہ تھا۔ چائے کی برآمدات میں سال 1901-1900 میں 190 ملین پاؤنڈ سے لے کر سال 40-1939 میں 359 ملین پاؤنڈ کا اضافہ ہوا۔ اس کے نتیجہ میں ہندوستان کی عوام کو تغذیہ کی کمی کا سامنا کرنا پڑا جب کہ آبادی میں اضافہ ہوا۔ جس کے بعد کسی طرح کی ٹکنالوجی کے بغیر اراضیات کا بٹوارہ ہوا۔

12.6.1 دیہی مقروضیت (Rural Indebtedness)

برطانوی حکمرانوں نے نئی ریونیو پالیسیاں بنائی اور اراضی کی تقسیم کی جس کی وجہ سے زرعی شعبہ پر دباؤ بڑھا۔ اس کے علاوہ حکومت اور کسانوں کے مابین درمیانی افراد کا بھی اضافہ ہوا۔ اس عمل میں ان کی کافی دولت صرف ہو جاتی تھی جس کے نتیجہ میں زرعی شعبہ سے وابستہ افراد کی غربت بڑھی۔ اس طرح دیہی مقروضیت میں اضافہ ہوا اور کسان قرضوں کے جال میں پھنستے چلے گئے۔ یہ صورتحال 1870 میں آبادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ مزید خراب ہوتی چلی گئی۔ دوسری جانب پیسہ بازار میں لگ گیا اور کسان قرضوں کے بحران سے نکل نہیں سکے۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت کی پالیسیاں کسان مخالف تھیں اور دیہی کاشت کاروں کے بارے میں اس کا نظریہ منفی ہی تھا۔ بڑھتی ہوئی آبادی، ناقص زرعی سہولتیں اور قدیم زرعی طریقے دیہی مقروضیت کے اضافہ کی اہم وجوہات تھیں۔ ان تمام حالات نے زرعی پیداوار میں کمی کردی جب کہ اخراجات میں اضافہ ہوا۔ اور یہی سب دیہی مقروضیت کی سب سے بڑی وجہ بنی۔

12.6.2 زرعی مزدوروں میں اضافہ (Increase in Agricultural Labour)

برطانوی پالیسیوں کی وجہ سے زرعی مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ برطانوی حکومت کی زمین داری، محال واری اور رعیت واری ریونیو پالیسیوں کا مقصد کسانوں سے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا تھا اور یہ نئے قوانین کسانوں کی پٹہ داری حقوق کی ضمانت نہیں دیتے تھے۔ کاشت کاروں کی آمدنی میں کمی، قرض کی وجہ سے زمینوں کو چھوڑ دینا اور زمینوں سے بے دخلی کی وجہ سے پٹہ داری حقوق کا خاتمہ ہوتا گیا اور یہ تمام عوامل زرعی مزدوروں کی تعداد میں اضافہ کا سبب بنے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کو غیر زرعی سیکٹر میں شامل نہیں کیا جاسکا۔ 1833 سے برطانوی پالیسی برائے شرح قیمت برائے تجارت نے زراعت کی اقتصادیات کی حوصلہ افزائی کی اور جس نے دستی مصنوعات کو نقصان پہنچایا۔ دستی صنعت برطانوی اشیا کی درآمدات کی وجہ سے شدید نقصان سے دوچار ہوئی۔ ہندوستانی گھریلو صنعت اور دستی صنعت کی اشیا برطانوی صنعتوں میں تیار اشیا سے مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں اور جس کے نتیجہ میں ایک غیر مساوی مقابلہ شروع ہوا۔ جب کہ 1833 سے برطانوی قیمتوں کی شرح پالیسی نے دیہی دستی صنعت کو تباہ کردیا۔ ہندوستان میں صنعتی ترقی سے متعلق برطانوی لاپرواہی نے مقامی لوگوں کی غربت میں اضافہ کیا اور گزر بسر کیلیے تمام ذرائع ناپید ہوے لگے۔ عوام کی ایک بڑی تعداد جو زمینوں سے محروم ہوگئی تھی زرعی مزدوری کو اپنانے پر مجبور ہوئی۔

12.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

سامراجی دور میں زرعی شعبہ کو شدید نقصانات کا سامنا تھا۔ برطانوی اراضی محصولاتی قانون اور زرعی پالیسیاں زیادہ تر برطانوی صنعتوں کیلیے خام مال فراہم کرنے اور ان کے مفادات کی حوصلہ افزائی کرتیں جب کہ ہندوستان محض برطانوی اشیا کا صارف (consumer) بازار بن کر رہ گیا تھا۔ جدید ٹکنالوجی کی عدم موجودگی اور اختراعی طریقوں کی کمی سے زرعی شعبہ انحطاط کا شکار تھا۔ محکمہ مال کاشت کاروں سے زیادہ سے زیادہ مال بٹورنے کیلیے ہوتا رہا جس کے باعث کاشت کاروں کے پاس کوئی دولت نہیں بچ پاتی۔ برطانوی زرعی پالیسیوں نے دیہی معیشت کو بچانے بجائے برطانوی معاشی مفادات کے حق میں کام کیا۔ کنڑاکٹس کا قرار پانا، کسانوں اور درمیانی افراد کے درمیان تنازعات کا حل، اراضی محصولات برطانوی حکومت کے نئے قوانین کے تحت آگئے۔ یہ تمام مال داری قوانین نئے طریقوں اور اصولوں پر چلنے لگے۔ آخر کار ہندوستان میں زرعی شعبہ زبردست تباہی سے دوچار ہوا اور دستی صنعت کے ساتھ ہی دیگر مقامی صنعتوں کو بھی نقصان ہوا اور یہ سلسلہ 1947 میں انگریزوں کی حکومت کے اختتام تک چلتا رہا۔

12.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

زراعت کی تجارت کاری	:	بازار کے لیے نقد فصلیں اگانا جیسے نیل، کپاس، گنا وغیرہ
درآمدات	:	(import) جو چیز ملک میں کہیں باہر ملک سے آئے۔
برآمدات	:	(export) جو چیز ملک سے کہیں باہر دوسرے ملک کو جائے۔
اسٹرلنگ	:	گھریلو اخراجات کیلیے استعمال ہونے والی کرنسی

12.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

12.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. محال واری نظام کن علاقوں میں رائج تھا؟
2. رعیت واری سے کیا مراد ہے؟
3. محل واری نظام کا کیا مطلب ہے؟
4. دولت کی نکاسی کا نظریہ (Drain of Wealth) کس نے دیا تھا؟
5. 'دولت کا بہاؤ تمام برائیوں اور ہندوستانی غربت کی جڑ ہے' یہ قول کس کا ہے؟
6. کسی ایک سامراجی مؤرخ کا نام بتائیں۔
7. کس کمیشن نے ہندوستان میں تجارتی فصلوں کی اصلاح کے اقدامات تجویز کیے؟

   (الف) رائل کمیشن (ب) ہسٹنگز کمیشن (ج) انڈین کمیشن (د) بوسٹن کمیشن
8. آزاد تجارت کی برطانوی پالیسی کب شروع ہوئی؟
9. کس پریسیڈنسی میں تھامس منرو نے رعیت واری نظام متعارف کروایا؟
10. laissez-faire سے کیا مراد ہے؟

12.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. دولت کی نکاسی کے نتائج پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. وہ کون سی زرعی اشیا ہیں جنہوں نے یورپی بازار میں برطانوی تجارتی منافع میں اضافہ کیا؟ اظہار خیال کریں۔
3. ہندوستان میں زرعی نظام کی تجارتکاری پر نوٹ لکھیں۔
4. دولت کی نکاسی کے بارے میں مورخین کے خیالات بیان کیجیے۔
5. جدید صنعتوں کے ارتقا پر ایک نوٹ لکھیے۔

12.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں نوآبادیات کے مراحل پر روشنی ڈالیں۔
2. ما قبل برطانوی عہد میں مالگزاری اور زراعت پر اظہار خیال کریں۔
3. زرعی معیشت اور زراعت کی تجارت کاری پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

12.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Chandra, Bipan, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India*, Anamika Publishers, New Delhi, 2016.
3. Dalrymple, William, *The Anarchy*: *The East India Company, Corporate Violence, and the Pillage of an Empire*, Bloomsbury, London, 2019.
4. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
5. Durant, Will, *The Case for India*, Standard Book Stall, Mumbai, 2007.
6. Kumar, Dharma, and Desai, Meghnad (eds.), *The Cambridge Economic History of India*, *Volume II: c.1757–2003*, Orient Longman, New Delhi, 2005.
7. Robb, Peter, *A History of India*, Cambridge University Press, 2011.
8. Roy, Tirthankar, *Traditional Industry in the Economy of Colonial India*, Cambridge University Press, 1999.
9. Roy, Tirthankar, *The East India Company*: *The World's Most Powerful Corporation*, Allen Lane/ Penguin, New Delhi, 2012.
10. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707–1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.
11. Tharoor, Shashi, *An Era of Darkness*: *The British Empire in India*, Aleph, 2016.
12. Wilson, Jon, *India Conquered*: *Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon and Schuster, London and New Delhi, 2017.

اکائی 13۔ برطانوی صنعتی پالیسی: عدم صنعتکاری

(British Industrial Policy: De-Industrialisation)

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 ابتدائی یورپی تجارت

13.3 ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا قیام

13.3.1 کمپنی کی حکمرانی

13.3.2 تاج برطانیہ کی حکمرانی

13.4 صنعت اور دستکاری کا زوال

13.5 کپڑے کی صنعت کا زوال

13.6 صنعت اور دستکاری کے زوال کے نتائج

13.7 اکتسابی نتائج

13.8 کلیدی الفاظ

13.9 نمونہ امتحانی سوالات

13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

13.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید (Introduction)

انگریزوں نے جنوبی ایشیا میں سب سے بڑی علاقائی سلطنت قائم کی اور ہندوستان برطانیہ کے شاہی تاج میں سب سے زیادہ قیمتی ہیرے کی حیثیت سے چمکنے لگا۔ انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک انگریزوں نے ہندوستان کے تقریباً تمام معاملات پر قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی تشکیل، ریاست کی سرپرستی میں کوئی عظیم سامراجی اس کی م نہیں تھی بلکہ اس کو ایک تجارتی کمپنی برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے قائم کیا تھا، جو ایک نجی تجارتی کارپوریشن تھی۔ کچھ ہی سالوں میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی ایک طاقتور سامراجی ایجنسی بن گئی، جس نے ہندوستان میں وسیع و عریض علاقوں پر کنٹرول حاصل کیا۔ انگریزوں کے ذریعہ ہندوستان کو عالمی بازار سے ملانے کی کوششوں کے نتیجے میں ریلوے، سڑک اور نقل و حمل کے نیٹ ورک اور ٹیلی گرام وغیرہ کے آنے سے بین علاقائی رابطے بہتر ہوئے۔

ہندوستان پر برطانوی قبضے کے بعد سب سے زیادہ تباہ کن اثر یہ ہوا کہ اس نے زراعت، دیہی کاریگری اور صنعت کاری کی صدیوں پرانی روایات کو تباہ کر دیا۔ نوآبادیاتی تسلط کے نتیجے میں ہندوستان کی دستکاری بنیادی طور پر برطانوی درآمد شدہ مشین سے تیار کردہ سامان کا مقابلہ نہ کر سکی اور زوال پذیر ہو گئی۔ برطانوی صنعتوں میں کم وقت میں بڑے پیمانے پر اور بڑی تعداد میں بہت سامان تیار کرنے کی استطاعت موجود تھی، جس کے سبب سستی قیمتوں کے ساتھ ہندوستان کی منڈیوں میں بہتر درجے کا سامان فراہم ہونے لگا۔ دستکاری کے زوال کا یہ سارا عمل ہندوستان کی معاشی تاریخ کا ایک مشہور واقعہ ہے اور اسے عدم صنعتکاری (De-industrialisation) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس اکائی میں آپ برطانوی معاشی پالیسیوں اور ہندوستان پر ان کے تباہ کن اثرات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

13.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ابتدائی یورپی رابطے کی آمد اور ان کی تجارت سے متعلق جان سکیں گے۔
- بحر ہند میں ایشیائی آزاد تجارت کی اصل کو سمجھ سکیں گے۔
- ہندوستان کے ساتھ یورپی تجارت اور اس کی نوعیت کو سمجھ سکیں گے۔
- دستکاری پر آزادانہ تجارت کے اثرات کی وضاحت کر سکیں گے۔
- صنعتی زوال اور دستکاری کے زوال کے اسباب بیان کر سکیں گے۔
- تجارتی ضوابط اور کپڑے پر برآمد درآمد کی حکمت عملی کا تجزیہ کر سکیں گے۔

13.2 ابتدائی یورپی تجارت (Early European Trade)

1453 میں ترکوں کا قسطنطنیہ پر قبضہ جنیوا کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ کیوں کہ بحیرہ اسود کی بندرگاہیں، جو مشرقی سامان کی

فروخت کا ان کا اصل بازار ہوا کرتا تھا، وہ آہستہ آہستہ ان کے لیے بند ہوتا گیا۔ یہ اور اس کے علاوہ وینس کے ساتھ ان کی پرانی دشمنی ہی وہ اہم عوامل تھے، جس کی وجہ سے جنیوا نے پرتگال اور اسپین کی، بحری جہازوں، پیسوں کے ذریعہ سمندری راستوں کی تلاش میں مدد فراہم کی۔ جیسا کہ مشہور ہے، کرسٹوفر کولمبس نے 1492 میں امریکہ کو دریافت کیا تھا، جب واسکوڈاگاما کالی کٹ پہنچا تو وہاں کے زمورین یعنی راجا نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ اس نے مسالوں کی تجارت کرنے، ایک فیکٹری اور مال کا ذخیرہ کرنے کے لیے گودام قائم کرنے کی اجازت مانگی۔ ساحل یورپ تک مسالوں کی تجارت پر پرتگالی اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتے تھے۔ آہستہ آہستہ پرتگالیوں نے کالی کٹ، کوچین، گوا، دیو اور دمن میں تجارتی مراکز قائم کیے۔ پرتگال وہ پہلا یورپی ملک تھا جس نے ہندوستان جانے والے سمندری راستے کی کھوج کی تھی اور وہ پہلے یورپی شہری بھی تھے جنھوں نے سمندری راستے سے ایشیا کے ساتھ براہ راست تجارت میں سرگرم کردار ادا کیا تھا۔ ہندوستان کے مغربی ساحل پر واقع گوا کے اپنے مرکزی دفتر سے، انہوں نے ملاکا کے وسطی حصے پر قبضہ کرکے روایتی تجارت اور جہاز رانی کے نیٹ ورک پر گرفت حاصل کرنے کی کوشش کی، جس نے بحر ہند کے خطے اور اس کے درمیان ایشیائی تجارتی نیٹ ورک میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔

1498 میں پرتگالی مہم جو، واسکوڈاگاما (Vasco da Gama) کی کافی مشقتوں کے بعد تین جہازوں کے ساتھ کالی کٹ پہنچنے کو عالمی تاریخ میں خاص طور پر ایشیا اور یورپ کے مابین تعلقات کے سلسلے میں ایک نئے دور کا آغاز سمجھا جاتا ہے جس سے یورپی تجارت میں اضافہ ہوا۔ اس سے پہلے سلطنت عثمانیہ نے ایشیا کے تقریباً تمام یورپی تجارتی راستوں پر کنٹرول حاصل کیا تھا اور چونکہ عثمانی بندرگاہوں سے گزرنے والے تجارتی جہازوں کو جہاز سے مال اتار کر زمین کے راستے آگے بھیجنا پڑتا تھا، جس سے لاگت اور خطرہ دونوں بڑھ جاتے تھے۔ اس لیے پرتگال اس وقت افریقہ کے آس پاس سمندر کے ذریعہ ہندوستان جانے والا تجارتی راستہ تلاش کررہا تھا۔ پرتگال کے پرنس ہنری (Prince Henry) نے بحری مہم جوؤں کو بلا کر نئے راستوں کی تلاش کی غرض سے سرگرمیاں شروع کردی تھیں۔ یہ دنیا بھر میں زبردست تحقیق کا آغاز تھا۔ تقریباً 1419 سے لے کر 1460 میں اپنی موت تک شہزادہ ہنری نے افریقہ کے ساحل پر کئی جہاز رانی مہمات کی قیادت کی۔ اس کے بعد 1481 میں پرتگال کے بادشاہ، جان دوم (John-II) نے ان کوششوں کو جاری رکھا اور افریقہ کے جنوبی ساحلوں کے آس پاس ایک سمندری راستہ تلاش کیا جاتا رہا۔ بہت سے کھوجیوں نے متعدد کوششیں کیں۔ بارتھولومیڈیاس (Bartholomew Dias)، ایک پرتگالی مہم جو تھا جس نے 1488 میں افریقہ اور بحر ہند کے آس پاس اولین بحری سفر کیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ ہندوستان تک پہنچ سکے، اسے پرتگال واپس لوٹنا پڑا۔ جب 1495 میں ایمانوئیل اول (Emmanuel-I) پرتگال کا بادشاہ بنا تو اس نے افریقہ کے آس پاس جا کر ہندوستان کے تجارتی راستے کھولنے کی کوششیں جاری رکھی۔ ایمانوئل نے بالآخر اس کام کے لیے 37 سالہ واسکوڈی گاما کو منتخب کیا۔ مالابار کے ساحل پر اس دوران واسکوڈی گاما نے اپنے سمندری کیریئر کا آغاز کیا۔ ایسٹ انڈیز تک راس امید کے راستے کی دریافت اور اسپین میں امریکی چاندی کی بڑھتی ہوئی درآمد کو سولہویں صدی میں جدید معاشی نظام کے عروج کے پیچھے دو بڑی طاقتوں کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک، ایشیا کا بیشتر حصہ یوروپیوں کے اثرو رسوخ میں رہا۔ دنیا کی تجارت میں متعدد ایشیائی ممالک کی بڑھتی ہوئی شمولیت نے ان کی معیشتوں اور معاشروں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

نیدرلینڈ کے اسٹیٹس جنرل کے ذریعے منشور عطا کی ہوئی Vereenigde Oostindische Compagnie یا ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل 1602 میں ہوئی تھی۔ یہ چونکہ دنیا کی پہلی ملٹی نیشنل کارپوریشن (Multinational Corporation) اور گودام کی سہولت فراہم کرنے والی اولین کمپنی تھی۔ ڈچوں کی اصل دلچسپی ہندوستان میں نہیں بلکہ ان مصالحوں میں تھی جو زیادہ تر انڈونیشیا میں پیدا ہوا کرتے تھے۔ ڈچوں نے ہندوستان میں سورت، بھروچ، کیمبے، ناگاپٹنم، مچھلی پٹنم، چنسورا، پٹنہ اور آگرہ میں تجارتی مراکز قائم کیے۔ اس کے بعد، انہوں نے 1605 میں اپنی پہلی فیکٹری مسولی پٹنم میں قائم کی اور پرتگالیوں پر فتح حاصل کی۔ 1616 کے بعد سے پلی کٹ ان کا مرکز رہا تھا اور اس کے بعد اسے ناگاپٹنم منتقل کیا گیا۔ 16 ویں صدی کے نصف آخر میں، شمالی نیدرلینڈ کے باشندے بھی اس تجارت میں داخل ہوئے اور اس کامیابی کو مورخین نے 'ڈچوں کے انوکھے کام' سے منسوب کرتے ہیں۔ اس وقت ڈچ مصالحوں کی تجارتی منڈی کے گویا تنہا مالک ہو گئے اور سادہ لوح جنوبی نیدرلینڈ والوں میں ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ لیکن شاید تقدیر نے ان کا ساتھ نہ دیا اور ان کا سنہرا دور جلد ہی روبہ زوال ہوا۔ اس زوال کے متعدد اسباب تھے۔

1595 میں پہلی مہم کے فوراً بعد ہی، ڈچوں نے ایشیا میں جاری تجارتی مقابلے میں پرتگالیوں اور دیگر یورپی ممالک پر سبقت حاصل کی۔ ایشیائی تجارتی کمپنیوں تک سفر کے لیے جہازوں پر تجارتی سامان لادنے کی غرض سے بڑے بڑے مراکز قائم کیے گئے۔ اس طرح سے تجارت میں کافی منافع ہوا اور اسے مقبولیت بھی خوب حاصل ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی توقعات بھی بڑھتی گئی اور نتیجے میں بڑے بڑے جہازوں کو ایشیا کے لیے روانہ کیا جانے لگا۔ 1602 تک، جب ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت 65 جہازوں پر مشتمل اکٹھے چودہ بیڑے بھیجے گئے تھے، جب کہ 1591 تا 1601 کے دوران پرتگالیوں نے 59 جہازوں پر مشتمل قافلہ روانہ کیا تھا۔ تاہم ڈچ قوت زوال پذیر ہونے لگی اور آخر کار 1759 میں چنسورا کی جنگ (The Battle of Chinsurah) میں انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھا کر ختم ہو گئی۔ ڈچ اور برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنیوں کی ابتدائی کوششیں مسالحوں کی تجارت تک ہی محدود تھیں لیکن بعد میں یہی کوششیں کپڑے کی طرف بڑھتی گئیں کیونکہ ہندوستانی کپڑے کی یورپ میں بہت ڈیمانڈ یا طلب تھی۔

ہندوستان کے ساحل پر پہنچنے والا آخری یورپی ملک فرانس تھا۔ گوکہ وہ سولہویں صدی کے آغاز ہی سے مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت میں مصروف تھا۔ لوئی پانزدہم (Louis-XV) کے دور حکومت میں اس کے قابل وزیر کولبرٹ (Colbert) نے 1664 میں فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی۔ فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان اور بحرالکاہل میں تجارت کے لیے 50 سال کی اجازت حاصل ہوئی۔ یہ کمپنی 1667 تک ہندوستان میں نوآبادکاری کی کوشش کے تحت اپنے وسائل کا خوب استعمال کرتی رہی۔ اسی کے تحت اس نے سورت میں ایک فیکٹری قائم کی۔ اس کے بعد 1669 میں مسولی پٹنم میں مزید ایک فیکٹری قائم کی۔ ساتھ ہی ساتھ کولکاتہ کے قریب چندر نگر میں ایک بستی بسائی۔ 1673 اور 1674 میں ان کے ذریعے پدوچیری میں فیکٹریاں قائم کی گئیں۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی اور خاص طور پر ساحلی علاقوں میں ماہے، کریکال، بالاسور اور قاسم بازار فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے چند اہم تجارتی مراکز تھے۔ اگرچہ برطانوی اور فرانسیسی ہندوستان میں تجارتی مقاصد سے آئے تھے، تاہم یہ دونوں اپنی روایتی دشمنی کے ساتھ ہندوستان میں اپنے اپنے اقتدار کو

پھیلانے کے لیے میں ایک دوسرے سے لڑے۔ ہندوستان کی سرزمین اینگلو-فرانسیسی دشمنی کا میدان جنگ بن گئی۔آسٹریا میں تخت نشینی کی جنگ کے ساتھ اس کا دوبارہ آغاز ہوا اور سات سالہ جنگ کے بعد یہ اختتام پذیر ہو گئی۔ خاص طور پر ہندوستان میں اس باہمی رقابت کے نتیجے میں تین جنگیں ہوئیں جس کے نتیجہ میں فرانس والوں کی ہار ہوئی اور ہندوستان پر برطانیہ کا اقتدار پہلے سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو گیا۔ ہندوستان پر اپنی بالادستی قائم کرنے میں فرانسیسی ناکام رہے۔

13.3 ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا قیام (Establishment of the British Empire in India)

پرتگالیوں کی کامیابی اور مشرقی علاقوں میں تجارت سے زیادہ منافع حاصل ہونے کے سبب برطانوی تاجروں نے بھی ایشیائی تجارت میں قدم رکھا۔ نتیجتاً 1599 میں ان کے ایک گروہ نے اپنے آپ کو تجارتی مہم جو (Merchant Adventurers) کے نام سے موسوم کیا اور ایک کمپنی تشکیل دی۔ اس کے بعد ملکہ ایلزبتھ اول (Queen Elizabeth-I) نے 31 دسمبر 1600 کے روز ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام تجارتی حقوق کا ایک منشور (Charter) جاری کیا اور باضابطہ طور پر پندرہ سالہ اجارہ داری کو منظوری دی۔ اسی کے ساتھ مئی 1609 میں ایک نئے منشور کے ذریعے اسے غیر معینہ مدت تک بڑھا دیا گیا۔ ڈچ پہلے ہی مشرق کی جانب بہت زیادہ توجہ دے رہے تھے۔ لیکن اس سے قبل ہی برطانیہ نے کپڑے اور دیگر تجارتی مصنوعات کی تلاش میں ہندوستان کا رخ کیا۔

اٹھارویں وسط کے صدی میں اس ہنگامہ آرائی کے دوران فرانسیسی اور انگریزی حریف تجارتی کمپنیاں ہندوستان کی ساحلی منڈیوں اور تجارتی مراکز پر بالادستی قائم کرنے کے لیے باہم مقابلہ کر رہی تھیں۔ کے این چودھری (K.N. Chaudhry) نے اسے three 'great crafts' یا تین عظیم دستکاریوں، کپڑے (textiles)، روئی (cotton) اور ریشم (silk)، دھات (metal) اور ایشیائی چینی مٹی کے برتن (Porcelain of Asia) کے عنوان سے موسوم کیا۔ چاندی کے متبادل سامان کی خاطر یورپی منڈیوں پر ان کا تسلط قائم ہوا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں ڈچ، فرانسیسی اور انگریز پرتگالیوں کے زیر سایہ ہوا کرتے تھے اور کپڑے، ریشم اور اسی کے ساتھ نمک کے کارخانے قائم کرنے کی غرض سے ساحلی اور صوبائی تجارتی مراکز کی تلاش میں تھے۔

آہستہ آہستہ انگریزوں نے اپنے تمام حریفوں کو شکست دے کر میدان سے باہر کر دیا۔ مقامی حکمرانوں کو بھی متعدد جنگوں میں شکست دے کر ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ کی مالک بن گئی۔ اپنی سیاسی برتری کو اس نے اپنے معاشی اور تجارتی فائدے کے لیے استعمال کیا۔ ان کے نتیجے میں ہندوستان کی مالگزاری سے حاصل شدہ رقم برطانیہ بھیجنے کے لیے تجارتی سامان بہت کم قیمت پر خریدے گئے۔ بدلے میں ہندوستان کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اسے معاشی اصطلاح میں دولت کی نکاسی (Drain of Wealth) کہا گیا۔ دوسری طرف انگلینڈ میں صنعتی انقلاب آنے سے مشین کے ذریعے پیداوار کا عمل تیز ہو گیا۔ اس کے لیے کچے مال کی فراہمی اور تیار شدہ مال کی کھپت کے لیے بازار کی ضرورت پیش آئی۔ ہندوستان چونکہ برطانیہ کے قبضے میں تھا اور امریکی نوآبادیات چھن جانے کی وجہ سے برطانوی صنعتوں کی ان دونوں ضرورتوں کو بآسانی پورا کر سکتا تھا۔ ساتھ ہی اس سے کسی مزاحمت کی توقع بھی نہیں تھی چونکہ کوئی مقامی مقتدر اعلیٰ ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا

تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان برطانیہ کے لیے کچے مال کی فراہمی اور مشینی مصنوعات کی کھپت کا بازار بن گیا۔ ہندوستانی دستکار اور صنعت کار ، مشین سے بنی سستی اور خوبصورت اشیا کا مقابلہ نہیں کر سکے اور مقامی حکمرانوں کی سرپرستی سے محروم ہونے کی وجہ سے اپنے خریدار کھو بیٹھے۔ اس طرح ہندوستانی صنعت اور دستکاری کا زوال شروع ہو گیا۔ اس عمل کو عدم صنعتکاری (de-industrialisation) یا مقامی صنعتوں کی تباہی کا عمل کہا جاتا ہے۔ یہ معاشی تباہ کاریاں، دو مراحل میں شروع ہوی۔ پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی کے دوران اور دوسرے تاج برطانیہ کی حکومت میں زوال کا یہ عمل مزید تیز ہو گیا۔

13.3.1 کمپنی کی حکمرانی (Company Rule, 1757–1858)

1757 کی جنگ پلاسی کے بعد برصغیر ہند، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت چلا گیا جسے ہندوستان میں کمپنی کی حکمرانیسے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کمپنی حکومت کے دوران سامان تجارت اور مزدوروں کو لانے لے جانے کے لیے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کئی تجارتی جہاز استعمال کرتی تھی۔ جنگ پلاسی سے حاصل شدہ مال و دولت سے ہندوستانی راجاؤں کے خلاف جنگ چھیڑنے میں مدد ملی جس سے انگریزوں کی سیاسی قوت کو استحکام ملا اور بالآخر برطانوی اقتدار قائم ہو گیا۔ اس دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانی مصنوعات بالخصوص کپڑے پر اجارہ داری حاصل کرلی۔

انگریزوں کی اختیار کردہ معاشی پالیسیوں کے نتیجہ میں ہندوستانی معیشت تیزی سے نوآبادیاتی معیشت میں تبدیل ہو رہی تھی جس کا مزاج اور ساخت انگریزوں کی ضروریات کے مطابق تھا۔ ہندوستان پر برطانوی تسلط نے ہندوستانی معیشت کی روایتی ساخت کو مکمل طور پر تہس نہس کر دیا۔ 1813 کے بعد برطانیہ نے ہندوستان پر یک طرفہ آزادانہ تجارت کی پالیسی تھوپ دی اور برطانوی صنعت کاروں نے بالخصوص کپڑے کی صنعت میں دخل اندازی کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ قدیم تکنیک سے تیار کردہ مصنوعات، بھاپ پر چلنے والی مشینوں سے بڑے پیمانہ پر تیار کردہ مصنوعات سے مقابلہ نہیں کرپارہی تھی۔

1856 میں اودھ کے برطانوی حکومت کے ماتحت چلے جانے کے بعد ہمالیہ تک برصغیر ہند کا پورا علاقہ اور برما کا بیشتر حصہ کمپنی کی حکومت میں یا پھر ان مقامی حکمرانوں کے تحت چلا گیا جن کا کمپنی کے ساتھ الحاق ہو چکا تھا۔ اپنے دور حکمرانی میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں صوبہ بنگال (Bengal Presidency)، صوبہ بمبئی (Bombay Presidency)، صوبہ مدراس (Madras Presidency) اور شمال مغربی صوبہ جات (North-West Frontier Provinces) کے نام سے چار اہم صدر مقام قائم کر لیے تھے۔ کمپنی کا اقتدار اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی توسیع کا یہ مرحلہ 1857 کی ہندوستانی بغاوت تک جاری رہا۔ 1857 کے بعد بالآخر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1858 کے ساتھ کمپنی کا اقتدار ختم ہو گیا۔ حالانکہ ایسٹ انڈیا کمپنی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت 1874 میں تحلیل ہوئی۔

13.3.2 تاج برطانیہ کی حکمرانی (Rule by the Crown of Great Britain, 1858–1947)

1858 سے ہندوستان ملکہ برطانیہ کی بادشاہت کے تحت چلا گیا۔اس حکمرانی میں ریاست کے محصول میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی لیکن اس کے سبب برطانوی سلطنت کی معیشت دور دراز کے علاقوں میں پہونچ گئی۔ نتیجتاً برطانوی تجارت کی توسیع، سرمایہ کی روانی اور مقامی دستکاری میں تنزلی ظاہر ہونے لگی۔ہندوستانی معیشت جمود کی حالت میں پہنچ گئی اور صنعتی زوال کا شکار ہو گئی جب کہ برطانوی معیشت ترقی پاکر صنعتی انقلاب کے دور سے گذر رہی تھی۔انگریزوں کی نافذ کردہ متعدد معاشی پالیسیوں کے سبب ہندوستان کے دستکاری شعبہ میں تنزل واقع ہوا۔اس کے نتیجہ میں ملازمتوں اور خدمات میں کمی واقع ہوئی۔ مجموعی طور پر نوآبادیاتی حکومت نے ہندوستان پر گہرے معاشی اثرات مرتب کیے۔انیسویں صدی کے درمیانی حصہ میں تجارت کے حجم میں اضافہ ہوا لیکن تجارت کا توازن اب بدل چکا تھا اور یہ برطانیہ کے حق میں ہو گیا تھا۔ماضی میں ہندوستان کپڑے کا برآمد کنندہ ملک تھا لیکن اب یہ برطانیہ کو زرعی اشیاء اور کچے مال فراہم کرنے والا اور وہاں سے تیار شدہ مصنوعات درآمد کرنے والا ملک بن گیا تھا۔ کچی سوت اور غذائی اجناس نے سامراجی تجارت میں اہم رول ادا کیا۔ہندوستان میں ریلوے کے نظام کی توسیع کے لیے نجی اور سرکاری انگریز سرمایہ کاروں نے بڑی مقدار میں سرمایہ کاری کی جس کے سبب اعلیٰ درجہ کی تجارت اور فوج کے استعمال میں مدد ملی۔1853 میں ریلوے کا آغاز ہوا اور اس میں بتدریج اضافہ ہوا اور اس کے بعد برصغیر کے دور دراز علاقوں تک رسائی ممکن ہوئی۔

13.4 صنعتوں اور دستکاری کا زوال (Decline of Industries and Handicrafts)

جدید ہندوستان ایک صنعتی ملک نہیں تھا۔لیکنسترہویں اور اٹھارہویں صدی کے معیارات کے مطابق غالباً یوروپی اقوام کی آمد سے قبل ہندوستان دنیا کی صنعتی کارگاہ تھی۔ہندوستان کی روایتی معیشت، زراعت اور دستکاری کا ملا جلا بہترین نمونہ تھی۔ برطانوی حکومت نے اس کی صنعت اور زراعت کی تباہی میں اہم رول ادا کیا۔ برطانوی حکومت کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہندوستانی معیشت کی ساخت اور کارکردگی میں تبدیلی کی گئی جس کے نتیجے میں ہندوستانی معیشت پوری طرح تباہ ہو گئی اور یہ ایک نوآبادیاتی معیشت (Colonial Economy) میں تبدیل ہو گئی، جس کا مقصد مادر وطن (Mother Country) کے فائدے کے لیے کام کرنا تھا۔انگریزوں نے جان بوجھ کر روایتی ہندوستانی صنعتوں کو تباہ کرنے والی پالیسیاں اپنائی۔انگریز تاجروں اور صنعت کاروں کے دباؤ میں آکر برطانوی حکومت نے ہندوستانی صنعت کاروں پر برطانوی کارخانہ داروں کو ترجیح دی اور اس کے خراب اثرات کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ہندوستان کو مشینوں سے تیار کردہ برطانوی مصنوعات کا بڑا بازار بنانا ہی ان کا مقصد تھا۔اس کے نتیجہ میں بالآخر ہندوستان صرف زرعی خام مال فراہم کرنے والا ملک بن کر رہ گیا اور اس طرح ہندوستان برطانیہ کی خام مال کی بڑھتی ہوئی ضروریات پوری کرنے کے کی حد تک محدود ہو گیا۔یہ دونوں مقاصد کا حصول اسی وقت ممکن تھا جب کہ دستکاری کی صنعت کا خاتمہ ہو جائے۔اب ہندوستان کو مصنوعات کے لیے برطانیہ سے درآمدات پر انحصار کرنا پڑا۔1800 میں ہندوستان کی روایتی مصنوعات کی تیاری میں بڑی حد تک کمی واقع ہوئی اور یہاں سے زرعی پیداوار کی برآمد میں اضافہ ہوا۔اب برصغیر ہند پوری طرح سے برطانوی صنعتوں کے تابع ہو گیا۔اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں صنعتی اشیاء کی تیاری اور روزگار میں

کمی کو عدم صنعت کاری کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے دوران ہندوستان، دنیا میں ایک نمایاں تیار کنندہ ملک کی حیثیت سے جانا جاتا تھا جب کہ اس کی 15 سے 20 فیصد آبادی یا دوسرے لفظوں میں ڈیڑھ سے دو کروڑ افراد مقامی صنعتوں سے منسلک تھے۔ یہاں کی اہم صنعتوں میں کپڑے کی کتائی بنائی، چمڑا اور اس کی اشیاء کی تیاری، دھاتوں کے کام، قالین اور شالوں کی تیاری شامل تھی۔ ان تمام صنعتوں میں مشینوں کا استعمال نہیں ہوتا تھا اور یہ بڑے کارخانوں کی صورت میں منظم نہیں تھیں اور نہ ہی یہ انگلینڈ کی طرح کسی طرح کے قوانین کی تابع تھی۔ یہ زیادہ تر خاندانی کاریگروں اور گھریلو عورتوں کے ذریعے پر کی جاتی تھی جنہیں روایتی صنعتوں (Traditional Industries) کا نام دیا گیا۔ اس دوران ہندوستان اور عالمی تجارت میں ڈرامائی اضافہ ہوا اور ہندوستانی روایتی صنعتوں کو برطانیہ کی جدید صنعتوں سے سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ برطانیہ میں مشینوں سے تیار کردہ کپڑے نے ہندوستان میں ہاتھ سے تیار کردہ دھاگے اور کپڑے سے مقابلہ شروع کیا۔ مورخین کے مطابق ہندوستان میں صنعتی تیاری کی مستحکم روایت تھی جن کا نوآبادیاتی دور میں زوال واقع ہوا۔ ان کی جگہ حاصل کرنے والی جدید صنعتوں نے روزگار اور آمدنی میں نقصانات کی بھرپائی نہیں کی۔ صنعتی زوال کے نہایت منفی اثرات مرتب ہوئے۔ اس نظریہ کو چار نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

1. ہندوستان میں روایتی صنعتوں کا زوال
2. تکنیکی فرسودگی کے سبب زوال
3. ہاتھ سے تیار کردہ اشیاء اور مشینوں سے تیار کردہ اشیاء میں غیر مساوی مقابلہ آرائی
4. بازار کا برطانیہ کی ضروریات کے مطابق چلنا

ان وجوہات کے سبب برطانیہ سے نزدیکی معاشی رشتے استوار ہوئے۔ یہ پورا عمل نوآبادیاتی پالیسیوں کے سبب قائم رہا اور ہندوستانی نوآبادی کو اس کی وجہ سے معاوضہ سے محروم ہونا پڑا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے دوران ایشیا سے وسیع پیمانے پر کاروبار میں مصروف کمپنیاں اجارہ دار کمپنیاں تھیں جن کا تعلق یورپ کے شمال مغرب کے متعدد ممالک سے تھا۔ یورپ میں ایسٹ انڈیا کمپنیاں قائم ہوئی اور مغربی بازار میں مشرق کی پر تعیش مصنوعات کی طلب میں اضافہ ہوا کیونکہ یورپ میں ان کی بڑی مانگ تھی۔ ابتدائی قوم پرست مورخ رمیش چندر دت (Romesh Chunder Dutt) کے مطابق 'آزاد تجارت نے روایتی دستکارانہ صنعت کو ختم کردیا اور ہندوستان کو مزید غریب بنادیا۔' ان کے مطابق ہندوستانی صنعتکاروں سے برطانوی کارخانہ داروں کی طرف تبدیلی برطانوی ہند کی تاریخ کا ایک دردناک باب ہے۔

ہندوستان میں صنعتی زوال کی متعدد وجوہات حسب ذیل ہیں۔

- برطانوی فیکٹریوں نے سستا کپڑا بنایا اور ہندوستان میں اس کا سیلاب آگیا۔ صنعتی انقلاب کے ساتھ برطانیہ نے کپڑے کی تیاری کے لیے جدید ٹکنالوجی اور مشینیں متعارف کیں۔ اس وجہ سے اشیاء کی تیاری میں آسانی ہوئی اور برصغیر ہند میں انگریزی کپڑے کی کثرت ہو گئی۔ یہ کپڑا سستے داموں پر فروخت ہوتا اور اس طرح ہندوستان کی روایتی صنعت تباہ ہو گئی۔

- 1853 میں ریلوے نظام متعارف ہوا جس کے سبب ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک برطانوی اشیاء کی رسائی ممکن ہو گئی۔
- ہندوستانی دستکاری کی حفاظت کے لیے نرخ کی پالیسیوں کی عدم موجودگی۔ انگریزوں نے برطانوی مصنوعات کے فروغ کے لیے برطانوی مصنوعات کے ہندوستان میں داخلہ کو آسان بناتے ہوئے اس پر عائد ٹیکسوں میں کمی کی، جب کہ ہندوستانی مصنوعات کی برآمدات پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس عائد کیا۔ اس پالیسی کو تجارتی تحفظ پسندی (Mercantilism) کی پالیسی کہا گیا۔ بین الاقوامی بازار، بین الاقوامی تاجروں کے کنٹرول میں تھا جس کے سبب دستکاروں کو ان تاجرین کے رحم و کرم کا محتاج ہونا پڑا۔ دیگر اقوام کے مقابلہ میں ہندوستان میں دستکاروں کی تنظیمیں کمزور ہو گئی۔
- برطانوی اقتدار کے سبب کاریگروں کے لیے مقامی بادشاہوں کی سرپرستی میں کمی آ گئی جو قدیم زمانے سے ان کے بڑے خریدار اور سرپرست رہے تھے۔ اس کے نتیجہ میں دستکاری زوال کا شکار ہوئی۔
- ہندوستان اور برطانیہ کی مصنوعات میں مقابلہ آرائی کے لیے غلط قوانین ہندوستان پر مسلط کیے گئے۔ ناانصافی اور غیر برابری پر مبنی پالیسیوں جیسے ہندوستانی اشیاء پر پابندی، گھریلو بازار میں بھاری قیمت اور آزاد تجارت کے نام برطانوی تاجروں کے لیے ہندوستانی بازار میں آزادی، وغیرہ کے ذریعہ ہندوستانی کارخانہ داروں کے لیے انگلینڈ کے بازار تک رسائی کو محدود کیا گیا۔
- 1848 سے ہندوستان سے انگلینڈ کے لیے برآمدات پر زیادہ ٹیکس عائد کیا گیا اور گھریلو چنگیوں (Inland Customs) اور ترسیلی محصول نظام (Transit Duty System) کے ذریعہ ہندوستانی بازار کو محدود کر دیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا سیاسی اثر ورسوخ استعمال کرکے کاریگروں اور کپڑا بنکروں پر اجارہ دارانہ کنٹرول قائم کیا اور، انہیں سستی اشیاء کی تیاری یا پھر اس میں ناکامی کی صورت میں اپنے آبائی پیشے کو چھوڑنے پر مجبور کیا۔

13.5 کپڑے کی صنعت کا زوال (Decline of the Textile Industry)

15 ویں صدی میں انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں سوتی کپڑے کی تیاری نے ایک ممتاز شکل اختیار کر لی تھی جس کے سبب ہندوستان سے زمینی اور سمندری راستہ کے ذریعہ بڑے پیمانے پر مشرق میں انڈونیشیاء اور جاپان جیسے ایشیائی ممالک اور عرب، ایتھوپیا، مصر اور مغربی افریقہ تک تجارت کے لیے وسیع بنیاد فراہم ہوئی۔ ہندوستانی تاجر سوتی کپڑے کی مختلف اقسام کی تجارت کرتے تھے جس کے عوض وہ متعدد اشیاء جیسے کھانے پینے کی اور پر تعیش اشیاء خریدتے تھے۔ مغربی ہندوستان میں گجرات کا علاقہ، شمال میں کورومنڈل اور بعد ازاں بنگال بڑے تجارتی مراکز بنتے جا رہے تھے۔ یوروپی اقوام بھی اس طرح کی بڑے پیمانہ پر تجارت سے کافی حیرت زدہ تھے۔ بحری سیاحوں نے بھی ناگا پٹنم، سینٹ تھامس اور مسولی پٹنم میں تیار کیے جانے والے مہین کپڑے کا مشاہدہ کیا۔ یہ سوتی کپڑے اپنے رنگ اور مختلف طریقوں کی بنائی اور نقش و نگار کے لیے مشہور تھے جو بہت مہین اور نزاکت سے تیار کردہ تھا اور ہندوستان میں عام طور سے استعمال ہوتا تھا۔ ہندوستانی سوتی کپڑے بحر ہند کے علاقہ میں زیادہ تر ممالک تک رسائی رکھتے تھے۔ سترہویں صدی کی ابتداء میں بڑی مقدار میں یہ ہندوستانی سوتی کپڑے ایران کے شمالی ساحل پر مستقلاً فروخت ہوتے تھے اور ہندوستانی تاجروں کے ذریعہ زمینی اور سمندری راستہ سے فارس، بغداد اور بصرہ جاتے تھے جب کہ

شام کے راستہ قسطنطنیہ تک پہنچتے تھے۔ براعظم ایشیاء کے دیگر ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنے میں دیگر مصنوعات کے ساتھ کپڑے نے بھی اہم رول ادا کیا۔ یہاں تک کہ 1660 کے دہے میں بیک وقت 25تا30ہزار اونٹوں پر سوار کپڑے کی مصنوعات ہندوستان سے ہر سال ایران روانہ کی جاتی تھی۔ سترہویں صدی کی ابتداء سے یورپ، ہندوستانی کپڑے کا نیا بازار بن چکا تھا۔ حالانکہ بنگال، گجرات اور کورومنڈل بین الاقوامی تجارت کے مراکز بنے رہے لیکن ان کی اہمیت میں کمی واقع ہوئی اور صرف بنگال کافی اہمیت اختیار کر گیا۔ 1700 تک ہندوستانی بحری تجارت، ہندیورپی نوعیت کی حامل تھی اور اس تجارت کی اہم ترین مصنوعات کپڑا بن گیا تھا۔ اس نے چاول اور مسالوں کی جگہ لے لی تھی جس کا اب تک بحری تجارت پر غلبہ تھا۔

ہندوستان اور چین سے پر تعیش اشیاء کی یورپ درآمد نے اٹھارہویں صدی کے آخر میں یورپی معیشت کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ پر تعیش اشیاء کی صورت میں کپڑے نے مغربی صارفین اور صنعتوں تک رسائی حاصل کر لی۔ ایشیاء سے درآمدی اشیاء کی طلب صرف دربار اور امیر افراد تک محدود نہیں رہی بلکہ فیشن انڈسٹری میں بھی اس کی طلب میں اضافہ ہوا۔ یوروپی یہ مصنوعات درآمد کرتے تھے۔ طلب اور رسد میں غیر معمولی اضافہ اور دیگر ایشیائی مصنوعات کے یورپی بازار میں رسائی کے سبب انیسویں صدی کے آخر تک آسان تکنیک پر مبنی کپڑے کی صنعت نے بین الاقوامی بازار پر غلبہ بنائے رکھا۔ ابتداء میں یورپی کمپنیوں کو کپڑے برآمد کرنے کے لیے مناسب درآمدی سامان تلاش کرنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ طلب قیمتی سونے اور چاندی کی تھی جس کے سبب ہندوستان میں بلین (Bullion) یا سونے اور چاندی کی بڑے پیمانہ پر ترسیل کا آغاز ہوا۔ 1757 میں برطانیہ کے سیاسی اقتدار کے حصول تک یہ رجحان جاری رہا۔ اس کے بعد سونے کی ترسیل رک گئی اور اس کی جگہ کمپنی کو حاصل ہونے والے زمینی محصول نے لے لی۔ کمپنی نے زمینی محصول میں اضافہ کر دیا اور کپڑے پر بھی محصول نافذ کر دیا۔ ہندوستانی کپڑے کو بین الاقوامی بازار میں سوتی کپڑوں کے معیار اور ڈیزائن نیز کاریگروں کی کم اجرت پر دستیابی کے سبب مسابقتی فوائد حاصل ہوئے۔ اٹھارہویں صدی کے درمیانی عرصہ میں ہندوستانی کپڑے کی مصنوعات، برطانیہ میں صنعتی انقلاب آنے سے مشین سے تیار کی جارہی مصنوعات کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہو گئی۔ حالانکہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے برآمدات کے لیے ادائیگی کے ذریعہ اس مسئلہ کے حل کی کوشش کی لیکن کپڑے کی صنعت کو ایک بڑا دھچکا لگا جس کے سبب بین الاقوامی بازار میں ہندوستان کے مقام کو کافی نقصان پہنچا۔ انیسویں صدی کے آخر تک ہندوستانی دستکاری صنعت، زوال کا شکار ہوئی اور اس کے ختم ہو جانے کی نوبت آپہنچی۔

برطانیہ میں کاریگروں کی اجرت ہندوستان کے مقابلہ میں پانچ گنا زیادہ تھی اس لیے وہاں ہندوستانی تکنیک سے کپڑے کی تیاری کافی مہنگی تھی۔ صنعتی انقلاب کی کم محنت طلب تکنیک کے سبب یہ حالات تبدیل ہو گئے اور مشینوں کے ذریعہ سوتی کپڑوں کی تیاری سے اس کی قیمتوں میں کافی کمی واقع ہوئی۔ ہندوستانی کاریگر اس قیمت پر کپڑے تیار نہیں کر سکتا تھا اور ادھر برطانیہ میں تیزی سے کپڑے کی تیاری جاری رہی، جس کے سبب برطانوی بازار میں ہندوستانی کپڑا مقابلہ نہیں کر پایا۔ ادھر اندرون ملک بھی ہندوستانی مصنوعات کو برطانوی مصنوعات سے مقابلہ پیش آیا۔ انیسویں صدی کے درمیانی عرصے میں رفتہ رفتہ ہندوستانی مصنوعات کی جگہ برطانوی مصنوعات نے لے لی۔ دستکاری سے تیار کردہ مصنوعات، صنعتی انقلاب کے سبب مشینوں سے تیار کردہ مصنوعات کا مقابلہ نہیں کر پائی اور ہندوستانی صنعت اور دستکاری زوال کا شکار ہو

گئی۔ایسااس وجہ سے بھی ہوا کیوں کہ ہندوستانی دھاگہ نے ہندوستانی کپڑے پر اپنا قابو کھو دیا۔ ہندوستان میں تکنیکی تبدیلیوں کی رفتار کافی سست تھی اور ہندوستانی بنکروں نے گھریلو تیار کردہ دھاگے کی جگہ اب سستے اور ٹکاؤ باہر سے منگائے ہوئے دھاگے کا استعمال شروع کر دیا تھا۔اس کے بعد ہندوستانی کپڑے کی صنعت کی جگہ انگریزی ملوں میں تیار کردہ کپڑے نے لے لی تھی، جس کے سبب 1830 اور 1880 کے درمیان ہندوستانی کپڑوں کی مصنوعات کے گھریلو استعمال میں کمی واقع ہوئی۔سال 1828 میں سوتی کپڑوں کی سالانہ درآمدات 40 لاکھ سے زائد تھی جو مجموعی درآمدات کا 8 فیصد تھی۔ 1867 اور 1886 کے دوران سوتی کپڑے کی درآمدات 95.8 کروڑ گز سے بڑھ کر 215.6 کروڑ گز تک پہنچ گئی۔سال 1870 میں ان مصنوعات کی درآمدات مجموعی درآمدات کی 47 فیصد تک پہنچ گئی اور 1960 میں یہ 230.9 کروڑ گز تک پہنچ گئی۔

13.6 صنعتوں اور دستکاری کے زوال کے نتائج

(Consequences of the Decline of Industries and Handicrafts)

جدید صنعتی ترقی کی جانب انگریزوں نے کسی طرح کے اقدامات نہیں کیے تھے۔روایتی زندگی ہندوستان میں صنعت کاری سے ماورا نہیں رہ پائی جو اسی دوران انگلینڈ اور دیگر صنعتی ممالک میں وقوع پذیر ہوا تھا۔اس کے سبب ہندوستان میں عدم صنعت کاری ہوی جب کہ یورپ میں صنعتی انقلاب پوری شدت کے ساتھ ترقی کر رہا تھا۔یہ تمام سرگرمیاں اس وقت ہو رہی تھیں جب کہ ہندوستانی کاریگر اور دستکار پہلے ہی زمینداروں اور مقامی حکمرانوں کی سرپرستی سے محرومی کے سبب بحران کا شکار تھے جو اب نئے مغربی اقتدار کے زیر اثر آ چکے تھے۔اس عمل کے نتیجہ میں دیہاتوں کی جانب واپسی کا عمل شروع ہوا۔ ہزاروں بنکر اپنی گذر اوقات سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ایک تخمینے کے مطابق بنگال میں 1801 میں صنعتی روزگار میں 9 فیصد کے مقابلہ 1901 میں 21 فیصد کی گراوٹ درج کی گئی۔ مجموعی افراط زر میں صنعت و تجارت کے شعبہ میں بھی کمی واقع ہوئی۔انیسویں صدی کے دوران شہروں میں سکونت اختیار کرنے کے رجحان میں 15 سے 9 فیصد کی گراوٹ درج ہوئی۔اس دوران ہندوستان کی مصنوعات کی تیاری کی بین الاقوامی حصے داری میں 2 سے 27 فیصد تک کی گراوٹ درج ہوئی۔ ہندوستان جو ماضی میں صنعتی اشیاء کا برآمد کنندہ ملک تھا،آہستہ آہستہ زرعی پیداوار کا برآمد کنندہ ملک بن گیا اور برطانوی سلطنت کی بین الاقوامی معیشت سے مربوط ہو گیا۔1880 میں سوتی کپڑے کا مقامی مصرف 60 فیصد برطانوی درآمدات کی صورت میں درج ہوا۔ چونکہ درآمد کردہ سوتی کپڑا سستا تھا لہٰذا فی کس آمدنی میں بھی اضافہ درج ہوا۔ ہندوستانی اشیا کی تیاری بھی زوال کا شکار ہوئی اور تیار شدہ اشیاء اس کی فہرست برآمدات سے خارج ہو گئی۔1880 کے بعد جدید کپڑے کی صنعت کی ترقی کے ساتھ ہندوستانی کپڑا بنانے والے بازار میں حصص (shares) حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ کپڑا بنکروں اور کاریگروں کی بے روزگاری میں اضافہ ہوا جس کے سبب وہ گذر اوقات کے لیے زراعت کی جانب متوجہ ہوئے لیکن اس کے سبب کاریگروں کے مجموعی معیار زندگی پر برے اثرات مرتب ہوئے۔ 1901 تک 1.3 کروڑ صنعتی مزدوروں کی ایک تہائی تعداد دستکاروں پر مشتمل تھی۔متعدد کاریگر، کمپنی حکومت کے تحت کم سے کم اجرت اور جابرانہ پالیسیوں کا شکار ہوئے۔کاریگروں اور بنکروں کو کم سے کم اجرت دی جاتی تھی اور ان کی تیار کردہ اشیاء کم قیمت پر فروخت کرنے کے لیے انہیں مجبور کیا جاتا۔اس کے سبب زرعی زمینوں پر

بوجھ میں اضافہ ہوا۔ برطانوی دور حکومت میں غربت کی ایک بڑی وجہ زرعی شعبے پر اضافی بوجھ بھی تھی جس کی وجہ سے دیہاتوں کا معاشی نظام بھی متاثر ہوا۔

13.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

برطانوی نوآبادیاتی حکومت کے سبب ہندوستان میں روایتی صنعت ختم ہوگئی۔ یہ بازار کی ضروریات کے مطابق، تیار کردہ مصنوعات کے انگلینڈ سے ہندوستان آنے کے سبب ہوا جس نے ہندوستانی دستکاروں اور کارخانہ داروں پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے۔ انیسویں صدی کے درمیانی عرصہ میں ہندوستان میں برطانوی استعماریت متعدد معاملات میں کامیاب تھی۔ جب کہ اس کی ترقی اور صنعتی انقلاب کی ایجادات نے ہندوستان کو تیار کنندہ ملک سے بدل کے خام مال برآمد کرنے والا ملک بنادیا تھا۔ یہ عدم صنعت کاری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہندوستانی دستکاری کی تباہی و بربادی کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ انیسویں صدی کے دوران درآمد شدہ مصنوعات پر برطانیہ کی نرخ کی پالیسی (Tarrif Policy) نے ہندوستان میں برطانوی مصنوعات کی توسیع میں کافی مدد کی۔ روایتی صنعت کاری اور زراعت کو انہوں نے نقصان پہنچایا اور عمومی زراعت کے طرف بڑھتے ہوئے رجحان کے سبب زرعی شعبے پر روزگار کی فراہمی کا بوجھ بڑھ گیا۔ ہندوستان جو یورپ کے لیے سوتی کپڑوں کی مصنوعات کا بڑا برآمد کنندہ ملک تھا اب برطانوی سوتی کپڑوں کا درآمد کنندہ اور زرعی خام مال کا برآمد کنندہ ملک بن گیا تھا۔

13.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

تجارتی تحفظ پسندی	:	اپنی ملکی تجارت کو بیرونی مصنوعات کے مقابلے میں چنگیوں کے ذریعے تحفظ دینا۔
درآمدات	:	(import) جو چیز ملک میں کہیں باہر سے آئے۔
برآمدات	:	(export) جو چیز ملک سے کہیں باہر جائے۔
بلین	:	سونا چاندی اور قیمتی پتھر
ادائیگی	:	(payment) تجارت میں کسی شے کی قدر کا مبادلہ
نرخ کی پالیسی	:	(Tarrif Policy) چنگی کی پالیسی، جو کسی چیز کی درآمد یا برآمد پر محصول لگا کر اپنائی جاتی ہے جس سے مقامی تجارت اور صنعت کو تحفظ دیا جاسکے۔

13.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ترکوں نے قسطنطنیہ پر کس سال میں قبضہ کیا؟
2. کرسٹوفر کولمبس نے 1492 میں کس ملک کو دریافت کیا تھا؟

3. ہندوستان میں سب سے آخر میں آنے والے یورپی کون تھے؟
4. 1759 کی چنسورا کی جنگ میں ڈچوں کو کس نے شکست دی؟
5. ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد کس سال میں پڑی؟
6. تجارتی تحفظ پسندی (Mercantilism) کی پالیسی سے کیا مراد ہے؟
7. درآمدات کسے کہتے ہیں؟
8. برآمدات کسے کہتے ہیں؟
9. بلین کسے کہتے ہیں؟
10. نرخ کی پالیسی(Tarrif Policy)سے کیا مراد ہے؟

13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. یوروپی ممالک مشرق کے لیے بحری راستہ کی تلاش میں کیوں تھے؟ واضح کیجیے۔
2. یوروپیوں کی ہندوستان کے ساتھ ابتدائی تجارت کی نوعیت کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
3. کمپنی کی حکومت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
4. تاج برطانیہ کی حکومت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
5. صنعت اور دستکاری کے زوال کے نتائج پر نوٹ لکھیے۔

13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے قیام پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. روایتی صنعتوں پر برطانوی نوآبادیاتی حکومت کے نتائج کا جائزہ لیجیے۔
3. کپڑے کی صنعت کے زوال پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

13.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Chandra, Bipan, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India*, Anamika Publishers & Distributors Pvt., Ltd., 2016.
3. Dalrymple, William, *The Anarchy*: *The East India Company*, *Corporate Violence*, *and the Pillage of an Empire*, Bloomsbury, London, 2019.
4. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press,

New Delhi, 2019.
5. Durant, Will, *The Case for India*, Standard Book Stall, Mumbai, 2007.
6. Kumar, Dharma, and Desai, Meghnad (eds.), *The Cambridge Economic History of India*, *Volume II*: *c.1757–2003*, Orient Longman, Hyderabad, 2005.
7. Tharoor, Shashi, *An Era of Darkness*: *The British Empire in India*, Aleph, New Delhi, 2016.
8. Roy, Tirthankar, *Traditional Industry in the Economy of Colonial India*, Cambridge University Press, 1999.
9. Roy, Tirthankar, *The East India Company*: *The World's Most Powerful Corporation*, Allen Lane/ Penguin, New Delhi, 2012.
10. Wilson, Jon, *India Conquered*: *Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon and Schuster, London and New Delhi, 2017.

اکائی 14۔ 18ویں اور 19ویں صدی میں ہندوستانی سماج

(Indian Society in the 18th and 19th Centuries)

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 ہندوستانی سماج

14.2.1 ذات پات

14.2.2 خواتین کی حالات

14.2.3 نومولود بچیوں کا قتل

14.2.4 کمسن یا بچپن کی شادی

14.2.5 ستی کا نظام

14.2.6 کثیر ازدواجی

14.2.7 مسلم سماجی نظام

14.3 اکتسابی نتائج

14.4 کلیدی الفاظ

14.5 نمونہ امتحانی سوالات

14.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید (Introduction)

ہندوستانی معاشرہ تبدیلی کے کئی ادوار سے گزرا ہے۔ روشنی اور تاریکی کی طویل تاریخ میں اگر ترقی، نشاۃ ثانیہ اور اصلاح کے ادوار آئے ہیں تو وہیں ہندوستانی معاشرہ کئی تنزلی اور بہت سی برائیوں کے ادوار سے بھی گزرا ہے۔ زیادہ تر مورخین اکثر ہندوستانی تاریخ میں اٹھارویں صدی کو غیر ملکیوں کی لوٹ مار، انارکی اور فتح کا دور قرار دیتے ہیں۔ کچھ جدید اسکالرز کی طرف سے اٹھارویں صدی کی خوشنما تصویر پیش کرنے کی کوششوں کے باوجود، جنوبی ایشیا کے بااثر مورخین کا ایک گروپ اب بھی اس بات پر زور دیتا ہے کہ اٹھارویں صدی جدید تاریخ کا "تاریک دور" تھا۔ پروفیسر این آر فاروقی کے مطابق وہ صدی جس نے شاہ ولی اللہ اور سید غلام علی آزاد بلگرامی جیسے علماء پیدا کیے، حافظ رحمت خان اور ٹیپو سلطان جیسے ہنر مند سیاست دان، شاہ کلیم اللہ شاہجہان آبادی اور مرزا مظہر جان جیسے نامور اور ممتاز صوفیاء کرام پیدا کیئے، مرزا محمد رفیع سودا، میر تقی میر اور غالب جیسے شاندار اور باصلاحیت شعراء، سراج الدین علی خاں آرزو، ٹیک چند بہار اور آنند رام مخلص جیسے ماہر لسانیات، لغت نویس اور مورخین کو جنم دیا، اسے تاریکی اور زوال پذیری کا دور کہنا غلط ہوگا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم پڑتا ہے کہ ہندوستانی اسلام کی تاریخ میں اٹھارویں صدی کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے۔ یہ سیاسی زوال کا دور تھا لیکن فکری قوت اور سماجی بیداری کا دور بھی تھا۔ یہ صدی طاقتور مغل سلطنت کے زوال کی گواہی کے لیے بدنام ہے لیکن اسے ایک سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریک کو جنم دینے کا سہرا بھی دیا جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس عہد کا ہندوستانی معاشرہ بالخصوص ہندو سماج بہت سی سماجی برائیوں میں پھنسا ہوا تھا جن میں ذات پات، اچھوت پرستی، پردہ داری، تعدد ازدواج، ستی کا نظام، جہیز، بیوہ کی دوبارہ شادی، انسانی قربانی، بچیوں کا قتل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ہندوستانی سماج کی ترقی میں وہ سب سماجی برائیاں مضبوط دیوار کے طور پر موجود تھے۔ اور ان کے کچھ اثرات ہندوستانی مسلم سماج میں بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ مسلم سماج میں کچھ ایسے سماجی خلفسار کا بھی ظہور ہوا جن کا تعلق غیر مسلموں کے رسم ورواج سے تھا۔ اس دور کے عظیم مذہبی رہنما اور سماجی مصلح شاہ ولی اللہ نے اپنی آخری وصیت میں اپنے اصحاب کی توجہ اس طرف کروائی تھی، جن میں دوبارہ شادی پر پابندی، شادی اور موت سے جڑی مہنگی رسومات، جہیز، اور بھاری مقدار میں مہر مقرر کرنا وغیرہ شامل تھا جو اٹھارویں اور انیسویں صدی تک ہندوستانی مسلم سماج کا ایک لازمی حصہ بن چکا تھا۔ اسی پس منظر میں ہم اٹھارویں اور انیسویں صدی کے سماجی حالات کا مطالعہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

14.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- 18 ویں اور 19 ویں صدی کے سماج اور ذات پات کے نظام کو سمجھ سکیں گے۔
- خواتین کی دگرگوں حالت کو سمجھ سکیں گے، خاص طور پر سماجی اور مذہبی برائیوں جیسے کہ ستی کی رسم، بچپن کی شادی، نوزائیدہ قتل، تعدد ازدواج وغیرہ کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ان کے علاوہ ہم سماج کی ایک بہت اہم برائی کو سمجھ سکیں گے، جس کا تعلق دلت طبقے سے تھا اور جسے ہم اچھوت کے نام سے جانتے ہیں جو دلت طبقے کے ہزاروں سال سے ہو رہے استحصال کو سمجھنے میں ہماری نئی سمجھ قائم ہو گی۔

- ان کے علاوہ ہم بت پرستی اور ہندومت کے اثر کی وجہ سے مسلمانوں میں شامل چند اہم برائیوں اور بدعتوں کو جانیں گے۔

14.2 ہندوستانی سماج (Indian Society)

19ویں صدی کا ہندوستانی معاشرہ مکمل طور پر مذہبی توہمات میں پھنسا ہوا تھا اور اس کی وجہ سے سماجی اصلاح کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ میکس ویبر نے لکھا ہے کہ ہندوازم دراصل جادو، توہم پرستی اور روحانیت کا مرکب بن کر رہ گیا تھا۔ خدا کی عبادت کی جگہ جانوروں کی قربانی اور جسمانی مشقت جیسے گھناؤنے عمل شروع ہوگئے تھے۔ پجاریوں اور مذہبی رہنماؤں کا عوامی ذہن پر زبردست تسلط تھا۔ بت پرستی اور شرک نے پجاریوں اور مذہبی رہنماؤں کے اس تسلط کو برقرار رکھنے میں مزید مدد کی۔ اور تمام روحانی علوم پر اُن کی بالادستی تھی اور مذہبی رسوم و رواج کی من مانی تشریح کیا کرتے تھے۔ راجہ رام موہن رائے کے مطابق ان پجاریوں نے مذہب کو دھوکہ دہی اور منافقت کے نظام میں تبدیل کر دیا تھا۔ مذہبی لوگ نہ صرف غیر مرئی اور قادر مطلق خدا کو اعلیٰ تصور کرتے تھے بلکہ ان پجاریوں کی خواہشات اور احکامات کو بھی خدائی احکامات سمجھ کر تعلیم خم کرتے تھی۔ کوئی ایسا کام نہیں تھا جو مذہب کے نام پر لوگوں سے نہ کرایا جا سکتا تھا۔ صورتحال ایسی تھی کہ پجاریوں کی جنسی تسکین کے لیے عورتیں خود اپنے آپ کو ان پجاریوں اور مذہبی رہنماؤں کے حوالے کر دیا کرتی تھی۔

14.2.1 ذات پات کا نظام (Caste System)

ہندو سماج ورن نظام پر مبنی تھا لیکن ان کے علاوہ بھی بے شمار ذاتیں سماج میں موجود تھیں۔ اگرچہ ذات پات رگ ویدک سماج کا حصہ نہیں تھی، لیکن یہ یقینی طور پر ہندومت کی طرح پرانی ضرور تھی۔ ذات پات کے ان نظاموں میں کبھی سختی اور کبھی سخاوت کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایک وقت تھا جب ہندو سماج کی ذاتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں، یہاں تک کہ کسی برہمن پر چنڈال کا سایہ پڑنا بھی مکروہ فعل سمجھا جاتا تھا۔ اور کبھی کبھی بھکتی سنتوں کی کوششوں کے نتیجے میں برہمنوں اور چنڈالوں کو گلے لگاتے دیکھا گیا۔ سولھویں صدی کے ہندوستان میں چیتنیا اور بھکتی راہ کی تعلیمات کے دنوں میں، ذات پات کے نظام کی سختی بہت نرم ہوگئی تھی اور خدا کو ذاتی عقیدے اور بھکتی عقیدت کے ذریعے شودروں کے قریب لایا گیا تھا۔ لیکن اٹھارویں صدی میں سماج کی اخلاقی قدریں سولھویں صدی کی اقدار کے بالکل برعکس ہو چکی تھیں۔ 19ویں صدی میں ذات پات کے نظام کو آزاد کرنے اور مذہبی سرگرمیوں کو معقول بنانے کے لیے اصلاحی تحریکیں شروع کی گئیں۔ چونکہ 18ویں صدی میں ایسی کوئی ترقی پسند تحریک نہیں تھیں (مسلم سماج میں کچھ خصوصی اصلاحی تحریک شاہ ولی اللہ جیسے دیگر علماء اور صوفیاء اکرام نے شروع کر دی تھی)، اس لیے اس دور میں ذات پات کی تفریق اپنے عروج پر تھی اور اس دور میں ذات پات کا نظام سب سے زیادہ سخت تھا۔

یقین سے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس دور کے سماج میں کتنی ذاتیں اور ذیلی ذاتیں موجود تھیں۔ بعض قیاس کے مطابق دو سے تین ہزار ذاتیں اور ذیلی ذاتیں اس وقت موجود رہی ہوں گی۔ اس ذات پات کے نظام کی سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ معاشرہ کئی متعین اور غیر امتیازی طبقات میں بٹا ہوا تھا، جس کی وجہ سے سماج میں اتحاد کا فقدان نظر آتا ہے اور جس کی وجہ سے ہندوستان کو بہت سے برے اور شدید نتائج بھگتنے پڑے تھے۔ 18ویں صدی سے پہلے، ایک فرانسیسی سیاح Tavernier نے ذات پات کے نظام کا تجزیہ کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے،

'ہندوستان میں بت پرستوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ایک مسلمان کے تناسب میں اُن کی تعداد پانچ یا چھ ہے۔ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ اتنی بڑی آبادی ہونے کے باوجود کس طرح تھوڑے سے لوگوں (مسلمانوں) کو اپنے اوپر حکومت کرنے دیا اور یہ حیرت اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان بت پرستوں میں اتحاد کا فقدان تھا اور ان کے ضعیف الاتقادی کی وجہ سے بہت سے عجیب وغریب اور مختلف عقائد، طرز عمل سماج میں عروج پا چکے تھے، جس کی وجہ سے وہ کبھی بھی ایک دوسرے سے متفق نہیں ہو پاتے تھے۔'

ذات پات کے نظام کی خوبیاں یا خامیاں جو بھی رہیں ہوں، وہ کسی نہ کسی سماجی رسمیت پر مبنی تھیں۔ اعلیٰ طبقے سے لے کر ادنی طبقے تک سب اس نظام میں شامل تھے۔ اعلیٰ ذات کے لوگوں کو خدا کے قریبی کے طور پر سمجھا جاتا تھا اور دوسرے لوگوں کی طرف سے ان کی بہت زیادہ عزت کی جاتی تھی، اور نچلی ذات کے لوگوں کو اتنا زیادہ قابل مذمت سمجھا جاتا تھا کہ انہیں دوسرے طبقوں سے بالکل الگ رہنا پڑتا تھا۔ اونچے اور نچلے طبقے کے درمیان اور بھی بہت سے طبقے یا ذاتیں تھی جو اپنی اپنی ذاتوں کے پیشوں کے حساب سے تقسیم تھیں۔ ایسے نظام میں انسان کی زندگی اور روزی کمانے کا کاروبار اس کے پیدا ہوتے ہی طے ہو جاتا تھا، خواہ اس کا فطری خصوصیات کچھ بھی ہو۔ اس طرح اگر کوئی بے وقوف یا کمتر شخص برہمن گھرانے میں پیدا ہوتا تھا تو معاشرہ اسے بہت پرہیزگار اور عالم سمجھتا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ صحیفوں اور قوانین کا ماہرین ہے۔ جب کہ شودر گھرانے میں پیدا ہونے والے انتہائی باصلاحیت اور ذہین شخص کو سماج سے پہچان حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا اور معاشرہ اسے دھوبی، دلت یا فضلہ اکٹھا کرنے والے سے بڑھ کر نہیں سمجھتا تھا۔ بین ذاتی شادی تقریباً ناممکن ہو چکی تھی۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ کھانا پینا بھی ممنوع تھا۔ یہاں تک کہ کئی ذاتیں ایسی تھیں جن کے ہاتھ سے پانی پینا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ ان پابندیوں کو اس قدر سختی سے نافذ کیا گیا تھا کہ اگر کوئی ان کی خلاف ورزی کرتا ہے، خواہ انجانے میں، اسے معاشرتی بے راہ روی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لوگوں میں ذات سے باہر نکالے جانے کا بڑا خوف رہتا تھا۔ اٹھارویں صدی میں ذات پات کے نظام کو سماج کا کوئی بڑا مسئلہ نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن اٹھارویں صدی میں ذات پات یورپیوں کی نظر میں ایک ذلت آمیز نظام تھا۔

'اچھوت' (The 'Untouchables')

اگر ذات صرف کام کی تقسیم کا ایک معاشی نظام ہوتا تو اسے فائدہ مند سمجھ کر جائز قرار دیا جا سکتا تھا۔ لیکن معاشرہ دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا، ایک چھونے والا یا چھوت اور دوسرا اچھوت۔ یہ تقسیم انتہائی متضاد تھی۔ مختلف مذاہب اور پیغمبروں کی طرف سے انسانوں کی مساوات کی تمام تعلیمات اس دور میں ہندوستان کے تناظر میں بے معنی ہو چکی تھیں۔ اچھوت کا نظام اپنے آپ میں سماجی عدم مساوات کی سب سے بڑی مثال تھا، لیکن اس سے بڑی بات یہ تھی کہ اس عدم مساوات کے ساتھ ناانصافی کا مسئلہ جڑا ہوا تھا۔ اچھوت طبقے کے لوگ زندگی کے بنیادی حقوق سے بھی محروم تھے۔ وہ ان تالابوں، کنویں، دھرم شالوں یا اسکولوں کو استعمال نہیں کر سکتے تھے جو اعلیٰ طبقے یا اونچی ذات کے ہندوؤں کے لیے تھے۔ اچھوت طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے عبادت گاہوں یا عوامی مقامات پر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ 18 ویں صدی کے سماج میں اچھوت اپنی مکمل شکل میں قائم ہو چکا تھا۔ وہ ہندوستان میں سماجی عدم مساوات کا آخری سب سے بڑا دور تھا۔ ایک طرح سے اچھوت کی وجہ سے شودر کو انسان کا درجہ بھی حاصل نہیں تھا۔ 18 ویں صدی کے بعد کی صدیوں میں، مغربی نظریات کے اثر اور سماجی و

مذہبی اصلاحی تحریکوں کے عروج کے ساتھ، ذات پرستی پر تنقید اور مؤثر طریقے سے مذمت کی گئی، جس کے نتیجے میں اچھوت کی سختی میں کچھ نرمی آئی۔ لیکن ان اصلاحی تحریکوں کے باوجود انیسویں صدی میں ذات پات سے متعلق عدم فعالیت جاری رہی اور اچھوت طبقے کی حالت میں کوئی خاص بہتری نہیں دیکھنے کو ملتی۔

14.2.2 خواتین کی حالات (Conditions of Women)

اس وقت سماج میں خواتین کی حالت انتہائی قابل رحم تھی۔ لڑکی کی پیدائش کو انتہائی بدقسمتی سمجھا جاتا تھا، اس کی شادی کو بوجھ سمجھا جاتا تھا اور بیوہ ہونے پر کوئی انہیں پوچھتا تک نہیں تھا۔ کئی علاقوں میں صورتحال ایسی تھی کہ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جاتا تھا۔ اور اگر کسی طرح لڑکی بچ بھی جاتی تو اسے بچپن کی شادی کے اذیت کا سامنا کرنا پڑتا۔ سماجی بے عزتی سے بچنے کے لیے لڑکی کی شادی کسی نہ کسی طرح طے کر دی جاتی تھی یا کسی عمر دراز سے شادی کر دی جاتی تھی۔ اس طرح شادی لڑکی کے لیے کوئی خوشگوار تجربہ نہیں تھا۔ ان سب کے باوجود جب اس کے شوہر کی موت ہوتی تو سماج نے اسے ستی ہونے کے لیئے مجبور کیا۔ اگر کوئی عورت ستی ہونے سے بچ بھی جاتی ہو تب بھی اسے زندگی بھر بیوہ پن کی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں یعنی ذلت، حقارت، نظراندازی، مصیبتوں کے پہاڑوں کی زندگی وغیرہ۔

14.2.3 نومولود بچیوں کا قتل (Infanticide)

لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کرنا کوئی عام رواج نہیں تھا۔ لیکن اس کا سب سے برا پہلو یہ تھا کہ اس قسم کا کام چھپ کر کیا جاتا تھا۔ کچھ علاقوں میں، امیر اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں بچیوں کو قتل کرنا زیادہ عام تھا۔ 1789ء میں ان دنوں بنارس کے برطانوی آفیسر جوناتھن ڈنکن نے وہاں کے شہزادوں میں یہ رواج دریافت کیا۔ یہ رواج کاٹھیاواڑہ اور کچ کی جڈیجا برادری میں بھی پایا جاتا تھا۔ بعد کے زمانے میں دیکھا گیا کہ یہ رواج الہ آباد کے قریب کچواہا راجپوتوں میں بھی رائج تھا۔ پنجاب میں لڑکیوں کا قتل عام تھا۔ پنجاب کے راجہ دلیپ نے خود اپنی بہنوں کو پیدا ہوتے ہی قتل ہوتے دیکھا تھا۔ جالندھر کے بیدی لوگوں نے اس پر اس قدر سختی سے عمل کیا کہ اگر ان میں سے کوئی کسی لڑکی کو زندہ رکھتا تو اسے ذات سے باہر نکال دیا جاتا۔ یہ رواج راٹ قبیلے کے کچھ مسلمانوں میں بھی رائج تھا۔

نومولود بچیوں کو قتل کرنے کی وجوہات مختلف تھیں۔ چوہانوں کے درمیان، یہ بنیادی طور پر اقتصادی وجوہات کی وجہ سے تھا، جس پر جاہلانہ غرور کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی بیٹیوں کو مارتے تھے کیونکہ لڑکیوں کی شادی پر بھاری رقم خرچ کرنی پڑتی تھی۔ بیدیوں کے لیے یہ سماجی فخر کی بات تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو اپنی ذات سے کم ذات کو نہ دیں۔ اس مشق کا حکم سب سے پہلے گرونانک کے پوتے دھرم چندر بیدی نے دیا تھا۔ ایک دفعہ غصے میں آکر انہوں نے ایسے حکم دیے اور بعد میں اس توہم پرستی نے زور پکڑ لیا اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک سماجی رواج بن گیا۔ منھا راجپوت اپنی ذات کی پاکیزگی برقرار رکھنے کے لیے بچیوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیتے تھے۔

یہ رواج خواہ غرور سے پیدا ہوا ہو یا غربت، توہم پرستی یا جہالت سے، یہ ایک سنگین جرم تھا۔ اس طرز عمل کو برداشت کرنے والا معاشرہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس دور کا معاشرہ کس حد تک تنزلی کا شکار تھا۔ لڑکیوں کو جس طریقے سے مارا گیا وہ انتہائی وحشیانہ تھا۔ بہت سی

جگہوں پر لڑکیوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کے منہ میں گائے کا گوبر بھر دیا جاتا تھا یا ان کے سر کو گائے کے دودھ میں ڈبو دیا جاتا تھا یا ان کے گلے میں نال باندھ کر فوراً مار دیا جاتا تھا۔ کچھ اور مقامات پر نو مولود بچے کو گڑھے میں زندہ دفن کر دیا گیا۔ دوسرا طریقہ لڑکی کے منہ میں افیون کی گولی رکھ کر مار دیا جاتا تھا۔ ایسے بہت سے وحشیانہ طریقے تھے جو مہذب سماج میں ناقابل برداشت ہیں۔

14.2.4 کمسن یا بچپن کی شادی (The Practice of Child Marriage)

دوسرا مسئلہ بچوں کی شادی سے متعلق تھا۔ قدیم ہندوستان میں ایک وقت تھا جب لڑکیاں اپنی ذہانت کا صحیح استعمال کر لینے کے بعد انہیں اپنے شوہر کا انتخاب کرنے کا حق دیا جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ سماج میں خواتین کی شادی بہت کم عمر میں کر دی جانے لگی۔ منوا سمرتی میں لڑکیوں کی شادی کی عمر 12 سال یا اس سے بھی کم 8 سال مقرر کی گئی تھی۔ رفتہ رفتہ بہت چھوٹی عمر میں شادی کرنے کا رواج عام ہو گیا۔ مختلف سماجی وجوہات نے اس رواج کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہاں کے موسم کے اثرات کے مطابق سماجی نظام کو منظم کیا گیا۔ گرم آب و ہوا والے علاقوں میں، جسمانی نشو و نما تیزی سے ہوتی ہے اور معاشرہ، اپنے اخلاقی معیارات کو برقرار رکھنے کی فکر میں، بچوں کی کنواری کو خصوصی اہمیت دیتا ہے۔ شادی کی عمر سے پہلے بچوں کی شادی کر کے لوگوں کو یقین دلایا جاتا تھا کہ سماج کی اخلاقی پاکیزگی برقرار رہے گی۔ اس کے علاوہ کچھ معاشی وجوہات بھی تھیں۔ غریب لوگوں کے لیے لڑکی اپنے والدین پر بوجھ تھی، جب کہ وہ اپنے شوہر کے خاندان کے لیے مفید تھی کیونکہ اسے باورچی خانے کا انتظام کرنا تھا۔ ہندو مشترکہ خاندانی نظام بھی کم عمری کی شادی کی حوصلہ افزائی کا کم ذمہ دار نہیں تھا۔ دادا دادی یا بزرگوں کی یہ خواہش رہتی تھی کہ وہ اپنے زندہ رہتے ہی پوتے پوتیوں کو شادی شدہ دیکھیں۔

بہر حال وجہ کچھ بھی ہو، اٹھارویں صدی تک کم عمری کی شادی جیسی برائی سماج میں سرائیت کر چکی تھی۔ یہ رواج ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر رائج تھا۔ آبادی میں اضافہ اور خواتین کی صحت میں بگاڑ بیک وقت جاری رہا۔ چھوٹی عمر میں ماں بن جانا، کمزوری، کمزور بچوں سے گھرا رہنا وغیرہ کچھ ایسے حالات تھے جو ہندوستانی خواتین کی حالت زار اور مصائب کی زندہ تصویر بن چکے تھے۔ کمسن کی شادی سے بہت سی دوسری سماجی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ سماج کے نچلے ترین اور علم سے محروم طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں والدین اپنی مالی حالت کے مطابق لڑکیوں کو ایسے لوگوں کو دلہن بنا کر بیچ دیتے تھے جو ان کی مانگ پوری کر سکیں۔ مثال کے طور پر بنگال کے ایک اسی سالہ برہمن کی تقریباً دو سو بیویاں تھیں اور اس کی سب سے چھوٹی بیوی کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔ اسی طرح، ہمیں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ سوامی وویکانند کے روحانی گرو 23 سالہ رام کرشنا پرمہنس کی شادی کے وقت ان کی اہلیہ شارادادیوی کی عمر صرف پانچ سال تھی۔ دولہا یا ان کے سرپرست دلہنوں کو خریدنے کے لیے قرض میں ڈوب جاتے تھے۔ دولہا اور دلہن کے درمیان عمر کے فرق پر کوئی غور نہیں کیا گیا۔ کم عمری کی شادی سے پیدا ہونے والی سب سے بڑی برائی چائلڈ بیواؤں کی بڑھتی ہوئی تعداد تھی۔ ان چھوٹی بچیوں کے پاس زندہ رہنے کا کوئی مالی ذریعہ نہیں تھا، انہیں اپنے قریبی رشتہ داروں سے کوئی دلار و ہمدردی نہیں ملتی تھی اور انہیں ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ بیوائیں کسی نہ کسی طرح سماجی بدنامی اور توہم پرستی کے ماحول میں اپنی زندگی گزار رہی تھیں۔ سماج کے اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والی کچھ بیواؤں نے اس حالت زار سے چھٹکارا پانے کے لیے ستی یا خود سوزی کا سہارا لیا۔

14.2.5 ستی کا نظام (The Practice of Sati)

بہت سے متضاد سماجی رسوم ورواج میں، سب سے زیادہ غیر فطری تھا ستی کا رواج یا ہندو بیوہ کو اس کے مردہ شوہر کی آخری رسومات (چتا) پر جلانا۔ یہ رواج قدیم زمانے سے ہندو سماج کا اٹوٹ حصہ بن چکا تھا۔ یہ اب بھی ایک معمہ ہے کہ ستی کا رواج کیسے شروع ہوا۔ اس کا پہلا کتباتی ثبوت گپت حکمراں بھانو گپت کے ایرن نوشتہ سے ملتا ہے، جس میں اس کے کمانڈر گوپراج کی موت کے بعد، اس کی بیوی نے ستی کا ارتکاب کیا۔ عہد وسطیٰ کے کئی حکمرانوں نے اس پر پابندی لگانے کی ناکام کوشش کی۔ پرتگالی پہلے یورپی تھے جنہوں نے اس برائی پر پابندی لگانے کی کوشش کی۔ سیرام پور کے ڈینش لوگ، چنسورہ کے ڈچ لوگ اور چندر نگر کے فرانسیسیوں نے اپنے اپنے علاقوں میں ستی کی رسم کو جاری نہیں رہنے دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں نے اپنے علاقوں میں اس رواج کو روکنے کی کوشش کی۔ دوسری جگہوں پر برطانوی حکمرانوں نے ہندوؤں میں عدم اطمینان کے خوف سے اس طرز عمل کے بارے میں انتہائی نرم رویہ رکھا۔

گیارھویں صدی میں البیرونی نے ستی کے رواج کے حوالے سے یہ تفصیل دی ہے: "اگر کسی ہندو بیوی کا شوہر مر جائے تو وہ کسی دوسرے شخص سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس کے پاس صرف دو ہی راستہ تھا کہ وہ یا تو زندگی بھر بیوہ رہے یا خودکشی (ستی) کر لے، اور خود سوزی کو مطلوب سمجھا جاتا تھا کیونکہ بیوہ ہونے کے ناطے اسے زندگی بھر نا قابل برداشت زیادتی کا سامنا کرنا پڑتا تھا"۔ توہم پرستی کا مقصد جس کی وجہ سے ایک بیوہ اپنی مرضی سے مرنا چاہتی تھی یا اس کے قریبی رشتہ دار اسے جلانا چاہتے تھے اسے سولہویں صدی کے ہندو کتابوں کے مصنف رگھونندن نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے: "بیوہ کو چتا (ہندو مردہ کو آگ میں جلنے کا رسوم) میں داخل ہونے سے پہلے یہ الفاظ کہنے پڑتے تھے: میں، اروندھتی کی طرح، جنت کی شان حاصل کرنے کی، بے پناہ امن کے خطوں میں گھومنے کی خواہش رکھتی ہوں، اپنے شوہر کے ساتھ اتنے سال رہوں گی جتنے انسانی جسم پر بال ہوتے ہیں، اپنے ماں باپ اور سسر کے تینوں خاندانوں کی پاکیزگی کے لیے، جب تک 14 اندرا موجود ہیں تب تک اپسراوں سے تعریف حاصل کرنے کے لیے، میرے شوہر کو اس کے گناہوں سے نجات دلانے کے لیے، میں رضاکارانہ طور پر اپنے شوہر کے چتا میں داخل ہوتی ہوں"۔

یہ جنت کے حصول کی امید تھی جس نے دراصل بیواؤں کو اس انتہائی اذیت سے گزرنے کی ترغیب دی۔ توہم پرستی کی وجہ سے باپ اپنی بیٹیوں کو شوہر کی چتا پر بیٹھنے پر مجبور کرتے تھے۔ بیٹے اپنی بوڑھی ماؤں کو ستی قربانی کے لیے اکساتے تھے۔ کچھ خواتین ستی کرنے پر آمادہ تھے، لیکن بہت سی بیواؤں کے لیے آگ میں جل کر مرنا ایک خوفناک اذیت رہا ہوگا۔ سماج میں انہیں تقریباً زبردستی خود سوزی پر مجبور کیا جاتا رہا ہوگا۔

ستی کے رواج کے خلاف مہم اٹھارہویں صدی کی آخری سہ ماہی میں انگریزوں کے زیر تسلط علاقوں میں شروع ہوئی۔ اس کا آغاز عیسائی مشنریوں نے کیا تھا۔ لیکن راجا رام موہن رائے اور ولیم بینٹک کی کوششوں سے 1829ء میں ستی کے خلاف قانون لایا گیا اور ستی کو قانونی جرم قرار دیا گیا۔

14.2.6 کثیر ازدواجی (Polygamy)

کثیر ازدواج ایک پرانی سماجی برائی تھی، جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں موجود تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس برائی نے تمام حدیں پار کر دیں۔ تعدد ازدواج کا رواج بنیادی طور پر سماج کے امیر اور اعلیٰ طبقے تک محدود تھا۔ اپنی دولت اور خوشحالی کے ساتھ، امیر لوگ تعدد ازدواج اور دیگر زنا کے متحمل کے اخراجات اٹھا سکتے تھے۔ حرم بنانے اور بہت سی بیویاں رکھنے میں کوئی شرم وحیا کی بات نہیں تھی، بلکہ اگر کوئی ایسا کر سکتا تھا تو اسے اس کے لیے فخر اور سماجی وقار کی بات سمجھا جاتا تھا۔ 18ویں صدی میں کثیر ازدواج بنگال میں سب سے زیادہ رائج تھا اور وہ بھی برہمنوں کے اعلیٰ طبقوں میں۔ بپن چندر نے بنگال کے ایک اسی سالہ برہمن کی تقریباً دو سو بیویوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک امیر ایک ہی دن میں دو، تین یا چار عورتوں سے بھی شادی کر سکتا ہتھا، اپنی زندگی میں درجنوں بیویاں رکھ سکتا تھا، یہاں تک کہ سو بیویاں بھی رکھ سکتا تھا۔ اشرافیہ کے لیے شادی کی عمر کی کوئی عمر کی حد نہیں تھی، وہ کسی بھی عمر میں شادی کر سکتا تھا۔ اسی طرح کسی شخص کی دلہن بھی بہت چھوٹی سی چھوٹی عمر کی ہو سکتی تھی۔ اس سے بھی بدتر یہ رواج یہ تھا کہ ایک امیر شوہر کو اپنی بہت سی بیویوں کی کفالت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ نام نہاد بیویاں اپنے والدین کے گھروں میں رہتی تھیں اور بعض اوقات شوہران بدقسمت سسرال والوں سے کچھ پیسے بھی بٹورتا تھا۔ اس قسم کی مشق کے نتائج سنگین تھے۔ اس سے سماجی بے حیائی اور زنا کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ ہندوؤں میں تعدد ازدواج کی وجہ سے پردہ کا رواج اور بھی سخت ہو گیا۔ اس کی صرف اچھی بات یہ تھی کہ یہ رواج عام لوگوں میں رائج نہیں تھا۔

14.2.7 مسلم سماجی نظام (Muslim Social System)

ہندو مذہب کے علاوہ مسلم کمیونٹی بھی ہندوستانی سماج کا ایک اٹوٹ حصہ تھی۔ سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ ان کے سماجی زوال کے کئی عناصر بھی نظر آتے ہیں۔ ایک وہ دور تھا جب مسلمانوں اور عربوں کے علم سے پوری دنیا استفادہ حاصل کی تھی لیکن اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں لوگوں کے رجحان سائنسی اور منطق علم سے دور ہوتے چلے گئے۔ شروعاتی جتنے بھی مصلحین آئے سبھی کا زور قرآن اور احادیث تک ہی محدود رہا۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی زبان کی مخالفت کی گئی۔ جن لوگوں نے اس جدید علم اور تعلیم کی حمایت بھی کی تو انکا پر جوش طریقے سے مخالفت ہوئی اور اُن پر بے شمار فتوے لگائے گئے۔ سر سیّد احمد خان اسکے اوّلین مثالوں میں سے ایک ہے جنہوں ایسے لاتعداد مشکلوں کا سامنا کیا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم سماج جدید علم سے بہت دور ہوتا چلا گیا جو مسلم سماج میں گرواٹ کی ایک خاص وجہ رہی۔ لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ پورا ہندوستان میں علم کا زوال ہو چکا تھا، کئی ایسے مدارس اور علم کے مرکز تھے قرآن اور احادیث کے علاوہ علم کے مختلف شعبہ میں تعاون کا کم بخوبی انجام دیا تھا۔ ایسے مراکز میں رحیمیہ مدرسہ، شاہ کلیم اللہ کے کا مدرسہ اور فرنگی محل کا نام قابل ذکر ہیں۔ انکے علاوہ ہندوستانی مسلم سماج میں دیگر بہت سی سماجی برائیاں موجود تھیں۔ ان میں کچھ ایسی معاشرتی برائیاں بھی تھیں جو ہندو مذہب کے اثرات سے مسلم سماج کا اٹوٹ حصہ بن گئی تھیں جن میں شرک اور بدعت کا ذکر بنیادی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ اٹھارویں صدی کے سماجی مصلحین کی کاوشیں جن میں شاہ ولی اللہ، سید احمد رائے بریلوی جیسی عظیم شخصیات شامل تھیں، اُن کی تعلیمات اور اصلاحات اس دور کی بہت سی سماجی برائیوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر بہت سی معاشرتی برائیاں جیسے بیواؤں کی دوبارہ شادی اور حج کی

ممانعت، پیری مریدی وغیرہ مسلم سماج میں شامل ہو چکی تھیں۔

سید احمد رائے بریلی کی ملفوظات، سیرت مستقیم کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے تو دوسرا باب ان کی طرف سے چلائی گئی اصلاحی تحریک کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ سیّد احمد نے خاص طور پر تین نکات کو دور کرنے کی کوشش کی جو مسلم سماج کی اخلاقی اور مذہبی نوعیت پر کافی منفی اثرات ڈال رہے تھے اور ان کے مطابق ان برائیوں کا فوری خاتمہ ضروری تھا۔ اُنہوں نے ان سماجی برائیوں پر سخت حملہ کیا۔ یے تصوف سے جڑی مروجہ روایات، شیعہ فرقے سے متعلق رسومات اور ہندوؤں سے لی گئی مختلف رسومات تھیں۔ 18 ویں صدی میں سید احمد رائے بریلوی کے علاوہ 19 ویں صدی میں سر سید احمد خان وغیرہ جیسے مصلحین نے ان صوفیاء پر کڑی تنقید اور مذمت کی جو دنیاوی فائدے کے لیے سیرتِ مستقیم سے ہٹ گئے تھے۔ اور انہیں صوفیاء کے بھیس میں چھپا ہوا ملحد اور بدعتی کہنے سے گریز نہیں کیا۔ انہوں نے ان صوفیاء کے وضع کردہ پیر مریدی کے طریقوں پر اعتراض کیا جس میں پیر کی حد سے زیادہ اور بے جا تعظیم کی جاتی تھی۔ سید احمد کو یقین تھا کہ پیر کے احکام کی آنکھ بند کر کے پیروی کرنا، پیر کے پاس خدا سے دعا کرنے کی طاقت پر یقین رکھنا، مصیبت کے وقت اُن کے پاس مدد کے لیے جانا، اُن کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھنا، بچے کی پیدائش اور عہدے حاصل کرنے جیسی دنیاوی خواہشات کی تکمیل کے لیے اس سے مدد مانگنا، دولت حاصل کرنے، بیماریوں کا علاج وغیرہ کے لیئے اُن پر حد سے زیادہ یقین رکھنا، ایمان کے کمزوری کی نشانی ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ سید احمد بریلوی تصوف یا ہندوستانی صوفی روایت کا احترام نہیں کرتے تھے۔ وہ خود ایک صوفی تھے اور ان کے لاتعداد شاگرد تھے۔ انہیں قبروں سے متعلق نئے تجربات اور زیادتیوں سے گریز تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ صوفی بزرگ کے مقبرے کی زیارت کے اپنے فائدے ہیں لیکن اسے ایک رواج بنانے سے مسلمان لوگوں پر بہت تباہ کن اثر پڑتا ہے اس لیے اسے ترک کر دینا مسلمانوں کے حق میں زیادہ فائدہ کن ہے۔

اسی طرح سیرت مستقیم اس وقت کی بہت سی دوسری سماجی اور مذہبی برائیوں پر روشنی ڈالتی ہے جو مسلمانوں کی زندگیوں میں شامل ہو چکی تھیں۔ سیّد احمد نے کہا کہ محرم میں تعزیہ بنانا، انتہائی عقیدت اور جوش وجذبے کے ساتھ سڑکوں پر لے جا کر گھمانا یہ بت پرستی اور امام حسین کو خدا کا درجہ دینے کے مترادف ہے۔ اس لیے تعزیوں کو تباہ کرنا اس کے اور اس کے پیروکاروں کے درمیان ایک اہم کام بن چکا تھا۔ تعزیہ سے متعلق ایسے بہت سے واقعات رونما ہوئے جن میں تعزیہ جلایا گیا اور محرم کی تقریبات کو زبردستی روک دیا گیا۔ اس کے علاوہ مسلم سماج میں ہندو سماج سے متعلق بہت سی برائیاں بھی حملہ آور ہوئیں، مثلاً ہندوؤں کی زیارت گاہوں پر جانا، ہندو دیوتاؤں جیسے سیتلا، مسان، کلمہ بیر اور دیگر دیوتاؤں کی پوجا کرنا، ہولی اور دیوالی جیسے ہندو تہوار منانا، برہمن سے کوئی نیا کام شروع کرنے کے لیے مشورہ لینا، کسی الدیوی دیوتا کی تعظیم میں ناک اور کان چھیدنا، یوگیوں کی تقلید میں سر کے بال اور داڑھی منڈوانا وغیرہ رسمیں مسلمانوں میں کافی مشہور ہو چکی تھیں۔ اسی طرح بیواؤں کے خلاف تعصب، ذات پات کی تفریق، ماتم اور دیگر خشیوں کے وقت اور تہوار کی تقریبات پر بے جا خرچ جس کا معاشی بوجھ جسے صرف چند لوگ ہی اٹھا سکتے تھے، ایسے غیر اسلامی طرز عمل سے مسلمان خاندانوں میں طرح طرح کے اخلاقی اور معاشرتی مسائل پیدا ہونے لگے تھے۔ مثلاً دولت کی کمی کی وجہ سے لڑکوں کے ختنے اور لڑکیوں کی شادی میں غیر ضروری تاخیر ہوئی اور اُن کے والدین ان ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے عموماً اپنا گھر بار بیچ دیتے تھے۔ 19 ویں صدی کی ایک اور کتاب جو شاہ محمد اسماعیل کی تقویۃالایمان کے نام سے مشہور

ہے،اسی طرح کی اہم برائیوں پر خصوصی روشنی ڈالتی ہے۔

14.3 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد، ہم دیکھتے ہیں کہ 18 ویں اور 19 ویں صدی کا ہندوستانی معاشرہ، خاص طور پر ہندو سماج، بہت سے مختلف طبقات میں بٹا ہوا تھا۔ ہزاروں قسم کی ذاتیں موجود تھیں۔ سماج میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے معاشرہ انتہائی پسماندہ ہو چکا تھا اور اس وقت کے برہمنوں اور پجاریوں کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ اپنی ویدک تعلیمات کو بھلا کر ہندو مذہب مختلف سماجی برائیوں کی لپیٹ میں آ گیا، جن میں ستی، ذات پرستی، بچوں کی شادی، بیواؤں کی شادی پر پابندی، مردانہ قربانی، نوزائیدہ قتل وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مسلم معاشرہ میں کئی قسم کی معاشرتی برائیاں پیدا ہو چکی تھیں جن کا ایک حصہ تعلیم کی کمی اور ایک حد تک ہندو مذہب کے اثرات کی وجہ سے مسلم سماج میں بہت سے نئے نظریات اور طرز عمل پھیل چکے تھے۔ لیکن انگریزوں کے اس نقطہ نظر کو جس میں اٹھارویں صدی کو تاریکی کا دور کہا گیا ہے اسے قبول کرنا منطقی نہیں لگتا۔ ایسی بہت سی سماجی مذہبی تحریکیں اٹھارویں صدی میں بھی جاری تھیں جو سماج میں پھیلی سماجی و مذہبی برائیوں کے خلاف آواز بلند کر رہی تھیں۔ لیکن انگریزوں کی آمد اور ان کی جدید تعلیم نے اسے تیز کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 19 ویں صدی میں راجا رام موہن رائے، کیشو چندر سین اور ایشور چندر ودیا ساگر وغیرہ جیسے سماجی مصلحین نے جدید تعلیم اور مغربی افکار سے متاثر ہو کر سماج میں پھیلی برائیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ راجا رام موہن رائے نے سمواد کمودی کے ذریعے ستی کے خلاف قانون بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایشور چندر ودیا ساگر کی کوششوں سے 1856 میں بیوہ کی دوبارہ شادی سے متعلق ایک قانون پاس کیا گیا، جسے ہندوستانی سماجی اصلاح میں ان کی سب سے اہم کردار سمجھا جاتا ہے۔

14.4 کلیدی الفاظ (Keywords)

ستی	:	برصغیر میں انگریزوں کے دور تک ہندوؤں میں رواج کسی شخص کے مرنے پر اس کی بیوی بھی اس کی چتا کے ساتھ جل جاتی تھی اور یہ رسم ستی کہلاتی تھی
تقویۃ الایمان	:	19 ویں صدی کے شاہ اسماعیل کی تصنیف جو 27-1826 میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔

14.5 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

14.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. اٹھارویں صدی کے دو مسلم سماجی مصلحین کے نام بتائیں۔
2. ستی ایکٹ کب پاس ہوا؟
3. ستی رسم سے کیا مراد ہے؟

4. سوامی رام کرشن پرمہنس کی بیوی کا نام کیا تھا؟
5. دھرم چندر بیدی کا تعلق کس علاقے سے تھا؟
6. سماجی اصلاح میں ایشور چندر ودیا ساگر کی سب سے اہم شراکت کس شعبے میں ہے؟
7. سمواد کمودی میگزین کس نے شروع کیا؟
8. سیرت المستقیم کس کی ملفوظات ہے؟
9. تقویۃ الایمان کس کی تصنیف ہے؟

14.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. 18ویں صدی کے اچھوت نظام پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
2. اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران کم سنی کی شادی ایک سماجی برائی تھی۔ اس پر اپنی رائے دیجئے۔
3. اپنے خیالات پیش کریں۔ اٹھارویں صدی کی بیواؤں کی زندگی پر ایک مضمون لکھیں۔
4. ستی کے رواج پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
5. اٹھارویں صدی میں کثیر ازدواجی کی صورتحال پر روشنی ڈالیں۔

14.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اٹھارویں صدی میں ذات پات کے نظام پر تفصیل سے بحث کریں۔
2. اٹھارویں صدی میں عورتوں کی حالت انتہائی قابل رحم تھی۔ بحث کیجیے۔
3. اٹھارویں صدی میں مسلم سماج میں رائج معاشرتی برائیوں پر روشنی ڈالیں۔

14.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bhattacharya, Bhabani, *Socio-Political Currents in Bengal: Nineteenth Century Perspective*, Vikas Publishers, Ghaziabad, 1980.
2. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
3. Jones, W. Kenneth, *Socio-Religious Reform Movements in British India*, Cambridge University Press, New York, 2008.
4. Natarajan, S., *A Century of Social Reform in India*, Asia Publishing House, New Delhi, 1959.
5. Raghuvanshi, VPS, *Indian Society in the Eighteenth Century*, Associated Publishing House, New Delhi, 1969.
6. Sen, Amiya P., *Social and Religious Reform*: *The Hindus of British India*, Oxford University Press, New Delhi, 2003.
7. Umar, Muhammad, *Islam in Northern India during Eighteenth Century*, Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi, 1993.

اکائی 15۔ جدید تعلیم کا ارتقاء

(Growth of Modern Education)

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 برطانوی دور سے پہلے ہندوستان میں تعلیمی نظام

15.3 ہندوستان میں نو آبادیاتی تعلیمی پالیسی کی شروعات

15.4 چارٹر ایکٹ 1813

15.5 میکالے منٹ 1835

15.6 چارس ووڈس ڈسپیچ مشن 1854

15.7 ہندوستانی تعلیمی کمیشن 1882

15.8 جدید تعلیم کے فروغ میں غیر سرکاری اقدامات

15.9 نو آبادیاتی تعلیم کے بارے میں مختلف نظریات

15.10 اکتسابی نتائج

15.11 کلیدی الفاظ

15.12 نمونہ امتحانی سوالات

15.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے پہلے یہاں کا مقامی تعلیمی نظام رائج تھا جس تک رسائی صرف اعلی طبقے کو ہی تھی۔ مگر انگریزوں کی آمد کے بعد یہاں نیے جدیدی تعلیمی نظام کو متارف کیا گیا جس کے دروازے سب لوگوں کے لیے کھولے گئے تھے۔ یہ تعلیمی نظام ہندوستان کے تعلیمی نظام سے بلکل مختلف تھا۔ اس نئے تعلیمی نظام میں اب مذہبی تعلیم کی جگہ سکولر تعلیم کو ترجی دی جانے لگی۔ پسماندہ طبقوں کے علاوہ عورتوں کی تعلیم پر زور دیا گیا۔ ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانی لوگوں کو تعلیم دینے کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا مگر جیسے جیسے انگریزی حکومت کی سامراجی گرفت ہندوستان پر مظبوط ہونے لگی انہوں نے ہندوستان میں جدید تعلیم کو پھیلانا شروع کیا۔ اس تبدیلی کے پیچھلے سامراجی مقاصد شامل تھے جن کو جانے بناہم اس نئ تعلیمی پالیسی کی نوعیت کو نہیں سمجھ سکتے۔

15.1 مقاصد(Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعدآپ

- ہندوستان میں جدید تعلیم کی شروعات کیسی ہوئی؟ جان سکیں گے۔
- انگریزوں نے ہندوستان میں جدید تعلیم کو کیوں فروغ دیا، سمجھ سکیں گے۔
- اس کے پس منظر اور پیش منظر میں کون سے مقاصد کار فرما تھے، وضاحت کر سکیں گے۔

15.2 برطانوی دور سے پہلے ہندوستان میں تعلیمی نظام

(Education System in India during the Pre-British Times)

برطانوی سامراجیت کے قیام سے پہلے دونوں ہندؤں اور مسلمانوں کے لیے مقامی تعلیمی نظام قائم تھا۔ یہ نظام انگریزوں کے آنے کے بعد زوال کا شکار ہوتا گیا۔ مسلمانوں کے لیے مدرسے اور مکتب تھے اور ہندؤں کے لیے تولز اور پاٹشالے تھے۔ ان میں عربی اور سنسکرت کی اعلیٰ تعلیم کے مراکز سے لے کر فارسی اور مقامی زبانوں میں نچلی سطح پر لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے ادارے شامل تھے۔ سائنسی اور سیکولر علوم ان اداروں میں نہیں پڑھائے جاتے تھے جو کہ اس تعلیمی نظام کی ایک بڑی خامی تھی۔ تاہم بہت سے ہندو فارسی اسکولوں میں پڑھنے جاتے تھے کیونکہ فارسی عدالتی زبان تھی اور اس کو پڑھنے سے روزگار کے مواقع بھی کافی تھے۔ یہی نہیں فارسی اسکولوں میں ہندو استاد بھی پڑھاتے تھے۔

مقامی تعلیمی نظام کی کچھ مشترکہ خصوصیات یہ تھیں۔

- اسکول عام طور پر زمینداروں یا مقامی امیروں کے تعاون سے چلائے جاتے تھے۔ بعض اوقات ریاست اسکول کی مالی مدد کے لیے عطیے بھی دیتی تھی۔
- نصاب میں سب سے زیادہ زور کلاسیکی زبانوں جیسے سنسکرت، عربی اور فارسی پر دیا جاتا تھا۔ کلاسیکی ہندو یا اسلامی روایت کے مضامین

جیسے گرامر، منطق، طب پڑھائی جاتی تھیں۔

- خواتین اور نچلے طبقے کو ان اداروں میں عموماً تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔
- ریاست کا اسکول کی تعلیم میں بہت کم یا کوئی رول نہیں تھا حالانکہ بادشاہ اپنی تعلیم کے لیے خاص لوگوں کی سرپرستی کرتے تھے۔
- انیسوی صدی تک چھاپہ خانے کی عدم موجودگی کی وجہ سے علم اور معلومات، زبانی روایات(oral tradition)اور یادداشت (memory)پر مبنی تھی۔اس کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے لکھے گئے مخطوطات بھی پڑھائے جاتے تھے۔

اعلیٰ تعلیم کے مراکز کے علاوہ جو بنیادی طور پر اعلیٰ ذاتوں کے زیر انتظام تھے یہاں بڑی تعداد میں ابتدائی اسکول بھی تھے۔ہندوستان کے اشرافیہ کی مالی مدد سے یہ اسکول چلتے تھے۔ یہ اسکول روزمرہ کی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے طلبہ کو ابتدائی ریاضی اور بنیادی خواندگی سکھاتے تھے۔ سماج کے مختلف طبقوں کے طلباء سوائے انتہائی پسماندہ یا پسماندہ ذاتوں کے لوگ ان اسکولوں میں علم حاصل کرتے تھے۔

15.3 ہندوستان میں نوآبادیاتی تعلیمی پالیسی کی شروعات

(The Beginnings of Colonial Education Policy in India)

18ویں صدی کے آخر تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں تعلیم کے فروغ میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ چونکہ یہ ایک تجارتی کارپوریشن تھی اس لیے اس کا بنیادی مقصد تجارت اور زیادہ سے زیادہ منافع کمانا تھا۔ہندوستان میں اپنی سامراجیت قائم کرنے کے بعد ابتدا میں کمپنی نے تعلیم کے فروغ میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔تاہم انفرادی طور پر مشنریوں کی طرف سے کچھ فلائی اسکول قائم کرنے اور ان میں انگریزی زبان کو فروغ دینے کی کوششیں کی گئیں۔18ویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں مشرقی ہندوستان پر برطانوی قبضے کی وجہ سے حالات بدلنا شروع ہوگئے۔اب یہ بحث بڑھ رہی تھی کہ ہندوستان میں تعلیم کے فروغ میں کمپنی کا کیا رول ہونا چاہیے۔اس بحث کا دوسرا اہم نکتہ یہ تھا کہ آیا کمپنی کو ہندوستان میں مشرقی یا مغربی تعلیم کو فروغ دینا چاہیے یا نہیں۔ابتدائی مرحلے میں کمپنی کے اہلکاروں نے مشرقی علوم میں تعلیم دینے کی وکالت کی۔

شیکھر بندوپادھیائے(Sekhar Bandyopadhyay)کے مطابق ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام مختلف نظریات پر مبنی تھا۔ شیکھر بندوپودیاں کا ماننا ہے کہ سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی (East India Company) کی شروعاتی پالسی حقیقت پسندانہ تھی جس کی وجہ سے انہوں نے ہندوستان کے اندورنی سماجی معملہ جات میں دخل اندازی کرنے سے گریز کیا۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے شرق شناسی (Orientalism)کو بھی کافی اہمیت دی۔ شرق شناسی سے متاثر ہو کے وارن ہیسٹنگ (Warren Hastings)نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے یہاں کے علوم جو کہ مختلف زبانوں جیسے فارسی، سنسکرت اور دیگر زبانوں میں موجود تھا ان کا مطالعہ کیا جائے تاکہ اس معلومات سے ہندوستان پر حکومت کرنے میں آسانی ہو۔اس پالیسی کی وجہ سے Asiatic Society of Bengal، کلکتہ مدرسہ، سنسکرت کالج بنارس جیسے ادارے وجود میں آئے۔ہندوستانی تہذیب کے علوم سے برآمد

معلومات نوآبادیات نظام کی بنیاد کو مضبوط بنانے میں اہم ثابت مانی جاتی تھی۔

شیکھر بندوپادھیائے اپنی کتاب (From Plassey to Partition and After: A History of Modern India) میں لکھتے ہے کہ وارن ہیسٹنگ کے بعد دیرے دیرے ہندوستان کے اندرونی سماجی معملوں میں دخل اندازی کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا جانے لگا۔ خود برطانیہ کے اندر مختلف نظریہ جات کا ابھرنا اور اس کا اثر ہندوستان کی نوآبادیاتی سوچ اس بدلاو کی وجہ سمجھی جاتی ہے۔ ان نظریات میں Free Trade، Utilitarianism، اور Evangelicalism قابل ذکر ہیں۔ Utilitarianism نظریہ معاشرتی تعمیر، اصلاحی تحکم پسندی کی تقلید کرتا ہے۔ Evangelicalism نظریہ حکومت کی مداخلت کے ذریعے ہندوستانیوں کو مقامی مذہب کے چنگل سے آزاد کرانا جو کہ ان کی نظر میں وہم پرستی، بت پرستی اور پجاری طبقے کے ظلم پر مبنی تھا۔ اور آزاد تجارتی نظرے والے لوگ اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہندوستانی معشیت جو کہ ان کے رائے میں روایتوں بنیادوں پر منجمند تھی صرف حکومتی مداخلت کے ذریعے ہی اس میں حرکت لائی جاسکتی ہے تاکہ تجارت کو فروغ دیا جائے۔

ان اثرات کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی نے عارضی حکومتی مداخلت کو ترجیح دے دی تاکہ ہندوستان میں بغاوتی عناصر کو ہوا نا دی جائیں۔ کمپنی کا ماننا تھا کہ ہندوستانی سماج میں اصلاح کی کوشش تب تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک ہندوستان کا ایک طبقہ اس کی حمایت میں سامنے نا آئے۔ یہ طبقہ جلد ہی جدید تعلیم کے ذریعے اُبھر کر آیا۔ اس مقامی طبقے نے بعد میں ہندوستانی سماج میں اصلاح لانے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور سرکاری مداخلت کی پیروی اس ضمن میں کی۔ اسی لیے تعلیم سب سے پہلے برطانوی حکومت کی مداخلت کا ذریعہ بنا۔

15.4 چارٹر ایکٹ (The Charter Act–1813)

ابتدا میں انگریزی تعلیم اٹھارویں صدی میں فلاحی اسکولوں کے ذریعے کلکتہ، مدراس اور ممبئی میں دی جانے لگی۔ اس کا مقصد صرف ہندوستان میں انگریز بچوں کو پڑھانا تھا حالانکہ ان اسکولوں کو کمپنی کی حمایت حاصل تھی مگر کوئی براہ راست ذمہ داری 1813 تک نہیں لی۔ صحیح مانو میں مغربی تعلیم کی شروعات چارٹر ایکٹ (1813) کے پاس ہونے سے ہوئی۔ اس ایکٹ کے ذریعے اب مشنری کو ہندوستان سفر کرنے کی اجازت دی گئی اور ایک لاکھ روپیہ تعلیم کے لیے مخصص کیا گیا۔ یہ روپیہ دو بنیادی چیزوں پر صرف ہونے والا تھا۔ ایک مقامی تعلیم شدہ طبقے کی حوصلہ افزائی کرنا اور ادب کو فروغ دینا۔ دوسرا سائنسی علوم کو ترقی دینا۔

برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے سب سے بڑی پریشانی کمپنی کے افسروں کی بدعنوانیاں تھی جو یہ سمجھ رہے تھے کہ ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ عارضی وقت کے لیے ہیں اس لیے وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ استحصال کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے اس ضرورت کو محسوس کیا گیا کہ ہندوستانی عوام کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ برطانوی حکومت یہاں کی ترقی کے لیے کوشاہیں جو کہ نوآبادیاتی نظام کو مضبوط بنانے کے لیے لازمی تھا۔ اسی پس منظر میں جدید تعلیم دینے کی وکالت کی گئی۔

مگر چارٹر ایکٹ کے کلاز نمبر 43 نے ہندوستان میں دی جانے والی تعلیم کی نوعیت کا فیصلہ نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے ایک لاکھ روپیہ کس تعلیم پر صرف کیا جائے ایک بڑا مسئلہ بنا۔ جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن (General Committee on Public Instruction) جو کہ تعلیم کے فروغ کے لیے بنائی گئی تھی میں آورنٹلسٹ (Orientalists) کا غلبہ تھا۔ ان کی رائے تھی کہ ایک لاکھ روپیہ ہندوستانی کلاسکی ادب اور سائنسی علوم پر خرچ ہونا چاہئے۔ اسی سوچ کے تحت سنسکرت کالیج کلکتہ اور آورنٹل کالج آگرہ اور دہلی قائم کیے گئے۔ اسی دوران دوسری طرف کچھ مشنری نے ہندوستان میں نئے اسکول قائم کیے اور ان میں تدریس کا ذریعہ انگریزی زبان رکھا۔ مشنریوں نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی پرزور حمایت کی کیوں کہ ان کا مقصد تعلیم کے ذریعے مقامی سماج تک رسائی حاصل کرنا اور مغربی تہذیب کی ثقافت کو فروغ دینا تھا جس سے لوگوں میں عیسائیت پھیلانے میں مدد مل جائیں۔

اسی وقت کے دوران برطانیہ اور ہندوستان میں مختلف طبقوں نے کمپنی پر جدید تعلیم دینے کے لیے دباؤ ڈالا۔ اگر ہندوستانیوں کی بات کی جائے تو تعلیمی پالیسی کے بحث پر انکا ردعمل ملا جلا تھا۔ ایک طرف قدامت پرستوں نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی کیوں کہ ان کو اس بات کا خدشہ تھا کہ تعلیم کی وجہ سے ہندوستان کی تہذیب اور سماج پر بُرے اثرات مرتب ہوگیں۔ دوسری طرف راجہ رام موہن رائے اور دیگر روشن خیال لوگوں نے اس یقین کے ساتھ مغربی تعلیم کو متعارف کرانے کی حمایت کی کہ اس سے ہندوستانیوں کو مغربی سائنس، عقلیت پسندی، نئے خیالات اور ادب کے علم کو ضم کرنے میں مدد ملے گی۔ اور مغربی تعلیم کا علم، خاص طور پر انگریزی کا علم، انہیں نوکریوں اور حکمران اشرافیہ کے قریب آنے میں مدد دے گا۔ اسی ز من میں راجا موہن رائے نے انگریزی تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ایک مورنڈم (memorandum) گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کیا اور سنسکرت کالج کھولنے پر احتجاج درج کیا۔ راجا موہن رائے اور سر سید احمد خان جیسے روشن خیال لوگوں کا ماننا تھا کہ ہندوستان کی جدیدیت مغربی سائنسی علوم اور انگریزی زبان کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتی ہیں۔

15.5 میکالے منٹ (The Minute of Macaulay, 1835)

دوسری طرف 1828 میں ولیم بنٹک (William Bentinck) ہندوستان کے گورنر جنرل منتخب ہوئے۔ وہ (Utilitarianism) نظریے سے کافی متاثر تھے۔ ولیم بینٹک نے دلیل دی کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا سب سے بڑا مقصد ہندوستان کے باشندوں میں یورپی ادب اور سائنسی علوم کو فروغ دینا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اعلان کیا کہ اب تمام مختص فنڈز ہندوستان میں انگریزی تعلیم پر صرف کیے جائیں۔ اس ز من میں ولیم بینٹک نے 1835 میں قرارداد پاس کی جس کے چند اہم نکات درج ذیل یہ ہیں۔

1. فارسی کو عدالتی زبان کے طور پر ختم کردیا گیا اور اس کی جگہ انگریزی رکھ دی گئی۔
2. انگریزی کتابوں کی طباعت اور اشاعت مفت اور نسبتاً کم قیمت پر دستیاب رکھی گئی۔
3. انگریزی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے مزید فنڈز فراہم کیے گئے، جب کہ مشرقی تعلیم کے لیے فنڈ میں کمی کی گئی۔

اسی دوران ولیم بینٹک نے لارڈ تھامس مقالے(Lord Thomas Babington McCauley)کو کمیٹی آف جنرل انسٹرکشن کا صدر بنایا۔ 2فروری 1935 کو انہوں نے اپنی تفصیلات پیش کی جو کہ ہندوستان میں جدید تعلیم کے لیے ایک اہم سنگ میل سمجھی جاتی ہیں۔ اکثرتاریخ دانوں کا ماننا ہے کہ تھامس مقالے کی رائے مشرقی علوم کے بارے میں حقیر اور قابل نفرت تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ اصلی علوم مغربی اور یورپی ادب میں ہی موجود ہیں۔ انکا مشہور قول ہے کہ "یورپی/مغربی لائیبری کا واحد شلف(Shelf) سارے ہندوستانی اور عربی علوم پر فوقیت رکھتا ہے"۔ اسی سوچ کی وجہ سے انہوں نے اس بات کی وکالت کی کہ تعلیم یورپی ادب اور سائنسی علوم میں ہی دی جائے اور یہ انگریزی زبان کے ذریعے ہی کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں۔ تھامس مقالے کا ماننا تھا کہ "اس تعلیم کے ذریعے وہ ہندوستان میں ایک طبقے کو جنم دیں گے جو رنگ اور خون میں ہندوستانی ہی ہوں گے مگر ان کے مزاج، خیالات اور سوچنے کا نظریہ مغربی ہوگا"۔ یہی طبقہ نوآبادیت کو مضبوط بنانے کے لیے ضروری تھا۔

ڈاؤنوارڈ فلٹریشن کا نظریہ (Downward Filtration Theory)

میکالے منٹ کی خاص بات ڈاؤنوارڈ فلٹریشن کا نظریہ(Downward Filtration Theory) تھا۔ اس پالیسی کے مطابق انگریزی تعلیم ہندوستان کے اس طبقہ جات کو دی جائے جو پہلے سے ہی علمی ذوق رکھتے ہوں۔ اس طبقے سے مراد یہاں کے کاروباری لوگ، امیر طبقہ، مقامی تعلیم یافتہ برہمن یا اشرافیہ وغیرہ تھا۔ انگریزوں کا ماننا تھا کہ جب یہ طبقے تعلیم حاصل کرلیں گے تو پھر یہی لوگ اس تعلیم کو عام لوگوں تک کم خرچے اور مقامی زبانوں میں پھیلائیں گے۔ اس طرح ساری ہندوستانی قوم اس انگریزی تعلیم اور اس کے اعلی اخلاقی خیالات سے فیض یاب ہوسکتی ہیں۔ بعض تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ دراصل میں نوآبادیاتی ریاست عام لوگوں کو تعلیم دینے کی ذمہ داری سے بچنا چاہتی تھی اسی لیے ڈاون ویڈ فرٹریشن کے زرئعے یہ کام ہندوستانیوں کے ذمہ رکھنے کی کوشش کی گئی۔

15.6 ووڈس ڈسپیچ (The Woods Despatch,1854)

میکالے منٹ سے ہٹ کے جیمز تھامس جو لفٹنٹ گورنر کے عہدے پر فائز تھے نے شمالی مغربی صوبوں میں تعلیم مقامی زبانوں کے ذریعہ ابتدائی اسکولوں میں دینے کی کوشش کی۔ بعد میں اُس وقت کے گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی(Lord Dalhousie) نے بنگال اور بہار صوبوں کے لیے اسی طرز کی تعلیم دینے کا فیصلہ کیا۔ اسی سوچ کو بنیاد بنا کے چارس ووڈس نے Downward Filtration Theory کو مسترد کر کے ابتدائی تعلیم پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ابتدائی تعلیم مقامی زبانون میں ہی کاآمد ثابت ہوسکتی ہیں۔ مگر اس تبدیلی کے پیچھے نوآبادیاتی نظام کی سیاسی معشیت کے مفاداد کو فروغ دینا بھی مقصد تھا۔ اس پالسی کے مطابق نوآبادیاتی نظام کو دو اہم طبقوں کی ضرورت تھی۔ ایک وہ اعلی طبقہ جسکو تھامس مقالے کی تعلیمی پالسی میں اہمیت دی گئی تاکہ یہ وفادار طبقہ ہندوستان میں برطانوی انتظامیہ میں ماتحت عہدوں پر کام کرسکیں اور نوآبادیاتی نظام کو بھی مضبوطی بخشیں۔ اور دوسرا طبقہ عام مزدور لوگوں کا تھا جسکو سودمند تعلیم سے آرستا کرنا سامراجی نظام کے لیے ضروری تھا تاکہ یہ اچھے مزدور، اچھے خریدار بن کر برطانوی سامان/چیزوں کے اعلی معار کے فرق کو سمجھ سکیں۔

اب عام لوگوں کی ابتدائی اور تکنیکی تعلیم پر زور دیا گیا۔اس سلسلے میں ابتدائی اسکول کھولے گیے۔اعلی تعلیم ایک ہندوستانی مخصوص طبقے کو دینے کے لیے 1857 کے فورن بعد تین اہم یونیورسٹیاں (کلکتہ یونیورسٹی، مدراس یونیورسٹی اور بمبی یونیورسٹی) کھولی گئی جن کو برطانوی یونیورسٹیوں کے طرز پر قائم کیا گیا تھا۔مزید اس بات کی سفارش کی گئی کہ جن اسکولوں میں تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ دی جائے گی ان کو گرانٹ یا مالی امداد بھی دی جائے گی۔ساتھ ہی میں ان اسکولوں کو فیس لینے کی ہدایت دی گئی تاکہ تعلیم کی اہمیت کو لوگ سمجھے کیوں کہ انکا ماننا تھا کہ مفت چیزوں کی قدر نہیں ہوتی۔

ووڈس ڈسپیچ کی اہم سفارشات درج ذیل ہیں۔

1. کمپنی کے زیر انتظام صوبوں میں سے ہر ایک میں پبلک انسٹرکشن کا ایک شعبہ قائم کرنا۔
2. کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں یونیورسٹی کا قیام کرنا۔
3. اسکولوں (ہائی اسکول، مڈل اسکول اور ایلیمنٹری اسکول) کے نیٹ ورک کا قیام۔
4. اساتذہ کی تربیت کے اداروں کو قیام کرنا۔
5. مقامی اسکولوں کو فروغ دینا۔
6. اسکولوں کو مالی مدد کے لیے گرانٹ ان ایڈ کی فراہمی۔

15.7 ہندوستانی تعلیمی کمیشن (The Indian Education Commission, 1882)

ووڈس ڈسپیچ پاس ہونے کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ چارس ووڈس نے جن سفارشات کی بات کی تھی وہ زمینی سطح پر پوری طرح سے لاگو نہیں ہو پائی ہے جس کی وجہ سے خاص کر ابتدائی تعلیم نظرانداز ہوئی۔اسی وجہ سے اس ضرورت کو محسوس کیا گیا کہ ہندوستان میں تعلیمی ترقی پر دوبارہ غور فکر کیا جائے۔اس کے علاوہ اور بھی کچھ وجوہات تھی جو ہندوستانی تعلیمی کمیشن کی وجہ بنی۔

15.7.1 عیسائی مشنریوں کا احتجاج

یہ لوگ 1858 کے اعلانیہ ملکہ برطانہ سے ناراز تھے جسمیں انہوں نے ہندوستان کے مذہبی معاملات میں دخل نہ دینے کی یقین دہانی دلائی تھی۔ان کی ناراضگی میں مزید اضافہ ہونے کی وجہ حکومت کا مشنری اسکولوں کے تئیں غیر ہمدردانہ رویے اور مقامی اسکولوں کو مالی امداد دے کر ان کو مشنریوں اسکولوں کے برابر قابل بنانا شامل تھا۔مشنروں نے اسی لیے ہندوستان اور برطانہ میں احتجاج کرنا شروع کر دیا اور یہ شکایت درج کی کہ

- ہندوستان کا تعلیمی نظام ووڈس ڈسپیچ کی ہدایات کے مطابق نہیں چل رہا ہے جس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ دھیرے دھیرے برطانوی سرکار تعلیمی میدان سے اپنی علاحدگی اختیار کر لیں گی۔
- حکومت کے ذریعے دی جانے والی غیر مذہبی تعلیم سے مشنری لوگ کافی ناراض تھے جن کا کہنا تھا کہ یہ تعلیم منکر خدائی ہے۔

لارڈ رپن نے فروری 1882 میں ولیم ہنٹر کو پہلے ہندستانی تعلیمی کمیشن (The First Indian Education Commission) کے لیے صدر منتخب کیا۔ بیس ممبران کی تعناتی کی گئی جس میں کچھ ہندوستانی بھی شامل تھے۔ کمیشن کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ اس بات کی جانچ کریں کہ ووڈس ڈسپیچ کی سفارشات کس حد تک اپنائی گئی ہیں اور یہ بھی مشورہ دے کہ ابتدائی تعلیمی نظام کو کیسے اور بہتر بنایا جائے۔ اس کمیشن میں ابتدائی تعلیم پر زور دینے کی ایک اور وجہ یہ ت بھی تھی کہ برطانیہ میں اسی وقت (1880) میں ایک ایکٹ کے ذریعے ابتدائی لازمی قرار دیا گیا تھا۔

ہنٹر کمیشن کی سفارشات

- اس کمیشن نے حکومت کو عوام کو تعلیم دینے کی ذمہ داریوں سے رہا کر دیا۔ کالجوں اور سیکنڈری اسکولوں کی ذمہ داریوں کو دھیرے دھیرے غیر سرکاری تنظیموں کے سپرد کرنا اور انکا مالی انتظام بھی کرنا۔
- ہنٹر کمیشن نے دیسی تعلیم کو فروغ دینے کی بات کی۔ ان اسکولوں کی انتظامی ذمہ داریاں ڈسٹرکٹ اور مونسپل بورڈ کو سونپنے کی وکالت کی گئی اور اپنا نصاب، پڑھانے اور امتحان لینے کا طریقہ کار خود سے مقرر کریں تاکہ حکومت کو ان اسکولوں میں مداخلت سے روکا جائے۔
- اساتذہ کو باقاعدہ طور پر ٹرینگ دی جائے۔
- ابتدائی تعلیم کی ترقی پر خاص توجہ دینے کی بات کی گئی۔ مقامی لوگوں کی ضرورتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے نصاب تشکیل دینے کی بات کی گئی۔
- کتب سازی وتحفظ کتب، مساحت وپیائش، علم حساب، قدرتی جسمانی سائنس جیسے مضموں کو پڑھانے کی سفارش کی گئی تاکہ لوگ ان علوم سے افادیت حاصل کر سکیں۔
- کالجوں کو کتنی امداد دی جائے اس بات پر منحصر ہوگا کہ کالج میں پڑھنے اور پڑھانے والوں کی تعداد، اس ادارے کی کارکردگی اور مقامی ضرورتوں کو نظر میں رکھ کے مقرر کی جائے گی۔ ان علوم کو پڑھانے کی سفارش کی گئی جس سے لوگوں کو نوکریاں، ملک کے باہر اعلی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع مل سکیں۔
- ہنٹر کمیشن نے پسماندہ طبقوں کو تعلیم دینے کی بھی سفارش کی اور ان طبقوں کو کم فیس کے عوض تعلیم دی جائیں ن
- مسلم طبقے کو اپنی تعلیم کا انتظام خود کرنے کیلیے سرکار کی طرف سے امداد اور سہولتیں دینے کی وکالت کی گئی۔ مسلم لڑکیوں کیلیے ابتدائی اسکول کھولنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔
- کمیشن نے مقامی راجاؤں اور شاہی خاندانوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کے لیے مخصوص اسکول اور کالج کھولنے کے لیے بھی سفارش کی۔

15.8 جدید تعلیم کے فروغ میں غیر سرکاری اقدامات

(Non-Governmental Initiatives in the Development of Modern Education)

ہندوستان میں مغربی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ریاست کے ساتھ ساتھ مشنریوں نے انفرادی طور پر کوششیں کی۔ بنگال علاقے میں عیسائی مشنریوں نے کچھ اہم کالج قائم کیے۔ان اداروں نے مغربی علوم کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا حالانکہ ان کا بنیادی مقصد لوگوں کو مسیحیت کی طرف لانا تھا۔ مشنریوں کے علاوہ کچھ لوگوں نے کلکتہ میں انگریزی تعلیم کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ کلکتہ میں ڈیوڈ ہیر (David Hare) کے ساتھ مقامی نامور ہندو افراد کے ایک گروپ نے کلکتہ میں ہندو کالج کو قائم کیا جس سے ہندوستانیوں کو سیکولر تعلیم دینے میں مدد ملی۔ جے.ای.ڈی. بیتھون (J.E.D. Bethune) خواتین کی تعلیم کے پر جوش حمایتی تھے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے انہوں نے کلکتہ میں اسکول بھی کھولا۔ اسی طرح بمبئی اور مدراس میں بھی مشنری اسکول قائم کیے گئے۔ بمبئی میں Native Education Society اور Elphinstone Institution جیسے ادارے قائم کیے گیے۔ مدراس میں کرسٹین کالج (Christian College) 1837 میں اور پریزیڈنسی کالج (Presidency College) 1853 میں قائم کیا گیا۔ اتر پردیش میں پہلا انگریزی میڈیم کالج آگرہ میں 1823 میں قائم کیا گیا تھا۔ اس طرح 1850 کی دہائی تک ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے بیشتر صوبوں میں جدید تعلیم کے اداروں کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

جدید تعلیم خاص کر تعلیم نسواں کے لیے مقامی مصلحین نے بھی پہل کی۔ سب سے پہلے بنگال میں راجا رام موہن رائے نے جدید تعلم کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کے لیے برطانوی سرکار سے مانگ بھی کی۔ ودیا ساگر (Vidyasagar) نے خاس کر بیوائیوں کی شادی اور خواتین کو تعلیم دینے کی حمایت کی۔ علی گڑھ میں مسلم لڑکیوں کی تعلیم کے لیے شیخ عبدالا نے پہلا اسکول 1906 میں قائم کیا۔ دوسری طرف دلت اور پسماندہ گان لوگوں کے لیے بھی جدید تعلیم کی مانگ کی گئی۔ اس زمن میں دلت مصلحین اور سیاسی رہنمائیوں نے اپنے اپنے علوقوں میں جدید تعلیم کے ادارے کھولے۔ ای۔ وی۔ راماسوامی پریار نے تامل ناڈو میں جدید تعلیم کے ادارے کھولنے پر زور دیا۔ جوتی باپھولے اور ان کی بیوی ساوتری بائی پھولے نے پونے میں لڑکیوں کے لیے اسکول کھولا۔ اس سماجی مہم میں مسلم خاتوں شیخ فاطمہ نے جوتی باؤ پھولے اور ساوتری بائی پھولے کا بھرپور ساتھ دیا۔ جب جوتی باؤ پھولے اور ساوتری بائی پھولے کا ان کے نظرے کی وجہ سے سماجی بیکاٹ ہوا تو شیخ فاطمہ نے ہی انکو اپنے گھر میں پناہ دی۔ وہ بھی عورتوں کی تعلیم کی خیر خواہ تھی۔ انہوں نے جوتی باؤ پھولے کے اسکول جو کہ لڑکیوں کے لیے کھولا گیا تھا بحصیت استانی کے طور پر اپنا خدمات انجام دی۔

15.9 نو آبادیاتی تعلیمی نظام کے بارے میں مختلف نظریات

(Different Views on Colonial Education System)

نو آبادیاتی ریاستوں نے طاقت کے ساتھ ساتھ تسلط (Hegemony) کے زریعے اپنے سامراجی نظام کو مظبوطی بخشی۔ ایک

طرف طاقت کا استعمال کرکے زبردستی سامراجی نظام کو قائم کیا گیا اور دوسری طرف تسلط کے زرئعے عام رعایا کے ذہنوں کو متاثر کرکے ان کو سامراجیت قبول کرنے کے لیے تیار کیا۔ اس زمن میں جدید تعلیم، جدید صحت عامہ اور نئے قانونی نظام کے ذریعے رعایا کے ذہنوں میں نوآبادیاتی نظام کے تعی برتری کا احساس اور مقامی تہذیب کے مطلق احساس کم تری پیدا کرنا بھی شامل تھا۔ ہندوستان کی اگر بات کریں تو یہاں پر نوآبادیاتی ریاست نے اپنی مغربی تہذیب کی برتری کی نمائش کے لیے بہت سارے آلات کا استعمال کیا جس میں جدید تعلیم ایک اہم ذریعہ تھا۔

ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا مقصد صرف کلرک (clerks) پیدا کرنے تک محدود نہیں تھا۔ بلکہ اس تعلیم کا مقصد اخلاقی ایجنڈے سے بھی جڑا ہوا تھا تاکہ ہندوستانی لوگوں کے ذہنوں میں برطانوی سرکار کے تعیں قربت پیدا کی جائے۔ دوسری طرف اسی تعلیم کی بدولت بہت سارے جدید تعلیم یافتہ لوگ برطانوی سامراجت کے خلاف ہوگئے۔ اس کی مثال دادا بھائی نزو لجی کے طور پر دی جاسکتی ہے جو ایک طرف مغربی تہذیب کی برتری کے حامی تھے لیکن دوسری طرف انہوں نے نوآبادیاتی نظام کی معاشی پالسیوں کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا۔ لیکن مجموعی طور پر نوآبادیاتی نظام کے تعلیمی نصاب، تدریس، درسی کتب کا مقامی سماج پر وسیع اور دیرپا اثرات مرتب ہوئیں۔ آج بھی آزاد ہندوستان کا تعلیمی نظام دو صدیاں گزرنے کے باوجود بھی نوآبادیاتی دور کے اثرات سے متاثر ہے۔

ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام تعلیم پر بہت سی تحریریں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر تحریریں پر ملا. وی. راؤ (Parimala V. Rao) کے مطابق پرانے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں ۔ انہوں نے ان نظریات کو چار زمروں میں تقسیم کیا ہے: سامراجی (Imperialist)، سامراج مخالف (Anti-imperialist)، مابعد جدیدیت (Post-modernism) اور قوم پرست (Nationalist)۔ وہ کہتی ہے کہ ان سب مکتب فکر سے جڑے لوگوں کا ماننا ہیں کہ دنیا مشرق/مغرب، Coloniser/ Colonised اور یورپی/غیر یورپی کے تقسیم شدہ زمروں پر مشتمل ہے اور ان زمروں کے مطابق تحقیق کاروں نے اپنے اپنے نظرے دلائل کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

ایک طرف سامراجی مورخین کے لیے ہندوستانی لوگ حاصل شدہ علم پر غور کرنے یا کلاس میں پڑھائی جانے والی چیزوں سے آگے سوچنے کی قابلیت نہیں رکھتے تھے۔ دوسری طرف سامراج مخالف اور مابعد جدیدیت پسندوں کا کہنا ہیں کہ نوآبادیاتی ریاست (مغرب) نے مشرقی نوآبادیاتی سماج اور غیر یورپی لوگوں پر تعلیم مسلط کی تاکہ اپنی ثقافتی سامراجیت کے ذریعے یورپی تسلط (European Hegemony) کو تقویت دیں۔ قوم پرست مورخین کے نزدیک نوآبادیاتی نظام سے پہلے کا تعلیمی نظام جو فطری طور پر اعلیٰ تھا انگریزوں نے تباہ کردیا۔ اس کے باوجود اسکالرشپ کے حالیہ رجحانات نے ایک نئے نظریے کو جنم دیا جس کو Subaltern Studies کہا جاتا ہے جو تاریخ کو (History from Below) سے لکھے جانے پر زور دیتا ہے تاکہ عام لوگوں کے ماضی کو بھی تاریخ کے تحقیقی دائرے میں لایا جائیں۔ مثال کے طور پر مشہور Subaltern تاریخ دان سبیاساچی بھٹاچاریہ (Sabyasachi Bhattacharya) اور دیگر اسکالرز کی متعدد تحریریں میں نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی ہندوستان میں سماج کے مختلف پسماندہ طبقات کو درپیش تعلیمی مواقع میں عدم

مساوات کو بحث کا مدہ بنایا ہے۔

نوآبادیاتی ہندوستان میں انگریزی تعلیم کو 'نوآبادیاتی منصوبے' سے منسوب کیا گیا ہے جس کا ایک 'سیاسی ایجنڈا' تھا اور ثقافتی سامراجیت (Cultural Imperialism) کو نافذ کرنے کا ایک آلہ بھی تھا۔ اس سوچ کے مطابق مارٹن کارنوئے (Martin Carnoy) نے دلیل دی ہے کہ برطانوی انتظامیہ نے ثقافتی سامراجیت کو قائم کرنے کے لیے مشنریوں کا سہارا لیا۔ وہ بتاتے ہے کہ کمپنی کے فوجی تحفظ کے تحت مشنری ایک جغرافیائی علاقے کو زیادہ قریب سے جان سکتے تھے اور لوگوں کی سماجی ساخت، ثقافت، اقتصادی پیداوار اور معاشیت کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کر سکتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے عیسائیت کی برتری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقامی لوگوں میں غیر ملکی موجودگی کو جائز ٹھہرانے میں مدد کی۔

گوری وشواناتھن (Gauri Viswanathan) نے اپنی تصنیف '*Masks of Conquest: Literary Study and British Rule in India*' میں ہندوستانی تاریخ کو ایڈورڈ سید (Edward Said) کے نظریے شرق شناسی (Orientalism) سے دیکھنے کی کوشش کی۔ گوری وشواناتھن نے دلیل دی کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو انگریزی ادب کا مطالعہ کرنے پر مجبور کیا۔ دھرم پال نے اپنی کتاب *The Beautiful Tree* میں یہ دعوا کیا ہے کہ انگریزوں نے مقامی ہندوستانی تعلیمی نظام کو تباہ کر ڈالا۔ حال ہی میں پری ملا۔ وی۔ راؤ نے اپنی تحقیق میں *New Perspectives in the History of Indian Education* میں اس بات پر زور دیا کہ انگریزوں کی تعلیمی پالسی کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں موجودہ نظریات یعنی Coloniser/ Colonised، یورپی/ غیر یورپی اور سامراجی/ سامراجی مخالف، کے دائرے سے باہر نکلنے کی ضرورت ہیں۔

پری ملا۔ وی۔ راؤ کا کہنا ہے کہ نوآبادیاتی ہندوستان میں کچھ جدید یا انگریزی اسکولوں میں انگریزی کے ذریعہ جدید علوم، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ اور سیاسی معیشت کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب مقامی زبانیں اور سنسکرت پڑھائی جاتی تھی جب کہ دیگر اسکولوں میں جدید نصاب کو مقامی زبانوں کے ذریعے اور انگریزی کو دوسری زبان کے طور پر پڑھایا جاتا تھا۔ نوآبادیاتی ریکارڈ میں اسکولوں کے ان دونوں زمروں کو 'اینگلو ورنیکولر اسکول اور انگریزی اسکول کہا جاتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر سیکنڈری اسکول تھے۔ ان کے نیچے پرائمری اسکول تھے جن میں مکمل طور پر مقامی زبانوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ جدید تعلیم کے متعارف ہونے سے پہلے ہندوستان بھر کے مقامی اسکولوں میں مقامی ادب اور ریاضی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انکا کہنا ہے کہ نوآبادیاتی ریاست نے زیادہ تر معاملات میں ضم incorporation کی پالیسی اپنایا۔ اس نے مقامی اسکولوں کے اساتذہ کو ایک معمولی تنخواہ اور حاضری کے رجسٹر کو برقرار رکھنے اور سالانہ رپورٹیں تیار کرنے کے لیے کچھ تربیت دی اور انھیں سرکاری پرائمری اسکول میں تبدیل کیا۔ اس کے علاوہ مقامی نصاب کو بھی ترجی دی۔

پری ملا۔ وی۔ راؤ کہتی ہے کہ اس کے برعکس ہندوستانیوں کے قائم کردہ اسکول جیسے کلکتہ میں ودیالیہ (Vidyalaya)، بمبئ میں ایلفنسٹن کالج (Elphinstone)، مدراس میں پچیپا کالج (Pachaiyappa College) اور ہندوستان بھر میں غیر معروف

افراد کے ذریعہ قائم کیے گئے متعدد اسکول یورپی اسکولوں کی طرز پر قائم کیے گئے۔ ان اسکولوں نے پرائمری اور سیکنڈری دونوں کلاسوں کے لیے انگریزی کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اپنایا۔ نوآبادیاتی ریاست نے اپنی حکمرانی کے پہلے 95 سالوں (1757– 1852) کے دوران ایک بھی انگریزی اسکول قائم نہیں کیا۔ حالانکہ بعد میں کچھ سنجیدہ کوششیں کی گئی۔ برطانوی سامراجی ریاست نے اس دور کے دوران جو واحد تعلیمی ادارے قائم کیے وہ کلکتہ مدرسہ، 1781؛ بنارس سنسکرت کالج، 1792؛ بھاگلپور اور جونپور کے مدارس، 1811؛ کالج آف فورٹ سینٹ جارج- عربی اور سنسکرت، 1812؛ کلکتہ اور پونا میں سنسکرت کالج، 1821؛ آگرہ کالج- عربی اور سنسکرت، 1824؛ اور دہلی کالج- عربی اور سنسکرت 1824۔ حالانکہ برطانوی لبرلز (Liberals) کے شدید دباؤ اور برطانوی پارلیمنٹ میں پوچھ گشت کے خوف کے تحت نوآبادیاتی ریاست نے 1852 کے بعد چند اسکول قائم کیے تھے۔ پری ملا۔ وی۔ راؤ کے مطابق یہ تاریخی حقائق مصنفین کے ذریعہ مشہور کی گئی تصویر کو بدل دیتے ہیں کہ مقامی تعلیم غیر رسمی (informal)، زبانی (oral) تھی اور انگریزوں نے مقامی تعلیمی نظام کو تباہ کر دیا۔ مذید یہ کہ انگریزی تعلیم کا آغاز ایک نوآبادیاتی منصوبہ تھا۔

15.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ہندوستان میں انگریزوں کی جدید تعلیمی پالیسی نوآبادیاتی سوچ پر مبنی تھی۔ اس تعلیمی نظام کے پیچھے سامراجی مقاصد شامل تھے جس میں سامراجی ضرورتوں کو پورا کرنا ایک اہم مقصد تھا۔ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا مقصد صرف چھوٹے عہدوں کے لیے ہندوستانیوں کو تیار کرنا نہیں تھا بلکہ ان کے ذہنوں میں برطانوی سرکار کے تعیں وفاداری پیدا کرنا اور اپنی مغربی تہذیب کی برتری کی نمائش کو بھی ظاہر کرنا شامل تھا۔ ساتھ ہی میں اس نئے تعلیم نظام نے ہندوستان کے سماج پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے۔ اس تعلیم کی وجہ سے نوآبادیاتی ریاست کچھ حد تک ایک طبقے کو جنم دینے میں کامیاب ہوئی جس نے ابتدا میں انگریزی حکومت کی حمایت کی مگر بعد میں اسی طبقے نے نوآبادیاتی نظام کی مخالفت بھی کی۔

15.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

نوآبادیت	:	سامراجیت
مشرقیت	:	مغرب کا مشرقی تہذیب کے تعیں نظریہ
تسلط	:	(Hegemony) یہ نظریہ انٹونیو گرامشی نے دیا ہے جس کے مطابق اعلی حکمرانی طبقہ یا ریاست عام لوگوں کے ذہنوں کو اثرانداز کرتا ہے تاکہ ان پر حکومت کی جا سکیں۔
سبالٹرن	:	(Subaltern) تاریخی نظریہ جو پسماندہ طبقے کے تاریخی حالات کو بنیاد بنا کے تاریخ لکھنے پر زور دیتا ہے۔

15.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

15.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. چارٹر ایکٹ 1813 میں کتنی رقم مختص رکھی گئی؟
2. کس ایکٹ میں عیسائیوں مشنری کو ہندوستان آنے کی اجازت دی گئی؟
3. (Downard Filtration Theory) کا نظریہ کس نے دیا؟
4. کس سال میں ولیم بنٹک (William Bentick) ہندوستان کے گورنر جنرل بنائے گئے؟
5. لارڈ رپن نے کس کو ہندستانی تعلیمی کمیشن (First Indian Education Commission) کے لیے صدر مقرر کیا؟
6. کس سال میں تھامس مقالے کو کمیٹی آف جنرل انسٹرکشن کا صدر بنایا گیا؟
7. کس ہندوستانی شخص نے انگریزی تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ایک مورنڈم (Memorandum) گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کیا؟
8. میکالے منٹ سے ہٹ کر کس لفٹنٹ گورنر نے شمالی مغربی صوبوں میں تعلیم مقامی زبانوں کے ذریعہ ابتدائی اسکولوں میں دینے کی کوشش کی؟
9. ولیم بینٹک نے کس کو رکن قانونی (Law Member) کے طور پر نامزد کیا؟
10. جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن کس کے فروغ کے لیے بنائی گئی تھی؟

15.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تھامس مقالے کی رائے ہندوستانی علوم کے بارے میں کیا تھی؟ وضاحت کیجیے۔
2. 1835 کے میقالے منٹ کے اہم نکات بیان کیجیے۔
3. چارٹر ایکٹ 1813 سے ہندوستان میں جدید تعلیم کی شروعات کیسی ہوئی؟ روشنی ڈالیے۔
4. 1857 کے فوراً بعد ہندوستان میں کون سی یونیورسٹیاں برطانوی یونیورسٹیوں کے طرز پر قائم کی گئی تھیں؟
5. ہنٹر کمیشن کی سفارشات کا مختصر جائزہ لیجیے۔

15.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. جدید تعلیم دینے کے پیچھے برطانوی نوآبادیاتی مفادات کیا تھے؟
2. نوآبادیاتی تعلیم کے بارے میں مختلف نظریات پر روشنی ڈالیں۔

3. نوآبادیاتی تعلیمی پالیسی کا تنقیدی جائزہ لیں۔

15.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Azizuddin Husain, S.M. ed., *Madrasa Education in India: Eleventh to Twenty First Century*, Kanishka Publishers, New Delhi, 2005.
2. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition and After*: *A History of Modern India*, Oreint BackSwan, New Delhi, 2015.
3. Banerjee-Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2015.
4. Basu, Aparna, *The Growth of Education and Political Development in India*, *1898–1920*, Oxford University Press, New Delhi, 1974.
5. Bhattacharya, Sabyasachi ed., *The Contested Terrain: Perspectives on Education in India*, Orient Longman, New Delhi, 1998.
6. __________ (ed.), *Education and the Deprivileged: Nineteenth and Twentieth Century India*, Orient Longman, New Delhi, 2002.
7. Dharampal, *The Beautiful Tree: Indigenous Indian Education in the Eighteenth Century*, Biblia Impex, New Delhi, 1983.
8. Ghosh, Suresh Chandra, *The History of Education in Modern India*: *1757–2012*, (4th edition), Oriental BlackSwan, New Delhi, 2013.
9. Kumar, Nita, *Lessons from Schools*: *The History of Education in Banaras*, Sage Publications, New Delhi, 2000.
10. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707–1857*, Oreint BlackSwan, New Delhi, 2018.
11. Rao, Parimala V. ed., *New Perspective in the History of Indian Education*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014.
12. Viswanathan, Gauri, *Masks of Conquest*: *Literary Study and British Rule in India*, Oxford University Press, New Delhi, 1998.

اکائی 16۔ تعلیم نسواں کی ترقی

(Development of Women's Education)

اکائی کی ساخت

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 برطانوی ہندوستان میں تعلیمی نظام

16.3 برطانوی ہندوستان میں تعلیم نسواں

16.3.1 1854 سے قبل تعلیم نسواں

16.3.2 تعلیم نسواں کے تعارف میں عیسائی مشنریوں کا کردار

16.3.3 ڈلہوزی اور چارلز ووڈ کا مراسلہ (1854)

16.3.4 ہنٹر کمیشن کے بعد تعلیم نسواں کا ارتقاء اور نشوونما

16.3.5 1901-02 کے پنج سالہ رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں تعلیم نسواں کی ترقی

16.3.6 بیسویں صدی کے اوائل میں تعلیم نسواں

16.4 خواتین کے لیے روایتی تعلیم

16.5 لڑکیوں کے لیے ابتدائی اسکول

16.6 اصلاحی تحریکیں اور تعلیم نسواں

16.7 انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تعلیم نسواں کے نامور کارکن

16.7.1 پنڈت راما بائی

16.7.2 ماتاجی مہارانی تپسوینی

16.7.3 ڈونڈھو کیشو کاروے

16.7.4 بیگم روقیہ سخاوت حسین

16.7.5 سسٹر سوبالکشمی

16.8 اکتسابی نتائج

16.9 کلیدی الفاظ

16.10 نمونہ امتحانی سوالات

16.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید(Introduction)

حق تعلیم، بلالحاظ جنس، ہر فرد کے لیے ایک لازمی جز تسلیم کیا گیا ہے۔تاریخی طور پر، تمام ثقافتوں میں مردوں کی تعلیم کو فروغ دیا جاتا تھا، جب کہ خواتین کی تعلیم ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یہ صنفی امتیاز غالباً قدیم سے لے کر ما قبل جدید دنیا کے ہر خطے میں محسوس کیا گیا۔اسی لیے پچھلے دو سو سالوں سے بھی زیادہ عرصے سے دنیا بھر میں متعدد مباحثوں اور تحریکوں کے ذریعے مردوں اور عورتوں نے تعلیم نسواں کے لیے ایک طویل جنگ لڑی۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، برطانوی حکومت ہند نے تعلیم نسواں کو متعارف کرنے میں ایک بنیادی کردار ادا کیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں کی تاریخ ایسے علمبرداروں سے بھری پڑی ہے جنھوں نے صنفی رکاوٹوں کو توڑا اور تعلیم نسواں اور نسوانی آزادی کے لیے سخت محنت کی۔ ان علمبرداروں کی کاوشوں کی وجہ سے ہی آج خواتین نے سیاست، فنون، سائنس، قانون اور دیگر شعبوں میں بے پناہ ترقی حاصل کی ہے۔

1840ء کی دہائی تک حکومت نے تعلیم نسواں کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا تھا، لیکن اس وقت بھی برطانوی ہند میں کئی روایتی اسکول لڑکیوں کو تعلیم دے رہے تھے۔ عیسائی مشنریوں نے انیسویں صدی کے اوائل میں ہی لڑکیوں کے لیے متعدد تعلیمی ادارے قائم کیے تھے، جن کو بعد میں ریاست نے مالی امداد فراہم کی۔ چارلز ووڈ کے مراسلے (1854) اور ہنٹر کمیشن (1882) کی آمد سے تعلیم نسواں میں خاصی ترقی ہوئی۔اس کے علاوہ، متعدد ماہر تعلیم اور خواتین کارکنوں نے تعلیم کی اصلاح اور تبلیغ کے عمل کو آگے بڑھایا۔ہندوستان میں تعلیم اور سماجی تبدیلی کی حمایت کرنے والی پہلی خواتین میں رسندری دیوی (1809-99) ایک ممتاز شخصیت ہے۔گھر کے کام کاج اور بارہ بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داریوں سے قیمتی لمحات چرا کر رسندری دیوی کتابوں کا مطالعہ کرتی تھی۔ ساوتری بائی پھولے (1831-97) اور ان کے شوہر، جیوتی راؤ پھولے، نے بھی تعلیم نسواں کی حمایت کی۔ ان کا ماننا تھا کہ تعلیم حاصل کرنا خواتین کے لیے بہتر مستقبل بنانے کا واحد ذریعہ ہے۔ رما بائی (1858-1922) کو ان کی عمدہ تعلیم کے اعتراف میں "پنڈتا" کے لقب سے نوازا گیا۔ آننت پدمنابھ ڈونگرے، رما بائی کے والد، ایک عظیم ویدک اسکالر تھے جنھوں نے سماج کے متعدد اعتراضات کے باوجود بھی اپنی اہلیہ کو تعلیم دینے کا فیصلہ کیا۔ رما بائی نے بھگوت پران، بھگواد گیتا اور سنسکرت گرامر کا بھی مطالعہ کیا۔ دیگر تعلیم یافتہ خواتین یا تعلیم نسواں کے حامیوں میں تارا بائی شندے، فاطمہ شیخ، سوارنا کماری دیوی، اینی بیسنٹ، سسٹر نویدیتا، چندر مکھی باسو، کامنی رائے، آشا پورنا دیوی، رخما بائی، ایشور چندر ودیا ساگر، دیانند سرسوتی، سوامی ویوکانند، ڈونڈھو کیشو کاروے، وغیرہ شامل ہیں۔ تاہم، ان مثالوں سے ہندوستان میں تعلیم نسواں کی صورتحال کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا

ہے۔ لیکن موجودہ دور کے روایتی تصورات اور تعلیم نسواں کی نامناسبت کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سر کردہ خواتین اقلیت میں تھیں۔ لہذا، ان ریاستی کوششوں، عیسائی مشنریوں اور سر گرم کارکنوں نے ہندوستان میں تعلیم نسواں کو متعارف کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔

16.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان میں تعلیم نسواں کا تعارف اور اس کی نوعیت۔
- ہندوستان میں روایتی نسوانی تعلیم کا جائزہ۔
- تعلیم نسواں کی ترقی میں نوآبادیاتی حکومت کا کردار۔
- ہندوستان کے نسوانی تعلیمی نظام میں تسلسل اور تبدیلی۔
- تعلیم نسواں کی وکالت میں مختلف خواتین کارکنوں کا کردار۔

16.2 برطانوی ہندوستان میں تعلیمی نظام (Education System in British-India)

اٹھارویں صدی کے دوران، ہندو اور مسلم تعلیمی ادارے معدومیت کے دہانے پر تھے۔ ملک بھر میں سیاسی انتشار کی وجہ سے غیر معمولی صورتحال پیدا ہوئی تھی، جو اساتذہ اور شاگردوں میں فکری حصول کے لیے غیر موافق ثابت ہوئے۔ مزید برآں، سیاسی اقتدار کے خاتمے نے مقامی اسکولوں کو شاہی سرپرستی سے محروم کر دیا۔ 1765ء میں، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی بنگال پر قابض ہو گئی، لیکن کمپنی حکومت نے مقامی لوگوں کے لیے تعلیم کی سہولیت مہیا کرنے سے انکار کر دیا، اور اسے نجی کوششوں تک محدود رکھنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستانی افسران نے کورٹ آف ڈائریکٹرز (Court of Directors) پر زور دیا کہ وہ رعایا کی تعلیم کے لیے اقدامات اٹھائے۔ اس لیے، کمپنی حکومت نے مشرقی تعلیم کے فروغ کے لیے کچھ کوششیں کی۔ 1781ء میں، وارن ہاسٹنگز نے فارسی اور عربی کا مطالعہ کرنے کے لیے کلکتہ مدرسہ قائم کیا۔ 1791ء میں، برطانوی ریذیڈینٹ جوناتھن ڈنکن نے بنارس میں ہندوؤں کے قوانین، ادب اور مذہب کی آبیاری کے لیے ایک سنسکرت کالج قائم کیا۔ مشرقی زبانوں میں لوگوں کی تعلیم کے لیے یہ ابتدائی کوششیں زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ عیسائی مشنریوں نے سابقہ روایتی تعلیمی نظام کو بحال کرنے کی کوششوں کی مذمت کی، اور انگریزی کے ذریعے مغربی ادب اور عیسائی مذہب کی تعلیم کی وکالت کی۔ خاص طور پر، سیرام پور کے مشنری تعلیم کی ترقی کے لیے بہت پر جوش تھے۔ 1800ء میں، کمپنی کے افسران کی تربیت کے لیے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ 1813 کے چارٹر ایکٹ (Charter Act) کے مطابق ہندوستان میں جدید تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ چارٹر ایکٹ کے تحت ادب کی احیاء اور فروغ، اہل علم کی حوصلہ افزائی اور ہندوستان میں سائنسی علوم کی ترقی کے لیے ایک لاکھ روپے کا سالانہ بندوبست کیا گیا۔ ترقی پسند ہندوستانی عناصر نے بھی انگریزی اور مغربی تعلیم کی حمایت کی۔ ممتاز مستشرق ایچ۔ ٹی۔ پرنسپ نے مشرقی ادب اور معروف مستغرب چارلز ٹریولین نے انگریزی زبان و ادب کی وکالت کی۔ ایگزیکٹو کونسل کے رکن میکالے نے 2 فروری 1835 کو

تعلیمی پالیسی کے حوالے سے اپنا مشہور منٹ پیش کیا، جس میں انہوں نے مستغربین کے نقطۂ نظر کی حمایت کی۔ میکالے کا مقصد لوگوں کا ایک طبقہ تیار کرنا تھا جو "خون اور رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی، لیکن ذوق، رائے، اخلاق اور عقل کے لحاظ سے انگریز ہو"۔ دوسرے الفاظ میں وہ کمپنی انتظامیہ کے نچلے درجوں پر "بھورے رنگ کے انگریزوں" کو تیار کرنا چاہتے تھے۔

1854ء میں، چارلز ووڈ نے مستقبل کے لیے تعلیم کی ایک جامع اسکیم پیش کی، جسے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا میگنا کارٹا سمجھا جاتا ہے۔ اس اسکیم نے اعلیٰ تعلیم، مغربی تعلیم، مقامی زبان، نجی تعلیم، تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم، اساتذہ کی تعلیم و تربیت اور تعلیم نسواں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد ہی جے۔ ای۔ ڈی۔ بیتھون کی کوششوں سے ہندوستان میں لڑکیوں کے اسکول قائم ہوئے۔ 1882 میں، ہنٹر کمیشن کے ذریعے پرائمری اور ثانوی تعلیم کو بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے علاوہ، کمیشن نے اسکولوں کے لیے سرکاری امداد کو بڑھانے اور امداد یافتہ اسکولوں کی حیثیت اور مراعات کی بڑھوتری پر زور دیا۔ 1917ء میں، سیڈلر کمیشن نے کلکتہ یونیورسٹی کے حالات اور مستقبل کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے خواتین کی تعلیم کے لیے سہولیات میں توسیع کی ضرورت پر زور دیا، اور کلکتہ یونیورسٹی میں خواتین کی تعلیم کے خصوصی بورڈ کے قیام کی سفارش کی۔ 1937 میں، ایم۔ کے۔ گاندھی نے ایک خصوصی تعلیمی پروگرام (جسے وردھا اسکیم کے نام سے جانا جاتا ہے) پیش کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ آٹھ سے چودہ سال کی عمر کے بچوں کو ان کی متعلقہ مقامی زبانوں میں مفت اور لازمی تعلیم فراہم کی جائے گی۔ "کماتے وقت سیکھو اور سیکھتے وقت کماؤ" گاندھیائی تعلیم کا اہم اصول تھا۔

درحقیقت، مختلف مقاصد کے ساتھ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا، اور اس کی مسلسل توسیع جاری رہی۔ عیسائی مشنریوں کے لیے، تعلیم ہندوستانیوں کے مذہب و عقیدہ تبدیل کرنے کا حربہ تھا۔ افادیت پسندوں کے لیے یہ برطانیہ کے نوآبادیاتی مشن کی حتمی تکمیل تھی۔ جیسا کہ 1815ء میں لارڈ مویرا (Lord Moira) نے کہا تھا کہ "مقامی باشندوں کو تعلیم دینا ہمارا اخلاقی فرض ہے"۔ دوسری طرف، انیسویں صدی کے آغاز سے ہی برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی انتظامی ڈھانچے کے نچلے درجوں پر ہندوستانیوں کو فائز کر کے حکومتی خرچات کو کم کرنا چاہتی تھی۔ ان کو انگریزی زبان سے متعلق مناسب تعلیم دی گئی تاکہ وہ ماتحت عہدوں پر عوامی خدمات انجام دینے کے اہل بن جائے۔ اس طرح، نوآبادیاتی حکومت نے ہندوستانی رعایا میں وفاداری کا جذبہ پیدا کیا اور اپنا تہذیبی مشن جاری رکھا۔ گوری وشوناتھن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوآبادیاتی تعلیمی نظام نے مقامی لوگوں میں محنت، استعداد، اعتماد اور اطاعت کو یقینی بنانے کے لیے نصاب میں انگریزی ادبی علوم کو ایک آلہ کے طور پر استعمال کیا۔

16.3 برطانوی ہندوستان میں تعلیم نسواں (Women's Education in British-India)

ابتدائی نوآبادیاتی ہند میں، تعلیم کچھ خاص اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ لوگوں کو تعلیمی حقوق فراہم کرنے کے لیے نہ کوئی قانون تھا اور نہ ہی شر پسندوں سے نمٹنے کے لیے کوئی موثر انتظامی مشینری تھی۔ اسکول جانے والے عمر کے بچوں میں سے سبع ثمانیہ (7/8th) کسی بھی قسم کے اسکول میں نہیں جاتے تھے۔ اس لیے تعلیم کو تمام طبقوں کی پہنچ میں لانے اور اسے استفادہ حاصل کرنے کے لیے کئی سلسلہ وار

کوششیں کی گئی۔ جب برطانوی حکومت نے ہندوستان کے لوگوں کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کی تو اسے مذہب، ذات، زبان، نسل، رسم ورواج اور تعلیم نسواں جیسے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طرح، ہندوستان میں تعلیم نسواں کے ارتقاء اور ارتقا کو شروع سے ہی عجیب وغریب مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مردوں کے ذریعے مادی فوائد حاصل کرنے کی مضبوط ترغیب نے لڑکوں کی تعلیم کے لیے راستہ ہموار کیا، جو تعلیم نسواں کے معاملے میں نقصان دہ ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ، ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرف سے لڑکیوں کو الگ رکھنے کے رواج نے سرکاری اسکولوں میں تعلیم نسواں کے لیے مضبوط رکاوٹیں کھڑی کی۔ مزید برآں، ہندوستانی والدین اکثر اپنی بیٹیوں کی تعلیم کے حوالے سے عمومی بے حسی کا مظاہرہ کرتے تھے۔

16.3.1 1854 سے قبل تعلیم نسواں (Women's Education before 1854)

انیسویں صدی کے پہلے نصف میں، عیسائی مشنریوں اور چند ہندوستانی اشراف خاندانوں نے خواتین کی تعلیم کے لیے متعدد اسکول قائم کیے۔ قدامت پسند لوگ تعلیم نسواں کے مخالف تھے، لیکن مغربی تعلیم یافتہ اور آزاد خیال ہندوستانی تعلیم نسواں کے حامی ثابت ہوگئے۔ رام موہن رائے تعلیم نسواں کے بہت بڑے حامی تھے، اور برہمو سماج نے بھی اس سلسلے میں بہت تعاون کیا۔ 1813ء کے چارٹر ایکٹ کے مطابق، ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں محرّرین (clerks) اور مترجمین کی ابھرتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مغربی تعلیم کو متعارف کیا۔ 1835ء میں میکالے کے ذریعے پیش کیے گئے منٹ کے مطابق، انگریزی سرکاری زبان بن گئی۔ 1844ء میں لارڈ ہارڈنگ نے اعلان کیا کہ انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سرکاری تقرریوں کے لیے ترجیح دی جائے گی۔ تاجروں نے اس پالیسی کی حمایت کی، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے ہندوستانیوں میں ایک وفادار طبقے کو فروغ دینے میں مدد ملے گی۔ عیسائی مشنریوں نے بھی اس فرمان کو تسلیم کیا، کیونکہ اس کی وجہ سے عیسائیت کی تعلیمات کو پھیلانے میں آسانی پیدا ہوسکتی تھی۔ آزاد خیال لوگوں نے مغربی تعلیم، فلسفے اور ادب کو ایک تہذیبی عمل کے طور پر قبول کیا۔ حالانکہ انیسویں صدی کے اواخر سے برطانوی حکمرانوں کو تعلیم کے خطرناک پہلوؤں یعنی قوم پرستی اور سیاسی بدامنی کا سامنا کرنا پڑا۔

برطانوی حکومت کی طرف سے انگریزی تعلیم کی سرپرستی سے پہلے، ہندوستانی اصلاح کاروں جیسے رام موہن رائے اور رادھاکانت دیب نے 1816ء میں کلکتہ ہندو کالج قائم کیا تھا۔ اس کالج کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی میں منافع بخش عہدوں کے لیے ہندوستانی نوجوانوں کو تیار کرنا تھا۔ ہندو کالج اور اسی طرح کے دیگر اسکول مالدار ہندوستانیوں کی سرپرستی پر منحصر تھے۔ لڑکوں کے لیے اسکولوں کی حمایت کے برعکس، تعلیم نسواں میں بہت کم دلچسپی پائی جاتی تھی۔ عیسائی مشنریوں اور آزاد خیال لوگوں کے دباؤ کے باوجود، نوآبادیاتی حکومت خواتین کی تعلیم سے بے پرواہ تھی۔ عیسائی مشنری تعلیم نسواں اور لڑکیوں کے اسکولوں میں دلچسپی رکھتے تھے، کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ سماجی تبدیلی لانے کے لیے خواتین کو تعلیم کے دائرے میں لانا ضروری ہے۔ چونکہ مرد حضرات مشیروں اور فیصلہ کاروں کا کردار ادا کر رہے تھے، اس لیے خواتین کی تعلیم محکومیت کا شکار ہوگئی۔

بنگال میں تعلیم سے متعلق ایک رپورٹ (1836) میں ولیم ایڈم لکھتے ہیں کہ 'توہم پرستی کا احساس مبینہ طور پر ہندو گھرانوں میں اکثر پایا جاتا تھا جس کو خواتین پسند کرتی تھیں اور مرد کبھی حوصلہ شکنی نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جو لڑکی پڑھنا لکھنا سیکھ لیتی ہے وہ شادی کے فوراً بعد بیوہ ہو جاتی ہے۔ ایڈم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ خوف پر بھی تبصرہ کیا کہ علم اور بیداری خواتین کو سازشی اور دغا باز بنا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ، کچھ جگہوں پر خواتین بھی نسوانی آزادی اور تعلیم نسواں کے خلاف تھے۔ جیسا کہ مارگریٹ پرناؤ شاہی ریاست حیدرآباد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ لڑکیوں کی مائیں آزادی کی شدید خواہش رکھتی تھیں، اگر اپنے لیے نہیں، تو آنے والی نسلوں کے لیے، لیکن پھر بھی وہ کبھی پردے کے نظام کو بدلنے کی خواہش نہیں کر سکتی تھیں۔'

تعلیم نسواں سے متعلق ایک نئی سوچ پیدا کرنے میں متعدد جرائد جیسے "بمابودھینی" (امیش چندر)، "مہیلا" (گریش چندر سین)، 'بھارت مہیلا' (بسنتی مائیکرا)، تہذیب النّسواں (مولوی محب حسین)، وغیرہ نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ پرارتھنا سماج (1867)، دکن ایجوکیشن سوسائٹی (1884) اور تھیوسوفیکل سوسائٹی (1875) کا تعاون بھی اس سلسلے میں خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔

16.3.2 تعلیم نسواں کے تعارف میں عیسائی مشنریوں کا کردار

(The Role of Christian Missionaries in the Introduction of Women's Education)

انیسویں صدی کے اوائل میں تعلیم نسواں کی ترقی کی طرف پہلا قدم انسان دوست (Philanthropist) کارکنوں اور عیسائی مشنریوں نے اٹھایا تھا۔ 1815ء میں، جے۔ ای۔ ڈی۔ بیتھون نے کلکتہ میں مشہور بیتھون اسکول کی بنیاد رکھی۔ 1820 میں، ڈیوڈ ہیئر نے کلکتہ میں گرلز اسکول قائم کیا تھا۔ 1848ء میں، پیٹرسن کی کاوشوں سے بمبئی میں کئی اسکول قائم کیے گئے۔ لیکن ہندو اور مسلم والدین اپنی بیٹیوں کو ان اسکولوں میں بھیجنے سے کتراتے تھے۔ اس دوران، مدراس پریذیڈنسی کو خواتین کی تعلیم میں برتری حاصل تھی۔ 1821ء میں، چرچ مشنری سوسائٹی نے تیرونل ویلی میں لڑکیوں کے لیے پہلا سیکنڈری اسکول قائم کیا۔ 1840ء میں، ریورنڈ آئزک ولسن اور ان کی اہلیہ کی مدد سے، سکاٹش چرچ سوسائٹی نے مدراس میں ہندو لڑکیوں کے لیے چھ اسکول شروع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ 1845ء میں، جزوی طور پر مقامی انتظام کے تحت ایک اور گرلز اسکول مدراس میں قائم کیا گیا۔ 1854 میں، عیسائی مشنریوں کے زیر انتظام اسکولوں میں غالباً سات ہزار لڑکیاں زیر تعلیم تھیں، جن میں زیادہ تر مقامی عیسائی اور اعلیٰ ذاتوں سے تعلق رکھنے والے ہندو تھے۔ سکول آف دی فری چرچ آف سکاٹ لینڈ میں بھی طلباء کی تعداد 1843ء میں نو (9) سے بڑھ کر 1854 میں 700 ہو گئی تھی۔ اس طرح، 1854 کے مراسلے کی اشاعت سے پہلے، ہندوستان میں تعلیم نسواں نے مخلص انداز سے کام کرنا سروع کیا تھا، اور اعلیٰ ذاتوں نے اس میں شرکت کرنے میں سبقت حاصل کی تھی۔

1840 کی دہائی میں، خواتین عیسائی مشنری ہندوستان میں آگئیں، اور انہیں خواتین اور بچوں کو تعلیم دینے کا کام سونپا گیا۔ یہ تعلیم یافتہ مشنری خواتین بالغ شادی شدہ ہندوستانی خواتین کو عیسائیت میں تبدیل کرنے کی خواہش مند تھیں۔ وہ اساتذہ کے طور پر گھروں میں داخل

ہو گئے، اور خواتین کو سوئی کا کام سکھایا اور انہیں عیسائیت کا پیغام سنایا۔ لیکن، وہ ان بالغ خواتین کو عیسائی بنانے میں ناکام رہے۔ جب یہ منصوبہ ناکام ہوا، تو تب عیسائی مشنریوں نے لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کیے۔ مشنری خواتین ان اسکولوں میں پڑھاتی رہیں؛ اور ان کی طالبات ہندو اور عیسائی خاندانوں سے تعلق رکھنے والی ہندوستانی خواتین تھیں، جنھوں نے آنے والے وقت میں لڑکیوں کے اسکولوں میں اساتذہ کی حیثیت سے کام کیا۔

16.3.3 ڈلہوزی اور چارلز ووڈ کا مراسلہ (Dalhousie and Charles Wood's Despatch, 1854)

1849ء تک، برطانوی حکومت نے تعلیم نسواں کے موضوع پر کوئی غور نہیں کیا۔ 1849ء میں، لارڈ ڈلہوزی نے بنگال کونسل آف ایجوکیشن کو تعلیم نسواں پر توجہ مرکوز کرنے کے لیے زور دیا۔ اس کے فوراً بعد بیتھون اسکول کو برطانوی حکومت نے تسلیم کیا، اور اسے گرلز اسکول کا درجہ دیا۔ 1854ء میں، ہندوستان میں لڑکیوں کے تقریباً 626 اسکول قائم تھے) بنگال: 288، مدراس: 256، بمبئی: 65، اور NWFP اور اودھ: 17 (جن میں 21755 طالبات زیر تعلیم تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسکول بہت کم تھے اور تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کی تعداد بھی کل آبادی سے بہت کم تھی۔

گورنر جنرل ڈلہوزی (1848-1856) نے اس بات پر زور دیا کہ تعلیم نسواں سماج میں تبدیلی لانے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ 1854ء میں، بورڈ آف کنٹرول (Board of Control) کے صدر چارلز ووڈ (1853-1855) نے تعلیم سے متعلق ایک مراسلہ پیش کیا، جس میں حکومت کی تعلیمی پالیسی میں تبدیلی کی نمائندگی کی گئی۔ اس نئی پالیسی کے مطابق اشراف طبقے کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کو بھی (مقامی زبانوں میں) تعلیم دینے کا اعلان کیا گیا۔ چارلز ووڈ کے مراسلے نے ہندوستان کے تعلیمی نظام میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اس اسکیم میں مغربی تعلیم اور تعلیم نسواں کے علاوہ، جدید تعلیم کے متعدد عناصر کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ 1854ء کے مراسلے میں یہ ہدایت بھی دی گئی کی کہ تعلیم نسواں کو حکومت کی طرف سے ہمدردانہ تعاون حاصل ہونا چاہیے۔ اس اسکیم میں تعلیم نسواں کی توسیع اور بہتری کے لیے کئی تجاویز پیش کیے گئے، جس میں نجی تعلیمی اداروں کے لیے مالی امداد، طلباء و طالبات کے لیے اسکالرشپ، وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح، 1854 کے مراسلے کے بعد تعلیمی اداروں میں لڑکیوں کی تعداد کافی حد تک بڑھ گئی، لیکن اب بھی ایک ہزار میں سے صرف سات لڑکیاں لکھنا اور پڑھنا جانتی تھی۔

نو آبادیاتی حکومت کی اخلاقی اور مالی مدد تعلیم نسواں کی ارتقاء، ارتقا اور نشو و نما کے لیے ضروری تھی۔ لیکن حکومت نے لڑکیوں کے لیے اسکول تعمیر کرنے کی کوئی ضمانت نہیں دے دی۔ اس کے علاوہ، مردوں کی تعلیم کے برعکس، خواتین کی تعلیم نے خاندان کے وقار اور مالی حیثیت میں اضافہ نہیں کیا۔ علاوہ ازیں، ہندوستان کے سماج اور رسم و رواج نے برطانوی طرز کے اسکولوں کے قیام کو مشکل بنا دیا۔ جنسی علیحدگی اور مکمل تنہائی کے گہرے تصورات نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ لڑکیوں کو علیحدہ تعلیمی اداروں میں خواتین اساتذہ کے ذریعے تعلیم دی جائے۔ مزید برآں، موجودہ دور کی کمسن شادیوں سے بھی تعلیم نسواں متاثر ہو جاتی تھی؛ اور گھریلو کام کاج اور بچوں کی پرورش نے بھی لڑکیوں

کی تعلیم پر گہرا اثر ڈالا۔ اگرچہ 1854 کے مراسلے نے تعلیم نسواں پر زور دیا، لیکن یہ اس کے فروغ کے طریقوں اور سلیقوں کے بارے میں خاموش رہا۔ مراسلے کی منظوری کے چودہ سال بعد بھی فورٹ سینٹ جارج میں حکومت کے پاس تعلیم نسواں کی عمل آوری کے لیے کوئی ٹھوس انتظام نہیں تھا۔ حالانکہ، اس مراسلے کے ذریعے قائم کی گئی مدراس، بمبئی اور کلکتہ یونیورسٹیوں نے تعلیم نسواں کی طرف خصوصی توجہ دے دی۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ 1870 کی دہائی تک جو خواتین پڑھنا لکھنا سیکھ چکی تھیں وہ دوسری عورتوں سے اپنی پڑھائی کے کارنامے چھپاتی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مائیں بیٹیوں کے ساتھ اکثر نرمی برتتی تھیں، لیکن سسرال میں لڑکیوں کے ساتھ ایسی ہمدردی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی کہ انہیں پڑھنے اور لکھنے کے لیے وقت دیا جائے۔ اسی لیے جو خواتین تعلیم کی شدید مخالفت کرتی تھیں، ان کے اندر تعلیم نسواں سے متعلق مثبت خیالات پانا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ، خواتین پدر شاہی نظام کے مروجہ ضابطوں کی مخالفت کرنے کی حالت میں بھی نہیں تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ سابقہ سماجی صورتحال قائم رہے، اور وہ اپنے درمیان کسی بھی تعلیم یافتہ شخص کو شک کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم نسواں کا عمل غالباً 1870 کی دہائی تک سست رفتاری سے کام کر رہا تھا، لیکن اس کے بعد اس عمل میں ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ 1870 کی دہائی تک، مندرجہ ذیل عوامل کی وجہ سے تعلیم نسواں جمود اور انحطاط کا شکار رہی :

- ہندوستانی لوگوں کی قدامت پسندی۔
- ہندوستانی والدین میں تعلیم نسواں کی عدم دلچسپی۔
- کمسن شادیاں۔
- خواتین اساتذہ کی کمی۔
- خواتین اساتذہ کے لیے تربیتی اسکولوں کا فقدان۔
- مالی امداد کی قلت۔

16.3.4 ہنٹر کمیشن کے بعد تعلیم نسواں کا ارتقاء اور نشوونما

(Rise and Development of Women's Education after the Hunter Commission)

1849ء میں بیتھون اسکول کے قیام سے لے کر 1882 کے انڈین ایجوکیشن (ہنٹر) کمیشن کے شائع ہونے تک، لڑکیوں کے لیے پرائمری اسکولوں اور اساتذہ کے لیے تربیتی اداروں کے قیام کے لیے کئی سنجیدہ اقدامات اٹھائے گئے۔ اس کمیشن کے پاس ہونے کے بعد بھی خواتین کے لیے اعلیٰ تعلیم اور مخلوط تعلیم متنازعہ تصور کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ، 1880 کی دہائی میں بھی اسکول جانے والی لڑکیوں کی آبادی میں تقریباً 98 فیصد لڑکیاں اسکول نہیں جاتی تھیں۔ اس لیے، تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے ہنٹر کمیشن نے مندرجہ ذیل سفارشات

پیش کیے :

- لڑکوں کے اسکولوں کے مقابلے میں لڑکیوں کے اسکولوں کے لیے زائد مالی امداد کی فراہمی۔
- مالی امداد (Grants-in-Aid) اسکیم کے قوانین کو آسان بنایا گیا۔
- اس میں امداد یافتہ اسکولوں کی حیثیت اور مراعات سرکاری اسکولوں کے مساوی تسلیم کرنے کی سفارش کی گئی۔
- کمیشن نے اس بات پر زور دیا کہ لڑکیوں کو پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی جائے اور خواتین اساتذہ کے لیے تربیتی اسکول قائم کیے جائیں۔
- قابل لڑکیوں کو وظائف یا اسکالر شپ دی جانی چاہیے تاکہ وہ اپنی اعلیٰ تعلیم جاری رکھ سکیں۔
- اسکول انتظامیہ کو لڑکیوں کے لیے اقامت خانوں کا انتظام کرنا چاہئے، تاکہ وہ تعلیم کی طرف راغب ہو جائے۔
- لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے نصاب مختلف ہونا چاہیے کیونکہ جو ہدایت لڑکوں کے لیے مفید ہے وہی لڑکیوں کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔
- مقامی، میونسپل اور صوبائی فنڈز لڑکوں اور لڑکیوں کے اسکولوں پر یکساں تناسب میں خرچ کیے جانے چاہیے۔
- حکومت کی طرف سے فراہم کردہ امداد سے نجی تنظیموں کے ذریعے ثانوی اسکول قائم کیے جاسکتے ہیں۔ ایسے نجی اسکولوں کی رہنمائی کے لیے ہر ضلع میں حکومت کے زیر انتظام ماڈل اسکول کھولے جائیں گے۔
- مشنری اسکولوں کی حوصلہ شکنی کی گئی، اور برطانوی راج کے ذریعے نجی اسکولوں کے قیام میں ہندوستانی لوگوں کی شرکت کی درخواست کی گئی۔

آنے والی دو دہائیوں میں اعلیٰ تعلیم میں تیزی سے توسیع ہوئی۔ 1881-82ء میں، ہندوستانی یونیورسٹیوں میں صرف چھ لڑکیاں زیر تعلیم تھیں، جن کا تعداد انیسویں صدی کے اختتام پر 264 تک پہنچ چکا تھا۔ اسی مدت کے دوران، ثانوی اسکولوں میں طالبات کی تعداد 2054 سے بڑھ کر 41582 ہوگئی۔ ہنٹر کمیشن کے بعد ہندوستانی یونیورسٹیوں نے لڑکوں اور لڑکیوں کو یکساں طور پر داخلہ دینا شروع کیا۔ اس دوران خواتین اپنی اعلیٰ تعلیم لڑکوں کے کالجوں اور لڑکیوں کے خصوصی کالجوں میں حاصل کرتے تھے۔

16.3.5 1901-02 کی پنج سالہ رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں تعلیم نسواں کی ترقی

(Growth of Women's Education in India According to the Quinquennial Report of 1901-02)

1901-02 میں لڑکیوں کے کالجوں کی تعداد بڑھ کر 12 ہو گئی تھی جن میں سے تین مدراس میں، تین بنگال میں اور چھ متحدہ صوبوں میں قائم تھے۔ ان خواتین کالجوں اور طالبات سے متعلق مزید تفصیلات مندرجہ ذیل ہیں:

- مدراس میں تین کالج تھے۔ پہلا، سارہ ٹکر کالج، پالم کوٹہ (1864) تھا، جسے 1896 میں کالج کا درجہ دیا گیا۔ باقی دو یعنی پریزنٹیشن کانونٹ کالج، ویپری اور سینٹ میری پریزنٹیشن کانونٹ کالج، بلیک ٹاؤن مدراس کے مشہور کیتھولک کانونٹ اسکول تھے جنہوں نے کالج کی کلاسیں متعارف کروائی تھیں۔ 1901-02 میں، تینوں کالجوں میں صرف دس طالبات زیر تعلیم تھیں۔
- بنگال کے تینوں کالج کلکتہ میں واقع تھے۔ 1849ء میں، بیتھون کالج ایک اسکول کے طور پر قائم کیا گیا تھا، اور 1888 میں اسے کلکتہ یونیورسٹی سے منسلک کیا گیا۔ اس کالج کی طالبات میں مقامی عیسائی، برہمو اور ہندو شامل تھے۔ بنگال میں لڑکیوں کے لیے دوسرا کالج مارٹنیئر کالج تھا۔ یہ کلکتہ مارٹنیئر انسٹی ٹیوٹ کی ایک شاخ تھی۔ اس کے علاوہ، لوریٹو ہاؤس اسکول، ایک کیتھولک گرلز اسکول تھا، جس میں کالج کا ایک چھوٹا سا شعبہ قائم تھا۔
- متحدہ صوبوں میں لکھنؤ کا ازابیلا تھوبرن کالج قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ، متحدہ صوبوں میں پانچ دیگر یورپی اور یوریشین گرلز اسکول تھے جن میں کالج کے الگ شعبے قائم تھے۔
- بمبئی اور برما میں کوئی زنانہ کالج نہیں تھا، اور ان علاقوں کی لڑکیاں لڑکوں کے کالجوں میں زیر تعلیم تھیں۔
- بارہ کالجوں میں زیر تعلیم 177 طالبات میں سے، 102 یورپی اور یوریشین، 32 مقامی عیسائی، 3 برہمن، 23 غیر برہمن ہندو، 16 پارسی، 1 غیر طبقاتی اور مسلمان کوئی بھی نہیں تھی۔

S. No	Province	Number of Colleges	Students
1	Madras	3	35
2	Bombay	-	30
3	Bengal	3	55
4	United Provinces	6	49
5	Burma	-	8
6	Total	12	177

Table Representing the Number of Female Colleges and Students in British-India in 1901–02
Source: R. Nathan, *Progress of Education in India 1897–98 to 1901–02* (Vol. II), Office of the Superintendent of Government Printing, India, 1904, p. 299.

اس کے علاوہ، 1896-97 میں لڑکیوں کے لیے 434 سیکنڈری اسکول تھے جو 1891-92 میں بڑھ کر 440 اور 1901-02 میں 461 ہو گئے۔ ان سیکنڈری اسکولوں میں 100 ہائی اسکول، 158 مڈل اسکول اور 203 مڈل ورنا کولر اسکول شامل تھے۔ مذکورہ تمام گرلز اسکولوں میں 41616 لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔ لیکن تمام اسکولوں میں لڑکیوں کی کل تعداد 44695 تھی۔ لڑکیوں کے اسکولوں کا نصاب لڑکوں کے اسکولوں کے مطابق بنایا گیا تھا، جب کہ مڈل اسکولوں کے نصاب میں کچھ تبدیلیاں لائی گئی۔ جہاں تک میٹرک کے نصاب کا تعلق ہے تو کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں لڑکوں اور لڑکیوں کے نصاب میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس کے علاوہ، مدراس اپر سیکنڈری نصاب میں لڑکیوں کو الجبرا اور علم ہندسہ کے مضامین پڑھنے کا اختیار دیا جاتا تھا۔ تاہم، مدراس لوئر سیکنڈری نصاب میں، لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے لازمی مضامین ایک جیسے تھے، لیکن اختیاری مضامین میں لڑکیوں کے لیے سوئی کا کام اور گھریلو معیشت شامل تھیں۔ نئی بنگال ریگولیشن کے مطابق

مقامی اسکولوں میں، زرعی معلومات کے بدلے لڑکیوں کو سوئی کا کام اور لڑکوں کو علم ہندسہ پڑھایا جاتا تھا۔ جن مخلوط اسکولوں (Mixed Schools) میں سوئی کے کام کی کوئی سہولت موجود نہیں تھی، وہاں پہ طلباء کو دستی تربیت (Manual Training) دی جاتی تھی۔ اس طرح، لڑکیوں کے اسکولوں میں پڑھائے جانے والے لازمی مضامین میں تحریر، گرامر، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، گھریلو معیشت اور سوئی کا کام شامل ہیں۔ اس کے علاوہ، اختیاری مضامین جیسے دوسری مقامی زبان، فارسی، عربی، علم ہندسہ اور الجبرا اور ابتدائی سائنس میں سے دو مضامین کا انتخاب کرنا پڑتا تھا۔

مزید برآں، 1891-92 میں، لڑکیوں کے 5228 پرائمری اسکول قائم تھے، جن کی تعداد 1896-97 میں 6039 اور 1901-02 میں 5623 ہوگئی۔ لڑکیوں کے اسکولوں کے علاوہ، ہندوستان میں متعدد مخلوط اسکول تھے جن میں دونوں لڑکے اور لڑکیاں زیر تعلیم تھے۔ 1901-02 میں، برطانوی ہند کے تمام اسکولوں میں (بشمول مخلوط اسکول) 198000 لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔ اس کے علاوہ، برطانوی ہند کے متعدد نجی تعلیمی اداروں میں ترقی یافتہ اسکول، روایتی اسکول، قرآن اسکول اور ابتدائی مقامی اسکول شامل تھے۔

16.3.6 بیسویں صدی کے اوائل میں تعلیم نسواں

(Women's Education in the Early Twentieth Century)

بیسویں صدی کے آغاز پر لڑکیوں کے اسکولوں کی تعداد اور اندراج کافی بڑھ گیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام تک، تقریباً ملک کے تمام اہم علاقوں میں لڑکیوں کے لیے تعلیمی ادارے قائم ہو چکے تھے۔ طلباء اور ان کے والدین اب اپنے پسندیدہ ادارے، نصاب اور ذریعۂ تعلیم وتدریس کا انتخاب کر سکتے تھے۔ ان متبادل اختیارات نے قدامت پسندوں، آزاد خیالوں، مذہبی اور غیر مذہبی لوگوں، بنیاد پرستوں، روایت پسندوں، حامیان اور مخالفین برطانیہ کے خدشات کو کم کیا۔

1929ء کی ہیر ٹاگ کمیٹی (Hartog Committee) نے اسکول جانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے اعداد و شمار میں ایک عظیم تفاوت کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے دیہاتوں میں لڑکیوں کی پرائمری اور ثانوی تعلیم کو ناکافی اور غیر موثر پایا۔ اس کمیٹی نے لڑکیوں کے لیے نئے نصاب، بڑی تعداد میں خواتین اساتذہ کی تقرری، تعلیم نسواں سے متعلق پروگراموں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ڈپٹی ڈائریکٹر کی تقرری اور خواتین انسپکٹروں کو اچھی تنخواہوں پر تعینات کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ کمیٹی نے ملک کے مستقبل کی ماؤں کے لیے تعلیم بتدریج جبری طور پر متعارف کرانے کی بھی سفارش کی۔ اس کے علاوہ، کمیٹی نے اس بات کا بھی مشاہدہ کیا کہ مرکزی سے صوبائی حکومتوں کی طرف تعلیم کا کنٹرول منتقل کرنا کوئی دانشمندانہ قدم نہیں تھا۔

سیڈلر کمیشن (1917) نے ان ہندو اور مسلم لڑکیوں کے لیے پردہ اسکولوں کی تنظیم کی سفارش کی جن کے والدین اپنی لڑکیوں کو پندرہ یا سولہ سال تک تعلیم دینے کے لیے تیار تھے۔ اس کے علاوہ، کمیشن نے خواتین کی تعلیم کے لیے ایک خصوصی بورڈ قائم کرنے کی تجویز پیش کی، جو خاص طور پر خواتین کے لیے موزوں کورسز کی دیکھ بھال کرے۔ مزید برآں، اس نے خواتین کے کالجوں میں پڑھانے کے لیے

انتظامات کو منظم کرنے کی پیشکش کی، اور مسلمانوں کی تعلیم کی مزید حوصلہ افزائی کے لیے ہر ترغیب کا مشورہ دیا۔

1937ء میں، ایم۔ کے۔ گاندھی نے اپنے رسالے ہریجن میں مضامین کا ایک سلسلہ شائع کیا اور اسے "بنیادی تعلیم" کے نام سے تعلیم کی ایک نئی اسکیم تجویز کی، جسے وردھا اسکیم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بنیادی تعلیم کا اصول "کام کر کے سیکھنا (learning through activity)" تھا۔ ذاکر حسین کمیٹی نے اسکیم کی متعدد دستکاریوں کا تفصیلی نصاب تیار کیا اور اساتذہ کی تربیت، نگرانی، امتحان اور انتظامیہ سے متعلق تجاویز پیش کی۔ اس اسکیم میں طلباء کی مادری زبان کے ذریعے سات سالہ کورس کا تصور پیش کیا گیا۔ تعلیم کا مجوزہ نظام بتدریج اساتذہ کے لیے معاوضہ پیدا کرے گا۔ اس اسکیم کے ذریعے گاندھی نے یہ تاثر پیش کیا کہ خواندگی تعلیم کا خاتمہ نہیں ہے اور نہ ہی ابتدا ہے۔ یہ تعلیم حاصل کرنے کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ، گاندھی نے تجویز پیش کی کہ اس اسکیم کے ذریعے تعلیم یافتہ بے روزگاری کا سنگین مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ تاہم، 1939 میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی اور کانگریس نے استعفیٰ دے کر اس اسکیم کو ملتوی کر دیا۔ 1947ء کے بعد یہ کام آزاد قومی حکومت پر چھوڑ دیا گیا۔

آزادی کے موقعے پر، ملک بھر میں 17 یونیورسٹیاں اور 636 کالج تھے، جن میں 238,000 طلباء زیر تعلیم تھے؛ 5,297 سیکنڈری اسکول جن میں 870,000 طلباء تھے؛ 12,843 مڈل اسکول جن میں تقریباً 20 لاکھ طلباء تھے؛ اور 1,72,661 پرائمری اسکول، جن میں تقریباً چودہ ملین طلباء زیر تعلیم تھے۔ پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم میں کچھ خاص ترقی نہیں ہوئی تھی اور اعلیٰ سطح کی تربیت یافتہ سائنسی افرادی قوت کی فراہمی بھی محدود تھی۔ شہری اور دیہی علاقوں کے درمیان؛ مردوں اور عورتوں کے درمیان؛ اونچے اور نچلے طبقوں کے درمیان؛ اور مختلف ذاتوں اور قبائلی لوگوں کے درمیان تعلیمی سہولیات میں مساوات کا فقدان تھا۔ یہی وہ مشکل صورتحال تھی جس کو سدھارنے کے لیے حکومت ہند نے 1947 کے بعد تعلیم سے متعلق متعدد پالیسیاں بنانی شروع کی۔

16.4 خواتین کے لیے روایتی تعلیم (Traditional Education for Women)

روایتی تعلیم وہ ہے جس میں طلباء کو روایات، رسومات، مذہب اور مقدس ادب کے بارے میں پڑھایا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں، برہمنوں کو تمام مقدس کتابوں کا علم دیا جاتا تھا۔ کشتریوں اور ویشیوں کو مختلف عملی مہارتیں سکھائی جاتی تھی۔ شودروں اور زیادہ تر عورتوں کو مقدس کتابیں نہیں پڑھائی جاتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی کچھ لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ مسلمان لڑکیوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ قرآن پڑھیں اور حساب کی کچھ مہارتیں گھر پہ ہی سیکھیں۔ اعلیٰ طبقوں نے اپنی بیٹیوں کے لیے گھر پر ہی پڑھنے اور لکھنے کا انتظام کیا، لیکن قدامت پسند لوگ اپنی بیٹیوں کو پڑھنے اور لکھنے سے منع کرتے تھے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں خواتین کی شرح خواندگی مردوں کے مقابلے میں انتہائی کم تھی۔ مردوں کی شرح خواندگی بنگال میں تقریباً 6 فیصد اور دکن میں 20 فیصد تھی، جو مغربی ممالک اور جاپان کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ طلباء تین طرح کے اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ ایک۔ مقامی اسکول جہاں بچوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی اور حساب کتاب کی مہارتیں سکھائی جاتی تھی۔ دوسرا۔ اعلیٰ اسکول جہاں پر

ہندو طلباء کو سنسکرت گرامر، لغت اور ادب پڑھایا جاتا تھے۔ اور تیسرا۔ مسلمانوں کے لیے فارسی اور عربی اسکول۔ جرالڈ این فوبز لکھتی ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ پورے ہندوستان میں اس وقت کتنے اسکول تھے، لیکن اس وقت بنگال میں ہر ضلعے میں تقریباً 100 روایتی اسکول ہوا کرتے تھے۔ 1820 کی دہائی میں پونا میں 164 ہندو اسکول تھے۔ اپرنا باسو دعویٰ کرتی ہے کہ 'ہندوؤں اور مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کی وہی حالت تھی جو پرنٹنگ کی ایجاد سے پہلے یورپ میں تھی۔'

تعلیم نسواں غیر رسمی تھی اور زیادہ تر عملی معاملات تک محدود تھی۔ معزز گھرانوں کی خواتین اکثر کلاسیکی یا مقامی ادب کا مطالعہ کرتی تھیں اور اقتصادی لحاظ سے امیر گھرانوں کی لڑکیاں حساب اور ادب کا مطالعہ کرتی تھیں۔ لیکن، زیادہ تر خواتین صرف گھریلو کام کاج اور گھر پر عملائے جانے والے فنون سیکھتی تھیں۔ اس کے علاوہ، لڑکیاں ڑیوڑھیوں یا گھروں میں بھی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ لیکن یہ سلسلہ تقریباً انیسویں صدی کے اواخر میں ختم ہوگیا۔ ڑیوڑھیوں کی جگہ اسکولوں اور کالجوں نے لے لی، کیونکہ ڑیوڑھیوں کی تعلیم بہت مہنگی، بار گراں اور بڑی حد تک بے اثر ثابت ہوئی۔ جب کہ، اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم زیادہ نتیجہ خیز اور آسان ثابت ہوگئی۔ لیکن، اس نئے نظام کو جاری رکھنے کے لیے انتظامیہ کو درج ذیل مسائل کا سامنا کرنا پڑا:

- قائم کیے جانے والے اسکولوں کی نوعیت۔
- خواتین اساتذہ کی تقرری۔
- مستقبل میں کس طرح کا نصاب پڑھایا جائے گا۔
- کیا لوگ اس نظام تعلیم پر عمل کریں گے یا نہیں؟
- کیا لڑکیاں شادی کے بعد تعلیم جاری رکھ سکتی ہے یا نہیں؟

سماجی اصلاح کاروں کے علاوہ ہندوستانی سماج کے سیاسی رہنماؤں کو بھی ان سوالات کا جواب دینا تھا، جو اخلاقی اور مالی مدد فراہم کرنے سے کہیں زیادہ مشکل کام تھا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں تعلیمی نظام کو نئے سرے سے تعمیر کیا گیا، مقامی اسکولوں کو مالی امداد کی پیشکش کی گئی اور سرکاری مشورے کے ذریعے روایتی اسکولوں کو بہتر اور جدید ترین بننے کی ترغیب دی گئی۔ روایتی اسکولوں کو ریاست کی طرف سے منظور شدہ نظام تعلیم پر عمل کرنے کی ہدایات دی گئی۔ اس کوشش نے ایک خاص کامیابی حاصل کی، جس میں جگہ جگہ اور وقتاً فوقتاً بہت فرق محسوس کیا جاتا ہے۔ اس نے بہت بڑی تعداد میں مقامی تعلیمی اداروں کو ریاستی یا جدید تعلیمی نظام کے ساتھ جوڑنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کوشش کے نتیجے میں متعدد تعلیمی ادارے قائم ہوئے جن میں لڑکیوں کو جدید، روایتی اور مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔

16.5 لڑکیوں کے لیے ابتدائی اسکول (Primary Schools for Girls)

1816ء میں ہندو کالج کے قیام کے فوراً بعد تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے کلکتہ اسکول سوسائٹی قائم کی گئی۔ اس سوسائٹی کے سکریٹری رادھاکانت دیب تعلیم نسواں کے مربّی اور سرپرست بن گئے۔ ان کی حصہ رسدی کی وجہ سے کلکتہ فمیل جووینائل سوسائٹی

(1819-Calcutta Female Juvenile Society) قائم کی گئی۔ 1821 میں، کلکتہ اسکول سوسائٹی نے مس میری اینی کوک (Miss Mary Anne Cooke) کو کلکتہ بلایا، لیکن وہ اسکول قائم کرنے کے لیے رقم اکٹھا نہ کر سکی۔ چرچ مشنری سوسائٹی نے مس کوک کو ملازمت دی، اور ہندو لڑکیوں کے لیے تیس اسکول قائم کیے۔ ان اسکولوں کو ہندوؤں کی حمایت حاصل تھی اور ان میں برہمن اساتذہ کی حیثیت سے کام کرتے تھے، لیکن وہ اعلیٰ ذات کی لڑکیوں کو اسکولوں کی طرف راغب کرنے میں ناکام رہے۔ مذہبی ہدایات نے معزز خاندانوں کو ان اسکولوں میں آنے سے روکا، جب کہ نچلے طبقے یا عیسائی بچوں کو کپڑے اور دیگر اشیاء کے تحائف کے ذریعے اسکول کی طرف راغب کیا گیا۔

چرچ مشنری سوسائٹی جنوبی ہندوستان میں زیادہ کامیاب رہی جہاں اس نے 1821 میں ترونل ویلی میں لڑکیوں کے لیے پہلا بورڈنگ اسکول قائم کیا۔ 1840 تک، سکاٹش چرچ سوسائٹی نے بھی چھ اسکول قائم کیے، جن میں 200 ہندو لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں، مدراس میں عیسائی مشنری تقریباً 8000 لڑکیوں کو تعلیم دے رہے تھے، لیکن ان میں اکثریت عیسائیوں کی تھی۔ لڑکیوں کے لیے سب سے اہم اسکولوں میں سے ایک ہندو بالیکا ودیالیہ تھا، جسے 1849 میں کلکتہ میں جے۔ای۔ڈی۔ بیتھون نے قائم کیا تھا۔ بیتھون گورنر جنرل کونسل کے ایک رکن اور کونسل آف ایجوکیشن کے صدر تھے۔ یہ اسکول سیکولر تھا، اور اس میں ذریعۂ تعلیم و تدریس بنگالی تھا۔ لڑکیوں کو گاڑی کے ذریعے اسکول لے جایا جاتا تھا۔ گاڑی پر ایک سنسکرت آیت لکھی ہوتی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ بیٹی کی تعلیم باپ کا مذہبی فریضہ ہے۔ پنڈت ودیا ساگر کو اس اسکول کا سکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ 1850 میں، اس ادارے میں اسّی شاگرد زیر تعلیم تھے۔ جب 1851 میں بیتھون کی وفات ہو گئی تو اسکول کی کاروائی کافی حد تک متاثر ہو گئی۔ 1863 میں، اس اسکول میں پانچ سے سات سال کی عمر کی ترانوے لڑکیاں زیر تعلیم تھیں، جن میں سے تین چوتھائی لڑکیاں نچلے طبقوں سے وابستہ تھیں۔

16.6 اصلاحی تحریکیں اور تعلیم نسواں (Social Reform, and Women's Education)

برہمو سماج، پرارتھنا سماج، آریہ سماج اور تھیوسوفیکل سوسائٹی نے تعلیم نسواں کی حمایت کی۔ برہمو سماج کے ارکان نے تعلیم نسواں اور جنسوں کے درمیان مساوات کی بات کی۔ کیشب چندر سین نے 1861 میں تعلیم نسواں کی اہمیت کا پرچار کیا؛ اور ایک سوسائٹی قائم کی، جس نے تعلیم نسواں کی حمایت کی۔ 1865 میں، برہمو سماج نے ایک نشست میں خواتین کی تعلیم، مذہبی ہدایات، سلائی کے اسباق اور سماجی مسائل پر بات چیت کی۔

شمالی ہندوستان میں تعلیم نسواں کی حوصلہ افزائی آریہ سماج نے کی۔ آریہ سماج ایک اصلاح پسند ہندو فرقہ تھا جس کی بنیاد سوامی دیانند سرسوتی نے 1875 میں ڈالی تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں ترقی پسند آریہ سماج کے کارکنوں نے اپنے اصلاحی پروگراموں میں خواتین کو شامل کرنے کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ جلندر سماج نے 1890 میں آریہ کنیا پاٹھ شالہ (گرلز اسکول) قائم کیا۔ جلندر کا کنیا مہاودیالیہ (گرلز ہائی اسکول) کا قیام اس کے بعد عمل میں لایا گیا۔ یہ ہائی اسکول 1892 میں لالہ دیوراج کی کاوشوں سے وجود میں آگیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ تعلیم نسواں کے خیال کو مقبولیت حاصل ہوئی، اور اسکولوں میں بھی لڑکیوں کا اندراج بڑھنے لگا۔ اس ادارے نے سماج میں ایک خاص مقام حاصل کیا اور پنجاب میں خواتین کی حالت میں مختلف قسم کی تبدیلیوں کا محرک بن گیا۔

مدراس میں تھیوسوفیکل سوسائٹی نے تعلیم نسواں کی حوصلہ افزائی کی۔ تھیوسوفیکل سوسائٹی کی بانی میڈم بلواتسکی نے کم سنی کی شادی، بیوگی اور ستی کو ہندو نظریے کے غیر مطابق قرار دیا۔ اینی بیسنٹ (1847-1933) نے اس بات پر زور دیا ہے کہ قدیم زمانے میں ہندو خواتین تعلیم یافتہ ہوا کرتی تھیں، اور سماج میں ایک آزاد کردار ادا کرتی تھیں۔ انہوں نے اس سنہری دور کی واپسی پر زور دیا۔ انگلینڈ میں، بیسنٹ کو 1874 سے خواتین کی آزادی سے منسوب کیا گیا، جب انہوں نے ایک عوامی لیکچر میں تعلیم اور آزادئ نسواں کی بات کی۔ 1889ء میں، میڈم بلواتسکی کی Secret Doctrine کو پڑھنے سے پہلے اینی بیسنٹ انگلینڈ کی کئی دیگر تحریکوں سے بھی منسلک رہی۔ اینی بیسنٹ تھیوسوفیکل یا معرفت خداوندی کی تحریک میں شامل ہوگئی اور ہندوستان کو اپنا گھر بنالیا۔ 1893 میں، اینی بیسنٹ نے ہندوستان کے ماضی کی عظمت پر روشنی ڈالی، اور اسے دوبارہ حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ 1901 میں، انہوں نے "انڈین لیڈیز میگزین" میں تعلیم نسواں پر ایک مضمون لکھا۔ بیسنٹ نے لوگوں کو اس بات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ اگر خواتین کو تعلیم نہیں دی گئی تو ہندوستان کی تقدیر متاثر ہو جائے گی۔ لیکن مغربی تعلیم اس کا حل نہیں ہے۔

16.7 انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تعلیم نسواں کے نامور کارکن

(Renowned Personalities who Worked for Women's Education in Late 19th and Early 20th Centuries)

ہنٹر کمیشن کے بعد تعلیم نسواں کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں متعدد ماہرین تعلیم جیسے پنڈتا راما بائی، ماتاجی تپسوینی، ڈی۔ کے۔ کاروے، رقیہ سخاوت حسین، سوبالکشمی، وغیرہ نے بہترین کردار ادا کیا۔ یہ شخصیات بہت اہم ہیں کیونکہ یہ خواتین کے اسکولوں کی تعمیر کی نمائندگی کرتے ہیں جو مذہبی اصلاحی تنظیموں سے مختلف ہیں۔ یہ چند مثالیں خاص طور پر توجہ کے لائق ہیں کیونکہ یہ تعلیم نسواں کی تشکیل میں خواتین کی شمولیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل سطور میں ان ماہرین تعلیم کے کردار پر روشنی ڈالی جائے گی :

16.7.1 پنڈتا راما بائی (Pandita Ramabai, 1858-1922)

پنڈتا راما بائی تعلیم نسواں کی علمبردار اور حقوق النّسواں کی حامی تھی۔ جب ان کے والد اور والدہ کا انتقال ہوا تو راما بائی سولہ سال کی تھی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ خاتون، اور سنسکرت پڑھنے کے قابل تھی۔ انہوں نے اور ان کے بھائی نے تعلیم نسواں اور سماجی اصلاح کا پرچار کرتے ہوئے پورے ہندوستان کا سفر کیا۔ کلکتہ کے اشراف نے انہیں "سرسوتی (علم کی دیوی)" اور "پنڈتا" کے خطاب سے نوازا۔ بائیس سال کی عمر میں ان کی شادی بپن بہاری داس میدھوی (ذات سے شودر) کے ساتھ ہوئی۔ بیٹی کو جنم دینے کے ایک سال بعد ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد راما بائی پونا واپس آگئی اور آریہ مہیلا سماج کے ذریعے تعلیم نسواں کا پرچار کیا۔

پنڈتا رامابائی نے بمبئی میں شارداسادن یعنی بیواؤں کے لیے ایک اسکول قائم کیا۔ اس ادارے نے کچھ اونچی ذات کی ہندو بیواؤں کو اپنی طرف متوجہ کیا، جیسے گوڈو بائی جن کا نام ڈی۔ کے۔ کاروے سے شادی کے بعد آنندی بائی رکھ دیا گیا۔ 1900ء تک، شارداسادن نے اسّی خواتین کو تربیت دی تھی، جو پڑھائی یا نرسنگ کے ذریعے اپنی روزی کمانے کے قابل ہوئی۔ 1897 کے قحط کے بعد، رامابائی نے پونا سے تیس میل دور کیڈگاؤں میں مکتی (ایک اسکول) قائم کیا۔

رامابائی نے ذات پات کو ہندو سماج میں ایک بڑی خامی کے طور پر پیش کیا ہے۔ رامابائی نے تعلیم نسواں پر توجہ مرکوز کی، اور ایک اصلاحی نصاب تیار کیا۔ انہوں نے طباعت، نجاری، سلائی، مستری، بُنائی، سوئی کا کام، کاشتکاری اور باغبانی جیسے مضامین کو نصاب میں شامل کیا۔ جب انہوں نے رخما بائی کیس کے بارے میں سنا تو انہوں نے انگریزوں اور ہندوستانیوں کی سخت مذمت کی۔۔ رما بائی لکھتی ہے:

> ہمارا تعجب صرف یہ ہے کہ رخما بائی جیسی بے دفاع عورت نے طاقتور ہندو قانون، برطانوی حکومت، 129,000,000 مردوں، 330,000,000 ہندو دیوتاؤں کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت کی۔ لیکن ان سب نے مل کر رخما بائی کو کچلنے کی سازش کی۔ اس معاملے میں، ہم برطانوی حکومت پر ایک بے بس عورت کا دفاع نہ کرنے کا الزام نہیں لگا سکتے، کیونکہ وہ صرف ہندوستان کے مردوں کے ساتھ کیے گئے معاہدے کو پورا کر رہے ہیں۔

16.7.2 ماتاجی مہارانی تپسوینی (Mataji Maharani Tapasvini, 1842-1907)

1893 میں، ماتاجی مہارانی تپسوینی نے بنگال کا مہاکالی پاٹھ شالہ قائم کیا۔ اس اسکول اور اس کی بہت سی شاخوں کو تعلیم نسواں کی ترقی کے لیے ایک 'حقیقی ہندوستانی کوشش' کا نام دیا گیا ہے۔ اس اسکول کو غیر ملکیوں سے کوئی مالی امداد نہیں ملتی تھی اور نہ ہی اس اسکول میں کسی غیر ملکی کو استاد کا منصب دیا گیا۔ ادارے کے بانیوں نے خواتین کی تعلیم کے لیے برطانوی 'اسکول' ماڈل قبول کیا، لیکن مخلوط تعلیم اور دونوں جنسوں کے لیے ایک ہی نصاب کی مخالفت کی۔ ان کا مقصد لڑکیوں کو قومی تعلیم دینا تھا تاکہ وہ ہندو سماج کی دوبارہ تخلیق کر سکیں۔ جب اس ادارے میں طالبات کی تعداد بڑھ گئی، تو اس کی مالی معاونت میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا۔ اس ادارے نے بنگالی اور سنسکرت کی نصابی کتابیں شائع کی۔ یہ اسکول بے حد مقبول ہوا۔ اس ادارے کے سرپرستوں نے مذہبی احکام، گھریلو مہارتوں اور پردے پر زور دینے کی منظوری دی۔ 1948 میں، مہاکالی پاٹھ شالا کو کلکتہ یونیورسٹی سے منسلک کر دیا گیا۔ 1948 میں، اس ادارے کے نصاب میں بہت تبدیلیاں آگئی تھیں، جب کہ اس میں کچھ مذہبی رسومات اب بھی موجود تھے۔ ماتاجی مہارانی تپسوینی (گنگا بائی) دکن کی ایک برہمن خاتون تھی، جس نے سنسکرت اور مقدس مذہبی ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کا مقصد ہندو مذہبی اور اخلاقی اصولوں کے مطابق تعلیم نسواں کو فروغ دینا تھا۔ وہ خواتین کے لیے ایک مثالی تعلیم اور نصاب تیار کرنا چاہتی تھی جس میں مقدس مذہبی ادب، تاریخ، افسانے، افسانوں کی تفہیم، کھانا پکانا اور سلائی شامل ہو۔

16.7.3 ڈونڈھو کیشو کاروے (Dhondo Keshav Karve, 1858-1962)

1890 کی دہائی میں، دھونڈو کیشو کاروے نے پونا میں خواتین کے متعدد اسکول قائم کیے تھے۔ اپنی سوانح عمری، Looking

Back میں، کاروے نے اپنی ذاتی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح ان کے تجربات نے انہیں 1896 میں بیواؤں کے لیے ایک اسکول بنانے پر مجبور کیا۔ اپنی اہلیہ کی وفات کے بعد، انہوں نے 22 سالہ بیوہ (آنندی بائی)، گوڈو بائی سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے آبائی شہر میں لوگوں نے انہیں اور ان کی ماں کو ستایا۔ انہوں نے تعلیم کے ذریعے بیواؤں کو مالی طور پر خود مختار بنانے کی کوشش کی۔ 1896 میں، انہوں نے بیواؤں کے لیے ایک پناہ گاہ قائم کی جو بعد میں ایک اسکول بن گیا۔ اس اسکول کا نصاب بیواؤں کو روزگار دلانے اور خود کفیل بنانے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ کاروے نے اچھی بیویاں، اچھی مائیں اور اچھے پڑوسی تیار کرنے کے لیے مہیلا ودیالیہ (گرلز اسکول) قائم کیا۔

پاروتی بائی اتھاولی، آنندی بائی کی بیوہ بہن، نے کاروے کے اسکولوں کی ترقی اور توسیع میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی شادی گیارہ سال کی عمر میں ہوئی اور بیس سال کی عمر میں وہ بیوہ ہو گئی۔ اس کے بعد پاروتی بائی نے دوبارہ شادی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا، اور تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ کاروے کے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ایک استاد اور پھر منتظم بن گئی۔ انہوں نے مقامی زبانوں کے ذریعے تعلیم اور گھریلو دستکاریوں پر زور دینے کی کوشش کی۔ روایتی طور پر، یہ مضامین گھر کی بوڑھی عورتیں پڑھاتی اور سکھاتی تھیں۔ 1916 میں، کاروے نے خواتین کے لیے ایک اور ادارہ قائم کیا۔ انہوں نے جاپان میں خواتین کی یونیورسٹی کے بارے میں سنا تھا اور یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ مغربی ماڈل کے بجائے جاپانی ماڈل ہندوستان کے لیے زیادہ موزوں رہے گا۔ خواتین کی یونیورسٹی میں تمام مضامین مقامی زبان میں پڑھائے جائیں گے۔ 1920 میں، اس ادارے کو سر وٹھل داس ٹھاکرسی نے اپنایا۔ انہوں نے اس ادارے کو اس شرط پر پندرہ لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا کہ ادارے کا نام ان کی والدہ پر رکھا جائے۔ اس طرح، 1920 میں اس ادارے کا نام شریمتی ناتھی بائی دامودر ٹھاکرسی ویمن یونیورسٹی (S.N.D.T. Women's University, Bombay.) پڑھ گیا۔

16.7.4 بیگم روقیہ سخاوت حسین (Begum Rokeya Sakhawat Hossain, 1880-1932)

1909 میں، بیگم روقیہ سخاوت حسین نے بہار کے ضلع بھاگلپور میں مسلم لڑکیوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا۔ شوہر کی وفات کے بعد ان کو اپنی سوتیلی بیٹی نے گھر سے باہر نکالا۔ 1911 میں بیگم روقیہ نے کلکتہ میں سخاوت میموریل گرلز اسکول قائم کیا۔ یہ اسکول اردو ذریعہ تعلیم کے ساتھ پردہ کرنے والی طالبات کے لیے منظم کیا گیا تھا، جب کہ بیگم روقیہ خود پردے کی رسم کے خلاف تھی۔ بیگم روقیہ اس لحاظ سے خوش قسمت تھی کہ ان کے بڑے بھائی اور شوہر نے ان کی تعلیمی دلچسپی کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کے بڑے بھائی ان کو رات کے وقت انگریزی سکھاتے تھے۔ سید سخاوت حسین ان کے شوہر تھے، جنہوں نے مغرب میں تعلیم حاصل کی تھی۔ بیگم روقیہ نے متعدد مضامین، کہانیاں اور ناول لکھے جن میں انہوں نے خواتین کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اپنے تین مضامین، "اردھانگی (The Female Half) "، "گھرہا (The House) " اور " برقع (*Burqah* —The Veil) " میں، بیگم روقیہ نے خواتین کی غیر متناسب ترقی، معاشی ذرائع کی کمی، اور ان کی آزادی پر تبصرہ کیا۔ " سوگریھنی (The Ideal Housewife) " میں، انہوں نے اس بات کی نشاندہی کی کہ تعلیم خواتین کے روایتی کرداروں کو علمی اور پیشہ ورانہ طور پر نبھانے میں مدد کرے گی۔ مزید برآں، تعلیم خواتین کو مردوں کے ساتھ قدم بہ قدم آگے بڑھنا سکھائے گی۔

لڑکیوں کو اسکول لے جانے میں پردے کے سخت ترین اصولوں کا مشاہدہ کیا گیا تھا۔ لڑکیوں کو ایسی گاڑیوں میں اسکول لے جایا جاتا تھا جن میں ہوا کی آمد و رفت نہیں ہوتی تھی، جس کی وجہ سے ان کو گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی گھٹن کی وجہ سے لڑکیاں قے کر کے بے ہوش ہو جاتی تھیں۔ اس لیے، بیگم روقیہ نے اپنی تحریروں میں پردے کی بہت تنقید کی، تاکہ لوگ پردے کے حقیقی المیے سے آگاہ ہو جائے۔ بیگم روقیہ لکھتی ہے کہ خلوت عورتوں کے لیے صرف ایک تکلیف دہ زخم نہیں، بلکہ کاربن مونو آکسائیڈ گیس کی طرح خاموش قاتل ہے۔ اس لیے، انہوں نے کہا کہ قرآن یا شریعت میں اس رواج کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

16.7.5 سسٹر سو بالکشمی (Sister Subbalakshmi, 1886-1969)

جب بیگم روقیہ نے کلکتہ میں مسلم لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کیا، سسٹر سو بالکشمی نے مدراس میں اعلیٰ ذات کی بیواؤں کے لیے ایک اسکول شروع کیا۔ سو بالکشمی سماج کی کمسن بیواؤں کے لیے کافی فکر مند تھی۔ ان کا منصوبہ ان بد قسمت خواتین کو سماج کے قابل قدر ارکان میں تبدیل کرنا تھا۔ 11 سال کی عمر میں سو بالکشمی کی شادی ہوئی۔ شادی کے فوراً بعد ان کے شوہر کا انتقال ہوا، اور وہ ضلع تنجور کے رشیور گاؤں میں اپنے والدین کے گھر واپس آگئی۔ ان کے والدین نے ان کو اسکول بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی برادری نے اس قدر پر تشدد رد عمل ظاہر کیا کہ سو بالکشمی کے والد، سبرامنیہ ائیر نے ہجرت کرنے کا عہد کیا۔ مدراس میں، سبرامنیہ ائیر نے اپنی بیٹی کو کانونٹ اسکول بھیج دیا۔ کانونٹ اسکول میں راہبہ کی لگن نے نوجوان سو بالکشمی کو اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے اپنی زندگی بیواؤں کو تعلیم دینے کے لیے وقف کرنے کا عزم کیا۔ اگرچہ وہ ہندو تھی، لیکن ان کے کام اور لگن سے وہ لوگوں میں سسٹر سو بالکشمی کے نام سے مشہور ہو گئی۔ سو بالکشمی نے میٹرک پاس کرنے کے بعد مدراس یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ مدراس میں بی۔ اے۔ کی تعلیم حاصل کرنے والی پہلی ہندو بیوہ سو بالکشمی تھی۔ انہوں نے پہلا اسکول مدراس کے مضافاتی علاقے میں اپنے والد کے گھر میں قائم کیا۔

1914 میں، کوئین میری کالج مدراس میں خواتین کے لیے پہلے کالج کے طور پر قائم کیا گیا۔ 1922 میں، سو بالکشمی کی صدارت میں لیڈی ہلنگڈن ٹریننگ کالج اور اساتذہ کی تربیت کے لیے پریکٹس اسکول قائم کیا گیا۔ اس کالج کے ذریعے پیش کردہ پروگراموں میں: ہائی اسکول اساتذہ کے لیے پوسٹ گریجویٹ تربیت، مڈل اسکول اساتذہ کے لیے ثانوی تربیت اور ابتدائی اساتذہ کے لیے تربیت شامل ہیں۔ اس کالج میں انگریزی زبان، پیشہ ورانہ تعلیم، جسمانی تعلیم، اخلاقی اور مذہبی تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

روحانی طور پر، سو بالکشمی سوامی وویکانند اور رام کرشن مشن سے بہت متاثر تھی۔ وہ رام کرشن اور ان کے شاگرد وویکانند کو پہلے مذہبی اصلاح کاروں کے طور پر مانتی ہیں جو عورت کے مسئلے سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اگرچہ بچپن میں سو بالکشمی ایک راہبہ کی طرف متوجہ تھی، لیکن جوانی میں انہوں نے اپنی روحانی غذا اور عملی فلسفہ اصلاح شدہ ہندو مذہب سے حاصل کیا۔

16.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

یہ بات واضح ہے کہ 1840ء کی دہائی تک حکومت نے تعلیم نسواں کے لیے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا تھا، لیکن برطانوی ہند میں

کئی روایتی اور مشنری اسکول لڑکیوں کو تعلیم دے رہے تھے۔ چارلز ووڈ کے مراسلے (1854) کے ذریعے تعلیم نسواں کی نشوونما کے لیے متعدد اقدامات اٹھائے گئے۔ یہ اقدامات برطانوی ہند کی تاریخ میں کافی اہمیت کے حامل ہیں، کیونکہ ان کو تعلیم مخالف سماج میں تعلیم شروع کرنے میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہنٹر کمیشن (1882) اور سیڈلر کمیشن (1917) کی آمد سے تعلیم نسواں میں خاصی ترقی ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ متعدد خواتین کارکنوں جیسے پنڈت رامابائی، ماتاجی مہارانی تپسوینی، ڈونڈھو کیشو کاروے، روقیہ سخاوت حسین، سسٹر سوبالکشمی، وغیرہ نے تعلیم کی اصلاح اور تبلیغ کے عمل کو آگے بڑھایا۔

اس کے علاوہ، ہندوستان میں تعلیم نسواں متعارف کرنے میں برطانوی حکمرانوں کے پاس متعدد مقاصد تھے۔ دراصل، برطانوی حکمران ہندوستانی لوگوں کی وفاداری کو مزید یقینی بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے تعلیم نسواں پر اس لیے زور دیا، تاکہ برطانوی حکومت ہند کے سرکاری ملازمین کی بیویاں تعلیم یافتہ ہو۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی خواتین اپنے بچوں کی پرورش اس طرح کریں گی کہ وہ برطانوی حکومت کے حامی بن جائیں گے۔ جب کہ اس عمل سے شادی شدہ خواتین میں برطانوی وفاداری کو فروغ نہیں ملا۔ بہت سی خواتین ہندوستان میں برطانوی پالیسی کی ناقد بن گئی۔ اصلاح پسند ہندوستانی مرد ترقی پسند سماج کی تشکیل میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ خواتین اپنی برادریوں کے کمزور افراد کی مدد کریں۔ اس طرح، خواتین نے ایسے وقت میں سماجی اصلاح کا کام سنبھالا جب مرد سیاسی عمل کے جنون میں مبتلا ہو رہے تھے۔ اگرچہ تعلیم نسواں حد سے زیادہ قدامت پسند تھا، پھر بھی خواتین کے کردار کی وجہ سے غیر متوقع نتائج سامنے آگئے۔

انیسوں صدی کے اوائل میں متعدد روایتی تعلیمی ادارے قائم ہوئے تھے۔ ان اداروں کی نوعیت قدامت پسند تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان روایتی اسکولوں کے نصاب میں اور مذہبی مضامین کے علاوہ جدید مضامین بھی شامل کیے گئے۔ اس طرح، نسوانی تعلیمی نظام وقفے وقفے سے ہونے والی تبدیلیاں ماضی کے تسلسل کو شامل کرتی تھیں۔ ابتداء میں جو لڑکیاں پڑھنا چاہتی تھیں ان سے چھیڑ چھاڑ کی جاتی تھی۔ کبھی کبھار اسکول جانے والی لڑکیوں پر گلیوں میں پتھراؤ کیا جاتا تھا۔ اگر وہ لڑکوں کے اسکولوں میں پڑھنے جاتے تھے تو انہیں ہراساں کیا جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس مزاحمتی عمل کی شدت میں کمی واقع ہوئی۔ لڑکیوں نے تعلیم حاصل کی، اور پھر معلم بن گئیں۔ انیسویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی کے اوائل تک خواتین اساتذہ کے لیے کئی تربیتی ادارے قائم کیے گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک نسل کے لیے جو منحرف سلوک تھا، وہ اگلی نسل کے لیے قابل قبول رویہ بن گیا۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک ہندوستانی خواتین اپنے مستقبل کی نئی تحریک میں بھرپور حصہ لے چکی تھیں۔

16.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

تعلیم : علم حاصل کرنا، ذہنی طاقتوں کو فروغ دینا اور بالغ زندگی کے لیے خود کو فکری طور پر تیار کرنا؛ تعلیم کہلایا جاتا ہے۔

اصلاح : کسی مذہبی، سیاسی یا سماجی ادارے کو بہتر بنانے یا بدلنے کے عمل کو اصلاح کہا جاتا ہے۔

ستی : ہندوستان میں ایک سابقہ رواج جس کے مطابق ایک بیوہ عورت اپنے آپ کو اپنے شوہر کی چتا پر جلا دیتی تھی۔

ڈھیوڑھی : ایک رہائشی عمارت جہاں پر ایک استاد گھر کی ساری لڑکیوں کو پڑھاتا تھا۔

جدیدیت : جدیدیت تبدیلی کا ایک عمل ہے جس میں پسماندہ یا ترقی پذیر سماج ترقی یافتہ معاشروں کی خصوصیات کو حاصل کرتے ہیں جن میں زندگی کے طریقے اور اقدار شامل ہیں۔

16.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

16.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. کلکتہ مدرسہ کب قائم کیا گیا؟
2. میکالے منٹ کب پیش کیا گیا؟
3. بیتھون اسکول کی بنیاد کب ڈالی گئی؟
4. سارا ٹکر اسکول کو کالج کا درجہ کب دیا گیا؟
5. ازابیلا کالج کہاں پہ قائم کیا گیا تھا؟
6. *Secret Doctrine* کس کی تصنیف ہے؟
7. *Looking Back* کس کی سوانح حیات ہے؟
8. روقیہ سخاوت حسین نے کون کون سے کتاب لکھی ہے؟
9. تعلیم نسواں کے چند نامور کارکنوں کے نام تحریر کیجئے۔
10. وردھا اسکیم کب پیش کی گئی؟

16.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. برطانوی ہندوستان میں تعلیمی نظام پر ایک مضمون قلمبند کیجیے۔
2. تعلیم نسواں کے تعارف میں عیسائی مشنریوں کے کردار پر روشنی ڈالیے۔
3. ہندوستان میں خواتین کے لیے روایتی تعلیم پر ایک نوٹ تحریر کریں۔
4. برطانوی ہندوستان میں تعلیم نسواں کا ایک مختصر تعارف پیش کیجیے۔
5. بیگم روقیہ سخاوت حسین پر ایک نوٹ تحریر کریں۔

16.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں نسوانی تعلیم نظام وقفے وقفے سے ہونے والی تبدیلیاں ماضی کے تسلسل کو شامل کرتی رہی۔ بحث کیجیے۔

2. انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تعلیم نسواں کے نامور کارکنوں کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

3. تعلیم نسواں کے حوالے سے چارلز ووڈ کے مراسلے کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے۔

16.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bagal, J.C., *Women's Education in Eastern India*: *The First Phase*, The World Press Private Ltd., Calcutta, 1956.
2. Bandhopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman Private Limited, 2004.
3. Banerjee Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, 2014.
4. Basu, Aparna *Essays in the History of Indian Education*, Concept Publishing Co., 1982.
5. Cowan, Minna S., *The Education of the Women of India*, Oliphant, Anderson and Ferrrier, Edinburg, 1912.
6. Forbes, Geraldine *Women in Modern India*, Cambridge University Press, 1996.
7. Ghosh, Suresh Chandra, *History of Education in Modern India 1757-2012*, Orient Blackswan Private Limited, 1995.
8. Grover and Grover, *A New Look at Modern Indian History*, S Chand & Company Limited, 1983.
9. Nathan, R., *Progress of Education in India 1897-98 to 1901-02* (Vol. II), Office of the Superintendent of Government Printing, India, 1904.
10. Nurullah, Syed and J.P. Nayak, *History of Education in India*: *During the British Period*, Macmillan Bombay, 1943.

اکائی 17۔ سماجی-مذہبی اصلاحی تحریک کے ابھرنے کے اسباب

(Causes for the Emergence of Socio-Religious Reform Movement)

اکائی کے اجزا

17.0 تمہید

17.1 مقاصد

17.2 انیسویں صدی کے قبل سماجی مذہبی اصلاحی سرگرمیاں

17.3 انگریزی تعلیم وزبان

17.4 عیسائی مشنریوں کا کردار

17.5 پرنٹنگ پریس

17.6 اکتسابی نتائج

17.7 کلیدی الفاظ

17.8 نمونہ امتحانی سوالات

17.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

17.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

17.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

17.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

17.0 تمہید (Introduction)

انیسویں صدی کی مذہبی اور سماجی اصلاحی تحریکیں ہندوستانی تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جدید نظریات کا ظہور، سماجی احتجاج اور مذہبی اختلافات میں اضافہ انیسویں صدی میں ہندوستان میں یورپی نظریات اور اداروں کی آمد کا باعث بنا۔ اس طرح کا خیال اس نظریے کو درست ثابت کرتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کو مہذب بنایا اور مغربی علم ہندوستانیوں کے لیے ایک اعزاز ثابت ہوا۔ اس خیال کے مطابق، ہندوستانیوں نے یورپی تاریخ، اداروں اور زبانوں سے واقفیت حاصل کی اور آزادی، عقلیت پسندی اور انسان پرستی کے یورپی نظریات کے ہم آہنگ اثر کو جذب کرتے ہوئے، انہوں نے اپنے قدیم اور قدامت پسند اداروں کی طرف تنقیدی موقف اختیار کیا اور بالآخر انہیں اسباب سے سماجی مذہبی اصلاحی تحریک کی شروعات ہوئی۔ ان کے علاوہ کچھ مورخین سماجی و مذہبی تحریکوں کے عروج کو ہندوستانیوں کی ثقافتی زندگی میں مشنریوں کے کردار پر اپنی تحقیق کو توجہ مرکوز کرتے ہیں، کچھ مورخین جدید نظریات کی ترقی کا کل سہرا مغربی تعلیم کو دیتے ہیں۔ بیشتر مورخین کے اس طرح کے خیالات بلاشبہ کئی علاقائی اصلاحاتی پروگراموں کو نظرانداز کرتے ہیں جو اٹھارویں صدی میں یورپیوں کمپنیوں کی آمد سے قبل رونما ہوئیں تھیں۔ مثال کے طور پر، راجستھان میں چرنداسی فرقہ، بنگال میں کارتھاواج اور بلرامی فرقہ، اتر پردیش میں ستنامی، اپاپنتھی اور شیو نارائن فرقہ وغیرہ جیسے علاقائی فرقوں نے اس زمانے میں پھیلی ہوئی سماجی و مذہبی برائیوں جیسے بت پرستی، شرک اور ذات پرستی وغیرہ کی مذمت کی۔ اس طرح کی اصلاحی مہمات غیر ملکی اثر و رسوخ سے آزاد سماجی اصلاحی تحریکوں کے ابھرنے کی گواہی دیتی ہیں۔ تاہم مغربی ثقافت کے اثرات اور برطانوی راج کی حمایت نے اسے تحریکی شکل میں تبدیل کراُن میں بہت شدت پیدا کی اور اٹھارویں صدی کی علاقائی اصلاحی تحریکیں جس کامیابی سے محروم تھیں انیسویں صدی میں اس پر قابو پالیا۔ اس اکائی میں مذکورہ بالا سماجی و مذہبی اصلاحی تحریکوں کی وجوہات پر مطالعہ پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

17.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- آپ 19ویں صدی سے قبل اٹھارہویں صدی کی کچھ مقامی سماجی اور مذہبی تحریکوں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- آپ ہندوستانی سماج پر مغربی تعلیم کے اثرات و نتائج سے سماجی و مذہبی تحریکوں کے آغاز کی نشاندہی کر سکیں گے۔
- سماجی مذہبی تحریکوں میں عیسائی مشنریوں کے کردار اور ان کے اثرات کو سمجھ سکیں گے۔
- ہم پریس کی شروعات اور اس کے ذریعے ہندوستان میں مختلف اخبارات اور رسائل کی ترقی اور سماج پر ان کے اثرات کو جانیں گے۔

17.2 انیسویں صدی کے قبل سماجی مذہبی اصلاحی سرگرمیاں

(Socio-religious Reformist Activities before the Nineteenth Century)

اورنگ زیب کی موت کے بعد ہندوستان کا انتظامی ڈھانچہ گرنا شروع ہو گیا تھا، انگریزوں کی آمد نے اسے اور کمزور کیا اور بالآخر اسے

منہدم کر دیا۔ ملک میں جیسے جیسے انگریزوں کا تسلط بڑھتا گیا، استحصال کی رفتار بھی پروان چڑھتی گئی اور ملک کی معاشی بنیادیں ہلنے لگی۔ ہندوستان کی سماجی زندگی پر بھی اس کا گہرا نقصان دہ اثر پڑا۔ نئی حکومت میں عوامی فلاح و بہبود کے عناصر کا فقدان تھا، اس لیے اس کی طرف سے ملک کی حالت بہتر بنانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ ایسے میں معاشی غربت کے ساتھ ساتھ سماجی برائیاں، تفریق اور مذہبی توہمات میں اضافہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک ہندوستان غربت اور پسماندگی کی آخری حد تک پہنچ چکا تھا۔ عام طور پر ان دونوں قوتوں کے مشترکہ اثر و رسوخ کی وجہ سے انیسویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان کی سماجی اور ثقافتی زندگی میں ایک تحریک شروع ہوئی اور پورے ہندوستان میں ایک بیداری پیدا ہوئی جسے بعض اہل علم نے ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا نام دیا ہے۔ اس تحریک کی اور بھی بہت سی وجوہات تھیں۔ ان وجوہات پر روشنی ڈالنے سے پہلے، ہم اٹھارویں صدی کی کچھ مندرجہ بالا علاقائی اصلاحی مہموں کے بارے میں جانیں گے، جو اس بات کی گواہ ہیں کہ ہندوستان میں سماجی اصلاح کی تحریک واحد انگریزوں کی آمد یا مغربی تہذیب و ثقافت کے اثرات کی وجہ سے ہی شروع نہیں ہوئی۔

18 ویں صدی میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مقامی فرقوں نے سماج میں پھیلی برائیوں اور توہمات کے خلاف مہم شروع کی۔ اس کی مثالیں اتر پردیش میں ستنامی، اپاپنتھی اور شیو نارائن فرقے، بنگال میں کارتھاواج اور بلرامی فرقے، راجستھان میں چرنداسی فرقہ، اور آندھرا پردیش میں ویربراہما فرقہ ہیں۔ کارتھاواج فرقے کے لوگ سال میں دو بار جلسے کرتے اور جہاں ہر قسم کے ذات پات کے فرق کو ترک کر دیا جاتا تھا۔ سب ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور ایک دوسرے کو بھائی بہن کہکر پکارتے تھے۔ اسی طرح چرنداسی فرقہ بت پرستی اور ذات پات کی مخالفت کے لیے ویدوں کا حوالہ دیا کرتا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ عام آدمی کے مفاد کے لیے ہندی میں ویدک سچائی کا پرچار کر رہے تھے۔ وہ ہر قسم کی رسومات کے خلاف تھے۔ انیسویں صدی کے سماجی مصلحین کی طرح ان جماعتوں نے ذاتی کردار کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ یہ درست ہے کہ ان سماجی و مذہبی مصلحین کی تنظیم اور کام انیسویں صدی کی مذہبی تحریکوں سے مختلف تھا، لیکن اس وجہ سے ان کے مہم کو سماجی اہمیت سے عاری انفرادی بغاوت کے طور پر مسترد کرنا، ان کے بنیادی نظریات کو سمجھنے حقیقی تصور نہیں جائے گا۔ لوگوں کی مذہبی زندگی میں جو ان دنوں توہمات اور پروہتوں کے مظالم سے بھری ہوئی تھی، بنیادی طور پر بڑھتے ہوئے مخالفت اور اختلاف کے رجحان کے طور پر انہیں لینا ہوگا اور اسی بنیاد پر ان کا جائزہ لینا صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح کی اصلاحات، غیر ملکی اثر و رسوخ سے آزاد سماجی اصلاحی تحریکوں کی شروعات کی گواہی دیتی ہیں۔

17.3 انگریزی تعلیم کے اثرات (Influence of English Education)

انیسویں صدی کے تقریباً تمام دانشوروں کا خیال تھا کہ اس صدی میں رائج سماجی رسومات اور مذہبی عقائد نے ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ شرک اور بت پرستی، شخصیت کی نشوونما میں رکاوٹ تھی اور مافوق الفطرت اور مذہبی پروہتوں کے غلبے کی وجہ سے لوگوں میں ایک خوفناک قدامت پرستی نے جڑ پکڑ لی ہے۔ ذات پات سے نفرت نہ صرف اخلاقیات اور طرز عمل کے اصولوں کی بنیاد پر کی جاتی تھی بلکہ اس لیے بھی کہ اس نے سماج کو تقسیم کیا اور لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا نہیں کیا۔ ستی اور بچوں کے قتل کو ہر صحیفے کی نظر میں

قتل سمجھا جاتا تھا۔ یہ بھی مانا گیا کہ دنیا کا کوئی بھی ملک جن کی خواتین جہالت میں ڈوبی ہوں وہ کبھی خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتا۔ اس طرح، انیسویں صدی کے ہندوستان کے سماجی اور مذہبی طریقوں اور رسوم ورواج کو ایک زوال پذیر سماج کی علامات کے طور پر دیکھا گیا، جس کی خصوصیات پابندیوں، توہم پرستی، سماجی حیثیت، اختیار، جنونیت اور اندھی تقدیر پرستی ہے۔ ان کی جگہ آزادی، اعتماد، معاہدہ، منطق، رواداری اور انسانی وقار قائم کرنے کی کوششیں شروع کی گئی۔ لہٰذا، انیسویں صدی کے دانشوروں کی اولین فکر یہ تھی؛ اس تبدیلیوں کو کن ذرائع اور اقدامات سے موثر بنایا جائے؟

ان دانشوروں کے مطابق ہندوستانی سماج کی تمام برائیوں کا ماخذ، بشمول مذہبی توہم پرستی اور سماجی قدامت پرستی، عام لوگوں کی جہالت یالاعلمی میں موجود ہے۔ اس لیے ان کے پروگرام کا مرکزی نکتہ علم کی ترویج تھا۔ تعلیم سے متعلق ان کے نظریات اہداف اور تفصیلات دونوں لحاظ سے نوآبادیاتی حکمرانوں سے مختلف تھے۔ اس نظام کے نظریاتی مضمرات کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے، جس سے وہ شدید پریشان تھے، ہندوستانی دانشوروں نے مقامی زبانوں کے ذریعے سائنس اور بڑے پیمانے پر تعلیم پر مبنی ایک متبادل وضع کرنے اور نافذ کرنے کی کوشش کی۔ ان کا ایک بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ روایتی اور ادبی تعلیم زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ راجارام موہن رائے کا یہ اعتراض کہ ”نوجوانوں کے ذہنوں پر گرائمر کی باریکیوں اور روحانی خصوصیات کو مسلط کرنا نقصان دہ ہے، جو سماج اور فرد کے لیے کوئی فائدہ مند نہیں“ اس وقت کی تعلیمات کی خامیوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اکشے کمار دت، جو تعلیم کے قومی منصوبے کے پہلے ہندوستانی پرموثر تھے، نے روایتی نظام تعلیم کو مکمل طور پر مسترد کر دیا۔ ایشور چند ودیا ساگر جیسے اسکالرز نے ان لوگوں کا مذاق اڑایا جو یہ مانتے تھے کہ تمام سائنسی حقائق ہندوستانی مذہبی صحیفوں میں موجود ہیں۔ سر سید احمد خان کے لیے مسلم تعلیم روایتی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔

لیکن برطانوی حکومت نے انگریزی تعلیم کا دائرہ صرف اپنے فائدے تک ہی محدود کر رکھا تھا۔ برطانوی حکومت کو نہ تو سائنسی علم کے عام پھیلاؤ میں دلچسپی تھی اور نہ ہی ہندوستانیوں کے ذریعہ سائنس کے مطالعہ کے اعلیٰ حصول میں۔ اسی لیے بہت سے سماجی مصلحین اور دانشوروں نے حکومت کی کوتاہیوں کو بے نقاب کرا نہیں اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس لیے خود ہندوستانی دانشوروں نے اس کام میں دلچسپی ظاہر کی اور اس کام کی حوصلہ افزائی کے لیے کئی ادارے کھولے گئے۔ مثال کے طور پر کلکتہ میں ترجمہ کرنے والی یورپی سائنسز کی سوسائٹی (1825) اور 1863ء میں غازی پور میں سر سید احمد خان کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی وغیرہ نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ انہیں یہاں تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

تاہم، انگریزی تعلیم اور زبان نے سماجی و مذہبی اصلاحی تحریک کے آغاز میں خاص کردار ادا کیا۔ انگریزی زبان نے ہمیں مغربی ثقافت اور تہذیب سے متعارف کرایا۔ بہت سے ہندوستانی آزادی، مساوات، بھائی چارے، جمہوریت اور قوم پرستی کے مغربی نظریات سے متاثر ہوئے۔ جوسیپ مازنی، اوتو فون بسمارک اور جوسیپ گاریبالڈی وغیرہ کی سوانح عمری ان کے لیے مشعل راہ بنی۔ انگریزی کے مطالعہ نے جدید ہندوستان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا اور مختلف سماجی تحریکوں کی راہ ہموار کی۔

انگریزی میں بہت سے لٹریچر کے مطالعہ اور لاتعداد انگریزی زبان میں ترجمہ نے ہندوستانیوں کے علم میں اضافہ کیا اور انہیں ایک عالمی تناظر فراہم کیا۔ ہندوستانیوں کے پڑھے لکھے طبقے نے دنیا کے جدید سائنسی علم کو سمجھا اور کئی ہندوستانی متون کا ترجمہ بھی کیا۔ اس نئی تعلیم کا اثر ہندوستان کے سماجی اور مذہبی شعبے پر بھی پڑا جس کی وجہ سے پڑھے لکھے ہندوستانیوں نے ہندو سماج کی اصلاح کی ضرورت کو سمجھا۔ خود ہندو سماج اس نئی زبان سے سب سے زیادہ متاثر ہوا، اسی لیے انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ذات پات کے نظام کے خاتمے، بیواؤں کی دوبارہ شادی، شادی کی عمر میں اضافہ، اچھوت کے خاتمے اور دلتوں کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کئی تحریکیں شروع کیں۔ راجہ رام موہن رائے اور اُن کا برہمو سماج کو اس میں اہم مقام حاصل تھا۔ اس سے بھی زیادہ متاثر آریہ سماج کی تحریک تھی جس کی بنیاد سوامی دیانند سرسوتی نے رکھی تھی۔ رام کرشنا مشن، جو بنگال میں 1897 میں سوامی وویکانند کی قیادت میں شروع ہوا، ایک اہم اصلاحی تحریک تھی۔ نئی تعلیم کے پھیلاؤ کی وجہ سے اس سماجی مذہبی تحریک میں زیادہ شدت نظر آتی ہے۔

ان کے علاوہ ہندوستان میں اس انگریزی تعلیم اور زبان نے ہندوستانی سماج کو مختلف طریقوں سے متاثر کیا تھا۔ ایسے کئی انگریز افسران اور مفکرین آئے جنہوں نے ہندوستانی ثقافت اور قدیم ادب کی فضیلت کو اپنے مطالعے کا مرکز بنایا۔ اس کے نتیجے میں، اس نے بہت سے قدیم ہندوستانی ادب کا انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا اور انہیں ہندوستانیوں اور دوسرے لوگوں کو متعارف کرایا۔ ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1784 میں ہندوستان میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا قیام عمل میں آیا۔ اور اس ادارے کے ذریعے بہت سے ہندوستانی متون کا ترجمہ کیا گیا، جن میں ابھگیان شکنتلم، بھاگوت گیتا، مانو اسمرتی اور ہتوپدیش جیسی کئی تحریریں شامل ہیں۔ ان ترجمہ شدہ تحریروں کے علاوہ اس سوسائٹی کے زیر انتظام جریدے میں ایسے بہت سے سماجی اور ثقافتی مضامین شائع ہوئے جنہوں نے ہندوستانی سماج کو بہت متاثر کیا اور ان مقالوں نے سماجی مذہبی تحریک کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

انگریزی یا جدید تعلیم سے متعلق پالیسی کے تعین کے سوال پر دو بڑے گروہ سامنے آئے جو مستشرقین اور مغربیت کے نام سے مشہور تھے۔ مستشرقین نے اسکول قائم کیے، زبانیں استعمال کیں، ہندوستان میں طباعت اور اشاعت شروع کی، کتابیں، رسائل، اخبارات اور ابلاغ کے دیگر ذرائع تیار کیے۔ انہوں نے ہندوستان کے ماضی کی طرف توجہ مبذول کرائی اور ہندوستانی دانشوروں میں تاریخی بیداری پیدا کی۔ مستشرقین ایسے تخلیقی منصوبے تجویز کر رہے تھے جو غیر ملکی اور ہندوستانی عناصر کے بامعنی امتزاج کے ذریعے تبدیلی لائیں گے۔ ان کے مطابق تبدیلی کے لیے تحریک کا ذریعہ نہ صرف مغربی ممالک سے لیا جا سکتا ہے بلکہ ہندوستان کے قدیم اداروں اور ادب کا دوبارہ مطالعہ کر کے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مستشرقین نے ہندو رسم و رواج کی علمی تعمیر نو کو ترجیح دی اور ہندوستانیوں نے اپنی قدیم ثقافت کی تعمیر نو کو ترجیح دی۔ ہندوستان کی اس نشاۃ ثانیہ کا کوئی ایک تخلیق کار نہیں تھا۔ اس میں بہت سے افراد نے تعاون کیا اور ان افراد کو اداروں کا تعاون اور حمایت حاصل رہا۔ ولیم جونس اور کولبروک کو ایشیاٹک سوسائٹی کا، راجہ رام موہن رائے کو برہمو سماج کا، مرتیونجے کو فورٹ ولیم کا، ڈیریزیو کو ہندو کالج کا اور ولیم کیری کو فورٹ ولیم کالج اور سیر امپور مشن کی حمایت اور مدد حاصل تھی۔

17.4 عیسائی مشنریوں کا کردار (Role of the Christian Missionaries)

یورپی باشندے اپنی مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کے ذریعے ہندوستانی طرز زندگی کے ساتھ بہت قریبی رابطے میں آئے۔ انگریز تاجروں کے ساتھ عیسائی پادری اور مذہبی مبلغین بھی ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ برطانوی راج کے قیام کے بعد ان کی سرگرمیاں مزید تیز ہو گئیں۔ 1813 کے ایکٹ کے تحت عیسائی مشنریوں کو قانونی طور پر ہندوستان میں داخل ہونے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کی آزادی ملی۔ دیگر کاموں کے علاوہ اس نے دو ایسے کام کیے جن سے ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کو مزید تقویت ملی۔ سب سے پہلے ان کی کوششوں سے ملک میں انگریزی تعلیم پھیلی جس کی وجہ سے مغربی علوم و افکار ہندوستانیوں تک پہنچنے لگے اور ان میں بیداری کا فکری عمل بننے لگا۔ دوسری بات یہ کہ جب عیسائی مشنریوں نے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا شروع کیا تو اس کے خلاف ہندوؤں کی طرف سے شدید رد عمل آیا اور کچھ ہندوؤں نے اپنے مذہب کی حفاظت شروع کر دی۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ ہندوؤں کی کن کمزوریوں سے عیسائی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ذات پرستی، توہم پرستی اور بے معنی دکھاوے کے نتیجے میں اس وقت خود ہندو مذہب اور معاشرہ غیر فعال اور بے اختیار ہو چکا تھا اور ہندو سماج کے نچلے طبقے نے سماجی احترام اور معاشی سہولیات کے لیے عیسائیت کو قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے ہندو مذہب کے تحفظ کے لیے اس میں اصلاحات ضروری معلوم ہوئیں۔ چنانچہ ہندوستانی مصلحین نے بھی عیسائی مشنریوں کے مذہبی تبلیغی نظام سے تحریک حاصل کی۔ یہی وجہ تھی کہ انیسویں صدی میں مذہبی اصلاح کا کام عیسائی مشنریوں سے ملتی جلتی تنظیموں کے ذریعے شروع ہوا۔

یوروپی مشنریوں کی مذہبی سرگرمیوں کی وجہ سے عیسائیت اور ہندومت ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے۔ اس سے پہلے پرتگالی حکام نے اپنے اپنے زیر اثر علاقوں کی مختلف بستیوں میں سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مذہبی سرگرمیاں بھی شروع کیں۔ اُنھوں نے مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کو زبردستی مسیحیت میں تبدیل کیا۔ ہالینڈ سے آنے والے لوگوں نے بھی ایسا ہی کام کیا۔ صرف فرانسیسی ہی تھے جنھوں نے اپنی اصل توجہ سیاست پر مرکوز کی۔ ابتدائی دور میں جب برطانوی کمپنی ایک تاجر کے طور پر آئی تھی تو اسے عیسائیت پھیلانے میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن جب وہ حکمران بنا تو اس نے عوامی جذبات کے خلاف جانے کے خوف سے مذہبی جوش و خروش مکمل طور پر ترک کر دیا۔ لیکن عیسائی مشنریوں نے ذاتی طور پر اس کام کو پوری قوت کے ساتھ انجام دیا۔ اٹھارویں صدی کی آخری دہائی میں باپٹسٹ مشنری سوسائٹی، ولیم کیری (William Carey)، جوشوا مارش مین (Joshua Marshman) اور ولیم وارڈ (William Ward) نے سیرام پور و بنگال کے آس پاس سے اپنی مذہبی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ اس وقت سیرام پور ڈنمارک کے کنٹرول میں تھا۔ انھوں نے مذہب کی تبلیغ کے علاوہ ہندو سماج کی بہت سی برائیوں اور متضاد رسم و رواج پر بھی حملہ کیا۔ انھوں نے بت پرستی، ستی، ذات پرستی، قتل کاشی وغیرہ کی کھل کر مخالفت کی اور تنقید کی۔

مشنریوں نے ہندومت کے بہت سے پہلوؤں کو قابلِ اعتراض و نفرت پایا۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ عیسائیت خود بہت سی غیر مطابقت پذیر برائیوں سے پاک نہیں ہے۔ سترہویں اور اٹھارویں صدی کے آخر تک جو خواتین انگلش بشپ گرجا گھروں میں عبادت کے لیے نہیں جاتی تھیں انہیں سمندر کے کنارے ریت پر کھمبوں سے باندھ دیا جاتا تھا اور رفتہ رفتہ سمندر کی بڑھتی ہوئی لہر میں وہ ڈوب جاتی تھیں۔ یا ان کے

چہروں پر گرم لوہے سے نشان لگا کر انہیں جہازوں میں ڈال کر امریکہ بھیج دیا جاتا۔ مذہب اور قانون کے نام پر اس سے بھی زیادہ وحشیانہ کارروائیاں یورپ میں کی گئیں۔ 18ویں صدی کے انگلینڈ میں اگر کوئی شخص مچھلی چوری کرتے ہوئے، دھمکی آمیز خط لکھتے ہوئے یا دکان سے پانچ شلنگ چوری کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو اسے پھانسی دے دی جاتی تھی۔ اگر کوئی ہندو فقیہ یا عقلیت پسند یورپ میں اس طرح کے بہت سے رواجوں کو دیکھتے تو وہ اتنا ہی حیران ہو جاتا جتنا یورپی فقہاء اور عقلیت پسند جب کچھ ہندوستانی رسومات کو دیکھ کر ہوئی تھے۔

ایک طرح سے یہ ہندوستان کے لیے بالواسطہ طور پر ایک اعزاز بن گیا کہ عیسائی مشنریوں کو ہندوستان کے کچھ سماجی اور مذہبی عقائد اور طریقوں پر اس قدر شدید اعتراض تھا۔ ان روایات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کسی بیرونی ذرائع کی ضرورت تھی جو جہالت کی وجہ سے ہو رہی تھیں۔ مشنریوں نے، ہندوستان کے لوگوں کو مسیحیت میں تبدیل کرنے کے لیے، ہندو مذہب کی سخت الفاظ میں مذمت کی، جس نے ہندوؤں کے عقائد اور طریقوں کے تمام پہلوؤں کو متاثر کیا۔ ہندومت کے خلاف عیسائی مہم نے بہت سے ہندوؤں کو اپنے مذہب کے اندر توحید اور دیگر تمام اعلیٰ خوبیاں تلاش کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ عیسائیت کے اثر سے خارجی اور داخلی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

لیکن برطانوی حکمرانوں کے طرز عمل اور کردار سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ یہ نووارد اعلیٰ سطحی سماج کے نمائندے تھے۔ وہ اپنے تشدد، لوٹ مار، لالچ، بدعنوانی اور زنا کے لیے مشہور تھے۔ اس کی بہت سی مثالیں خود یورپی مسافروں کے احوال میں درج ہیں۔ تاہم، جو چیز اہم تھی وہ ایک نئے مذہب کا نیا پن تھا نہ کہ اس مذہب کے پیروکاروں کا طرز عمل۔ اس کے علاوہ کچھ مشنریوں نے مذہبی دیانتداری کی اچھی مثالیں پیش کیں۔ اور ہندوستانیوں کو انگریزی سیکھنے کی ترغیب بھی دی۔ ولیم کیری نے بنگال میں انگریزی تعلیم کی بنیاد رکھی۔ مارش مین نے ہندوستان کی تاریخ لکھی۔ بنگال میں مشنریوں نے پرنٹنگ پریس لگوایا۔ اس طرح شروع میں انگریزی تعلیم کی ترقی میں ان مشنریوں کا بڑا اہم رول تھا۔

17.5 پرنٹنگ پریس کا کردار (Role of the Press)

پرنٹنگ پریس یا چھاپہ خانہ نے سماجی و مذہبی اصلاحی تحریکوں کے آغاز اور ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ پریس نہ صرف عوام کو سیاست سے لے کر تفریح کے دستیاب ذرائع تک مختلف موضوعات پر معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ یہ عوامی جذبات کو شکل دینے، ان پر اثر انداز ہونے اور ان کے خیالات کی عکاسی کرنے کا کام بھی کرتا ہے۔ وہ حکومت پر بھی نظر رکھتا ہے۔ اپنے مضامین، آراء، اداریے، اور قارئین کے ذریعہ ایڈیٹر کو لکھے گئے خطوط کے ذریعے حکومت کو عوام کے جذبات اور خیالات سے آگاہ کرتا ہے۔ چھاپہ خانہ سماج کو شکل، طاقت اور ذہانت فراہم کرتا ہے۔ پریس عوام کے ہاتھ میں ایک اہم اور مضبوط ہتھیار ہے اور یہ خیالات کو تیزی سے لوگوں تک پہنچانے کا ایک موثر ذریعہ بھی ہے۔

ہندوستان میں پہلا پرنٹنگ پریس پرتگالیوں نے 1550 کے آس پاس گوا میں قائم کیا تھا۔ ابتدا میں ان کا بنیادی مقصد عیسائی مذہبی لٹریچر کی اشاعت تھا لیکن بالواسطہ اس نے علم کے پھیلاؤ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ صحافت کا جنم پرنٹنگ پریس کے قیام سے ہوا اور مغربی اور مذہبی اصلاحات کے نظریات کو پھیلانے کی ایک مضبوط بنیاد رکھی گئی۔ جدید ہندوستانی پریس کا آغاز 1766 میں ولیم بولٹس (William Boalts) کے ایک اخبار کی اشاعت سے ہوا۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے انگلینڈ بھیج دیا۔ 1780ء میں جیمز آگسٹس ہکی (James

(Augustus Hicky نے انگریزی زبان میں بنگال گزٹ (*The Bengal Gazette*) کے نام سے ایک ہفتہ روزہ اخبار کلکتہ سے نکالنا شروع کیا۔ کسی بھی ہندوستانی کا انگریزی میں شائع ہونے والا پہلا اخبار گنگادھر بھٹاچاریہ کا ہفتہ وار بنگال گزٹ (*Bengal Gazette*) تھا۔ اس کی اشاعت 1816 میں شروع ہوئی۔ مارش مین کی قیادت میں سیرامپور سے بنگالی اور انگریزی زبان میں دگدرشن (*Digdarshan*) نامی ماہانہ رسالہ شائع ہوا۔ ایک صفحے پر انگریزی متن ہوتا تھا اور مقابل کے صفحے پر اُس کا بنگالی ترجمہ دے دیا جاتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ بنگالیوں کو نئی سائنسی معلومات سے آگاہ کیا جائے اور انھیں اصطباغی مسیحیت کی طرف مائل کیا جائے لیکن اب تک جتنے بھی اخبارات اور رسائل شائع ہوئے ان کا بنیادی مقصد سیاسی تھا۔

19 ویں صدی کے آغاز میں جن اخبارات اور رسائل نے سماجی اور مذہبی اصلاح میں اہم کردار ادا کیا وہ راجہ رام موہن رائے کے دو ہفتہ وار اخبار تھے۔ پہلی بنگالی میں سمواد کامودی (*Samvad Kaumudi*) تھی جو 1821 میں شائع ہوئی اور دوسری فارسی میں مرات الاخبار جو 1822 سے شائع ہونا شروع ہوئی۔ ان اخبارات کے ذریعے انہوں نے نہ صرف سماجی اصلاح کا پرچار کیا بلکہ انہیں مذہبی اور فلسفیانہ مسائل پر بحث و مباحثہ کا ذریعہ بھی بنایا۔ سمواد کمودی نے ستی کے رواج کو ختم کرنے کے لیے خاص طور پر کامیاب مہم کی قیادت کی۔ یہ ہندوستانی زبان کا پہلا اخبار تھا جسے کسی ہندوستانی نے شائع کیا تھا۔ مرات الاخبار ہر جمعہ کو شائع ہونے والا اخبار تھا۔ اس اخبار کے ذریعے توحید کا پرچار کیا گیا۔ لیکن جلد ہی یہ اخبار برطانوی حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے بند ہو گیا۔

مذکورہ اخبارات و رسائل کے علاوہ انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کئی اخبارات، رسائل اور کتابیں شائع کر کے سماجی اصلاح میں اہم کردار ادا کیا۔ 1854ء سے مہاراشٹر اور گجرات میں دادابھائی نوروجی کے ذریعے چلائے جانے والے راست گوفتار (*Rast Goftar*) اخبار نے مغربی ہندوستان میں پارسیوں میں سماجی اصلاح کی حمایت کی۔ اسی طرح اینی بیسنٹ کی نیو انڈیا (*New India*) جو مدراس سے شائع ہوتی تھی، نے بھی اہم کردار ادا کرنے میں کامیاب رہا۔ بنگال سے سوم پرکاش، بنگواسی، سنجیوانی، انڈین مرر، امرت بازار پتریکا اور مہاتما گاندھی کے ینگ انڈیا اور ہریجن نے بھی سماجی اصلاح میں اہم کوششیں کیں۔ اردو صحافت میں سرسید احمد خان کی تہذیب الاخلاق، مولانا آزاد کی الہلال اور البلاغ وغیرہ نے مسلمانوں کی اخلاقی اور سماجی اصلاح میں اہم کردار ادا کیا۔

ان ہندوستانی اخبارات کو خیالات پھیلانے اور رائے عامہ بنانے میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ ہندوستانی زبان کے اخبارات اور رسائل انگریزی زبان میں شائع ہونے والے اخبارات کے مقابلے میں زیادہ بااثر تھے۔ اس سے نہ صرف پڑھے لکھے بلکہ ناخواندہ بھی متاثر ہوئے کیونکہ ہر گاؤں میں مکھیاں، سکول ماسٹر، لمبردار یا پٹواری ہر کسی کو اونچی آواز میں اخبار پڑھ کر سناتے تھے۔ 1888ء میں مختلف ہندوستانی زبانوں کے اخبارات کی سرکولیشن 250000 تھی تاہم پریس سے متاثر ہونے والے اور اس کے نظریات سے واقف ہونے والوں کی تعداد اس تعداد سے کہیں زیادہ تھی۔

17.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد، ہمیں کچھ اہم عوامل کے بارے میں معلوم ہوا جنہوں نے ہندوستانی سماجی مذہبی اصلاحی تحریکوں میں اہم کردار ادا کیا۔ بنیادی طور پر مغربی تعلیم، ادب اور زبان نے ان میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مختلف مغربی مفکرین سے متاثر ہو کر ہندوستانی مصلحین نے ہندوستانی عوام کو مساوات، اور آزادی کا پیغام دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم نے دیکھا کہ اٹھارویں صدی میں بھی مغربی ثقافت کے اثر کے بغیر کتنے علاقائی اصلاحاتی پروگرام کیے گئے۔ لیکن اس تحریک کو منصوبہ بند اور منظم انداز میں آگے بڑھانا انگریزی تعلیم، زبان، ادب، پرنٹنگ پریس اور عیسائی مشنریوں کے کردار کی وجہ سے ہی ممکن ہوا۔ سماجی مصلحین نے خود کو منظم کیا اور اپنے مقاصد کو اسی طرح آگے بڑھایا جس طرح عیسائی مشنریوں نے منظم انداز میں کام کیا۔ برہمو سماج میں راجا رام موہن رائے، دیویندر ناتھ ٹیگور اور کیشو چندر سین، آریہ سماج میں دیانند سرسوتی اور لالہ لاجپت رائے، رام کرشن مشن میں وویکانند، مہاراشٹر میں پرارتھنا سماج، اور مدراس میں وید سماج وغیرہ نے اس اصلاحی تحریک کو منظم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی طرح پرنٹنگ پریس کے آنے سے اصلاح پسندوں کے لیے ہندوستانی عوام میں اپنے نظریات اور خیلات پھیلانا آسان ہو گیا۔ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعے ہندوستانی سماج کو کئی سماجی برائیوں کے خلاف بیدار کرنے کی کوشش کی۔

17.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

چرن داسی	:	اٹھارہویں صدی میں راجستھان میں سماجی مذہبی اصلاحی فرقہ جس کی بنیادی چرن داس نے رکھی تھی
الہلال والبلاغ	:	مولانا آزاد کا ہفتہ وار اردو زبان کا اخبار تھا
کارتھ واج	:	بنگال کا ایک سماجی اصلاحی فرقہ
اورنٹلسٹ	:	(مستشرقین)، کمپنی کے وہ افسران، تاجر و عالم جنہوں نے ہندوستانی تہذیب، روایات اور زبان کے فروغ کی حمایت کی
دگدرشن	:	مارش مین کے ذریعے شائع ہونے والا ماہنامہ اخبار

17.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

17.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. چرنداسی فرقہ کس علاقے میں پروان چڑھا؟
2. بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کب قائم ہوئی؟
3. کس ایکٹ کے تحت عیسائی مشنریوں کو ہندوستان میں اپنی سرگرمیاں کرنے کی آزادی ملی؟
4. آریہ سماج کی بنیاد کس مقام پر رکھی گئی؟

5. سمواد کا مودی میگزین کس زبان میں شائع ہوئی تھی؟
6. مرات الاخبار رسالہ کس سماجی مصلح سے متعلق ہے؟
7. بنگال گزٹ کی اشاعت کس نے شروع کی؟
8. پرارتھنا سماج کا قیام کس سال ہوا؟
9. کسی دو مشنری کے نام بتائیں۔
10. کسی دو مسلم سماجی مصلح کے نام بتائیں۔

17.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. انیسویں صدی سے قبل اٹھارویں صدی کی سماجی و مذہبی اصلاحات پر ایک مختصر نوٹ تحریر کریں۔
2. سماجی اصلاحی تحریک میں رسائل کے کردار کا جائزہ لیں۔
3. عیسائی مشنریوں نے سماجی اصلاح کی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ مختصر نوٹ لکھیں۔
4. سماجی و مذہبی اصلاحی تحریکوں کو فروغ دینے میں انگریزی تعلیم کے کردار پر روشنی ڈالیں۔
5. انگریزی زبان نے سماجی و مذہبی اصلاحی تحریک کے لیے ایک راہ ہموار کی۔ مختصر نوٹ لکھیں۔

17.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. انیسویں صدی میں سماجی مذہبی اصلاحی تحریک میں انگریزی تعلیم اور زبان کے کردار پر تفصیلی نوٹ تحریر کریں۔
2. سماجی اصلاح کی تحریک میں چھاپا خانہ (پرنٹنگ پریس) کے کردار کا جائزہ لیں۔
3. سماجی و مذہبی اصلاحی تحریک کے آغاز میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اپنی رائے دیں۔

17.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

---

1. Bhattacharya, Bhabani, *Socio-Political Currents in Bengal*: *Nineteenth Century Perspective*, Vikas Publishers, Ghaziabad, 1980.
2. Datta, Kalikinkar, *Survey of India's Social Life and Economic Condition in the Eighteenth Century*: *1707–1813*, Munshiram Manoharlal, New Delhi, 1978.
3. Dubois, Abbe J.A., *Hindu Manners*, *Customs & Ceremonies*, Rupa, New Delhi, 2006.
4. Jones, Kenneth, W., *Socio-Religious Reform Movements in British India*, Cambridge University Press, New York, 2008.
5. Natarajan, S., *A Century of Social Reform in India*, Asia Publishing House, London, 1959.
6. Raghuvanshi, V.P.S., *Indian Society in the Eighteenth Century*, Associated

Publishing House, New Delhi, 1969.
7. Sen, Amiya P., *Social and Religious Reform*: *The Hindus of British India*, *New Delhi* (2003).
8. Sen, Amiya P., *Rammohun Roy: A Critical Biography*, Penguin, UK, 2012.
9. Sen, Amiya P., *Explorations in Modern Bengal*, *C. 1800–1900: Essays on Religion*, *History*, *and Culture*, Primus Books, Delhi, 2010.
10. Sen, Dinesh Chandra, *History of Bengali Language and Literature*, University of Calcutta, Calcutta, 1954.
11. Wilson, H.H. (Horace Hayman), *Essays and Lectures on the Religion of the Hindus*, Trubner & Co., London, 1861.
12. Wilson, H.H., *Sketch of the Religious Sects of the Hindus*, Bishop's College Press, Calcutta, n.d.

اکائی 18۔ شمالی ہندوستان میں سماجی و مذہبی اصلاحی تحریکیں
(Socio-Religious Reform Movements in North India)

اکائی کے اجزا

18.0 تمہید
18.1 مقاصد
18.2 اصلاح کی ضرورت
18.3 ہندوؤں میں اہم اصلاحی تحریکیں
18.3.1 برہمو سماج
18.3.2 ینگ بنگال تحریک
18.3.3 آریہ سماج
18.3.4 رام کرشنا مشن
18.4 مسلمانوں میں اہم اصلاحی تحریکیں
18.4.1 فرائضی تحریک
18.4.2 وہابی تحریک
18.4.3 دیوبند تحریک
18.4.4 علی گڑھ تحریک
18.4.5 احمدیہ تحریک
18.5 اصلاحی تحریکوں کی اہمیت
18.6 اکتسابی نتائج
18.7 کلیدی الفاظ
18.8 نمونہ امتحانی سوالات
18.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

18.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان کے مختلف حصوں میں انیسویں صدی کے آخراور بیسویں صدی کے آغاز میں اصلاحی تحریکوں کاایک سلسلہ شروع ہوا۔ ان تحریکوں کا مقصد جدید طرز پر ہندوستانی سماج کو نئی شکل دینا تھا۔اس اکائی میں ان سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریکوں کا عمومی اور تجزیاتی نقطۂ نظر پیش کیا گیاہے۔اس کے علاوہ ان تحریکوں کی اہمیت کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران انگریزوں کی ہندوستان پر فتح نے ہندوستانی سماجی اداروں کی کچھ سنگین کمزوریوں اور خامیوں کو بے نقاب کیا۔اس کے نتیجے میں متعدد شخصیتوں اور تحریکوں نے سماج کی اصلاح اور جلا بخشنے کے لیے سماجی اور مذہبی طریقوں میں تبدیلیاں لانے کی کوشش کی۔یہاں پر ایک اہم سوال ان قوتوں کے بارے میں ذہن میں آتاہے جنہوں نے ہندوستان میں یہ بیداری پیدا کی۔کیا یہ مغرب کے اثرات کا نتیجہ تھا؟ یا یہ صرف نوآبادیاتی مداخلت کاردِّ عمل تھا۔اس نقطۂ نظر سے اِن سماجی مذہبی تحریکوں کو نوآبادیاتی ہندوستان میں نئے ابھرتے ہوئے تعلیم یافتہ طبقے کی اصلاحی خواہشات کے اظہار کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔اصلاحی تحریکوں پر ابتدائی تاریخ دانوں نے بنیادی طور پر مغرب کے اثرات کا اظہار کیا ہے، خاص طور پر انگریزی تعلیم، عیسائیت، مستشرقین کی تحقیق، سائنس، فلسفہ، اور مغربی تہذیب کے مادی عناصر (اجزاء) وغیرہ۔انیسویں صدی میں سماج میں مغربی اثرات کی اہمیت مسلم ہے۔تاہم، اگر اصلاح کے اس پورے عمل کو نوآبادیاتی خیر خواہی کا نمونہ سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو صرف اس کی مثبت جہتوں (positive dimensions) تک محدود رکھتے ہیں، تو ہم اس واقعے کے پیچیدہ کردار کے ساتھ انصاف کرنے میں ناکام ہو جائیں گے۔اصلاحی تحریکوں کو نئی آبادیوں کے دخل سے پیش آنے والے چیلنج کے جواب کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔وہ نہ صرف سماج کی اصلاح کی کوششوں کے طور پر اہم تھیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نوآبادیت (colonialism) کی طرف سے پیدا ہونے والی نئی صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت ضروری تھیں۔

18.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان میں مختلف اصلاحی تحریکیں کی شروعات کے بارے میں جان سکیں گے۔
- معروف مصلحین اور ہندوستانی سماج کی نوعیت کے بارے میں ان کے خیالات سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔
- سماج کی مختلف جہتوں سے تبدیلی میں سماجی، مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کے کردار سے آگاہی حاصل کر سکیں گے۔
- ہندوستان میں موجودہ سماجی-ثقافتی-مذہبی عقائد پر نئے خیالات کے مجموعی اثر سے روشناس ہو سکیں گے۔

18.2 سماجی اصلاح کی ضرورت (The Need for Social Reform)

اصلاحی تحریکوں کی نوآبادیاتی فتح کے بعد سماج اور اس کے اداروں کو از سر نو ترتیب کی ضرورت تھی۔ان تحریکوں نے بیداری پیدا کرنے کے ایک طریقہ کی پہچان کرائی جسمیں ہندوستانی ماضی کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ، ہندوستانی ثقافت اور تہذیب کا دفاع کرنے کی توجہ ہے۔

اس کے علاوہ اس تدبیر نے لوگوں میں ثقافتی شعور اور اعتماد پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بہت سے آفسران ہندوستانی سماج میں موجود مختلف سماجی برائیوں کو دور کرنا چاہتے تھے، لیکن انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اس معاملہ سے الگ رہیں۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ سب سے پہلے، تقریباً 1813 تک، ایسٹ انڈیا کمپنی بنیادی طور پر اپنی تجارتی سرگرمیوں اور انتظامیہ سے حاصل ہونے والے فوائد میں دلچسپی رکھتی تھی۔ کمپنی اس ملک پر حکومت کر کے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کی خواہشمند تھی۔ حکمرانی کا کوئی دوسرا عنصر اس کے لیے بالکل اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ کمپنی ہندوستانی سوسائٹی کی مضبوط مذہبی بنیاد کو بھی پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ انگریزوں نے محتاط رویہ اختیار کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی طرف سے سماج کو از سر نو بنانے کی کسی بھی کوشش کو ہندوستان کے لوگ غلط سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان کی یہاں موجودگی کے خلاف ملک اٹھ کھڑا ہو سکتا ہے۔

اس لیے انگلینڈ میں حکمران کنزرویٹو پارٹی چیزوں کو ویسا ہی چھوڑنا چاہتی تھی۔ ان کی مدد ہندوستان کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (1773-85) اور کچھ مستشرقین جیسے ایچ ایچ ولسن نے کی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ انگریز آقاؤں کو زمین کے نافذ کیے ہوئے رسم و رواج میں مداخلت کیے بغیر فن، ادب اور مذہب کی سرپرستی پر قناعت کرنی چاہیے۔ اگرچہ بنارس کے ایک رہائشی جوناتھن ڈنکن نے بچیوں اور بچوں کے قتل کے رواج کو روکنے کی کوشش کی اور ویلزلی کے کچھ افسران نے ستی کے رواج کو روکنے کی کوشش کی، لیکن یہ محض چنندہ تھے اور ان کی کوشش نے بڑے پیمانہ پر کوئی خاص تبدیلی نہیں کی بلکہ ہندوستان سماجی برائیوں پر عمل پیرا رہا۔

اسکے باوجود ایوینجلیکلز، ریڈیکلز اور یوٹیلٹیر یز نے پرانے رسم و رواج کو ماننے والوں کی پالیسی پر اعتراض کیا۔ ایوینجلیکلز کا خیال تھا کہ انجیل کی تبلیغ کرنا، لوگوں کو انسانیت کا صحیح راستہ دکھانا، بت پرستی، توہم پرستی اور ظالمانہ عقائد کی مخالفت کرنا ان کا اخلاقی فرض ہے۔ دوسری طرف، ریڈیکلز اور یوٹیلٹیر یز بینتھم کے نظریہ پر یقین رکھتے تھے، کہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف پر مبنی قوانین جاری کرنے سے سماج کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ جیمز ملز، ہسٹری آف برٹش انڈیا (1817) کے مصنف، ان میں سے ایک تھے جنہوں نے برطانوی حکومت کو اپنا ذہن بدلنے کے لیے فکر مند کیا۔ برطانوی ہندوستانی انتظامیہ میں بہت سے آزاد خیال افراد جیسے مونٹ اسٹورٹ ایلفنسٹن، چارلس میٹکالف اور جان میلکم نے بھی ایک پریشر گروپ کے طور پر کام کیا اور حکومت کو مجبور کیا کہ وہ سماجی اصلاحات کو قدرے سنجیدگی سے لینے میں پہل کرے۔ لارڈ ولیم بینٹنک پہلے گورنر جنرل تھے جنہوں نے ہندوستان میں اصلاحات کی پالیسی کو شروع کیا، ہدایت کی اور نافذ کیا۔

خوش قسمتی سے ہندوستان کے لیے جب ہندوستان میں لبرل اور بنیاد پرستوں کا غلبہ تھا، اسی گروہ کا برطانوی پارلیمنٹ پر بھی غلبہ تھا۔ بہت سے ترقی پسند ہندوستانیوں نے بھی لبرل گروپ کی حمایت کی۔ راجہ رام موہن رائے نے اپنے کارکنوں، اور ہم خیال لوگوں کو منظم کیا، اور سماجی اصلاحات کے لیے قانون سازی کے لیے حکومت سے درخواست کی۔ یہ کام برطانوی حکومت، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں آزاد خیال اور بنیاد پرست اجزاء اور تعلیم یافتہ اور ترقی پسند ہندوستانیوں کے تعاون سے کیا گیا۔

18.3 ہندوؤں میں اہم اصلاحی تحریکیں (Major Reform Movements among the Hindus)

18.3.1 برہمو سماج (The Brahmo Samaj)

راجہ رام موہن رائے، جن کو 'بابائے جدید ہندوستان' کے نام سے جانا جاتا ہے، 1774 میں رادھا نگر، بنگال میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک برہمن خاندان سے تھا۔ انہوں نے پٹنہ میں فارسی، عربی اور مسلم لاء اور بنارس میں سنسکرت اور ہندو شاستروں میں مہارت حاصل کی۔ پھر 1797 میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں مالی آفیسر کے طور پر تھامس ووڈ فورڈ اور بعد میں ڈگبی کے ماتحت کام کیا۔ انہوں نے انگریزی، یونانی، لاطینی اور عبرانی (بائبل کی اصل زبان) سیکھی۔ انہوں نے بنگال میں ہری ہارانند تیر تھاسوامی سے تانترک سیکھا اور جین اور بدھ فلسفے بھی سیکھے۔ انہیں مغل بادشاہ اکبر دوم سے راجہ کا خطاب ملا جس نے اسے 1830 میں انگلینڈ بھیجا، راجہ رام کا انتقال 1833 میں برسٹل (لندن کے قریب) میں ہوا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کو بہت سے مسائل کا سامنا تھا۔ نوآبادیاتی مورخین نے اسے ہندوستانی سماج کے تاریک دور ('dark age') کے طور پر پیش کیا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان میں بہت ساری سماجی برائیاں اور ناانصافیں تھیں - ستی کا رواج، لڑکیوں کی پیدائش پر ان کو زندہ در گور کیا جانا، بہت سی شادیاں کرنا، بیوہ کے مسائل، بچوں کی شادی، پجاری کا غلبہ، مہنگی اور بے معنی رسومات ہندوستان کے بیشتر حصوں میں عام تھیں۔ انہی سماجی برائیوں اور ناانصافیوں کے خلاف جدوجہد شروع کرنے کے لیے راجہ رام موہن رائے نے چار طریقے استعمال کیے تھے۔

- مذہبی مجلسیں قائم کی۔
- کتابیں اور اخبارات جاری کیے۔
- بحث اور مباحثوں کا اغاز کیا اور تعلیمی اداروں کو قائم کیا۔

'تحفۃ المواحدین' ان کی پہلی کتاب (1803) تھی جس میں اسلام کا اثر اور معتزلہ کے فلسفے کا ان پر اثر واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ افسانوی فارسی جلال الدین رومی (73-1207) اور حافظ (37-1310) کے فلسفے سے بھی متاثر تھے۔ اسلام سے انہوں نے توحید، بت پرستی کی مخالفت، سماجی مساوات کا اصول، خدا اور اس کی صفات، آداب اور طرز زندگی کے درمیان تعلق کا نظریہ لیا۔ انہوں نے عبرانی میں بائبل پڑھی انہوں نے عیسی مسیح اور ان کی تعلیمات کی تعریف کی، خاص طور پر ان کے اخلاقی ضابطے جو ان کی کتاب *The Precepts of Jesus* (انگریزی) میں جھلکتے ہیں۔

انہوں نے کچھ اپنشدوں کا ترجمہ کیا، جیسے کتھا، کین، عیسیٰ، منڈوکا اور منڈو کیا سنسکرت سے بنگالی زبان میں۔ اس نے گایتر ارتھ (گایتری کا مطلب) اور اتما نترماوویک (خود، روح اور ضمیر سنکر اچاریہ کے کام کا ترجمہ) بھی شائع کیا۔ ان تمام علمی کاموں کا مقصد توحید، کی تبلیغ کرنا تھا اور بے شمار بے معنی مذہبی رسومات کو ختم کرنا تھا۔ انہوں نے اپنی کتاب مناظرۃ العدیان کے ذریعے مختلف مذاہب میں یکسانیت commonness کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ہندومت کے بارے میں عیسائی مشنریوں کی غلط فہمیوں کو بھی دور کرنے کی

کوشش کی۔ اگرچہ، انہوں نے تمام مذاہب کے مقدس متن یعنی رگ وید، اپنشد، بائبل اور قرآن کو بھی کافی اہمیت دی، لیکن عقل کو زیادہ اہمیت دی۔ کوئی بھی خیال یا عقیدہ جس کی بنیاد عقل کے مطابق نہ ہو اس کو انہوں نے رد کر دیا۔ انہوں نے اسلام اور عیسائیت کے لیے ایک ہی پیمانہ لگایا۔ انہوں نے اسلام کے بہت سے نظریات اور فلسفوں کو قبول کیا اور در حقیقت اس سے بہت متاثر ہوئے، لیکن 'برکت' اور 'ملعون' کے اسلامی تصور کو رد کیا۔ اسی طرح اس نے عیسائیت کے بنیادی اصول 'تثلیث' اور 'معجزات' کے نظریات کو رد کیا۔

آتمیہ سبھا (1815) کو کلکتہ میں راجہ رام موہن رائے اور دوستوں نے، زیادہ تر درمیانی طبقے کے لبرل اور سماجی اشرافیہ نے قائم کیا تھا۔ ان میں دوار کاناتھ ٹیگور (دیویندر ناتھ ٹیگور کے والد)، پرسنا کمار ٹیگور، کالی شنکر گھوسل، برندابن مترا، برج موہن مجمدار، نند کشور بوس، شیواپرساد متر ااور رام چندر ودیاوگیش (برہمو سماج کے پہلے آچاریہ) نمایاں تھے۔ اگرچہ، راجہ رام نے بنیاد پرستوں اور قدامت پسندوں کے درمیان دو انتہاؤں کو متوازن کرنے کی کوشش کی - پھر بھی ان کے توحید کے تصور، مسلمانوں کے ساتھ اس کی قربت، اس کی اسلام، عیسائیت اور مغربی لبرل فکر کی تعریف نے ہندو سماج کو خاص طور سے اور برہمنوں کو بالخصوص چونکا دیا۔ اس لیے اتمیہ سبھا کے ہفتہ وار اجلاسوں میں حاضری آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی اور 1819 کے بعد اس کا چلنا بند ہو گیا۔

خدا یا برہما، راجہ رام موہن رائے کے مطابق، وہ اعلیٰ لافانی روح ہے جس سے تمام انسانی روحیں پیدا ہوئیں اور موت کے بعد دوبارہ شامل ہوں گی۔ صرف برہما کی پوجا کرنے کے لیے، راجہ رام موہن رائے نے 20 اگست 1828 کو برہمو سبھا کی بنیاد رکھی اور 1829 میں اس کا نام بدل کر برہمو سماج رکھا۔ برہمو سماج کے مندرجہ ذیل دفعات ہیں:

- برہما کی پوجا کے لیے سماج تمام ذات پات اور مذاہب کے لیے کھلا تھا۔
- سماج کی عمارت میں مورتی، تصویر، قانون، پینٹنگ یا کسی بھی قسم کی تصویر کا داخلہ نہیں کیا گیا تھا۔
- اس سماج کے اندر قربانی یا مذہبی رسومات کی بھی اجازت نہیں تھی۔ عبادت دعاؤں اور مراقبہ اور اپنشدوں کے پڑھنے کے ذریعے کی جاتی تھی۔

رام موہن نے خود ایک پمفلٹ انوسٹھن (1829) لکھا جس میں سماج میں عبادت کے طریقہ کار کو بیان کیا گیا۔ ستی کے رواج کے خلاف راجہ رام کی جدوجہد غیر معمولی ہے۔ اس نے استدلال کیا کہ ستی کا عمل متوفی اور اس کی بیوی کی روحانی بہبود کے بجائے زندہ رہنے والے رشتہ داروں کی وقتی خوشی کو محفوظ بنانے کے لیے زیادہ ڈیزائن کیا گیا تھا۔ اپنے رضاکاروں کے ساتھ، اس نے ستی کے مقامات کا دورہ کیا اور لوگوں کو اس رواج کو روکنے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی کوششوں سے کم از کم دو خواتین کو بچا سکتا تھا۔ جب آرتھوڈوکس ہندوؤں نے گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹک کے سامنے ستی پر پابندی نہ لگانے کی درخواست کی تو راجہ رام نے جوابی پٹیشن دائر کی اور اس ضابطے کو منظور کرنے کی درخواست کی۔ آخر کار، 1829 میں، برطانوی حکومت نے ستی مخالف قرارداد منظور کی اور ستی کی رسم کو غیر قانونی قرار دے دیا۔

اسکے علاوہ، ستی کی سماجی قبولیت کی ایک وجہ وراثت سے متعلق تنازعہ تھا۔ سسرال والے بیواؤں کو کوئی حصہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ بنگال میں بہت سی بیواؤں نے اپنے سسرال والوں کے خلاف جائیداد کی وراثت کے لیے مقدمات درج کرائے تھے۔ اسے زندہ جلانے سے، اس کے شوہر کے ساتھ اس کے جنازے پر، سسرال والے وراثت کا مسئلہ حل کر سکتے تھے۔ راجہ رام نے اپنے پمفلٹ 'عورت کے قدیم حقوق پر جدید تجاوزات' میں وراثت کے ہندو قانون میں تبدیلی کی استدعا کی، تاکہ ہندو بیواؤں کی حالت کو بہتر بنایا جا سکے۔ ایک چائلڈ بیوہ اپنی باقی زندگی برہمیت میں گزار رہی ہے۔ انہوں نے رادھاکانت دیب، مدراس کے سبرامنیا شاستری، مدراس گورنمنٹ کالج کے سنکر ساستری، اور فورٹ ولیم کالج کے مرتیونجے ودیالنکر جیسے قدامت پسند ہندوؤں کے چیلنجوں کا کامیابی سے سامنا کیا۔ لیکن وہ دوہرے معیار کے آدمی کے الزام سے بچ نہ سکا۔ انہوں نے ذات پات کے نظام کی مخالفت کی لیکن زندگی کے آخری ایام تک مقدس دھاگے (جنیو) کو پہنتے رہے۔ انہوں نے تعدداز دواج اور کولن ازم کی مخالفت کی لیکن خود ان کی تین بیویاں تھیں۔ ان کے باوجود کوتاہیاں، راجہ رام موہن رائے کی عظمت اس بات میں پنہاں ہے کہ انہوں نے مشعل (مشال) کے ساتھ دوڑنا شروع کیا جس نے پوری قوم کو روشن کر دیا۔ راجہ رام کی موت تحریک کو بہت بڑا دھچکا تھا لیکن دیبیندر ناتھ ٹیگور اور کیشب چندر سین کی موجودگی کی بدولت برہمو سماج نہ صرف زندہ رہا بلکہ پھلا پھولا۔

دیبیندر ناتھ ٹیگور اور کیشب چندر سین (Debendranath Tagore, and Keshab Chandra Sen)

اس دوران رام موہن کی طرف سے اصلاح کی جو تحریک دی گئی تھی وہ اپنی رفتار کا بہت زیادہ حصہ کھو چکی تھی۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے والد دیبیندر ناتھ ٹیگور نے پھر اس میں جان ڈال دی۔ 1839 میں انہوں نے برہما سماج سے آزاد رام موہن کے نظریات کو آگے بڑھانے کے لیے "تتوابودھینی سبھا" قائم کی۔ ان کا مقصد ہندوستان میں عیسائیت کی تیز رفتار ترقی کا مقابلہ کرنا اور ویدانتزم کی ترقی کی وکالت کرنا تھا۔ تتوابودھینی سبھا کے زیر اہتمام مقامی زبان اور ثقافت پر زور بہت زیادہ واضح ہو گیا۔ تمام مضامین میں بنگالی تحریریں شائع ہوئیں۔ ایک تتوابودھینی پریس کا قیام عمل میں آیا اور 1843 میں نظریات کی تبلیغ کے لیے تنظیم کا ایک جریدہ تتوابودھینی پتریکا شروع کیا گیا۔ دیبیندر ناتھ ٹیگارے 1843 میں برہمو بن گئے اور اسی سال انہوں نے برہمو سماج کو دوبارہ منظم کیا۔ برہمو سماج سے متعلق ایک اور عظیم دانشور کیشب چندر سین تھے۔ کیشب نے خواتین کی آزادی پر زور دیا۔ انہوں نے عالمگیریت پر زور دیا جو کہ قومی ہندو شناخت پر دیبیندر ناتھ کے دباؤ کے خلاف تھا۔ آپس میں نظریاتی اختلافات کے باوجود برہما سماجسٹوں نے اجتماعی طور پر رام موہن کے نظریات کی تبلیغ اور بنگال کے سماج کو بدلنے میں حصہ لیا۔ انہوں نے مذہبی معاملات میں پادریوں کی ثالثی کی مذمت کی اور خدا کی عبادت کے لیے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بیوہ شادی، یک زوجیت اور خواتین کی تعلیم کی حمایت کی۔

ایشور چندر ودیا ساگر (Iswarchandra Vidyasagar)

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر۔ سنسکرت کے ایک عظیم اسکالر کا ظہور ہوا۔ ودیا ساگر 1851 میں سنسکرت کالج کے پرنسپل بنے۔ انہوں نے سنسکرت کالج میں مغربی فکر کا مطالعہ متعارف کرایا اور اس کے دروازے غیر برہمن طلباء کے لیے کھول دیے۔ انہوں نے ایک بنگالی پرائمر لکھا اور بنگالی میں ایک الگ جدید، نثری انداز تیار کرنے میں مدد کی۔

ان کا بہر حال، خواتین کی آزادی کے میدان میں بہت بڑا تعاون ہے۔ بیوہ شادی ایک مخصوص سماجی مسئلہ تھا جس کے لیے انہوں نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی۔ بیواؤں کی دوبارہ شادی کو قانونی حیثیت دینے کے لیے ان کی تحریک کو ملک کے مختلف حصوں سے روشن خیال طبقات کی حمایت حاصل تھی۔ ملک میں ایسا قانون نافذ کیا گیا (ہندو بیوہ ری میرج ایکٹ-1856)۔ ودیا ساگر کی نگرانی میں ہندوستان میں اونچی ذات کے درمیان پہلی قانونی ہندو بیوہ شادی 1856 میں منائی گئی۔ 1855 اور 1860۔ یہ یقیناً بنیاد پرست سماجی اصلاحات کی تاریخ میں ایک اہم پیش رفت تھی، جو رام موہن کے سنیاسی بیوہ ہونے کے خیال سے بہت بڑی تھی۔ انہوں نے خواتین کی عمومی ترقی کے لیے اعلیٰ تعلیم کو فروغ دیا۔ 1849 میں کلکتہ میں، انہوں نے خواتین کی تعلیم کی تحریک کی قیادت کرنے میں اہم کردار ادا کیا، انہوں نے بچوں کی شادی اور تعدد ازدواج کے خلاف بھی مہم چلائی۔

18.3.2 ینگ بنگال تحریک (The Young Bengal Movement)

ینگ بنگال تحریک کا آغاز ہنری لوئس ویوین ڈیروزیو کے ذریعے ہندو کالج، کلکتہ میں ہوا تھا، جو 1826 میں 17 سال کی عمر میں کلکتہ آیا تھا اور ہندو کالج میں انگریزی ادب اور تاریخ کے استاد کے طور پر منتخب ہوا۔ ہنری نے اس کالج میں 1826 سے 1831 تک درس و تدریس کا کام انجام دیا۔ اسی دوران اس نے فرانسیسی انقلاب کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس کے اصولوں سے کافی متاثر ہوا۔ ہنری ڈیروزیو نے اس کالج میں پڑھانے کے دوران اپنے طالب علموں کو ان تمام باتوں پر سوال کرنے کی تلقین کی جو انہیں بتائی گئی تھیں۔

ڈیروزیو نے اپنے شاگردوں پر زور دیا کہ وہ آزادانہ سوچ کا مظاہرہ کریں اور تمام قسم کے اختیارات کو چیلنج کریں۔ ڈیروزیو نے بنیاد پرست اقدار کو فروغ دیا اور ادب، تاریخ، فلسفہ اور سائنس پر گفتگو اور مباحثوں کو منظم کیا۔ ان کوششوں کے ساتھ، ڈیروزیو نے بنیادی طور پر کلکتہ کے نوجوان طالب علموں کو اپنی طرف خوب مائل کیا، اور ان میں ایک فکری انقلاب برپا کر دیا۔ اس نے عملی طور پر ذہنی آزادی، مساوات اور آزادی کو فروغ دیا، اور اپنے شاگردوں کو بھی ایسا کرنے کی تلقین کی۔ ڈیروزیو کے شاگرد، جو ڈیروزیو کے خیالات کو اپنانے کی وجہ سے "ڈیروزیئن" کے نام سے مشہور ہوئے، کنونشن اور ہندو مذہب کی پرانی روایت کے خلاف ہو گئے اور جدید خیالات کی طرف مائل ہوئی، خواتین کی تعلیم کے مطالبے کے لیے آواز بلند کی، آزادئ اظہار اور فکر حق کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ ہنری ویوین ڈیروزیو نے 1820 سے لے کر 1830 کی دہائی کے تک اس تحریک کے ذریعے کالج کے طالب علموں پر خاصا اثر ڈالا اور انہوں نے ڈیروزیو کے ان خیالات کو بڑے پیمانے پر اپنایا۔ چونکہ بنیادی طور ہنری ڈیروزیو کے خیالات کافی تفرقہ انگیز تھے جس کی وجہ سے 1831 میں اسے کالج سے نکال دیا گیا اور اسی سال ہیضے کی بیماری کے سبب اس کا انتقال ہو گیا۔

ہنری ڈیروزیو نے ینگ بنگال تحریک کے استحکام، اپنے نظریات اور تعلیمات عوام تک پہنچانے کے لیے اور اس سے دیگر افراد کو متاثر کرنے کے لیے تاریخ، سائنس، ادب اور فلسفہ جیسے موضوعات پر بحث و مباحثے کے لیے ایک گروپ کا اہتمام کیا۔ جن کے ذریعے بنیاد پرست نظریات کو پھیلانے کی کوشش کی۔ ڈیروزیو کا بنیادی مشن اپنے نوجوان طلباء میں فکری انقلاب کی ترغیب دینا تھا۔ وہ لبرل سوچ کے بہت بڑے

حامی تھے۔اس کا مشن خواتین کی تعلیم پر پابندی، بچوں کی شادی، چائلڈ لیبر، ستی پریکٹس وغیرہ جیسی سماجی برائیوں کو ختم کرنا تھااور جو فرانسیسی انقلاب سے اخذ مساوات، آزادی اور بھائی چارے جیسے نظریات کو پھیلانا تھا۔اس کا مقصد سائینٹیفک علم کا استعمال کرتے ہوئے پڑھائی کے پرانے طریقے کے بجائے جدیدیت اور عقلی سوچ پر مبنی طریقوں کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔

ینگ بنگال موومنٹ کے اثرات:

ینگ بنگال تحریک 'آگے چل کر بنگالی آزاد مفکروں کے ایک گروپ کی شکل میں منظر عام پر آیا جو ہندو کالج، کلکتہ سے نکلا تھا۔اس گروپ نے طلبہ میں آزادانہ سوچ کا جذبہ ابھارااوران کو ہندو سماج کے موجودہ سماجی اور مذہبی ڈھانچے کے خلاف بغاوت کے جذبے سے متاثر کیا۔ عقلی جذبے کی قبولیت کے بارے میں ڈیروزیو کے نظریات کو جزوی طور پراس وقت تک قبول کیا جاتارہاجب تک کہ وہ بنیادی عیسائی عقائد سے متصادم نہ ہوئے اور آرتھوڈوکس ہندوازم پر تنقید کرتے رہے۔ڈیروزیو کے خیالات کا سماجی تحریک پر خاصااثر پڑاجوانیسویں صدی کے اوائل میں بنگال کی نشاۃ ثانیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔اخبارات، رسالے اور کمیونٹی تنظیموں کے ذریعے، ڈیروزیوں نے راجہ رام موہن کے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل پر عوام میں بیداری پھیلانے کے عمل کو جاری رکھا۔انہوں نے کمپنی کے چارٹر پر نظرثانی کی ضرورت، پریس کی آزادی، بیرون ملک برطانوی کالونیوں میں ہندوستانی مزدوروں کے ساتھ بہتر سلوک، جیوری ٹرائل، جابرانہ زمینداروں سے فسادات کا دفاع اور اعلیٰ سطح کے سرکاری عہدوں پر ہندوستانیوں کی تقرری جیسے مسائل پر اپنا عوامی احتجاج جاری رکھا۔

اگرچہ ڈیروزلوایک اگنوسٹک تھا، لیکن بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے عقائد نے کئی اونچی ذات کے ہندوؤں، جیسے کرشن موہن بنرجی اور لال بہاری ڈے کو عیسائی مذہب قبول کرانے کا کام انجام دیا۔ مدھوسودن دتا، کالج کا ایک اور ہونہار طالب علم، جس نے 1843 میں اپنا آبائی مذہب چھوڑ دیا تھا۔اس کے علاوہ عیسائی مصنفین نے بہت سے دوسرے مذہب تبدیل کرنے والوں (پرسنا کمار ٹیگور کے اکلوتے بیٹے) کا دعویٰ کیا۔ شراب نوشی، جسے ڈیروزیوں نے آزادی کی علامت کے طور پر متعارف کرایا تھا، خطرناک حد تک ان لوگوں میں پھیلنا شروع ہو گیا جنہوں نے ابھی تک ڈیروزیائی آزاد فکر کے اعلیٰ مظاہر کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ شاید جدید ہندوستان کا پہلا قوم پرست شاعر ڈیروزیو تھا۔ٹوانڈیا-مائی نیٹیولینڈان کی سب سے مشہور نظم ہے۔

18.3.3 آریہ سماج (The Arya Samaj)

سوامی دیانند سرسوتی ایک اہم ہندو مذہبی اسکالر تھے اور 1824 میں موری (کاٹھیاواڑ، گجرات) میں پیدا ہوئے، دیانند (مل شنکر) آریہ سماج سوسائٹی آف نوبلز کے بانی کے طور پر مشہور ہیں، جو ایک بڑی (Hindu Reform Movement) تھی، 1875 میں قائم کیا گیا۔اس کے متجسس (curious) ذہن نے اسے خاندانی روایت کو توڑنے پر مجبور کیا۔ نوجوان دیانند اکیس سال کی عمر میں گھر سے فرار ہو گیااور ہندو طور طریقوں کی طرح زندگی گزارنے لگا۔اس نے جگہ جگہ سفر کیا، شمالی ہندوستان کے تمام مقدس مقامات اور ہمالیہ کے مندروں کا دورہ کرتے ہوئے چودہ سال تک کسی گرو یا مذہبی عالم کی تلاش میں رہے۔ آخرکار، 1860 میں، اس نے اپنے گرو کو سوامی

ویرجانند سرسوتی، ایک اندھے سنیاسی کے روپ میں پایا۔

دیانند نے بہت جگہوں پر سفر کیا اور علماء، ماہرین الہیات سے اپنے تمام شکوک و شبہات کے متعلق بحث کی اور انسے علم حاصل کیا۔ اس کا نعرہ، 'Go Back to the Vedas' نے ہندؤں پنڈتوں کے ذاتی مفادات کو خطرے میں ڈال دیا جسکی وجہ سے انہوں نے اسے قتل کرنے کی سازش کی۔ کیونکہ دیانند رسم و رسومات جن کا مذہبی کتابوں میں کوئی ذکر نہیں تھا اسکے خلاف تھے اور دھرم عام لوگوں تک پہچانا چاہتے تھے۔ دیانند سرسوتی نے 1875 میں بنارس سے ہندی میں ستیارتھ پرکاش (*Satyarth Prakash*) کتاب لکھی۔ اس کے نزدیک خدا اور انسانی روح کائنات کی تخلیق اور کام میں دو بالکل الگ الگ قوتیں تھیں۔ ان کے مطابق ہر آدمی کو اپنے عمل کی پوری ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔ انکا ماننا تھا کہ انسان کا دوسرا جنم اسکے اعمال کے حساب سے ہوگا۔ ان کی تعلیمات کے بنیادی نکات جسم کے پانچ حواس (senses) پر عبور حاصل کرنا، اپنے اندر خوبیاں پیدا کرنا اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنا تھا۔ اس وجہ سے اس نے ان سماجی رسومات اور اداروں کے خلاف بھی بحث کی جن کی کوئی مذہبی اہمیت نہیں تھی۔ جب دیانند سرسوتی 1874 میں بمبئی آئے تو اس کی ملاقات مہادیو گووند راناڈے سے ہوئی اور ان کی مدد سے 10 اپریل 1875 کو بمبئی میں آریہ سماج کی بنیاد رکھی اور 1877 میں لاہور منتقل ہو گئے۔

مندرجہ ذیل وہ بنیادی اصول و ضوابط ہیں جو آریہ سماج کے ماننے والوں پر فرض کیے گئے تھے:

- ویدوں کو ایک مکمل اختیار یعنی Supreme Authority مانا جاے گا۔
- ہر صوبے میں آریہ سماج کے چھوٹے چھوٹے ادارے ہونگے۔
- آریہ سماجی کردار اور اصولوں میں سچے اور خالص ہوں گے۔
- ہر آٹھویں دن دعائیہ اجتماعات اور مذہبی لیکچرز ہوں گے، جس میں آریہ سماج کے صدر، سکریٹری اور دیگر اراکین شرکت کریں گے۔
- آریہ سماج ویدک رسم و رواج انجام دیں گے اور پوری بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود اسی کا مقصد ہوگا۔
- سماجی معاملات کے لیے آریہ سماج نے درج ذیل اصول وضع کیے۔
- خدا کی وحدانیت کا اقرار اور آپس میں بھائی چارہ قائم کرنا۔
- سب کے ساتھ محبت اور خیرات۔
- صنفی مساوات۔
- سب کے لیے سماجی انصاف، سب کے لیے ان کے اعمال اور میرٹ کے مطابق یکساں مواقع۔

آریہ سماج تحریک بنیادی طور پر ایک احیاء پسند تحریک تھی، جو جدید دور میں قدیم آریائی روایت کو زندہ کرنا چاہتی تھی کیونکہ سماج کو لگتا تھا کہ یہ اصول وقت کے پابند نہیں ہیں۔ یہ تحریک لوگوں کو اسلام، عیسائیت اور مغربی مزاہب کی طرف راغب ہونے سے بچانے کے لیے شروع ہوئی۔ اس تحریک نے ہندو ثقافت کو بچانے کی کوشش کی، لیکن اس تحریک میں شامل 'شدھی' (تزکیہ) کے عمل نے، ہندوستان کے

دیگر حصوں میں جہاں آریہ سماج مضبوط تھا وہاں فرقہ وارانہ نفرت پیدا کی۔تاہم آریہ سماج کا سب سے بڑا تعاون تعلیم کے میدان میں تھا۔ دیانند سرسوتی کی 1883 میں اجمیر میں موت کے بعد ان کے شاگرد دو گروہوں میں بٹ گئے۔ لبرل گروپ، نے 1886 میں لاہور میں دیانند اینگلو ویدک کالج قائم کیا، جہاں طلباء کو مغربی اور ہندوستانی دونوں طرح کی معلومات فراہم کی گئیں۔لالہ ہنسراج اور لالہ لاجپت رائے اس کالج کے قیام میں اہم لوگ تھے۔آرتھوڈوکس گروپ، جس کی قیادت لالہ منشی رام (سوامی شردھانند) نے 1902 میں کانگڑی، ہریدوار میں کی، انہوں نے گروکل یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں ادارے ہندو سماج کے اندر رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہزاروں طلباء کو راغب کرنے میں کامیاب ہوگے۔ آریہ سماج ایک سماجی اصلاح اور سماجی خدمت کی تحریک کے طور پر آج بھی زندہ ہے۔ آزادی کے بعد کے ہندوستان میں، یہ تحریک بندھوامزدوروں کو آزاد کرنے میں زیادہ ملوث تھی۔اس میدان میں سوامی اگنیویش نے جو کام کیا ہے وہ واقعی قابل تعریف ہے۔

18.3.4 رام کرشنا مشن (The Ramakrishna Mission)

نریندر ناتھ دتہ (1863-1902) جو سوامی وویکانند کے نام سے مشہور ہیں۔انہوں نے انگریزی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی اور انہوں نے جان اسٹیورٹ مل، روسو، ہیگل، ڈوما، ڈانٹے وغیرہ کے فلسفے پڑھے تھے۔وہ ایک 'ریشنلسٹ' تھے اور رام کرشن پرم ہنسا 'روایت پرست' تھے۔شاید، عیسائی مشنریوں اور دیگر یوروپیوں کی طرف سے ہندو مذہب اور ہندوستانی ثقافت پر حملہ انہیں ایک پلیٹ فارم پر لے آیا۔

وویکانند نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں بڑے پیمانے پر سفر کیا اور ناخواندگی اور غربت دو وجہ سامنے آئی جسکی وجہ سے ہندوستان کو حقیقی ہندوستان یعنی ایک ترقی یافتہ دیش بننے میں دشواری ہوتی ہے۔ وہ ورلڈر یلیجیئس کانگریس (11 ستمبر 1893) میں شرکت کے لیے شکاگو (امریکہ) گئے اور مغرب میں مختلف مسائل دیکھے مثلاً مادی دنیا میں بڑی کامیابیوں کے باوجود مغرب کے لوگ ذہنی سکون نہیں پار ہے تھے۔اس طرح، انہوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ روحانی اور مادی زندگی کے درمیان ایک عادلانہ توازن وقت کی ضرورت ہے۔انہوں نے وہاں عوام کو 'امریکہ کی بہنوں اور بھائیوں' کہہ کر مخاطب کیا، جس نے فوراً حاضرین کے دل، دماغ اور روح کو چھو لیا۔ان کی تقریر نے امریکہ کے اخبارات میں سرخیاں بنائیں بہت سے لوگوں نے عیسائی مشنریوں کو ہندوستان بھیجنے کی ضرورت پر سوال اٹھایا کیونکہ جو خود دانشوروں کا ملک تھا۔ویویکانند نے امریکہ کے مختلف شہروں میں "ویدانتا سوسائٹی" قائم کی اور بہت سے امریکیوں اور انگریزوں کو اپنا شاگرد بنایا، جیسے لوئی (ابھیانند)، سینٹسبرگ (سوامی کرپانند) اور ملما گریٹ نوبل (سسٹر نیویدیتا)۔وہ پیرس، ویانا، مصر بھی گئے اور ہندو مذہب اور ہندوستانی ثقافت کے بارے میں پھیلی غلط فہمیوں کو دور کیا۔ مغرب میں بے شمار شہرت کی وجہ سے وہ پہلے ہی ہندوستان میں جانے جاتے تھے اس لیے جب وہ ہندوستان واپس آئے تو بہت مقبول ہوئے۔

انہوں نے 1897 میں بیلور (کلکتہ کے قریب) میں رام کرشنا مشن اور مایاوتی (المورہ، اترانچل کے قریب) میں ایک مٹھ قائم کیا۔ ابتدائی طور پر ان کا مشن قحط سے متاثر لوگوں کی مدد کرنا تھا مگر بعد میں اس مشن نے اپنے دائرہ کو وسیع کیا اور یتیم خانے، ہسپتال، لائبریری

وغیرہ قائم کیے،اس طرح وویکانند کی تحریک بنیادی طور پر ایک مذہبی اصلاح کی تحریک کے بجائے ایک انسانی اور سماجی خدمت کی تحریک تھی۔ رسومات یابت پرستی کو چیلنج کرنے کے بجائے انہوں نے غربت اور ناخواندگی کو دور کرنے پر زور دیا۔انہوں نے ہندوستان میں ناخواندگی کا ذمہ دار ہر پڑھے لکھے شخص کو ٹھہرایا جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے بھائی بہنوں کو بھول جاتا ہے۔انہوں نے نوجوانوں میں خود اعتمادی پیدا کی اور انہیں 'کرما' (ایکشن) کے لیے ترغیب دی۔ان کے خیالات کا خلاصہ مندرجہ ذیل نکات میں کیا جاسکتا ہے۔

- انہوں نے تمام مذاہب کو سچے مذاہب کے طور پر کہا،اس لیے مذہب کی تبدیلی سے کوئی مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا۔
- گیان(علم)،کرما(عمل)اور بھکتی(عقیدت) کے ذریعے خدا تک پہنچا جاسکتا ہے۔
- سماجی اور مذہبی رسمیں تب ہی قابل قبول ہوسکتی ہیں جب وہ عقلی ہوں۔
- ہر کوئی خدا کو پہچان سکتا ہے۔
- انہوں نے ہندوستان کو ہیومنزم (انسانیت) کی جائے پیدائش کہا لیکن ہندوستانیوں کے انسانی اقدار کو بھلانے اور ذات پرستی اور اچھوت وغیرہ کو اپنانے کی مذمت کی۔
- غربت، بیماریوں اور ناخواندگی کے خلاف جنگ عظیم انسانی کام تھے۔انہوں نے سنیاسیوں کو دنیا کو ترک کرنے کے بجائے انسانوں اور عوام کے لیے کام کرنے کی ترغیب دی۔
- انہوں نے توہم پرستانہ عقائد،ذات پرستی اور اچھوت کی مخالفت کی۔ایک بار انہوں نے کہا، "ہمارا مذہب ہمارے کچن تک محدود ہے،اور ہم 'چھونے والے نہیں' بن چکے ہیں۔ہمارا خدا ہمارے برتنوں میں ہے اور ہمارا مذہب وہ ہے جو تقویٰ ہے، مجھے مت چھونا۔"
- وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کچھ معاملات میں مغرب سے سیکھے جیسے خواتین کی ترقی۔

روحانیت کو عملی شکل دینا وویکانند کی ایک اہم شراکت تھی۔اپنے ہم عصر سماجی مصلحین کے برعکس، وویکانند کے نظریہ اور عمل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔انہوں نے ہزاروں پڑھے لکھے ہندوستانیوں، خاص طور پر ہندوؤں کو متاثر کیا اور خود اعتمادی پیدا کرنے میں ان کی مدد کی۔کسی اور سماجی مصلح نے پڑھے لکھے ہندوؤں کو وویکانند کی طرح متاثر نہیں کیا۔ان کا انتقال بہت پہلے (1902) ہوا لیکن ان کی تحریک زندہ ہے۔رام کرشنا مشن برما،امریکہ، برطانیہ اور پاکستان سمیت تقریباً 34 ممالک میں سرگرم ہے۔

18.4 مسلمانوں میں اہم اصلاحی تحریکیں (Major Reform Movements among Muslims)

18.4.1 فرائضی تحریک (The Faraizi Movement)

ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار سب سے پہلے بنگال میں قائم ہوا تھا، یہاں پر انہوں نے ایسا نظام رائج کیا جس میں عام کسانوں کی حالت بہت بدتر ہوگئی تھی، انگریز، ہندو جاگیرداروں کی وساطت سے اس علاقے سے پیداوار اور مالیہ اکٹھا کرواتے تھے، ہندو جاگیردار کسانوں سے اس طرح مالیہ وصول کرتے کہ ان کے پاس اپنی ضروریات کے لیے بھی کچھ باقی نہ رہتا تھا،ان عام کسانوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

بنگال میں کسانوں نے کئی دفعہ علم بغاوت بلند کیا، مگران کے پاس نہ تو کوئی طاقت تھی اور نہ ہی ان کے معاشی حالات نے انہیں زیادہ عرصے تک لڑنے کا حوصلہ دیا۔

بنگال میں جن نامور مجاہدین اور مصلحین نے اسلامی معاشرہ کو برائیوں سے پاک کرنے اور مسلمانوں کو سیاسی واقتصادی اور معاشرتی حقوق دلانے کے لیے بھرپور جدوجہد کی ان میں سرفہرست "حاجی شریعت اللہ" کے نام قابل ذکر ہیں، جس کے ذریعے سے بنگال میں ایک مظبوط وطاقتور تحریک نے جنم لیا، جو "فرائضی تحریک" کے نام سے مشہور ہے۔ فرائضی تحریک ایک کسان اور مذہبی تحریک تھی۔ یہ نام عربی لفظ (فرض) سے لیا گیا ہے، جس کے معنٰی ہے ذمہ داری کے۔ یہ تحریک بنگال کے مشرقی حصے میں زمینداروں کے خلاف شروع ہوئی جو زیادہ تر ہندو تھے اور نیل کی کھیتی کرنے والے کسان اور خریدنے والے برطانوی تھے۔

مسلم کسانوں کو متحرک کرنے کے لیے، اس کے رہنماؤں نے مذہبی علامتوں کا استعمال کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو غیر مسلموں سے ممتاز کرنے کے لیے لباس کے انداز میں تبدیلی کی تبلیغ کی۔ اس کے بانی حاجی شریعت اللہ "بنگال کے مسلمانوں میں رائج سماجی بدعات کے خلاف تھے، ان میں سے بہت سے ہندو مذہب سے مستعار تھے۔ وہ مختلف مذہبی رسومات میں پھنسے ہوئے تھے، جیسے کہ مسلم مزارات پر عبادت کرنا، بھیڑ جمع کرنا، (تقریبی کشتی) کا تیرانا، رسمی رقص کرنا، اور پہلی ماہواری کے موقع پر گھر کے ارد گرد کیلے کے درخت لگاتے تھے۔ جمعہ اور عید کی نمازوں کو انگریزوں کے ماتحت ہندوستان کو دارالحرب (دشمن کا علاقہ) سمجھ کر معطل کر دینا ان نمازوں کی ضرورت نہیں ہے۔

حاجی شریعت اللہ کے صاحبزادے دومیاں کی قیادت میں تحریک انقلابی شکل اختیار کر گئی، انہوں نے گاؤں سے لے کر صوبائی سطح تک ہر سطح پر ایک خلیفہ (مجاز نائب) کے ساتھ تحریک کو منظم کیا۔ انہوں نے جاگیرداروں اور پولیس کے غنڈوں سے لڑنے کے لیے ایک نیم فوجی دستے کو منظم کیا۔ انہیں کئی بار گرفتار کیا گیا لیکن 1862 میں ان کی موت کے بعد ان کی تحریک صرف ایک مذہبی تحریک کے طور پر باقی رہی۔ فرائضی تحریک کی مخالفت طائیانی تحریک نے کی جس کی قیادت کرامت علی جونپوری کر رہے تھے جو شاہ ولی اللہ کی مذہبی فکر سے متاثر تھے۔ انہوں نے فرائضیوں کی طرف سے جمعہ اور عید کی نماز کی معطلی پر تنقید کی اور دلیل دی کہ برطانوی دور حکومت میں مسلمانوں کے لیے مذہبی آزادی تھی، ہندوستان 'دارالحرب' نہیں تھا، اگر دارالاسلام نہیں تھا تو کم از کم دارالامان (امن کی سرزمین) تھا۔

18.4.2 وہابی تحریک (The Wahabi Movement)

سید احمد نے 1820 کے آغاز میں بھارت کے شہر رائے بریلی میں وہابی تحریک کی بنیاد رکھی جو کہ ایک سماجی مذہبی تحریک تھی۔ اور سب سے مشہور سنی اسلامی احیاء پسند تحریکوں میں سے ایک تھی۔ وہابی تحریک نے اسلام کی اصل روح کو ڈھال بنا کر محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ یہ بنگال (ہندوستان) میں انگریزوں کے اثر ورسوخ کے سبب وجود میں آئی۔ مشہور کتابچہ "سیرت مستقیم" کو سید احمد کے حکم پر ان کے شاگردوں نے جن میں مولوی محمد اسماعیل اور مولوی عبدالحئ شامل ہیں، انہوں نے اس کو مرتب کیا تھا۔ اور یہ تبلیغ شروع کی تھی کہ سچے مسلمان کا اولین فریضہ ہجرت کرنا یا ترک وطن ہے۔

وہابیت کے لوازم:

وہابی باقی مسلمانوں سے بالکل مختلف نہیں ہیں۔ وہ ان پانچ ضروری چیزوں کی پیروی کرتے ہیں جو ہر مسلمان کے لیے ضروری ہیں یعنی نماز روزہ، حج، زکوۃ اور جہاد۔ مزید برآں عاجزی، قناعت اور استقامت جیسی کئی دوسری خوبیوں کے حصول میں بھی کوشاں رہتے ہیں۔

- توحید- خدا خود موجود ہے اور باقی تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ وہ اپنی صفات میں بے مثال ہے۔ روحانی عظمت اور نجات خدا کے احکامات پر سختی سے عمل پیرا ہونے میں ہے۔ جیسا کہ قرآن میں دیا گیا ہے اور شریعت میں بیان کیا گیا ہے ۔
- اجتہاد- وہابی "تشریح" کے حق کو تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ مسلمانوں کو دیا گیا ہے اور اس حق کو استعمال کرنے کی خواہش پر زور دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چاروں عظیم اماموں کے پیروکاروں نے در حقیقت یہ حق ترک کر دیا ہے، عبدالوہاب نے اس موضوع پر کئی مقالے لکھے جن میں غلامانہ تقلید کے حامیوں پر تنقید کی گئی۔
- شفاعت- وہابی کسی تیسرے کی طرف سے شفاعت کے نظریہ پر یقین نہیں رکھتے۔ کہ جو افراد بزرگی کے حامل ہوں اور انہیں خدا کے قریب تر سمجھا جاتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ خُدا انسان سے اُس کی اپنی رگوں سے بھی زیادہ قریب تر ہے۔ اور یہ ہر کسی کے لیے کھلی بات ہے کہ وہ کسی تیسرے کی مدد کے بغیر اللہ سے دعا کر سکتا ہے۔ وہ ایکشن پر زور دیتے ہیں۔ اور ان کا ماننا ہے کہ اسلام کے اصولوں پر غیر فعال یقین رکھنا کافی نہیں ہے۔
- بدعت- وہابی بہت سے موجودہ مذہبی اور سماجی طریقوں کی مذمت اور مخالفت کرتے ہیں جن کی شریعت میں کوئی نظیر و مثال یا جواز نہیں ہے۔ ان میں مقبرے کی بے جا تعظیم، پیروں کے عزت و احترام میں مبالغہ آرائی، شادیوں میں حد سے زیادہ جہیز اور دیگر تہواروں جیسے ختنہ اور میلاد (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کا جشن) شامل ہیں۔ نیز بیواؤں کی دوبارہ شادیوں کی ممانعت وغیرہ کے موقعوں پر عمومی لگنے والی نمائش بھی اسی میں داخل ہے۔

تحریک کی نوعیت (Nature of the Movement)

تحریک کے مذہبی پہلو کو بعض مؤرخین نے بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ عام غلط فہمیوں میں سے ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کا رخ سکھوں کے خلاف ہے۔ لہٰذا اس تناظر میں اسلامی نظریے کے مطابق ہجرت کو سمجھنا ضروری ہے۔ ہجرت کا مفہوم یہ ہے کہ جب کسی بھی ملک کے اندرونی حالات ایسے ہو جائیں کہ اپنے مذہبی فرائض کی انجام دہی ناممکن ہو جائے تو ایسے ملک میں رہنے والے مسلمانوں کا فرض ہے کہ کسی اسلامی ملک میں ہجرت کریں یا کسی ایسی جگہ کا رخ کریں جہاں ان کے مذہبی حقوق کی پاسداری میں ایسی کوئی رکاوٹ آڑے نہ آتی ہو۔ جس ملک میں اسلامی حکومت نا ہو اس کو دارالحرب کہتے ہیں اور جہاں اسلامی حکومت ہو اس کو دارالاسلام کے نام سے جانا جاتا ہے۔ لہٰذا دارالحرب میں اپنے حقوق کی بحالی کے لیے جدوجہد کرنا فرض ہے۔ اور یہ جدوجہد ایک امام کو کرنی چاہیے۔ چوں کہ سید احمد نے محسوس کیا کہ انگریزوں کے آنے کے نتیجے میں ہندوستان کی آزادی چھن گئی ہے۔ اور ملک اب دارالاسلام کہلانے کے مستحق نہیں رہا اس لیے اس نے یہ سوچا کہ ایسے وقت میں تمام مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک آزاد علاقے کی طرف ہجرت کریں جو انگریزوں کے کنٹرول

سے خالی ہو۔ تبھی شمال مغرب کی سرحدان چند علاقوں میں سے ایک نظر آئی جو ابھی تک انگریزوں کے اثر سے باہر تھی۔اس علاقے کے لوگ ہر اس شخص سے ہاتھ ملانے کے لیے تیار تھے جو آزادی کی ضمانت دے سکے۔ سید احمد نے بھی اس علاقے میں خود کو ایک محفوظ مقام پر پایا۔ چند ریاستوں کے سردار جن میں بلوچستان، بہاولپور اور سندھ سید احمد سے تحریک کے سلسلے میں خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ اور اس سلسلے میں سکھوں کے ساتھ تصادم تحریک چلانا ان کا مقصد نہیں تھا بلکہ سید احمد کا یہاں پر رہنے کا مقصد محض یہاں کام کرنا اور برطانوی رکاوٹوں کے بغیر اسلام کے احکامات کی پیروی کرنا تھا۔

تحریک کا علاقہ

وہابی تحریک کے مراکز کانیٹ ورک پہلے یعنی 1820 سے 1860 تک پورے بنگال میں پھیلا ہوا تھا۔ بعد میں 1869-70 کی تحقیقات کے دوران، اس نے پشاور سے بیجاپور اور ڈھاکہ سے پونہ تک پھیلے ہوئے ملک کے بڑے حصے کا احاطہ کیا۔ ولسن مل کی ہسٹری آف برٹش انڈیا برقرار رکھتی ہے کہ آپریشن کا مرکزی منظر ضلع بارسات اور ضلع نادیہ کا ملحقہ علاقہ تھا۔

عرب اور ہندوستانی وہابی تحریک:

انگریز مصنفین نے سید احمد کے سفر حج کو ان کے کیریئر کا اہم موڑ قرار دیا ہے، یہ ان کا عرب میں قیام تھا کہ وہ عربی وہابیت کے قریب آئے، عرب میں وہابیت کے بانی محمد بن عبدالوہاب تھے۔ سید احمد کے عربی اثر و رسوخ کے بارے میں ہنٹر کا بیان ثابت نہیں ہے یہ بھی واضح رہے کہ سید احمد کی زیارت کے وقت مقدس شہر ترکوں کے زیر تسلط تھے۔ تمام نجدی وہابی مشتبہ تھے اور ان کی موجودگی مشکل سے برداشت کی جاتی تھی، اس لیے رابطے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سید احمد پہلے ہی مروجہ سماجی و مذہبی ریاست کے خلاف مہم چلانے کے قائل تھے اور غیروں کے خلاف جنگ چھیڑنے کی خواہش رکھتے تھے، سیرت مستقیم اس بات کی گواہی دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں تحریکوں میں قرآن وحدیث سے الہام ہونے کی وجہ سے مماثلت پائی جاتی ہے اور دونوں تحریکوں کے بڑھنے کے موقع پر دونوں ملکوں میں رائج حالات کی مماثلت کی وجہ سے انہوں نے اسلام کے بعض اصولوں جیسے توحید اور پرہیزگاری کا اعادہ کیا۔ بدعت سے۔ فرق اس تحریک کا واضح طور پر سیاسی پہلو تھا جس میں ہندوستانی وہابیت نے ملک کی آزادی پر زور دیا تھا، جب کہ وہاں عربی وہابیت تھی جس نے سماجی مذہبی اصلاح کی نمائندگی کی تھی ہندوستانی وہابیت کی ایک اور نمایاں خصوصیت مہدوی تحریک کے ساتھ ایک مرحلے پر اس کی شناخت تھی، جو عرب میں کبھی نہیں دیکھی گئی۔

وہابی تحریک کا سماج اور مذہب میں شراکت:

بیوہ کی دوبارہ شادی کی تشہیر اور اس پر عمل کرنا تہواروں کے موقعوں پر شوخی کی تقریب اور دیگر فضول خرچیوں کو ترک کرنا، مولوی طبقے کا عام لوگوں پر دباؤ کم کرنا اور مقبروں کو سجدہ کرنے اور مرنے والوں سے امداد کی دعا کے مروجہ رواج کو ختم کرنا اور سادہ لوح کو اپنانا۔ اور پاکیزہ زندگی اصلاح کی چند جھلکیاں تھیں۔ اس تحریک کا ایک اہم ضمنی نتیجہ یہ تھا کہ اس نے اردو نثری تحریر کو فروغ دیا تمام مشنری تحریکوں کی طرح اس میں بھی مقامی زبان کے استعمال پر زور دیا گیا! اس کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کی کوشش فارسی عام طور پر اشرافیہ کی

زبان تھی لیکن وہابی لیڈروں نے اردو کا بڑھتا ہوا استعمال کیا اور اس میں کئی پمفلٹ لکھے۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کو متاثر کیا، ان کے کچھ حربے جیسے غیر فعال عدم تعاون، پنچایتی نظام۔ وفاداروں کے سماجی بائیکاٹ نے آنے والی جدوجہد کی مثالیں قائم کیں۔ فنڈز جمع کرنے کے موثر طریقہ کار کا حوالہ سریندر ناتھ بنرجی نے ایک عوامی تقریر میں دیا تھا اور اسے اپنانے کی سفارش کی تھی۔ انتہائی خفیہ اور پیچیدہ وہابی تنظیم جو پورے ملک میں مردوں اور پیسوں کی آمدورفت کی اہم معلومات فراہم کرتی ہے، اس کی ایک موثر مثال بھی ثابت ہوئی۔

تحریک کی ناکامی:

اس کی ایک اہم وجہ قبائلی افغان وہابیوں کی انحراف اور وقفے وقفے سے دشمنی تھی۔ یہ مادی وسائل تیار کرنے میں بھی ناکام رہا حتیٰ کہ مخالفوں کے وسائل سے بھی مماثل ہے۔

18.4.3 دیوبند تحریک (The Deoband Movement)

تحریک دیوبند خالصتاً ایک دینی و اسلامی تحریک تھی اس میں مشرقی علوم کی ترویج کے لیے کام کیا گیا تھا، اور مغربی علوم، انگریزی یا اس طرح کے جتنے بھی علوم تھے اس کی مخالفت کی گئی تھی۔ اس اسلامی ادارہ (یعنی دیوبند تحریک کا قیام سن 1867ء) میں اترپردیش، ضلع، سہارنپور کے قصبہ دیوبند سے شروع ہوا اس کی ابتدا قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی کے ہاتھوں ہوئی۔ اس مکتب فکر کا اصل مقصد یہ تھا کہ 1857 کی بغاوت میں انگریزوں کے ہاتھوں بہت علمائے قتل ہوگئے تھے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر اسلامی تعلیم کی بہت زیادہ گراوٹ آگئی تھی، لہٰذا مسلمانوں اور عالم (علماء) اور متوسط طبقے کے درمیان دوبارہ رابطہ قائم کرنا، اور مسلم کمیونٹی کو اسلامی تعلیم کی طرف راغب کرنا تھا، تاکہ مسلمانوں کے اندر دینی و مذہبی اور ثقافتی اور تہذیبی ماحول پیدا ہو سکے اور کی طرف رغبت پیدا ہو۔

دیوبند میں ایک روایت پسند مطالعہ کا منصوبہ بنایا گیا تھا جب کہ جدید سائنس کو نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جدید طبیعی یا عقلی علوم (معقولات) سرکاری اداروں میں آسانی سے سیکھے جا سکتے ہیں، لیکن مسلم روایتی علوم (منقولات) زوال پذیر ہو رہے تھے۔ وہ اسلامی اور جدید مغربی عقلیت پسند مکتب فکر کے درمیان ایک پل بنانا چاہتے تھے۔ انہیں امید تھی کہ اگر کوئی طالب علم چاہے تو دیوبند میں اپنی مذہبی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کسی جدید اسکول یا یونیورسٹی میں داخلہ لے سکتا ہے۔ اس طرح، دیوبند اسکول اپنے آپ کو ایک ادارہ، جدید مغربی اسکولوں کا تکمیلی اور ابتدائی تصور کرتا ہے۔ اس وجہ سے یہ عملی سے زیادہ نظریاتی رہا، کیونکہ کورسز (نصاب تعلیم کی مدت) بہت طویل تھے، شروع میں دس سال اور بعد میں چھ سال۔ اس کے نصاب میں عربی اور فارسی گرامر، ادب، تاریخ اسلام، منطق، عرب فلسفہ، کلام، جدلیات، تنازعات، قرون وسطیٰ جیومیٹری، فلکیات، عرب طب، فقہ، حدیث اور تفسیر شامل ہیں۔ جو طلباء کی درجہ بندی اس نصابی کتب کے لحاظ سے کی گئی تھی، جن کا انہوں نے اپنے تعلیمی دور سے ہی مطالعہ کیا تھا۔ دیوبند، اگرچہ ایک راسخ العقیدہ مسلم تعلیمی ادارہ سمجھا جاتا ہے، اس نے انڈین نیشنل کانگریس اور آزادی کی جدوجہد کی حمایت کی۔ اس کے قائدین "مولانا محمود الحسن سے لے کر محمد حسین آزاد تک ہیں۔ اس نے آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور مسلم لیگ اور محمد علی جناح کے دو قومی نظریہ کی شدید مخالفت کی جس کی بنیاد پر پاکستان بنایا گیا تھا۔

18.4.4 علی گڑھ تحریک (The Aligarh Movement)

جدید ہندوستان میں مسلمانوں میں اصلاحی کام کرنے والے مشہور عالم قطب الدین احمد بن عبدالرحیم تھے، جو دہلی کے رہنے والے شاہ ولی اللہ کے نام سے مشہور تھے۔ انکا زمانہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے درمیان کا ہے۔ انہوں نے اسلامی طرز زندگی کی طاقت کو بحال کرنے کے ساتھ ساتھ پختہ عقیدہ لوگوں اور آزاد خیال والوں کے درمیان اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ شاہ عبدالعزیز (شاہ ولی اللہ کے بیٹے جنہوں نے برطانوی دور میں ہندوستان کو دارالحرب کا فتویٰ دیا)، رائے بریلی کے سید احمد شہید (1786-1831) اور مولانا شریعت العزیز۔ (بنگال) ان لوگوں کا تعلق راسخ العقیدہ طبقے سے تھا، پھر سر سید احمد خان اور چراغ علی آزاد خیال سے تعلق رکھنے والے تھے۔ ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے مولانا شبلی نعمانی جیسے شخصیت دونوں کے درمیان خالی جگہ کو پر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بہت سے اسکول، خاص کر علی گڑھ اسکول اور دیوبندی مدرسوں نے جدید دور میں ہندوستانی مسلمانوں پر سب سے زیادہ اثر چھوڑا۔

علی گڑھ تحریک کا آغاز سر سید احمد خان (98-1817) نے کیا تھا، جو برطانوی حکومت میں مجسٹریٹ کے عہدے پر کام کرتے تھے اور متحدہ صوبہ (.U.P) میں مختلف مقامات پر تعینات تھے۔ مسلم سماج کی اصلاح کے لیے ان کی ایک منظم تحریک علی گڑھ سے شروع ہوئی تھی اور اسی لیے اسے علی گڑھ تحریک کہا جاتا تھا۔ زمینی کام غازی پور (مشرقی یوپی) سے کیا گیا جہاں 1864 میں، ہندوستان میں مسلمانوں میں مغربی علوم کو مقبول بنانے کے لیے ایک نئے اسکول اور سائنسی سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ سوسائٹی نے فزیکل سائنسز پر جو کام تھا اسکا اردو میں ترجمہ کیا جو شمالی علاقے میں رہنے والے عوام کی زبان ہے۔

1857 کی بغاوت کی ناکامی ہندوستانیوں کے لیے خاص طور سے اشرافیہ (اشرف) مسلمانوں کے لیے ایک بڑا صدمہ تھا۔ سر سید احمد خان اشرافیہ مسلمانوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ سر سید احمد خان نے جان لیا کہ مسلمانوں کے لیے زندہ رہنے کا ایک ہی راستہ اپنے اداروں کو جدید بنانا اور برطانوی راج کا وفادار رہنا ہے۔ پہلا مقصد حاصل کرنے کے لیے اس نے 1875 میں علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا، جو کیمبرج یونیورسٹی کی طرز پر بنایا گیا تھا اور بنیادی طور پر مسلمانوں کے لیے تھا۔ اس کا مقصد آزاد خیال سوچ، سائنسی عالمی نظریہ اور سیاست کے لیے ایک عملی نقطہ نظر تھا۔ انہوں نے سرکاری خدمات میں پڑھے لکھے مسلمانوں کے مستقل اضافے کی کوشش کی۔

- 1886 میں اس نے محمڈن اینگلو اورینٹل کانفرنسز کی بنیاد رکھی۔
- قیمتی سائنسی کاموں کے تراجم کے ذریعے اردو زبان کو تقویت بخشی۔
- تمام سرکاری اور نجی اسکولوں میں اردو کو دوسری زبان کے طور پر قبول کرنے کے لیے سیاسی دباؤ ڈالنا۔
- آنے والی نسلوں کی ترقی کے لیے خواتین کی تعلیم پر زور دینا۔
- یورپ میں مسلم طلباء کی اعلیٰ تعلیم کے لیے پالیسی مرتب کی جائے۔

سر سید ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مسلمان برطانوی حکومت کے دشمن نہیں وفادار ہیں۔ انہوں نے 1888 میں محمدن پیٹریاٹک

ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے یہ بھی خدشہ ظاہر کیا کہ سیاسی نمائندگی میں مسلمان پیچھے ہو جائے گیں انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ ان کی دشمنی کی وجہ سے، بہت سے مؤرخین نے الزام لگایا کہ وہ مسلم علیحدگی پسند اور دو قومی نظریہ کے علمبردار تھے۔ تاہم، یہ ان کے عقائد کی غلط فہمی ہے۔ سر سید نے اپنی ایک مشہور تقریر میں کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک خوبصورت دلہن کی دو خوبصورت آنکھوں کی مانند ہیں۔

اسلام کے بارے میں سر سید کا نقطہ نظر بھی بہت جدید اور عقلی تھا۔ انہوں نے قرآنی آیات کی جدید، سائنسی اور عقلی تشریح کی وکالت کی۔ وہ اجتہاد کی روایت کو زندہ کرنا چاہتے تھے اور تعدد ازدواج، پردہ کے نظام اور رقم پر سود کے مسئلے پر ایک نیا نظریہ رکھتے تھے۔ انہوں نے دلیل دی کہ اسلام میں تاریخی اور سماجی تناظر میں تعدد ازدواج کی اجازت ہے، اس لیے ہندوستانی مسلم سماج کو یہ رواج ترک کرنا چاہیے۔

اسی طرح قرآنی آیات اور صحیح احادیث کو چیلنج کیئے بغیر انہوں نے خواتین کی تعلیم اور عوامی زندگی کے مختلف شعبوں میں خواتین کی شرکت کے حق میں بھی دلیلیں دیں۔ جب انہوں نے 1870-71 میں انگلینڈ کا دورہ کیا تو یورپی خواتین کو عوامی زندگی میں کام کرتے دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ 'سود' کے حوالے سے، انہوں نے تشریح کی کہ مرکب سود کو اسلام میں حرام سمجھا جا سکتا ہے لیکن سادہ سود، خاص طور پر بینک سود اور سرکاری بانڈز پر سود کو جائز سمجھا جانا چاہیے۔ جن لوگوں نے ان کی حمایت کی ان میں الطاف حسین حالی، نذیر احمد اور شبلی نعمانی وغیرہ شامل تھے۔ ان کی تحریک کا تعلق بھی مسلمانوں خاص طور سے نوجوان مسلم لڑکے اور لڑکیوں کی اخلاقی بہتری سے تھا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک اردو ماہنامہ تہذیب الاخلاق نکالنا شروع کیا۔ وہ اردو زبان میں جدید نثر لکھنے کے علمبردار تھے۔ انہوں نے اردو میں دو مشہور کتابیں لکھیں- 1858ء میں اسباب بغاوت ہند اور آثار الصنادید (دہلی کے فن تعمیر پر)۔

18.4.5 احمدیہ تحریک (The Ahmadiya Movement)

احمدیہ تحریک انیسویں صدی کی ایک مذہبی تحریک تھی، جس کا آغاز مرزا غلام احمد قادیان (1839-1908) نے پنجاب کے ایک مقام پر کیا۔ ابتدا میں اس تحریک نے آریہ سماج اور عیسائی مشنریوں سے اسلام کا دفاع کیا۔ 1889 میں، مرزا غلام احمد نے 'مسیح' اور 'مہدی' (ایک نبی) ہونے کا دعوی کیا۔ بعد میں، اس نے خود کو کرشنا اور یسوع کا اوتار بھی قرار دیا۔ تاہم مسلمانوں کی اکثریت نے غلام احمد اور ان کے پیروکاروں کی مخالفت کی جنہیں احمدیہ یا قادیانی کہا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ ایک الگ فرقہ بن گیا اور پاکستان میں ان کے ساتھ غیر مسلم جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔

18.5 اصلاحی تحریکوں کی اہمیت (Significance of the Reform Movements)

جدید ہندوستان کے ارتقاء میں انیسویں صدی کی اصلاحی تحریکوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ سماج کی جمہوریت سازی، توہم پرستی اور مکروہ رسومات کے خاتمے، روشن خیالی کے پھیلاؤ اور عقلی اور جدید نقطہ نظر کی ترقی کے لیے کھڑے تھے۔ مسلمانوں میں علی گڑھ اور

احمدیہ تحریکیں ان نظریات کی مشعل راہ تھیں۔احمدیہ تحریک جس نے 1890ء میں قادیان کے مرزا غلام احمد کی تحریک سے ایک خاص شکل اختیار کی، جہاد کی مخالفت کی، لوگوں کے درمیان برادرانہ تعلقات کی وکالت کی اور مغربی لبرل تعلیم کی حمایت کی۔ علی گڑھ تحریک نے تعدد ازدواج کی مخالفت اور بیوہ شادی کی وکالت کر کے مسلمانوں میں ایک نیا سماجی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ قرآن کی آزادانہ تشریح اور مغربی تعلیم کے فروغ کے لیے کھڑا تھا۔ ہندو برادری کے اندر اصلاحی تحریکوں نے کئی سماجی اور مذہبی برائیوں پر حملہ کیا۔ شرک اور بت پرستی جو انفرادیت یا مافوق الفطرت کی نشوونما کی نفی کرتی ہے اور مذہبی پیشواؤں کے اختیار کی نفی کرتی ہے جس نے موافقت کی عادت کو جنم دیا تھا، ان تحریکوں کی طرف سے سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ذات پات کی مخالفت نہ صرف اخلاقی اصولوں پر تھی بلکہ اس لیے بھی کہ اس نے سماجی تقسیم کو فروغ دیا۔ نسل پرستی کا وجود صرف ابتدائی برہمو میں نظریاتی اور محدود سطح پر تھا۔

تحریک، آریہ سماج، پراتھنا سماج اور راما کرشنا مشن جیسی تحریکیں ذات پات کے نظام کے غیر سمجھوتہ کرنے والی نقاد بن گئیں۔ ذات پات کے نظام پر زیادہ سخت تنقید ان تحریکوں کے ذریعے کی گئی جو نچلی ذاتوں کے درمیان ابھریں۔ انہوں نے بلاشبہ ذات پات کے نظام کے خاتمے کی وکالت کی، جیسا کہ جوتیبا پھولے اور سری نارائن گرو کی طرف سے شروع کی گئی تحریکوں سے ظاہر ہے۔ مؤخر الذکر نے کال دی-- صرف ایک خدا اور انسانوں کے لیے ایک ذات۔ خواتین کی حالت کو بہتر بنانے کی خواہش خالصتاً انسانی بنیادوں پر نہیں تھی۔ یہ سماج کی ترقی کی جستجو کا حصہ تھا۔ کیشوب چندر سین نے اس تشویش کا اظہار کیا تھا: "زمین پر کسی بھی ملک نے تہذیب میں اتنی ترقی نہیں کی جس کی عورتیں جہالت میں ڈوبی ہوں"۔ سماج کی اس وقت کی رائج اقدار کو بدلنے کی کوشش ان تمام تحریکوں میں واضح نظر آتی ہے۔ ایک یا دوسرے طریقے سے، کوشش یہ تھی کہ جاگیردارانہ سماج کی بالادستی کی اقدار کو تبدیل کیا جائے اور بورژوا نظام کی خصوصیات کو متعارف کرایا جائے۔

18.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

انیسویں صدی میں ہندوستان میں اہم پیشرفت ہو رہی تھی۔ اس پیشرفت میں، ہندوستانی سماج کی تعمیر نو کے امکانات موجود تھے۔ وہ مختلف سماجی، ثقافتی اور مذہبی مسائل اور طریقوں سے نمٹتے تھے۔ ان نظریات کو پھیلانے میں تعلیم کو بہت اہم کردار سونپا گیا تھا۔ خواتین کے مقام کی بلندی، ستی، جبری بیوہ پن، ذات پات کا نظام، اچھوت پرستی، بت پرستی، شرک، رسم پرستی، پجاری پرستی اور سماج میں رائج دیگر توہمات پر شدید فکری حملہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ مذہب اور سماج کے درمیان روابط کی تشکیل نو اور ماضی کے ساتھ ایک اہم ربط کو برقرار رکھنا اصلاحی تحریک کی چند اہم خصوصیات تھیں۔ تاہم، اپنے پھیلاؤ و توسیع کے لحاظ سے، تحریک دیہی آبادی کے بڑے حصوں تک پہنچنے میں ناکام رہی اور تعلیم یافتہ شہری متوسط طبقے تک ہی محدود رہی۔ سماج اور سیاست میں کچھ موروثی رکاوٹیں بھی موجود تھیں جنہوں نے ان نظریات کو ایک ناقابل تلافی سماجی قوت سے روک دیا۔ حدود کے علاوہ، اصلاحی تحریک کی ایک اہم کامیابی قوم پرست سوچ میں اس کی شراکت میں ہے۔ اگرچہ اصلاحی تحریک نے براہ راست سیاسی مسائل پر توجہ نہیں دی، لیکن بعد میں آنے والی ہندوستانی قومی تحریک کے لیے ایک جگہ پیدا کی۔ خاص کر ان اصلاحی تحریکوں نے ادب کے ذریعے سماجی و ثقافتی شعور کے عروج میں نمایاں کردار ادا کیا۔

18.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

احیاء پسندی	:	ماضی کو زندہ کرنے اور اس کی تسبیح کرنے کی کوشش۔
ستی	:	شوہر کی چتا پر بیوہ کو جلانے کا رواج۔
بنیاد پرستی	:	وہ عقیدہ ہے جس کا مقصد زبردست یا انتہائی سماجی یا سیاسی تبدیلی
بت پرستی	:	تصویری پوجا کی مشق۔
شرک	:	بہت سے خداؤں پر یقین۔
توحید	:	ایک خدا پر یقین
نوآبادیاتی	:	طاقتور ملک کا کمزور ملک پر تسلط۔
مستشرقین	:	جو مشرقی ایشیا کے ممالک کی زبان، ثقافت، تاریخ یا رسم و رواج کا مطالعہ کریں۔
ایوینجلیکل	:	بشارت انجیل / بائبل کو سنجیدگی سے لیتے ہیں اور مسیح کو نجات دہندہ مانتے ہیں۔
عقلیت پسند	:	وہ شخص جو تمام مذہبی عقائد اور عمل کو عقل کے لحاظ سے پرکھتا ہے۔

18.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

18.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Questions)

1. کلکتہ میں 1839 میں تتوابودھینی سبھا کس نے قائم کی؟
2. سوامی دیانند سرسوتی کا اصل نام کیا تھا؟
3. مشہور کتابیں جنانا یوگا، کرما یوگا اور راجہ یوگا کس نے لکھیں؟
4. برہمو سماج کا بانی کون ہے؟
5. 'تحفۃ المواحدین کتاب' کس نے لکھی؟
6. 'اتمیہ سبھا' کس سال میں قائم کی گئی تھی؟
7. وہابی تحریک کس نے شروع کی؟
8. 'Go back to the Vedas' کا نعرہ کس نے دیا تھا؟
9. رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کس نے شروع کیا؟
10. احمدیہ تحریک کس نے شروع کی؟

18.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Questions)

1. فرائضی تحریک پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
2. ینگ بنگال موومنٹ پر مختصر نوٹ لکھیں۔
3. سماجی اصلاحی تحریک میں راجارام موہن رائے کا کیا کردار ہے؟ واضح کریں۔
4. تحریک دیوبند کی شراکت پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
5. اصلاحاتی تحریکوں کا اثرات پر نوٹ لکھیں۔

18.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Questions)

1. مذہب اور خواتین کی حالت کے بارے میں موہن رائے کے خیالات کی وضاحت کریں۔
2. اونیسویں صدی کے دوران ہندوستان میں سماجی و مذہبی اصلاحی تحریکیوں کے اہم رجحانات پر تبادلہ خیال کریں۔
3. تعلیم پر علی گڑھ تحریک کے تعاون کی وضاحت کریں۔

18.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

---

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Chandra, Bipan, et. al., *India's Struggle for Independence*, Penguin Books, New Delhi, 1989.
3. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
4. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
5. Sen, Amiya P., *Social and Religious Reform*: *The Hindus of British India*, *New Delhi* (2003).
6. Sen, Amiya P., *Rammohun Roy: A Critical Biography*, Penguin, UK, 2012.
7. Sen, Amiya P., *Explorations in Modern Bengal*, *C. 1800–1900: Essays on Religion*, *History*, *and Culture*, Primus Books, Delhi, 2010.
8. Metcalf, Barbara D., and Thomas R. Metcalf, *A Concise History of Modern India*, Cambridge University Press, Delhi, 2012 (first pub. 2001).

اکائی 19۔ جنوبی ہندوستان میں سماجی و مذہبی اصلاحی تحریکیں

(Socio-Religious Reform Movements in South India)

اکائی کے اجزاء

19.0 تمہید

19.1 مقاصد

19.2 کندُکوری ویریش لنگم سے قبل کے سماجی اصلاح کار اور ان کی دانشورانہ سرگرمیاں

19.2.1 یینوگُلا ویرا سوامیّا

19.2.2 سامی نینی مُتّو نرسمہا نائیڈو

19.2.3 جیّر سوری

19.2.4 جی۔ ویدانتاچاری

19.2.5 دمپورو نَرسیّا

19.2.6 دیگر دانشوران

19.3 کندُکوری ویریش لنگم اور سماجی اصلاح کی تحریک

19.3.1 ہندوستان کے ماضی پر ویریش لنگم کے خیالات

19.3.2 ویریش لنگم کے خواتین پر خیالات

19.3.3 ویریش لنگم کا خواتین کے لیے جریدہ

19.3.4 خواتین کے لیے ویریش لنگم کے تحریریں

19.3.5 تعلیم نسواں پر ویریش لنگم کے خیالات

19.4 ویریش لنگم کے قائم کردہ ادارے

19.5 کم سنی کی شادی کے رواج پر ویریش لنگم کا نظریہ

19.6 ویریش لنگم اور بیواؤں کی دوبارہ شادی کی تحریک

19.7 ہندو دھرم شاستروں پر ویریش لنگم کا موقف

19.8 سماجی اصلاح کی تحریک میں کنڈ کوری راجیہ لکشمما کی خدمات
19.9 ہتکارنی سماج
19.10 ویریش لنگم کے سیاسی افکار
19.11 اکتسابی نتائج
19.12 ضمیمہ
19.13 کلیدی الفاظ
19.14 نمونہ امتحانی سوالات
19.15 تجویز کردہ اکتسابی مواد

19.0 تمہید (Introduction)

جیسا کہ آپ نے پچھلی اکائی میں دیکھا اور پھر اگلی اکائی میں بھی دیکھیں گے کہ انیسویں صدی کے نوآبادیاتی ہندوستان میں سماجی اصلاح کی کئی انجمنیں قائم ہوئیں۔ برہمو سماج، آریہ سماج، پرارتھنا سماج وغیرہ ان میں مشہور ہیں۔ البتہ چند ایسی اہم انجمنیں بھی تھیں جو یا تو کم مشہور تھیں یا پھر سرے سے ہمیں ان کے بارے میں معلومات ہی نہیں۔ ان ہی میں 'ہتکارنی سماج' ایک ہے۔ اس اکائی میں ہم اس انجمن کے بانی ویریش لنگم (1848–1919) کی سماجی اصلاح کی تحریک کے تئیں ان کی خدمات کا مطالعہ کریں گے۔ ویریش لنگم جنوبی ہندوستان میں ایک قدآور سماجی مصلح تھے۔ انہیں جنوب کے ایشور چندر ودیاساگر بھی کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے بھی خاص طور پر بیواؤں کی دوبارہ شادی کی تحریک میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ وہ خاص طور پر ایک چھوٹے سے شہر راجمنڈری یا راجہ مہندراورم سے اپنی سرگرمیاں چلاتے تھے۔ نوآبادیاتی آندھرا میں یہ مقام سماجی اصلاحی تحریک کا مرکز تھا۔

19.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- کنڈ کوری ویریش لنگم کے سماجی اصلاح کی تحریک شروع کرنے سے قبل جنوبی ہندوستان میں دانشورانہ سرگرمیوں کو سمجھ سکیں۔
- جنوبی ہندوستان میں ویریش لنگم کی سماجی اصلاحی تحریک کے تئیں کثیر جہتی خدمات کا استحسان کر سکیں۔
- خواتین کے بارے میں ویریش لنگم کے خیالات کو سمجھ سکیں۔
- ویریش لنگم کے قائم کردہ مختلف اداروں خاص طور پر 'ہتکارنی سماج' کے بارے میں جان سکیں۔
- سماجی اصلاح کی تحریک میں ویریش لنگم کی اہلیہ کنڈ کوری راجیہ لکشمما کی خدمات کو سمجھ سکیں۔

19.2 کنڈ کوری ویریش لنگم سے قبل کے سماجی اصلاح کار اور ان کی دانشورانہ سرگرمیاں
(Intellectual Currents before Veeresalingam)

19.2.1 ینوگُلاویراسوامیّا (Enugula Veeraswamaiah)

ویریش لنگم سے قبل چند دانشوروں نے اصلاحی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور خواتین کے مسائل پر خاص طور پر توجہ مرکوز کی۔ ینوگُلاویرا سوامیّا (1780تا1836) ایک برہمن تھے اور مدراس کے صدر سپریم کورٹ میں 'دوباشی' تھے۔ انہوں نے اپنے سفر نامہ 'کاشی یاترا چرتر' (1838) میں ہندوستانی سماج میں پائے جانے والی مختلف سماجی برائیوں پر بحث کی اور تنقید کی۔ روایتی رسم ورواج کے ایک سخت ناقد کے بطور انہوں نے خواتین اور "اچھوتوں" کے خلاف نارواسلوک کی سخت مذمت کی۔ انہوں نے ستی کی رسم پر حملہ کیا اور خواتین کی تعلیم اور بیواؤں کی دوبارہ شادی کی وکالت کی۔ 1830 کی دہائی میں قائم ہونے والی 'ہندو لٹریری سوسائٹی' ('Hindu Literary Society') کے بانیوں میں سے ایک کی حیثیت سے انہوں نے انگریزی تعلیم کو پھیلانے اور روشن ضمیری کو پیدا کرنے میں نہایت اہم حصہ ادا کیا۔

19.2.2 سامی نینی مُتّونرسِمہانائیڈو (Samineni Muttoonarasimmah Naidoo)

سامی نینی مُتّونرسِمہانائیڈو کا تعلق راجمندری سے تھا اور وہ ضلع منصف کے عہدہ پر فائز تھے۔ انہوں نے اصلاح کی سمت اہم خدمات انجام دیں۔ انہوں نے خواتین کی خصوصی ضروریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سال 1850 کے آس پاس اپنی کتاب 'ہت سوچنی' (*Hitasoochanee*) تحریر کیا، جس کا مطلب ہے 'اخلاقی ہدایت کار'۔ اس کتاب میں آٹھ مضامین ہیں جس میں ہر ایک مضمون تعلیم، شادی اور طب سے متعلق مختلف عنوانات پر لکھا گیا۔ شادی کے مسئلے پر وہ اپنے ہم عصروں سے بہت آگے تھے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ 170 سال قبل ہی انہوں نے شادی کرنے والی دونوں پارٹیوں یعنی لڑکا اور لڑکی کے درمیان آپسی محبت اور رضامندی پر سخت زور دیا۔ شادی کے دوران فضول اخراجات پر بھی کافی تنقید کی۔ ہندوؤں کی شادیوں کے دوران پڑھے جانے والے اشلوکوں کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کامیابی کے ساتھ ثابت کیا کہ ماضی میں شادیاں لڑکی کے مناسب عمر کو پہنچنے اور ذہنی طور پر پختگی کے بعد ہی انجام پاتی تھیں۔ اس دور میں عام طور پر پائی جانے والی کم سنی کی شادیوں کی رسم کی انہوں نے مذمت کی اور 12 سال اور 16 سال کی عمروں کی لڑکیوں اور لڑکوں کی شادی کی بالترتیب عمروں کی تجویز پیش کی۔ (جیسا کہ آپ جانتے ہیں، برطانوی حکومت نے چائلڈ میریج ریسٹرینٹ ایکٹ (The Child Marriage Restraint Act) جسے عام طور پر شاردا ایکٹ کہا جاتا ہے، 1929 میں منظور کرتے ہوئے لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے اقل ترین عمر بالترتیب 14 سال اور 18 سال مقرر کی تھی)۔ سامی نینی مُتّونرسِمہانائیڈو کا کہنا تھا کہ کم سنی کی شادیاں زیادہ تر بیوگی کا سبب بنتی ہیں جو ناجائز تعلقات اور نوزائیدہ کے قتل کا سبب بنتا تھا۔

19.2.3 جیّرسوری (Jiyyar Suri)

جیّرسوری کی کتاب 'استری کلاکلولینی' (*Stree Kalakallolini*, 1875) اس سلسلے میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یہ کتاب

تلگوزبان میں لکھی گئی ہے اور مختصر مضامین پر مشتمل ہے جو خاص طور پر لڑکیوں کے لیے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین کے عنوانات انگریزی میں بھی دیے گئے ہیں۔ چند عنوانات اس طرح ہیں: 'تعلیم نسواں قدیم استعمال کے مغائر نہیں ہے' ('Female Education is not Contrary to Ancient Usage')، 'غیر تعلیم یافتہ خواتین بچوں کے لیے دشمن ہوتی ہیں' ('Un-educated Females are Enemies to Children')، 'علم کی خوبصورتی' ('The Beauty of Knowledge')، 'زمین اور دوسرے عناصر انسانیت کی خدمت کرتے ہیں' ('The Earth and Other Elements Serve Mankind') اور 'پوری دنیا ایک خاندان کی تشکیل کرتی ہے' ('The Whole World Forms One Family') ظاہر ہے کہ عنوانات خود وضاحتی نوعیت کے ہیں۔

19.2.4 جی۔ ویدانتاچاری (G. Vedantachari)

وشاکھا پٹنم کے ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس جی۔ ویدانتاچاری نے ازدواجی اصلاح کی تحریک میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے 1870 میں گورنمنٹ آف مدراس کو ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں انہوں نے 'ہندو شادیوں کے موجودہ طرز' کو نہایت قابل نفریں اور بیہودہ قرار دیا۔ ان کا ماننا تھا کہ کم سنی کی شادیاں، شوہر اور بیوی کے درمیان نامناسب عمر کا تفاوت، شادی سے قبل ایک دوسرے سے متعلق ان کی لاعلمی، کنیا شُلکم (*'Kanyashulkam'*) کی رسم، یہ تمام شادی کے ادارے سے جڑی ہوئی اہم برائیاں ہیں اور یہ برائیاں ان کے مطابق بیوگی اور بدسلوکی جیسی برائیوں کو پیدا کرتی ہیں۔ ان کو دور کرنے کے لیے انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ کم سنی کی شادیوں اور کنیا شُلکم پر امتناع عائد کرنا چاہیے اور شادی کی اقل ترین عمر (لڑکیوں کے لیے کم سے کم نو سال اور لڑکوں کے لیے کم سے کم سولہ سال) مقرر کر دینا چاہیے اور ساتھ ہی جوڑوں کی باہمی رضامندی کو حاصل کرنا چاہیے۔

19.2.5 دمپورو نرسیّا (Dampuru Narasaiah)

مدراس سے شائع ہونے والے جریدہ *People's Friend* کے ایڈیٹر دمپورو نرسیّا نے کمسنی کی شادی کی مخالفت میں خطوط کو مدراس ٹائمز (*Madras Times*) میں 1865 میں شائع کرتے ہوئے تحریک چلائی۔ مذہبی کتابوں سے اقتباسات کے حوالے سے انہوں نے بحث کی کہ کم سنی کی شادیاں مقدس کتابوں میں شادی سے متعلق احکامات کی صریح خلاف ورزی ہیں۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ لڑکیوں کو اپنی پسند کے شوہر کے انتخاب کا حق دیا جانا چاہیے۔

19.2.6 دیگر دانشوران (Other Intellectuals)

اوپر بیان کیے گئے دانشوران کے علاوہ اور بھی دیگر لوگ تھے جنھوں نے جنوبی ہند میں مذہبی اصلاح کی کوششیں کیں۔ ان میں وینیلا کنٹی سوبراؤ (Vennelacunty Soobrow, 1784–1839) اور چدلوواڈا اننت رام شاستری (Chadaluvada Antarama Shastry) قابل ذکر ہیں۔ ان میں آخر الذکر نے لڑکیوں کی شادی کم از کم عمر 16 سال کی تجویز رکھی تھی۔ غرض

ویریش لنگم کے سماجی اصلاح کے منظر میں داخل ہونے تک ایک دانشورانہ فضا کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ان کے خیالات کو مزید استحکام ملااور 1870 کے دہے میں ویریش لنگم کی قیادت میں ان خیالات کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

19.3 کنڈ کوری ویریش لنگم اور سماجی اصلاح کی تحریک

(Kandukuri Veeresalingam and the Social Reform Movement)

حالانکہ ویریش لنگم سے قبل جنوبی ہند میں اصلاحی خیالات پیش کیے جا چکے تھے۔ لیکن ان خیالات کو ویریشالنگم کی قیادت میں مزید استحکام ملااور اس نے تحریک کی شکل اختیار کرلی۔انہوں نے اصلاح کے کام کو ایک جامع انداز میں انجام دیا جس میں تحریری کاوشوں،اشاعت اور اصلاح کے تعلق سے تقاریر کے علاوہ ادارے بھی قائم کیے تاکہ اپنے مشن کو آگے بڑھا سکیں۔

19.3.1 ہندوستان کے ماضی پر ویریش لنگم کے خیالات (Veeresalingam's Views on India's Past)

اونچی ذات کے ہندوؤں خاص طور پر برہمنوں کی ثقافتی گراوٹ،اور خواتین کے پست موقف کو دیکھتے ہوئے ویریش لنگم نے ہندو نظام کو سدھارنے اور ہمارے ملک کے 'شاندار ماضی' کو پھر سے بحال کرنے کی کوشش کی۔ ستمبر 1879 میں راجمنڈری بیواؤں کی دوبارہ شادی کی انجمن ('Rajahmundry Widow Remarriage Association')سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

> اے میرے دیس میں رہنے والو!ایک منٹ کے لیے غور کرو کہ عہد قدیم میں دوسرے ممالک کے لوگوں نے ہندوؤں سے تہذیب سیکھی۔ کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں ہوتی کہ تمہارا ملک اس وقت علم وفنون کا مرکز تھا؟ . . . کیا اس عظیم عہد میں ہمارے ملک کی خواتین تعلیم حاصل کرکے مردوں کے برابر احترام حاصل نہیں کرتی تھیں؟ میں اس عہد کی عظیم خواتین کے نام گنواتا ہوں، جیسے سیتا، شکنتلا، اَنسویا وار اوّا جنھوں نے اس عہد قدیم میں اونچا مرتبہ حاصل کیا تھا۔ . . . اے میرے دیس کے لوگو موجودہ حالات کو غور سے دیکھو۔ . . . ہم اپنے آپ کو ایک ذلیل اور پست مقام میں دیکھیں گے۔ وہی ہندو ملک جس نے ماضی میں پوری دنیا کے لیے ایک مثال پیش کی تھی،آج وہی ملک لوگوں میں ہنسی مذاق کا موضوع بنا ہوا ہے۔اے لوگو! تھوڑا سا اپنے ملک کے شاندار ماضی کے بارے میں سوچو اور آج کے انتہائی شرمناک حالات کی طرف دھیان دو۔ کیا ہم ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے بھی محض ہاتھ ملتے ہوئے خاموش بیٹھیں گے اور وہی لوگ (یوروپی) جنھوں نے ہم سے علم حاصل کیا (ثقافت اور تہذیب سیکھی) ہم پر اب انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔

19.3.2 ویریش لنگم کے خواتین پر خیالات (Veeresalingam's Views on Women)

خواتین کا انتہائی پست موقف ہی سماج کی تشکیل نو اور ثقافتی دفاع (Cultural Defence) کی سب سے بنیادی خصوصیت تھی۔انہوں نے اس حقیقت کو پہچان لیا تھا کہ ثقافتی دفاع اور قومی آگہی کے درمیان اہم تعلق پایا جاتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے سماجی، ثقافتی اور سیاسی

اُمور، دونوں میں آزادی کی بات کی۔ سماجی و ثقافتی اُمور کو انہوں نے زیادہ فوقیت دی کیونکہ ان کا یقین تھا کہ ''ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ گھر کی ترقی نہ ہو'' اور گھر کی ترقی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک خواتین کے حالات میں بہتری نہ ہو۔ سماج میں خواتین کے پست موقف کو قومی ثقافتی تنزل کا سب سے طاقت ور سبب مانتے ہوئے ویریش لنگم نے کہا کہ 'ہماری ترقی خواتین کی ترقی پر منحصر ہے'۔ لہٰذا خواتین کی ترقی کو یقینی بنانے کے لیے اور اس طرح ملک کی ترقی کو یقینی بنانے کے لیے ہمیں چاہیے کہ خواتین کے آگے بڑھنے کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کریں۔ انہوں نے خواتین کی تعلیم پر زور دیا، کم سنی کی شادیوں 'کنیا شُلکم (کچھ رقم کے عوض کمسن لڑکیوں کو خریدنے کی رسم)'، جبری بیوگی اور وراشُلکم (جہیز) جیسی رسومات پر زوردار حملہ کیا۔ انہوں نے خواتین کی تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت دی کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ 'جب تک خواتین تعلیم یافتہ نہیں ہوں گی اس وقت تک ملک کی ترقی ممکن نہیں ہے'۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ 'مرد اس وقت تک آگے نہیں بڑھ سکتے جب تک خواتین کو پستی کی حالت میں رکھا جاتا ہے۔ اگر مردوں کو آگے بڑھنا ہے تو انہیں خواتین کو تعلیم یافتہ بناتے ہوئے ان کے مقام کو اونچا کرنا پڑے گا۔ اگر مرد خواتین کو غلام رکھتے ہوئے ترقی کرتے ہیں تو در حقیقت یہ ترقی نہیں کہلائے گی اور وہ یقینی طور پر گر جائیں گے (اور ناکام ہو جائیں گے)'۔

19.3.3 ویریش لنگم کا خواتین کے لیے جریدہ (Veeresalingam's Journal for Women)

ویریش لنگم نے جب یہ دیکھا کہ تلگو میں خواتین کے استعمال کے قابل اچھی کتابیں نہیں ہیں، تو انہوں نے 'ستی ہت بودھنی' (*Satihitha Bodhini*) نام کا ایک رسالہ شروع کیا۔ یہ رسالہ خواتین کے لیے تلگو زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ تھا جو 1883 میں جاری ہوا اور 1905 تک شائع ہوتا رہا۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، یہ ہدایتی نوعیت کا تھا۔ اس میں خواتین کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں کیا کام کرنے ہیں اور کونسے کام نہیں کرنے ہیں، اس کے متعلق ہدایات دی جاتی تھیں۔ اس رسالہ نے خواتین کی تعلیم کے فروغ کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ تعلیم نسواں کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے بیان کیا کہ 'اگر ماں غیر تعلیم یافتہ ہوگی تو وہ اپنے بچوں کو بگاڑے گی۔ اگر وہ تعلیم یافتہ ہوگی تو وہ بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت بخوبی طور پر گھر پر ہی کر سکے گی اور اس طرح انہیں باعلم اور عقلمند بنا سکے گی'۔ اسی طرح ایک جذبات کو منتقل کرنے والا عنوان تھا 'غیر تعلیم یافتہ مائیں اپنے بچوں کی دشمن ہوتی ہیں' ('Uneducated Mothers are Enemies of their Children' (In Telugu: '*Chaduverugani Streelu tama Biddalaku Shatruvulu*'))۔ اس رسالے میں خواتین کی ازدواجی وفاداری ('*Pativratyam*') کو بھی ضروری قرار دیا گیا۔ جون 1883 کے شمارے میں انہوں نے خواتین کی اپنے شوہروں کے تئیں وفاداری کو اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ 'قدیم دور سے ہی مرد خواتین کی عزت کی نگرانی کرتے رہے ہیں۔ [لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے]۔ خواتین کی عزت اُسی وقت ممکن ہے جب خواتین تعلیم کے حصول کے ذریعے اپنے اخلاق کو سنواریں۔ یہ مردوں کی زبردستی سے نہیں ممکن ہے۔'

ان دو اہم موضوعات کے علاوہ 'ستی ہت بودھنی' نے کچھ اور مختلف موضوعات جیسے اخلاق و اقدار، رحم دلی، مدد کرنا، صبر، بہادری، گھر پر خواتین کی ذمہ داریاں، گھر گرہستی، بچوں کی پرورش، پیسہ، زیورات، فضول خرچی، ابتدائی سائنس، جس میں خصوصی طور پر خواتین کی

صحت پر زور دیا گیا۔ جھگڑالو پن، غیبت اور چغلی، ساس اور بہو کے درمیان رشتہ، بہوؤں پر ساسوں کا ظلم، ہندو خواتین کے موجودہ موقف، ملکہ وکٹوریہ، بد دعائیں اور توہمات، علم نجوم پر یقین وغیرہ کے علاوہ مائکرواسکوپ، آتش فشاں، سانپ جیسے موضوعات پر تحریریں ہوتی تھیں۔ ان تمام موضوعات پر لکھنے والے تقریباً مرد ہی تھے اور ان میں سب سے بڑا حصہ خود ویریش لنگم کا رہا۔ ان کی بیشتر تحریریں خواتین کے لیے ہی لکھی گئیں۔ انہوں نے اپنے تحریروں میں آسان اور عام فہم انداز اپنایا۔ اور اکثر اخلاقی قصوں اور کہانیوں کی شکل میں پیش کیا۔

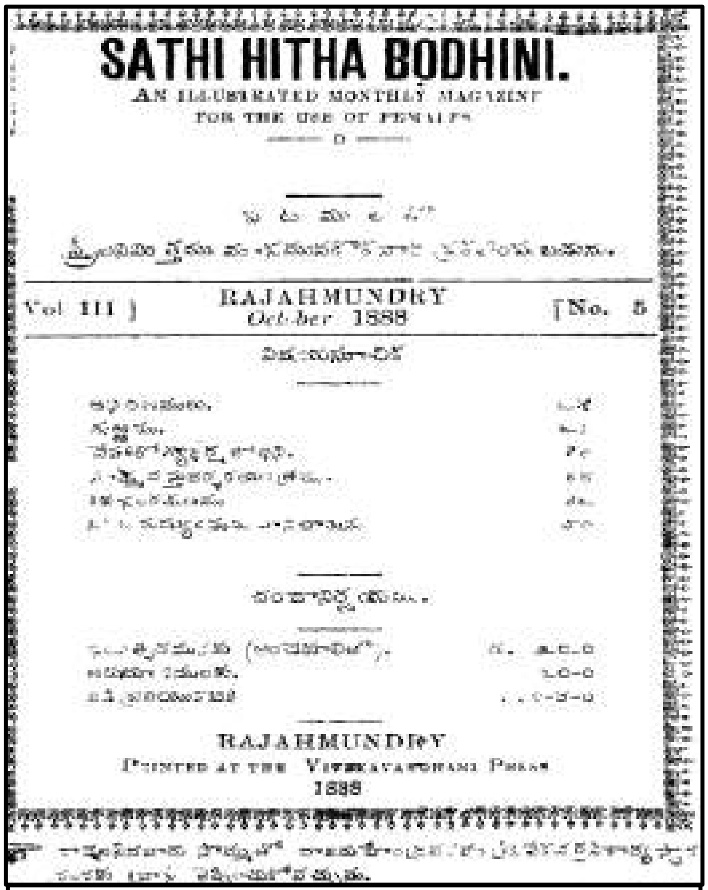
SATHI HITHA BODHINI.

AN ILLUSTRATED MONTHLY MAGAZINE FOR THE USE OF FEMALES

Vol III] RAJAHMUNDRY October 1888 [No. 5

RAJAHMUNDRY

PRINTED AT THE VIVEKAVARDHANI PRESS

1888

'ستی ہت بودھنی' کا سرورق

19.3.4 خواتین کے لیے ویریش لنگم کے تحریریں (Veeresalingam's Writings for Women)

'ستی ہت بودھنی' کو شائع کرنے کے علاوہ انہوں نے خواتین کی خصوصی 'ضروریات' کو مد نظر رکھتے ہوئے کئی کتابیں بھی لکھیں جو ابتداء میں 'ستی ہت بودھنی' میں قسط وار شائع ہوتی تھیں۔ 'پتنی ہت سوچنی' (*Patnihitha Suchani*) (گھریلو خواتین کو مشورے) جو 1896 میں شائع ہوئی۔ اس میں خواتین/بیویوں کو ماہواری، حمل، زچگی اور بچوں کی پرورش کے سلسلے میں مشورے شامل ہیں۔ 'دیہاروگیہ دھرم بودھنی' (*Deharogya Dharma Bodhini*) نامی کتاب 1889 میں شائع ہوئی اور یہ خواتین کی فزیالوجی اور صحت کے بارے میں ہے۔ 'ستیہ وتی چرترمو' (*Satyavati Charitramu*)، 'چندرمتی چرترمو'

(ستیہ وتی اور چندر متی جو ہندو پتی ورتائیں تھیں ان کی تاریخ)، 'ستیہ سنجیونی' (*Chandramati Charitramu*) (*Satya* *Sanjivani*, 1887)، 'نیتی کتھا منجری' (*Niti Katha Manjari*, 1893)، 'اُتّم استری چرترمو' (*Uttama* *Stree Charitramu*) (جس میں عظیم انگریز خواتین جیسے جون آف آرک، لیڈی جین گرے، میری کارپینٹر، ایلزبیتھ فرے وغیرہ کا تذکرہ ہے) اور 'استری نیتی دیپیکا' (*Stree Neeti Deepika*) وغیرہ ان کی تصنیف کردہ کتابوں میں سے چند ہیں۔

19.3.5 تعلیم نسواں پر ویریش لنگم کے خیالات

(Veeresalingam's Views on Women's Education)

ویریش لنگم خواتین کی تعلیم کی مخالفت کرنے والوں کے ساتھ دانشورانہ سطح پر جنگ کرنے میں مصروف رہے۔ اس زمانے میں کثیر تعداد میں ایسے قدامت پسند لوگ موجود تھے جو خواتین کی تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ جب تعلیم نسواں کے مخالفین نے ہم عصر رسالوں میں اس بات پر بحث کی کہ 'خواتین تعلیم کی اہل نہیں ہیں' تو انہوں نے طنزیہ انداز میں اس کا جواب دیا کہ 'مرد تعلیم کے اہل نہیں ہیں'۔ مخالفین تعلیم نسواں پر حملہ کرتے ہوئے ویریش لنگم نے اس طرح لکھا:

اگر خواتین تعلیم یافتہ ہوں
تو انسانی گوشت کی فروخت کا کیا ہوگا
کوئی سوچتا ہے۔
تو قدیم گھریلو رسومات کا کیا ہوگا
کوئی پریشان ہوتا ہے۔
کون میری خدمت اپنا خدا مان کر کرے گی
کوئی غم کھاتا ہے۔
کون مورتیوں کی دیکھ بھال کرے گی اور ان کی پوجا کرے گی
کوئی سوچتا ہے۔
اور یہ آج کے سماج کے قائدین ہیں جو
قدیم طریقوں سے
زندگی کی برائیوں کی حفاظت کرنے نکلے ہیں۔

قدامت پسندوں کی، جنہوں نے خواتین کی تعلیم کی مخالفت اس بنیاد پر کی کہ خواتین کو روزی روٹی کمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویریش لنگم نے اس کا جواب اپنے مضمون 'تعلیم نسواں' میں اس طرح دیا:

بعض لوگ سوچتے ہیں کہ تعلیم نوکری حاصل کرنے کے لیے ہے۔ روٹی کمانے کے لیے ہے۔ اور سوال کرتے ہیں کہ ''عورتوں

کو تعلیم کی ضرورت کیوں ہے جب کہ انہیں کام کرنے اور روٹی کمانے کی ذمہ داری نہیں ہے ؟'' میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں ''اس معاملے میں دولت مند لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کی کیوں ضرورت ہے جب کہ انہیں روٹی کمانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ایک مزدور ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنی مشقت و محنت سے پیسے کماتا ہے۔ پیسے کمانے کے لیے کوئی شخص کوئی بھی پیشہ کو اختیار کر سکتا ہے۔ تعلیم کسی اور چیز کو حاصل کرنے کے لیے ہے۔ علم، حکمت اور زندگی کی گہری اور عظیم خواہشات کی تکمیل کے لیے ہوتی ہے۔ خواتین کو بھی تعلیم ان ہی اسباب کے لیے حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

کیا وہ خواتین کی تعلیم کو واقعی زندگی کی گہری اور عظیم خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے ؟ جب ہم خواتین کے لیے تعلیم کی ضرورت پر ان کے پیش کردہ مختلف بیانات کا بغور جائزہ لیتے ہیں تو اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ درحقیقت وہ خواتین کا تعلیم یافتہ ہونا اس لیے چاہتے تھے کہ وہ اچھی بیویاں بنیں، اپنے شوہروں کی کامل ساتھی بنیں، اور اپنے بچوں کی اچھی مائیں بنیں۔ ویریش لنگمکے مطابق ایک تعلیم یافتہ عورت اپنے گھر کو جنّت کا نمونہ بناتی ہے۔ آیئے ان ہی کے الفاظ میں اس بات کو دیکھتے ہیں:

> ایک بیوی اپنے گھر کی ملکہ ہوتی ہے۔ اس کا اعلیٰ ترین مذہب (Dharma) یہ ہے کہ وہ گھر کے معاملات کی اچھی طرح دیکھ بھال کرے اور اپنے خاندان کو آرام دے اور خوش رکھے۔ وہ اپنے شوہر کے تمام کاموں میں ہاتھ بٹائے اور اس کو اچھے مشورے دے۔ وہ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دے اور ایک اچھی ماں بنے۔ اس کو سمجھ دار ہونا چاہیے تاکہ خاندان میں خوشیاں آئیں۔ یہ خصوصیات اُس وقت تک ایک عورت میں نہیں آسکتیں جب تک کہ وہ تعلیم یافتہ نہ ہو۔

ویریش لنگم کے مطابق تعلیم یافتہ خواتین، ازدواجی وفاداری (*Pativratyam*) کو بخوبی سمجھتی ہیں اور بغیر مرد کی نگرانی کے صالح اور نیک بن جاتی ہیں، وہ گھر کے انتظام میں مردوں کے بوجھ کو ہلکا کرتی ہیں اور اپنے بچوں کی مناسب نگہداشت اور پرورش کرتی ہیں۔ انہوں نے 'وِویک وردھنی' (*Vivekavardhani*, 1875) میں لکھا:

> خانہ داری کے تمام اُمور کی انجام دہی کا بوجھ خواتین ہی اُٹھاتی ہیں نہ کہ مرد۔ اگر وہ تعلیم یافتہ ہوں گی تو وہ کس خوش اسلوبی سے ان اُمور کو انجام دیں گی؟ چونکہ موجودہ حالات میں خواتین میں یہ مہارتیں (skills) نہیں پائی جاتی، اسی لیے یہ تمام اُمور مردوں کے کندھوں پر آگئے ہیں اور وہ دن بھر باہر کے کام انجام دینے کے بعد ان کو گھریلو اُمور کو انجام دینا پڑتا ہے کیا ان کو تکلیف نہیں ہوگی ؟ اس کے علاوہ اگر خواتین بھی مردوں کی طرح تعلیم یافتہ ہو جائیں تو ان کے بچے نہایت ذہین نکلیں گے۔

ویریش لنگم کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ 'جب تک خواتین کی مدد نہ کی جائے، سماجی اصلاح کا کوئی کام بھی کامیاب ثابت نہیں ہوگا۔' یہ صرف تعلیم ہی کے ذریعے ممکن ہے کہ ایک 'خوشحال ازدواجی زندگی' بسر کی جاسکے۔ وہ چاہتے تھے کہ بیویاں اپنے شوہروں کی کامل رفیق بنیں جیسے کہ ان کی بیوی کنڈ کوری راجیہ لکشمّا تھیں۔ یہ تبھی ممکن ہے جب انہیں تعلیم حاصل ہو۔

19.4 ویریش لنگم کے قائم کردہ ادارے (Institutions Established by Veeresalingam)

اپنے خیالات کو عملی طور پر ڈھالنے کے لیے انہوں نے لڑکیوں کے لیے اسکول کھولے۔ ایک دھولیش ورم میں 1874 میں اور

دوسرا 1881 راجمنڈری میں۔ 1907 میں ایک اور مخلوط تعلیم کا اسکول بھی کھولا گیا جس میں "اچھوت" لڑکوں کو بھی داخلہ دیا گیا۔ وہ خواتین کے لیے ووکیشنل تعلیم (پیشہ جویانہ تعلیم) کی وکالت کرتے تھے تاکہ وہ مفید مہارتوں کو سیکھ کر خود کچھ کمائی کر سکیں اور گھر کے اندر مالی اعتبار سے خود کفیل بن سکیں۔ پرارتھنا سماج کے تحت انہوں نے رات میں چلنے والا اسکول (Night School) بھی قائم کیا جو مزدور طبقے کے لیے تھا۔ پرنٹ میڈیا کے ذریعے انہوں نے مسلسل لڑکیوں کے اسکولوں کو قائم کرنے کی تحریک چلائی۔ ان کے قائم کردہ اسکول سے متاثر ہو کر کئی افراد لڑکیوں کے اسکول قائم کرنے کے لیے آگے آئے اور کئی سوسائٹیز تمام نوآبادیاتی آندھرا میں اسکولوں کے قیام کے ذریعے خواتین کی تعلیم کے فروغ میں ابھریں۔

19.5 کم سنی کی شادی کے رواج پر ویریش لنگم کا نظریہ

(Veeresalingam on the Practice of Child Marriage)

ویریش لنگم کم سنی کی شادی، کنیا شُلکم، زبردستی بیوگی، بیواؤں کے حلیے کی تبدیلی اور جہیز جیسی 'ظالمانہ رسومات' کو ایک دوسرے سے جوڑ کر دیکھتے تھے اور ان تمام کے خلاف مورچہ سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کے خیال میں یہ رسومات غیر ملکیوں کے آگے ہمارے ملک کی بے عزتی کا سبب بنے ہوئے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے ملک کے رہنے والوں سے اپیل کی کہ وہ ان بے جا اور ظالمانہ رسومات کو ترک کر دیں۔

کم سنی کی شادی کو 'انسانی گوشت کی فروخت' سے تعبیر کرتے ہوئے انہوں نے والدین پر اور خصوصی طور پر برہمنوں پر زور دار حملہ کیا جن کے یہاں یہ رسم زیادہ رائج تھی۔ انہوں نے ان کو 'قصاب سے بھی زیادہ ظالم' مذموم شمار کیا جو جانوروں کے گوشت بشمول (مقدس) گائے کے گوشت کو فروخت کرتے ہیں۔ والدین کو خاص طور پر والد کو نشانہ بناتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ حرص (لالچ) میں اتنے آگے چلے گئے ہیں کہ اپنی ہی معصوم بیٹیوں کا گلا کاٹتے ہیں اور ان کی عمر سے کہیں زیادہ عمر کے مردوں سے ان کی شادی کرتے ہوئے ان کی بلی چڑھاتے ہیں۔ ان کی نظر میں اس طرح کے باپ، 'کلجگ عہد کے راکھشس' ہیں جنہیں برطرف کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے مطابق کنیا شُلکم ایک زہریلے درخت جسے ہم کم سنی کی شادی کہتے ہیں، اس کا ایک اہم سبب ہے۔ کم سنی کی شادیاں دراصل بے جوڑ شادیاں ہوتی ہیں جہاں شوہر اور بیوی کے درمیان 'دوستی' کا موقع نہیں ملتا۔ سن بلوغ کے بعد ہونے والی شادیوں کے سلسلے میں ان کا کہنا تھا کہ 'دلہنوں کو اپنی پسند کے دلہے کے انتخاب کا حق ملنا چاہیے۔' وہ چاہتے تھے کہ برطانوی حکومت اس رسم کو ممنوع قرار دینے کے لیے قانون بنائے۔

19.6 ویریش لنگم اور بیواؤں کی دوبارہ شادی کی تحریک

(Veeresalingam and the Widow Remarriage Movement)

بالجبر بیوگی کا مسئلہ کم سنی کی شادیوں کا سب سے ظالمانہ نتیجہ مانا جاتا ہے۔ ویریش لنگم نے اپنا وقت اور توانائی اس مسئلے پر سب سے زیادہ خرچ کی۔ انہوں نے پوری وضاحت کے ساتھ مختلف قسم کے ظالمانہ سلوک جو بیواؤں پر کیے جاتے تھے جیسے اپنے ہی رشتہ داروں کے

ہاتھ بیواؤں کی شکل کو بگاڑنا وغیرہ کے بارے میں بیان کیا۔ان کے مطابق بالجبر بیوگی نہ صرف یہ کہ بیواؤں کے لیے ذاتی مصیبتوں کا سبب بنتی ہے بلکہ سماجی غیر اخلاقیت کی بھی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اگرچہ کوئی بیوہ جسمانی اذیتوں کو سہہ بھی لیتی ہے، پھر بھی وہ اپنی فطری خواہشات کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ کمینے مردوں کی ہوس کا شکار بن جاتی ہیں۔اس سے اکثر ناجائز تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور پھر اس کے نتیجے کے طور پر حمل واقع ہوتے ہیں جو مزید رحم مادر میں جنین کے قتل، نوزائیدہ بچوں کے قتل اور نوزائیدہ بچوں کو پھینک دینے جیسے ظالمانہ واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ان افسوس ناک حالات کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنے دو ساتھیوں چلہ پلی باپیّا اور پیپڈ ارام کرشنیّا کے ساتھ مل کر بیواؤں کی دوبارہ شادی کی تحریک کا بیڑہ اٹھایا۔

سنہ 1879 میں 'راجمنڈری وڈوری میرج اسوسی ایشن' ('Rajahmundry Widow Marriage Association') بنایا گیا جس کے سکریٹری ویریش لنگم تھے۔انہوں نے نہ صرف اپنی طاقتور تحریروں اور تقریریوں کے ذریعے بیواؤں کی دوبارہ شادی کے حق میں مہم چلائی بلکہ آندھرا کے مختلف اہم شہروں کا دورہ بھی کیا تاکہ عوام کی رائے عامہ کو اس جانب ہموار کیا جائے۔ان کی اس تحریک کا مثبت نتیجہ نکلا۔راجمنڈری میں 11 دسمبر 1881 کو پہلی مرتبہ ایک برہمن ذات کی بیوہ کی شادی انجام پائی۔بیواؤں کی شادی کی تحریک کو مزید تقویت دینے کی خاطر وہ بذات خود بیواؤں کی شادی میں شرکت کرتے ہوئے جشن مناتے تھے یا پھر دور دراز مقامات جیسے وجئے نگرم، بلاری، گنٹور، بنگلور اور مدراس جیسے شہروں میں اپنے دوستوں کے ذریعے اس طرح کی شادیوں کا جشن مناتے ہوئے حوصلہ افزائی کرتے تھے۔اس تحریک کے مزید استحکام کی خاطر انہوں نے بیواؤں کے لیے آشرم (Widow Home) 1905 میں مدراس میں کھولا اور بعد میں ایک اور آشرم 16 جنوری 1905 میں راجمنڈری میں کھولا۔ سنہ 1905 تک 63 بیواؤں کی شادی کی جا چکی تھی۔ عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہیکہ ویرش لنگم کے ذریعہ کی گئی بیواؤں کی دوبارہ شادی کی تحریک صرف برہمن طبقہ تک محدود تھی۔ یہ سراسر غلط ہے۔در حقیقت تاریخی حقائق یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کے ذریعہ کرائی گئی بیواؤں کی شادیوں میں 57 برہمن، تین ویشیہ، ایک وشوا برہمن اور ایک آدی وِیلمہ اور وِل لالہ ذاتوں سے تعلق رکھنے والے شامل تھے۔(وریش لنگم اور انکے دوستوں کے ذریعہ کرائی گئی بیواؤں کی شادیوں کی جدول آپ اس اکائی کے آخر میں دیئے گئے Appendix میں دیکھ سکتے ہیں)

شادیوں کو سادگی سے انجام دینے اور غیر ضروری اخراجات سے بچنے کے لیے زور دیا جاتا تھا۔اس طرح جہیز کو ترک کرنا، شراب نوشی اور رقص و موسیقی جیسے لغو رسومات کی مذمت وغیرہ ایسے مسائل تھے جو ویریش لنگم کے اصلاحی مشن کا حصہ تھے۔

19.7 ہندو دھرم شاستروں پر ویریش لنگم کا موقف

(Veeresalingam's Stand on the Dharmasastras)

خواتین کی تعلیم اور بیواؤں کی دوبارہ شادی کے حق میں اور کم سنی کی شادیوں اور کنیا شُلکم کی مخالفت میں ویریش لنگم نے ہندو دھرم شاستروں کا بہت زیادہ حوالہ دیا تاکہ اپنی بات کو صحیح ثابت کیا جاسکے۔ کم سنی کی شادیوں کے خلاف اپنی بات رکھتے ہوئے انہوں نے کہا 'منو اور

کشیپ(Manu and Kashyapa) کے مطابق ایک خریدی ہوئی عورت بیوی نہیں بن سکتی بلکہ گھریلو ملازمہ ہی بن سکتی ہے۔ اور اسی طرح وہ مذہبی رسومات انجام دینے کی بھی اہل نہیں ہے۔ . . . اس کے باوجود خود ساختہ اونچی ذات کے برہمن اسی شیطانی رسم کو بے شرمی سے جاری رکھے ہوئے ہیں'۔ اُن کے مطابق یہ بُری رسومات ایک 'ظالم شیطانی رواج' کا نتیجہ ہیں نہ کہ شاستروں کا۔ انہوں نے نہایت تلخ انداز میں ان قدامت پسند لوگوں پر حملہ کیا جنہوں نے شروتی، اسمرتی اور شاستروں کی غلط توضیح و تشریح کی۔ مدراس میں ایک کانفرنس کے دوران کسی نے اُن سے سوال کیا کہ کیا وہ ہندو دھرم شاستروں پر یقین رکھتے ہیں۔ تو انہوں نے اس کا نفی میں جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ دو اسباب کی بناء پر ان کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے آپ کو پنڈتوں کی بحث سے بچائیں اور دوسرے اُن مذہبی خیالات کے حامل لوگوں کو مطمئن کر سکیں۔

19.8 سماجی اصلاح کی تحریک میں کندُکوری راجیہ لکشمّما کی خدمات

(Kandukuri Rajyalakshmamma in the Social Reform Movement)

ویریش لنگم کی اہلیہ کندوکوری راجیہ لکشمّما (1851تا1910) نے ان کی اصلاحی کوششوں میں غیر معمولی مدد کی۔ وہ بلاشبہ آندھرا پردیش میں پہلی خاتون تھیں جنہوں نے اصلاح کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپنی اہلیہ کی خدمات کو سراہتے ہوئے ویریش لنگم اپنی آپ بیتی *Sweeya Charitramu* میں کہتے ہیں کہ 'انہوں نے ان کے تمام اچھے کاموں میں تعاون کیا اور مصیبت و آزمائش جیسی ہر حالت میں ایک چٹان کی طرح ان کے ساتھ کھڑی رہیں۔' وہ اس وقت بھی مضبوطی سے ڈٹی رہیں جب ان ہی کے رشتہ داروں نے ویریش لنگم کی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رہنے پر زور دیا۔ اگر بیواؤں کی دوبارہ شادی کے تئیں تحریک میں ان کی فعال شمولیت نہ ہوتی تو اس تحریک کو جو کامیابی ملی وہ ممکن نہ ہوتی۔ وہ کم عمر بیواؤں کے لیے بے پناہ ہمت اور مدد کا ذریعہ تھیں جو انہوں نے اپنے ہی گھر میں قائم کردہ Widow Home میں پناہ لینے کے لیے پہنچتی تھیں۔ وہ غیر تعلیم یافتہ بیواؤں کو پڑھاتی تھیں اور جب کبھی انہیں کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت پڑتی، وہ ان کے لیے ہمیشہ تیار رہتی۔ جب ان کے گھر کی ملازمائیں ان کے تحریک کے کاموں میں عدم تعاون کرنے لگیں تو وہ دریائے گوداوری تک خود پیدل چل کر جاتیں اور پانی لاتیں تاکہ خود پکا سکیں۔ انہوں نے جوان اور 'گری' ہوئی خواتین کے لیے پناہ گاہ 'پتِت یُوتی رَکشَن شالہ' ('Patita Yuvati Rakhshanashala') کو قائم کیا اور 'گری' ہوئی ('fallen') خواتین کے لیے کام کرنے لگیں۔ اس طرح کی سات خواتین کی انہوں نے مدد کی۔ ان میں سے تین کی انہوں نے شادی کروائی اور بقیہ بیواؤں کے جب بچے پیدا ہوئے تو بڑی محنت سے ان کی نگہداشت اور پرورش کی۔ وہ ہر طبقے کے لوگوں کے درمیان آزادانہ گھومتی پھرتی تھیں اور طوائفوں کی بہتر زندگی کے تعلق سے بھی فکر مند رہتی تھیں۔ انہوں نے اپنے گھر میں 'وکٹوریہ گرلز اسکول' ('Victoria Girls' School') بھی کھول رکھا تھا۔

راجیہ لکشمّما نے سماجی بائیکاٹ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سماجی اصلاح کی تحریک میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیا۔ نہ صرف یہ کہ وہ راجمنڈری میں بیواؤں کی دوبارہ شادی کی تقریبات کے انتظامات کرتیں بلکہ دور دراز مقامات پر اس طرح کی شادی کی تقریبات میں حصہ لینے

اپنے شوہر کے ساتھ سفر کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنی دولت جو اس وقت چالیس ہزار روپے تھی خوشی خوشی 'ہتکارنی سماج' کو عطیہ میں دے دی، جسے ان کے شوہر نے قائم کیا تھا(تصور کریں کہ 1906 میں چالیس ہزار روپی کی اہمیت موجودہ دور کے مطابق کیا رہی ہوگی)۔ انہوں نے خواتین کے لیے پرارتھنا سماج قائم کیا۔ میٹنگوں کا انعقاد کیا اور گیت ترتیب دیے۔ وہ ویریش لنگم کے لیے اس قدر طاقت کا سرچشمہ تھیں کہ اُنکی وفات کے بعد ویریش لنگم بے یار و مددگار ہو گئے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح میں چوتھے باب کے دوسرے حصے (1910 تا 1913) کا عنوان ''آسہائے دَشا'' یعنی بے مددگاری کا دور رکھا۔ اور واقعی وہ اپنی بیوی کی وفات کے بعد بے یار و مددگار ہو گئے تھے۔

کندُکوری ویریش لنگم اور ان کی اہلیہ کندوکوری راجیہ لکشمّا

19.9 ہتکارنی سماج (The Hitakarini Samaj)

ہتکارنی سماج جو ایک رجسٹرڈ تنظیم تھی۔ 1906 میں راجمنڈری میں قائم کی گئی جس کے صدر ویریش لنگم تھے۔ اس انجمن کے لیے ویریش لنگم نے اپنی تمام تر جائیداد جس کی لاگت اُس وقت کے حساب سے 41,500 روپیے تھی دان کر دی۔ رگھوپتی وینکٹ رتنم نائیڈو جو سماجی اصلاح کی تحریک کے ایک اور قدآور شخصیت تھے، وہ اس تنظیم کے نائب صدر تھے، کارموری ویرابھدرا سوامی سکریٹری تھے۔ دیشی راجو پیدا باپیّا، نالم کرشناراؤ، کن پرتی سری راملو، گنٹی لکشمنّا اور کنوموری کام راجو وغیرہ ارکان تھے۔ اس تنظیم کے مقاصد میں تعلیمی، انسان

دوستی اور دیگر مفید کاموں کو درج ذیل طریقوں سے آگے بڑھانا تھا۔

1۔ بیواؤں کے گھر، یتیم خانے، پناہ گاہیں، لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اسکولس، صنعتی اور تکنیکی ادارے اور دیگر تعلیمی وانسان دوستی کے اداروں کو قائم کرنا اور دیکھ بھال کرنا۔

2۔ درج بالا مقاصد کے لیے چندہ اکٹھا کرنا اور صحیح خرچ کرنا۔

3۔ سماج جن سماجی کاموں کو ضروری سمجھتا ہے اس کے لیے گرانٹس جاری کرنا۔

4۔ ان اداروں کے لیے زمین، جائیداد حاصل کرنا یا خریدنا۔

ویریش لنگم کی جانب سے کی جانے والی سماجی اصلاح کی کوششوں پر نظر ڈالیں جو نصف صدی پر محیط تھیں، تو یہ حیران کن نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے ہم عصروں سے بہت احترام حاصل کیا اور اپنی تحریک کے خاص طور پر فائدہ حاصل کرنے والی خواتین کا جذبہ قدردانی اور محبت بھی انہیں حاصل رہی۔ بعد میں انہیں بجا طور پر *Vegu Chukka* یعنی صبح کا ستارہ کہا جانے لگا۔ ان تمام باتوں کے باوجود بھی ان کی اصلاح کی تحریک بغیر تحدیدات کے نہیں تھی۔ جیسا کہ ہم نے اس سے قبل بھی وضاحت کی کہ خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں ان کے پراجیکٹ کا مقصد محض ایک 'نئے پدری نظام' ('New Patriarchy') کی تشکیل تھی، جس میں خواتین کو ان کے شوہروں کے 'سایے' ('shadows') کے بطور کردار ادا کرنا تھا۔

19.10 ویریش لنگم کے سیاسی افکار (Political Views of Veeresalingam)

ہندوستان کے کئی سماجی مصلحین کی طرح ویریش لنگم نے بھی برطانوی حکومت کی عظمت کے گن گائے۔ مشہور مؤرخ وکُلا بھرَنَم رام کرشنا (Prof. Vakulabharanam Ramakrishna) کے مطابق اس سے ہمیں اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ایک 'سیاسی رجعت پسند' ('political reactionary') تھے۔ رام کرشنا کے الفاظ میں 'وہ ابتدائی ہندوستانی قوم پرستی کی نمائندگی کرتے تھے۔ انہیں اعتدال پسندوں کے درمیان ایک اعتدال پسند' کہا جا سکتا ہے۔ ویریشا لنگم نے برطانوی راج کی تعریف ان الفاظ میں کی: 'یہ حقیقت کہ ہم بغیر کسی ڈر کے میٹنگ کر رہے ہیں اور موجودہ سیاسی مسائل پر بحث کر رہے ہیں تو یہ محض خدا کی طرف سے عطا کردہ برطانوی حکومت کی مہربانی کے سبب ہے جو ہمارے ملک کے مفاد میں ہے۔' ویریش لنگم کو یقین تھا کہ برطانوی حکومت کی جانب سے شروع کردہ عناصر جیسے انگریزی تعلیم، مضبوط نظم و نسق، شہری اور فوجداری عدالتیں، حمل و نقل کے جدید ذرائع اور دیگر سائنسی فائدے برطانوی راج کو ایک عظیم محسن کے بطور تاریخ میں درج کیا جائے گا۔

البتہ ویریش لنگم نے اپنی بات میں یہ بھی اضافہ کیا کہ برطانوی حکومت بالکلیہ طور پر خامیوں سے پاک نہیں ہے۔ انہوں نے برطانوی حکومت اور ہندوستانی عوام کے درمیان رشتہ کا تقابل ایک ماں اور اس کے بچے سے کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ امن، انصاف اور ایک اچھی حکومت کے قیام کے لیے آئینی اصلاحات (Constitutional reforms) متعارف کرانے کے لیے انگریزوں پر بھروسہ

کریں۔ انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر انگریز ملک چھوڑ کر چلے جائیں گے تو ملک میں بدامنی، بدانتظامی اور لاقانونیت پائی جائے گی اور اس سے بھی زیادہ سماجی اصلاح کی جو کوششیں کی جارہی ہیں اس کو سخت دھکا پہنچے گا۔ انہوں نے کہا:

> برطانوی حکومت کے سبب ہمارے ملک میں خانہ جنگی نہیں ہے اور امن واستحکام ہے۔ اگر انگریز محض ایک سال کے لیے بھی ملک کے انتظام کی تمام تر ذمہ داری ہندوستانیوں کو سونپتے ہیں تو چند ہی مہینوں میں پورا ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور مختلف مذاہب، طبقات اور قوموں کے درمیان لڑائی جھگڑا پیدا ہوگا۔ ہمارے اَن پڑھ اکثریت پڑھی لکھی اقلیت کو دہریے (خدا کے وجود کو تسلیم نہ کرنے والے) قرار دے گی۔ ان تمام کا آخر کار نتیجہ انتشار (Anarchy) کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ غرض اپنے ملک کو اس تباہی سے بچانے کے لیے ہمیں خدا سے دعا مانگنی چاہیے کہ وہ ہمارے ملک پر ہمیشہ حکومت کریں۔

ویریش لنگم نے مقامی حکومتی اداروں اور وایسرائے کی کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کی درخواست کی۔ وی رام کرشنا کہتے ہیں کہ 'اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرے اعتدال پسندوں کے برخلاف انہیں ہندوستان پر نوآبادیاتی حکومت کی اصلیت کی کوئی سمجھ نہیں تھی۔ ان کے برخلاف وہ نوآبادیات کے معاشی اُمور پر سخت تنقید کرنے میں ناکام رہے۔ . . . اس لحاظ سے وہ انیسویں صدی کے اواخر کے ایک عام اعتدال پسند قوم پرست نہیں تھے بلکہ انیسویں صدی کے پہلے نصف کے اصلاح کار دانشوروں سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔'

19.11 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ نے جنوبی ہند میں اور خصوصی طور پر مدراس پریسیڈنسی کے آندھرا علاقے میں پیش آنے والی سماجی اصلاح کی تحریک کو سمجھ چکے ہوں گے۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح ینوگُلا ویرا سوامیّا، سامی نینی مُتّو نرسمہا نائیڈو اور دیگر دانشوروں نے نوآبادیاتی آندھرا میں اصلاح کے تئیں شعور وآگہی بیدار کرنے کی شروعات کیں اور کندوکوری ویریش لنگم کی قیادت میں ان کوششوں کو استحکام حاصل ہوا۔ آپ نے یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ انہوں نے خاص طور پر عورتوں کے حالات کو بہتر بنانے پر توجہ دی۔ انہوں نے خواتین کی تعلیم کی تبلیغ کی اور کم سنی کی شادیوں اور جبری بیوگی (enforced widowhood) پر سخت تنقید کی۔ انہوں نے اپنی توانائی کا بڑا حصہ بیواؤں کی دوبارہ شادی پر صرف کیا اور 63 بیواؤں کی دوبارہ شادیاں کروائیں۔ انہیں بجا طور پر جنوب کے ایشور چندر ودیا ساگر کہا جاتا ہے۔ انہوں نے لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کیے اور بیواؤں کے لیے آشرم کھولے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ کس طرح انہوں نے اپنی تمام جائیداد کو ہتکارنی سماج کے قیام کے لیے دان دے دی۔ ایک فعال سماجی کارکن کے علاوہ بھی وہ ایک عظیم دانشور بھی تھے اور کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ انہوں نے خواتین کے لیے تلگو زبان میں پہلا رسالہ جاری کیا جس نے آندھرا میں خواتین کی صحافت کی بنیاد ڈالی۔ آپ نے یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ ان کی بیوی راجیہ لکشمّما نے کس طرح سماجی اصلاحی کام میں اپنے شوہر کے شانہ بہ شانہ کام کیا اور سماجی بائیکاٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پُرعزم طور پر اپنے کام میں ڈٹی رہیں۔ وریش لنگم کے ساتھیوں جیسے دیشی راجو پیدا باپیّا اور پیڈارام کرشنیّا نے ان کی اخلاقی ومالی دونوں طرح مدد کی اور سماجی اصلاح کے کام میں تعاون کیا۔ اس اکائی سے آپ پر یہ واضح ہوا ہوگا کہ سماجی اصلاح کا کام کوئی آسان کام نہیں ہے اور مصلحین کو سماجی قدامت پسندوں کے ہاتھوں بہت کچھ مصائب سہنے پڑتے ہیں۔ للٰہذا جو کچھ بھی ان کی کوششوں میں خامیاں پائی جاتی ہیں، اس کے باوجود بھی ان

کی کوششوں سے رونما ہونے والی سماجی تبدیلی خود اپنی جگہ ایک قابل قدر عمل ہے۔

19.12 ضمیمہ (Appendix)

ویریش لنگم اور انکے دوستوں کے ذریعہ کرائی گئی بیواؤں کی شادیوں کی جدول

S. No.	Name of the Bride	Name of the Groom	Caste/ Sect	Date of Marriage
1	Gavaramma	Gogulapati Sriramulu	Brahmin/ Niyogi	11.12.1881
2	Ratnamma	Racharla Ramachandra Rao	Brahmin/ Niyogi	15.12.1881
3	Sitamma	Taduri Rama Rao	Brahmin/ Madhva	22.10.1882
4	Sheshamma	Pulavarti Sheshaiah	Brahmin/ Vaidiki	03.01.1883
5	Sooramma	Munjuluri Gopalamu	Brahmin/ Niyogi	30.01.1883
6	Venkamma	Chebolu Venkaiah	Brahmin/ Vaidiki	13.03.1883
7	Ramalakshmamma	Bodaa Sriramulu	Vaishya	17.04.1883
8	Kopamma	Tanuku Chalapati Rao	Brahmin/ Niyogi	08.06.1883
9	Ratnamma	Saladi Ramaiah	Vaishya	18.08.1883
10	Subbamma	Nallagonda Kodanda Ramaiah	Brahmin/ Yaznaval-ki	05.01.1884
11	Poornamma	Kommaraju Gopalamu	Brahmin/ Niyogi	07.07.1884
12	N.A.	Chittooru Subba Rao	Brahmin/ Niyogi	12.02.1885
13	N.A.	Jataprolu Rama Rao	Brahmin/ Niyogi	12.02.1885
14	Vishveshwaramma	Tumukuru Rama Rao	Brahmin/ Madhva	18.07.1885
15	Narasamma	Pataneni Venkaiah	Karanakamma	20.12.1885
16	Mangamma	Nallagonda Kodanda Ramaiah	Brahmin/ Yaznavalki	17.10.1888

17	Kameshwaramma	Pataneni Venkaiah	Karanakamma	02.02.1889
18	Ammanna	Grandhi Venkata Reddy	Vaishya	21.03.1889
19	Lakshumma	Tanuku Narasimham	Brahmin/ Niyogi	23.09.1892
20	Sitamma	Kunooru Purushottam	Brahmin/ Madhva	06.11.1892
21	Narasamma	Gani Subba Rao	Brahmin/ Madhva	18.09.1893
22	Sitamma	Aadipudi Somanatha Rao	Brahmin/ Niyogi	28.06.1893
23	Abhiramamma	H. Baji Rao	Brahman	18.11.1894
24	Tulashamma	Dronamraju Sheshagiri Rao	Brahmin/ Madhva	09.08.1895
25	Ranganayaki	Kopalli Sheshgiri Rao	Brahmin/ Madhva	30.06.1896
26	Paarvatamma	Naallacheruvu Krishna Rao	Brahmin/ Madhva	08.10.1896
27	Varalakshmi	Tumukuru Rama Rao	Brahmin/ Madhva	01.01.1897
28	Paarvatamma	Pullaabhatla Gavaraiah	Brahmin/ Vaidiki	16.10.1897
29	Sannamma	Kommaraju Gopalamu	Brahmin/ Niyogi	23.10.1897
30	Sheshamma	Nandula Gopalaswamy	Brahmin/ Vaidiki	27.08.1898
31	Ratnamma	Pataneni Venkaiah	Karanakamma	27.09.1898
32	Bangaramma	Aadipudi Gopala Sharma	Brahmin/ Niyogi	26.01.1899
33	Mahalakshmi	Nyapati Sheshagiri Rao	Brahmin/ Madhva	26.02.1900
34	Chittemma	Gopala Krishnaiah	Brahmin/ Vaidiki	-.-.1900
35	Sitamma	Lingala Virabhadraiah	Brahmin/ Niyogi	28.10.1900
36	Lakshmibai	Mahadeva Modaliyar	Vellala	05.11.1900
37	Mahalakshmi	Ogirala Lakshminarayana	Brahmin/ Niyogi	22.01.1901
38	Kausalya	Pullabhatla Gavaraiah	Brahmin/ Vaidiki	31.12.1901
39	Chiranjivamma	Kokaa Subba Rao	Adi Velama	03.01.1901

40	Chittemma	Manjuluri Gopalam	Brahmin/ Niyogi	12.05.1901
41	Chokkamma	Sheshaiahngaar	Brahmin/ Vaishnava	11.07.1902
42	Ramanamma	Paranandi Ramachandra Rao	Brahmin/ Vaidiki	13.09.1902
43	Ramanamma	Betapudi Jogi Suryaprakasha Rao	Brahmin/ Niyogi	11.10.1902
44	Venkatalakshmi	Turumella Subba Rao	Brahmin/ Niyogi	24.10.1902
45	Sitaramamma	Bhattiprolu Sharabhaiah	Brahmin/ Niyogi	19.11.1902
46	Kamakshamma	Bhandaru Dandapani	Brahmin/ Niyogi	-.-.1902
47	Sheshamma	Dheram Venkateshwara Rao	Brahmin/ Vaidiki	26.12.1902
48	Annapoorna	Kotturti Namashshivaya	Vishwakarma	01.02.1903
49	Varalakshmi	C. N. Srinivasachari	Brahmin/ Vaishnava	12.03.1903
50	Sitaramamma	Uppuluri Subba Rao	Brahmin/ Niyogi	26.06.1903
51	Sitaramamma	Kasturi Subba Rao	Brahmin/ Niyogi	16.07.1903
52	Venkubai	Pasumarti Krishnamoorthy	Brahmin/ Niyogi	30.09.1903
53	Ratnamma	Putrevu Subba Rao	Brahmin/ Niyogi	01.04.1904
54	Nagaratnamma	Uppuluri Subba Rao	Niyogi	17.07.1904
55	Hanumayamma	Adharapurapu Sanjiva Rao	Brahmin/ Madhvudu	14.08.1904
56	Hanumayamma	Bandlamudi Venkata Rao	Brahmin/ Vaidiki	10.11.1904
57	Ranganayaki	Mellachervu Tandavakrishnaiah	Brahmin/ Vaidiki	25.12.1904
58	Krishnammal	Venkata Varadayyangaar	Brahmin/ Vaishnava	31.07.1892
59	N.A.	Chittooru Subba Rao	Brahman	31.07.1887

Source: Shaik Mahaboob Basha, 'Print Culture and Women's Voices: A Study of Telugu Journals, 1902 – 1960', Ph.D. Thesis submitted to Jawaharlal Nehru University, New Delhi, 2015, pp. 383–385.

19.13 کلیدی الفاظ (Keywords)

سماجی اصلاح کی تحریک (Social Reform Movement)

سماجی اصلاح کی انجمنیں (Social Reform Associations)

دانشوران (Intellectuals)

نوآبادیاتی آندھرا (Colonial Andhra)

نوآبادیاتی ہندوستان (Colonial India)

کم سنی کی شادی (Child Marriage)

بیواؤں کی دوبارہ شادی (Widow Remarriage)

19.14 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

19.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. 'کاشی یاتراچرتر' سفر نامہ کے مصنف کون ہیں؟
2. کس سنہ میں جیرّ سوری نے *Stree Kalakallolini* شائع کی؟
3. کس مقام سے دمپورو نَرسّیا نے *People's Friend* کو شائع کیا؟
4. *Hitasoochanee* کے مصنف کون ہیں؟
5. خواتین کے لیے شائع کیا جانے والا ویریش لنگم کے رسالے کا نام کیا تھا؟
6. 'راجمنڈری ویڈو میریج اسوسی ایشن' کس سال قائم ہوئی؟
7. کس تاریخ کو آندھرا میں برہمن ذات کی بیوہ کی پہلی مرتبہ دوبارہ شادی انجام پائی؟
8. 1905 تک ویریش لنگم نے بیواؤں کی کتنی شادیاں کروائیں؟
9. ویریش لنگم کی آپ بیتی کا عنوان کیا ہے؟
10. راجمنڈری میں ہتکارنی سماج کس سال قائم کی گئی؟

19.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہتکارنی سماج پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. سماجی اصلاح کی تحریک میں راجیہ لکشمما کی خدمات پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3. سامی نینی مُتّونر سیمہا نائیڈو پر نوٹ لکھیے۔

4. ویریش لنگم کی Satihitha Bodhini پر مختصر نوٹ لکھیے۔
5. برطانوی حکومت پر ویریش لنگم کے خیالات کے بارے میں نوٹ لکھیے۔

19.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. آندھرا میں ویریش لنگم کی جانب سے شروع کردہ سماجی اصلاح کی تحریک سے قبل پائے جانے والی دانشورانہ سرگرمیوں پر بحث کیجیے۔
2. خواتین کی تعلیم کی ترقی کے تئیں ویریش لنگم کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
3. ویریش لنگم کو کیوں جنوبی ہند کا ایشور چندر ودیا ساگر کہا جاتا ہے؟ بحث کیجیے۔

19.15 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. John and Karen Leonard, 'Viresalingam and the Ideology of Social Change in Andhra' in Sumit Sarkar and Tanika Sarkar eds., *Women and Social Reform in Modern India*, Vol. I, two Vols., Permanent Black, Ranikhet, 2007, pp. 341-384.
2. Jones, Kenneth W., *The New Cambridge History of* India, *Vol. III. 1*: Socio-*Religious Reform Movements in British India*, Foundation Books, New Delhi, 1994.
3. Leonard, John Greenfield, *Kandukuri Viresalingam*, Telugu University, Hyderabad, 1991.
4. Mahaboob Basha, Shaik, 'Punarvivaham Vs. Pativratyam: Pulugurta Lakshmi Narasamamba and the Widow Remarriage Question in Colonial Andhra', *Studies in History*, Vol. 37, No. 1, February 2021, pp. 61–91.
5. Mahaboob Basha, Shaik, 'Declaring Dharma Yudhdham: Conservative Reactions against the Child Marriage Restraint Act in Colonial Andhra, 1928–1938', *Indian Historical Review*, Vol. 50, No. 1, June 2023, pp. 90–108.
6. Mahaboob Basha, Shaik, 'Misusing the Neighbours: Performing Andhra Child Marriages in Hyderabad State, 1930-1938', *History and Sociology of South Asia*, Vol.13, No. 2, July 2019, pp. 73–92.
7. Natarajan, S., *A Century of Social Reform in India*, Asia Publishing House, New Delhi, 1959.
8. Narla, V.R., *Veeresalingam*, Sahitya Akademi, New Delhi, 1968.
9. Ramakrishna, V., *Social Reform in Andhra* (*1848–1919*), Vikas Publishing House Pvt., Ltd., New Delhi, 1983.
10. Sen, Amiya P., *Social and Religious Reform*: *The Hindus of British India*, Oxford University Press, New Delhi, 2003.

اکائی 20۔ مغربی ہندوستان میں سماجی و مذہبی اصلاحی تحریکیں

(Socio-Religious Reform Movements in Western India)

اکائی کے اجزا

20.0 تمہید

20.1 مقاصد

20.2 اصلاحاتی تحریکوں کا دائرہ کار

20.3 انیسویں صدی کا ابتدائی مرحلہ

20.3.1 بال شاستری جمبھیکر

20.3.2 بھاسکر پانڈورنگ ترکھڈکر

20.3.3 گوپال ہری دیش مکھ

20.3.4 وشنو بھیکاجی گوکھلے

20.4 انیسویں صدی کے بعد کا مرحلہ

20.4.1 مہتاجی درگارام منچھرم

20.4.2 دادوبا پانڈورنگ ترکھڈکر

20.4.3 آتمارام پانڈورنگ

20.4.4 جیوتیبا پھولے

20.4.5 وشنو پرشرم شاستری پنڈت

20.4.6 رام کرشن گوپال بھنڈارکر

20.4.7 مہادیو گوبند رانادے

20.4.8 وشنو شاستری چپلونکر

20.4.9 پنڈتا رما بائی

20.4.10 نارائن گنیش چنداورکر

20.4.11 دھونڈو کیشو کاروے

20.5 اصلاحی تحریکوں کی اہمیت

20.6 اکتسابی نتائج

20.7 کلیدی الفاظ

20.8 نمونہ امتحانی سوالات

20.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

20.0 تمہید (Introduction)

انیسویں صدی جدید ہندوستان کی تاریخ کا ایک بہت اہم مرحلہ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ملک نے بہت سے دانشوروں کا ظہور دیکھا، جنہوں نے مذہبی، سماجی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کا مطالعہ کر کے قوم کو دوبارہ وجود میں لانے کا اہم رول ادا کیا۔ تاہم، اس تحریک کو چلانے کے لیے چند محدود افراد ابھرے، جن کا سماج کی جہالت سے لڑنے کا جذبہ آر تھوڈوکس کے مددگاروں کے لیے کوئی بڑا چیلنج نہیں بن سکا۔ بہر حال اس تحریک نے اپنی رفتار برقرار رکھی اور انیسویں صدی کے درمیان میں اپنی اونچائی پر پہنچ گئی۔ اس اکائی میں مغربی ہندوستان میں انیسویں صدی کے دوران دانشور مصلحین کی طرف سے چلنے والی فکری، سماجی اور مذہبی تحریکوں کی بنیادی خصوصیات کا مطالعہ کیا جائے گا۔ مغربی ہندوستان میں، خاص طور پر مہاراشٹر اور گجرات میں، انیسویں صدی کے دوران کئی سماجی و مذہبی اصلاحی تحریکیں ابھری۔ ان اصلاحی تحریکوں کی ایک بھرپور تاریخ ہے جس نے روایتی اصولوں کو چیلنج کرنے، سماجی انصاف کی وکالت، وہمی باتوں، آر تھوڈوکس مذہبی طریقوں، تعلیم اور نئی انداز فکر کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ مغربی ہندوستان میں اصلاحی تحریک کی بنیادی توجہ مذہبی اور فلسفیانہ کی بجائے سماجی نظریات پر تھی۔ انیسویں صدی کے دوران مختلف نچلی ذاتوں میں سماجی امتیاز کی کئی اقسام کے خلاف ایک عمومی بیداری پیدا ہوئی۔ وشنو باوا برہم چاری، جیوتیبا پھولے، راناڈے اور دیگر مفکرین نے اس سماجی بیداری کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس مضمون میں زور، ان شخصیتوں کے سوانحی خاکے پر نہیں ہے، بلکہ ان کے نظریات پر ہے جن کے سبب یہ تحریکیں وجود میں آئیں۔ اسکے علاوہ اس باب میں وہ طریقہ کار بھی بتایا جائے گا جس کے ذریعے ایک نیا سماجی نظام نافذ ہوا اور کس طرح ان خیالات نے ترقی پائی۔

20.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان میں تعلیم کو فروغ دینے میں انیسویں صدی کے مصلحین کے کردار پر اظہار رائے۔
- سماج میں پھیلی سماجی برائیوں کے خاتمے میں سماجی، مذہبی، اصلاحی تحریکوں کے کردار کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

- اصلاحاتی تحریکوں نے ذات پات پر مبنی نظام اور جنسی اختلاف کو چیلنج کیا، اور سماجی درجہ بندی کی دیگر شکلوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔
- کس طرح سے خواتین کو بااختیار بنانا تمام اصلاحاتی تحریکوں کا بنیادی مرکز تھا اس پر بحث ہوگی۔
- غیر مراعات یافتہ گروہوں میں ایک نئے شعور کی نشو ونما کی وضاحت کیسے ہوئی اور انہوں نے موجودہ سماجی نظام کو تبدیل کرنے کی کوشش کیسے کی۔
- ان سماجی طریقوں کی نشاندہی کی جائیگی جو انیسویں صدی کے دوران ہمارے سماج میں موجود تھیں۔

20.2 اصلاحاتی تحریکوں کا دائرہ کار (Scope of the Reforms Movements)

انیسویں صدی کی اصلاحی تحریکیں خالصتہً مذہبی تحریکیں نہیں تھیں بلکہ وہ سماجی و مذہبی تحریکیں تھیں۔ بنگال میں رام موہن رائے، مہاراشٹر میں گوپال ہری دیش مکھ (لوکھیت واڑی) اور آندھرا میں ویر سالنگم جیسے مصلحین نے "سیاسی فائدہ اور سماجی سکون" کی خاطر مذہبی اصلاحات کی وکالت کی۔ تحریکوں اور ان کے قائدین کے اصلاحی نقطہ نظر اور مذہبی، سماجی مسائل باہمی ربط رکھتے تھے۔ انہوں نے سماجی اداروں اور طریقوں میں تبدیلی لانے کے لیے مذہبی نظریات کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر، کیشوب چندر سین، ایک اہم برہمو رہنما نے سماج میں ذات پات کی تفریق کو مٹانے کے لیے "دیوتا کے اتحاد اور بنی نوع انسان کے بھائی چارے" کی تشریح کی۔

اصلاحی تحریکوں کے دائرہ کار میں آنے والے بڑے سماجی مسائل یہ تھے:

- خواتین کی آزادی جس میں ستی، شیر خوار قتل، کم عمر بچوں اور بیوہ کی شادی۔
- ذات پرستی اور اچھوت کا خاتمہ۔
- سماج میں روشن خیالی لانے کے لیے تعلیم کا پھیلاؤ۔

دھرم کے میدان میں جو اہم مسائل کے خلاف اصلاحی تحریکیں چلائی گئیں وہ درج ذیل ہیں:

- بت پرستی
- شرک
- مذہبی توہم پرستی
- پادریوں کی طرف سے استحصال

20.3 انیسویں صدی کا ابتدائی مرحلہ (Early Phase of the Nineteenth Century)

مہاراشٹر میں فکری بغاوت کی پہلی آواز انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں شروع ہوئی۔ ابتدائی دانشوروں میں جنہوں نے تحریک کی شروعات کی اور اس کی رہبری کی۔ ان میں بال شاستری جمبھیکر، دادوبا پانڈورنگ ترکھڈکر، بھاسکر پانڈورنگ ترکھڈکر وغیرہ کے

نام سب سے زیادہ مشہور تھے۔اور انیسویں صدی کے آخری دور میں 'لوکھیت واڑی، وشنو بھیکا جی گوکھلے، آتمارام پانڈورنگ، جیوتیبا پھولے، وشنوشاستری پنڈت، رام کرشن گوپال بھنڈار کر وغیرہ۔اس باب میں ان کے نظریات اور کردار پر روشنی ڈالی جائے گی۔

20.3.1 بال شاستری جمبھیکر (Bal Shastri Jambhekar, 1812–1846)

بال شاستری جامبھیکر مہاراشٹر کے ایک مشہور مراٹھی زبان کے اسکالر، صحافی، اور سماجی مصلح تھے۔انہوں نے انیسویں صدی کے دوران مراٹھی بولنے والے لوگوں کی ثقافتی اور تعلیمی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔جامبھیکر کو مراٹھی "بابائے صحافت" کے طور پر جانا جاتا ہے۔ 1832 میں،اس نے پہلا مراٹھی اخبار "درپن" شروع کیا جس نے عام لوگوں کی رائے اور بیداری پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔"درپن" نے مختلف سماجی مسائل کا احاطہ کیا، جن میں ذات پات کی تفریق، تعلیم اور خواتین کے حقوق شامل ہیں۔ جامبھیکر نے سماجی اصلاحات کی سرگرمی سے حمایت کی اور اپنے دور میں موجود سماجی برائیوں کو ختم کرنے کے لیے کام کیا۔انہوں نے ذات پات کی بنیاد پر فرق اور اچھوت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ تعلیم کو بڑھاوا دینے کی وکالت کی۔ 1840 میں، اس نے مہاراشٹر میں پہلا ماہانہ رسالہ "دیگدرشن" (*Digdarshan*) بھی شروع کیا۔ جس میں سائنسی مضامین کے ساتھ ساتھ تاریخ پر مضامین کا سلسلہ بھی شائع ہوا۔ جمبھیکر نے "بمبئی مقامی جنرل لائبریری" کی بنیاد رکھی اور "مقامی اصلاحی سوسائٹی" کا آغاز کیا جس کی شاخ طلباء ادبی اور سائنسی لائبریری تھی۔وہ ایلفنسٹن کالج میں ہندی کے پہلے پروفیسر ہونے کے علاوہ کولابا آبزرویٹری (The Colaba Observatory) کے ڈائریکٹر بھی تھے۔

انہوں نے کہا کہ ہندوستان بھی کبھی علم کا مرکز تھا۔نالندہ اور ٹیکسلا جیسی ہندوستانی یونیورسٹیوں میں دنیا بھر سے طلبہ آتے تھے۔ ہندوستان آنے والے غیر ملکی حملہ آور ہندوستانی مہارت اور علم کو اپنے ساتھ لے گئے۔اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔انہوں نے مہاراشٹر میں کئی تعلیمی ادارے بھی شروع کیے۔ جامبھیکر سائنسی تعلیم کی ترقی کے حق تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ ریاضی، کیمسٹری، جغرافیہ اور فلکیات جیسے جدید مضامین کی تعلیم حاصل کریں۔اور پھر حاصل شدہ علم کو اپنی عملی زندگی میں نافذ کرنا چاہیے۔ جمبھیکر کے مطابق ہندوستانی معاشرہ اپنی عادتوں کا غلام بن چکا ہے۔وہ تماشے (لوک داستان) دیکھنے میں مصروف ہیں۔یہی عادتیں انہیں نوآبادیاتی حکومت کے تحت اپنی پسماندہ صورتحال کا احساس کرنے سے روک رہی تھیں۔انہوں نے سماج کی اس صورتحال کے بارے میں حکومت کو بھی لکھا اور ہندوستانیوں کو تعلیمی سہولیات فراہم کرنے کی ان کی ذمہ داری کو یاد دلایا۔

20.3.2 بھاسکر پانڈورنگ ترکھڈکر (Pandurang Bhasker Tarkhadkar, 1816–1847)

بھاسکر پانڈورنگ ہندوستان میں نوآبادیاتی حکومت کے خلاف عسکریت قوم پرست نقاد کے طور پر مشہور ہوئے۔انہوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں برطانوی راج کے استحصالی کردار کو بیان کیا۔انہوں نے 1841 میں بمبئی گزٹ میں آٹھ طویل خطوط کا ایک سلسلہ لکھا، جس میں نوآبادیاتی تسلط کے تقریباً ہر پہلو کو بے نقاب کیا۔ اپنے ایک مضمون میں انہوں نے انگلینڈ میں شائع ہونے والی جیمز مل کی

کتاب 'ہسٹری آف برٹش انڈیا' (1817) میں ہندوؤں کے بارے میں تضحیک آمیز تبصروں پر شدید رد عمل ظاہر کیا۔ جیمز مل نے ہندوؤں کو مردانگی اور غلامانہ ذہنیت سے عاجز قرار دیتے ہوئے تنقید کی تھی۔

بھاسکر نے کمپنی کی حکومت کا موازنہ آخری مراٹھا پیشوا اور مغل دور حکومت سے کیا۔ انہوں نے کہا کہ لوٹ کھسوٹ کے باوجود کسانوں کو اپنی زمینیں کھونے کی اذیت سے بچایا گیا۔ مغل حکمرانوں نے ہندوؤں پر پابندیاں لگائی ہوں گی لیکن انہوں نے ہندوؤں کو سرکاری نوکریاں دیتے ہوئے امتیازی سلوک نہیں کیا۔ انگریزوں کے دور حکومت میں انتظام عدلیہ ڈھونگ پر مبنی تھا۔ انہوں نے (1838-39) کی غیر ضروری افغان جنگ اور افیون کی جنگ (1838-42) کے بارے میں شکایت کی۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ یہ جنگیں برطانوی حکومت کی توسیع پسندانہ پالیسی کو فائدہ پہنچا سکتی ہیں لیکن ہندوستانیوں کی غربت کا سبب بن سکتی ہیں۔ چنانچہ بمبئی شہر میں، بھاسکر کی قیادت میں، برطانوی استعماری پالیسی کے خلاف فکری مزاحمت کی پیشکش کی۔

20.3.3 گوپال ہری دیش مکھ (Gopal Hari Deshmukh, 1823–1882)

گوپال ہری دیش مکھ کو "لوکھیت واڑی" کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ وہ ہندو سماج میں سماجی برائیوں کی مخالفت کرنے والوں میں سب سے پہلے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے سماجی ڈھانچے کی وجہ سے انگریزوں کے غلام بنے ہیں۔ ہندوستانی معاشرہ مختلف ذاتوں میں بٹا ہوا تھا اور لوگوں میں تعلیم کا فقدان تھا۔ لوکھیت واڑی کا ذہن کھلا تھا۔ وہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکمرانی کو بہت بڑی نعمت سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ ان کی لبرل ازم اور سماجی ترقی سے بہت متاثر تھا۔ جیریمی بینتھم کے افادیت پسند فلسفے نے ان پر زبردست اثر ڈالا۔ وہ اپنے سماج کی اصلاح میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے قلم کو استعمال کرتے ہوئے اپنے لوگوں کی سماجی اور مذہبی زندگی کی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے انیسویں صدی کے دوران سماج کو درپیش مختلف مسائل پر متعدد کتابچے لکھے۔ ان کے مختصر مضامین 'شت پترے' *Shatapatre* (ایک سو خطوط) جو کہ ہفتہ وار 'پربھاکر' میں شائع ہوئے اور 1860 میں 'لوکاہت وادیکرتا نبندا سنگرہ' *(Lokahitwadikrita) Nibandha Sangraha* کے حصے کے طور پر جمع کیے گئے تھے۔ یہ مجموعہ کتابی شکل میں 1866 میں چھپا۔

'لوکھیت واڑی' نے سماج میں تعلیم کی اقدار کو فروغ دینا شروع کیا۔ انہوں نے 'پربھاکر' اور 'اندر پرکاش' جیسے اخبارات کو دیکھا۔ یہ اخبارات سماج میں تبدیلی لانے کے لیے اس کے ہتھیار بن گئے۔ ان اخبارات کے مضامین بعد میں "شت پترے" نامی کتاب میں شائع ہوئے۔۔ انہوں نے کہا کہ جب تک ہمارا معاشرہ اپنی غلامی سے آگاہ نہیں ہوگا وہ اس سے باہر آنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ صرف تعلیم ہی سماج میں تبدیلی لا سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں ہر معاملے میں عقلی رویہ اپنانا چاہیے۔ ہندوستانیوں کو انگریزی زبان کے بارے میں کچھ بنیادی معلومات حاصل کرنی چاہئیں کیونکہ مذہب اور سماج کے بارے میں زیادہ تر کتابیں انگریزی میں ہیں۔ 'لوکھیت واڑی' ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی کے خلاف تھا لیکن انہوں نے یہ بھی کہا کہ سائنس، صنعتی ترقی، ادب وغیرہ کے میدان میں ترقی کے لیے ہمیں

انگریزوں کی پیروی کرنی چاہیے۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ برطانوی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانیوں کو مفت ابتدائی تعلیم فراہم کرے کیونکہ صرف تعلیم ہی انہیں عقلی انداز میں سوچنے کے قابل بنا سکتی ہے۔وہ خواتین کی آزادی کے حقیقی حامی تھے۔ان کے مطابق کوئی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا جب تک ان کی خواتین سماج کی حدود سے آزاد نہ ہوں۔انہوں نے بیوہ کی دوبارہ شادی کے بارے میں پانچ مضامین بھی لکھے۔

ان کا دعوی تھا کہ ہر فرد خود مختار ہونا چاہئے اسلیے انہوں نے اچھوت کی مذمت کی۔ اسے برہمنوں کو یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ 'مہار' برادری کو سماجی سطح پر بہت زیادہ پستی میں رکھا ہوا ہے۔انہوں نے اس پر یہ دلیل دی کہ اونچی ذات کے یہ لوگ ان نچلی ذات کے لوگوں کے سائے سے بھی ناپاک ہو جاتے ہیں لیکن یہی اونچی ذات کے لوگ یورپیوں کے ساتھ بیٹھنے کو اپنا خاص اعزاز سمجھتے ہیں۔ درحقیقت مہاروں کو غیروں کی نسبت ان کے زیادہ قریب ہونا چاہیے۔انہوں نے لکھا، ''سب ایک ہی خدا کے بچے ہیں اور اس طرح کے سماجی امتیازات کو ترک کر دینا چاہیے''۔ وہ جنسوں کی مساوات، بیواؤں کی دوبارہ شادی اور خواتین کے تعلیم کے حق کے حامی تھے۔ وہ ہندو لوگوں میں تمام ذاتوں کے ساتھ یکساں سلوک چاہتے تھے۔یعنی انہیں تعلیم اور پیشے اور تجارت کے معاملہ میں برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ وہ مذہبی اور روحانی معاملات میں برہمنوں کے اختیار کو کم کرنا چاہتے تھے۔انہوں نے مذہب کی منع کردہ باتوں کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی پُرجوش درخواست کی۔

وہ اپنے مضامین میں بتاتے ہیں کہ ان نام نہاد علمی پنڈتوں اور انتہائی قابل احترام مبلغین کا رویہ قصابوں سے بھی بدتر ہے۔۔ ہزاروں بے سہارا اور بدقسمت خواتین کی کو نو عمری میں ہی دوبارہ شادی کرنے کے لیے ایسے تکلیف دہ تجربہ سے گزرنا پڑتا تھا۔ اگر کوئی ان بدقسمت عورتوں کی حالت سدھارنا چاہے تو یہ پنڈت اس سے شیطان سمجھیں گے۔ دنیا میں کہیں بھی آپ کو ایسے عالم نہیں ملیں گے جو انسانیت کے دودھ سے محروم ہوں۔ وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ یہ کوئی مذہب، کوئی اصول، کوئی خوبی اور کوئی حکمت نہیں ہے، کہ وہ بغیر کسی سوچ کے مشینی طریقے سے روایت کو جاری رکھیں۔انہیں اس طرح کے طرز عمل کی حدود کا احساس ہونا چاہیے۔جب ہزاروں عورتیں ان ظالمانہ رسومات کا شکار ہو چکی ہیں تو یہ برہمن ان رسموں کی اطلاع دینے والے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ دکھی عورتوں کی حالتِ زار دیکھ کر لوکھیت واڑی کا دل جل رہا تھا۔ اسلیے انہوں نے پوری زندگی سماجی خدمات کے لیے کام کیا۔ان کا تعلق "ستیہ شودھک سماج" سے تھا، جو جیوتی راؤ پھولے کی قائم کردہ ایک سماجی اصلاحی تنظیم تھی۔اس تنظیم کا مقصد ظالمانہ سماجی اصولوں اور طریقوں کو چیلنج اور ختم کرنا تھا۔

20.3.4 وشنو بھیکاجی گوکھلے (Vishnu Bhikaji Gokhale, 1825–1873)

مہاراشٹر میں حیات نو (Revivalism) کا آغاز انیسویں صدی میں عیسائی اور سیکولر مغربی اثرات کے خلاف ایک ردّ عمل کے طور پر ہوا۔اس دوران بہت سے ہندوؤں نے محسوس کیا کہ غیر ملکی اثر ورسوخ اور ان کی مذہبی دعوت و تبلیغ سے ان کے مذہبی اور سماجی اداروں کو خطرہ ہونے لگا ہے۔ غیر ملکی اثر ورسوخ کے بڑھتے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے اور مہاراشٹر کی مذہبی اور سماجی تعمیرِ نو کے لیے بہت سے ہندو رہنماء سامنے آئے۔ جن میں پہلے عظیم ''احیاء پسند'' رہنما وشنو بھیکاجی گوکھلے تھے۔ وشنو گوکھلے سماج میں 'وشنو باوا برہمچاری' یا 'برہمچاری باوا' کے نام سے مشہور ہوئے۔ 1857 میں، 22 سال کی عمر میں، انہوں نے پنڈھارپور میں ویدک مذہب کی تبلیغ شروع کی، اور

جلد ہی مہاراشٹر کے مختلف حصوں میں جاکر لیکچرز دینے شروع کیے۔ وشنو باوا پہلے مصلح تھے جنہوں نے ہندوستانی سماج کی مذہبی زندگی میں انگریزوں کی مداخلت کی مخالفت کرتے ہوئے ان کے خلاف اپنے مصلحانہ طریقے سے کارروائی کے لیے قدم بڑھایا۔ انہوں نے کہا کہ انگریز مشنری اپنے مذہبی اسکول اور ادارے قائم کرکے غریب ہندوستانی لوگوں کو عیسائیت میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لہٰذا، انہوں نے لیکچرز، مباحثوں، جرائد اور تحریروں کے ذریعے مشنریوں کے چیلنج کو قبول کیا۔ 1856 سے 1871 تک، برہمچاری باوا نے ہندو رسم و رواج اور روایات کے خلاف عیسائی مشنری کے پروپیگنڈے کا مقابلہ کرنے کی اپنی سرگرمیاں جاری رکھی۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ 1857 میں، انہوں نے چوپاٹی سمندر کے کنارے عیسائی مشنریوں کے ساتھ 6 ماہ طویل (1857، جنوری اور جوالائی کے درمیان) بحث و مباحثہ کی۔ ان مباحثوں میں ہندو، مسلمان، عیسائی اور دیگر مذاہب کے علماء بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس ہفتہ وار بحث کا لوگوں پر اتنا گہرا اثر ہونا شروع ہوا کہ 1857 میں حکومتِ بمبئی نے فرقہ وارانہ جذبات کے خوف سے وشنو باوا برہمچاری کو حکم دیا کہ وہ اسے مزید جاری نہ رکھیں۔

اس کے بعد برہمچاری باوا نے ویدوں کی برتری اور اعلیٰ ہونے کی تبلیغ کرتے ہوئے ہندوستان کے طول و عرض کا سفر کیا۔ ان کے مطابق، وید کا مطلب علم ہے اور یہ خود خدا کا ہی ایک حصہ ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ ویدک مذہب انسان کو اخلاقی اور روحانی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ وشنو باوا ہندوستان کے ویدک دور سے کافی متاثر تھے۔ ان کے مطابق، ویدک دور نہ صرف روحانی بصیرت میں بہت ترقی یافتہ تھا بلکہ سائنسی اور تکنیکی علم کے ساتھ ساتھ کیمسٹری اور فزکس جیسے مضامین میں بھی بہت آگے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ قدیم زمانے میں پوری دنیا میں لوگ ویدک مذہب کی پیروی کرتے تھے اور اپنی مذہبی ہدایات سنسکرت زبان کے ذریعے ہی حاصل کیا کرتے تھے۔ وشنو باوا برہمچاری برہمنی ہندو ازم کے کچھ پہلوؤں جیسے: ویدک تقریبات، سبزہ پرستی، پنر جنم (re-birth) میں عقیدہ، وغیرہ کے تعلق سے اپنے رویے میں بہت قدامت پسند تھے۔ ان کے نزدیک ایک طرف ہندوؤں اور دوسری طرف یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان بڑا فرق، ابراہیمی مذہب کے انہی عقیدوں پر مشتمل ہے کہ ان مذاہب کا ماننا ہے کہ دوبارہ زندہ ہونے والی روح صرف انسانوں میں ہے، جانوروں میں نہیں۔ یہ مذاہب دوبارہ جنم لینے کے نظریے کو مسترد کرتے ہیں اور وقت کے اختتام (قیامت) پر ہی ان کے عمومی فیصلے کے لیے دوبارہ زندہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں؛ جب کہ ہندو مذہب میں اس کے برعکس ہے۔

ان کے خیال میں ذات کا تعین انسان کی خوبیوں سے ہونا چاہیے نہ کہ اس کی پیدائش سے۔ انہوں نے خواتین کی تعلیم کی حمایت کی، اور لڑکیوں کے اس حق کو برقرار رکھا کہ ان کے شوہروں کے انتخاب میں ان سے بھی مشورہ لیا جائے۔ حالانکہ ان کا ماننا یہ بھی تھا کہ لڑکیوں کی شادی بارہ سال کی عمر سے پہلے کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ انہوں نے ستی کے رواج کی بھی مخالفت کی اور بیواؤں کی دوبارہ شادی کی حمایت کی۔ شادی کے ادارے کے بارے میں وشنو باوا کے خیالات بہت جدید اور آزاد خیالی پر مشتمل تھے۔ انہوں نے کہا کہ تمام شادیاں سرکاری قواعد کے مطابق ہونی چاہئیں اور طلاق پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے سماج کے تئیں اس کے لبرل رویے کی وضاحت ہوتی ہے۔ وہ ایک قابل ادیب بھی تھے۔ انکی مشہور تصنیف میں ویدوکت دھرم پرکاشا (ہندو مذہب کا اصول) ہے، جو 1864 میں شائع ہوئی تھی۔ "فائدہ مند حکومت" پر (مراٹھی میں)، ایک بہت ہی دلچسپ مضمون میں، انہوں نے "ایک گھر اور تمام شہری ایک خاندان کے طور پر" جیسے خیالات

پیش کیے تھے۔ان کا خیال تھا کہ بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ اپنی تمام رعایا کی خوشی کو یقینی بنائے،اور رعایا کا فرض بنتا ہے کہ وہ بادشاہوں کے قوانین کی پابندی کریں۔اس کے علاوہ، چونکہ اس کے مطابق، تمام شہری ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں،اس لیے تمام زمین اور اس کی پیداوار کو یکساں ہونا چاہیے،ہر فرد کو 'سماج کے لیے کام کرنا چاہیے،اور اس کے بدلے میں برادری کو اپنی ضروریات پوری کرنی چاہیے۔

سماجی معاملات میں وہ سول میرج اور طلاق کے حق میں تھے۔ان کے خیال میں بچوں کو پانچ سال کی عمر تک اپنے والدین کے پاس رہنا چاہیے اور پھر ریاست کے حوالے کر دیا جانا چاہیے۔وہ چاہتے تھے کہ ہر فرد کو اس کی صلاحیت کے مطابق کام سونپ دیا جائے،اور افراد کو ان کے پیشوں کے مطابق پانچ ذاتوں میں تقسیم کیا جائے۔وہ چاہتے تھے کہ ریاست بوڑھوں کا خیال رکھے اور انہیں ہر کام کے محکمے کے سربراہ کے طور پر ملازم رکھے۔اس طرح یہ ادارہ ایک قسم کی پارلیمنٹ کے طور پر کام کر سکتا ہے۔انھیں مغربی تہذیب پر ہندوستانی ثقافت کی برتری پر پورا بھروسہ تھا اور اسی لیے انہوں نے تبلیغ کی کہ ہندوستانیوں کو الہام اور رہنمائی کے لیے ویدک دور کی طرف دیکھنا چاہیے۔ان کا سماجی نظریہ، انسانی بھائی چارے اور فلاحی ریاست کا تھا۔

20.4 انیسویں صدی کے بعد کا مرحلہ (Later Phase of the Nineteenth Century)

اصلاحی تحریک نے انیسویں صدی کے آخری دہائیوں میں زور پکڑا۔فکری منظر نامے میں بہت سی بلند پایہ شخصیات سامنے آئیں۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر دادو باپانڈورنگ ترکھڈکر، وشنوپرشرم شاستری پنڈت، جیوتیبا پھولے، رام کرشن گوپال بھنڈارکر، نارائن مہادیو پرمان، مہادیو گوبند راناڈے، وشنو شاستری چپلونکر، کے۔ ٹی۔ تلنگ، گنیش واسودیو جوشی، نارائن گنیش چند غیرہ شامل ہیں۔

20.4.1 مہتاجی درگارام منچھرم (Mehtaji Durgaram Manchharam,1809–78)

وہ پڑھے لکھے شخصیت تھے جو 1830 کی دہائی میں سماج کے نقاد کے طور پر ابرے۔درگارام نے دوسروں کے لیے اس وقت بات کی جب اس نے 'بھوتوں کے وجود، جادو کے ذریعے ان کے بھوت پن، کم عمری کی شادی کی برائیوں اور اونچی ذات کی ہندو بیواؤں کی دوبارہ شادی کے خلاف پابندی کو مسترد کر دیا۔1842 تک درگارام نے ایک لتھوگرافک پریس حاصل کر لیا تھا جسے وہ اور اس کے دوست اپنے خیالات کو پھیلانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔اس کے علاوہ درگارام نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر 22 جون 1844 کو "مانو دھرم سبھا" کا قیام کی۔وہ ہر اتوار کو اجلاس منعقد کرتے تھے جو ہر اس شخص کے لیے کھلا ہوتا تھا جو شرکت کرنا چاہتا تھا۔اپنے پروگرام کے ایک حصے کے طور پر، مانو دھرم سبھا نے جادوگروں اور ترانے پڑھنے والوں کو چیلنج کیا کہ وہ اپنی مہارت کا مظاہرہ کریں۔اگر کوئی کامیابی سے ایسا کر سکتا ہے تو سبھا انہیں 27 روپے ادا کرے گی۔مانو دھرم سبھا کا ایک فعال تنظیم کے طور پر صرف ایک مختصر کیریئر تھا۔یہ 1846 میں اس وقت بکھرنا شروع ہوا جب دادو باپانڈرنگ بمبئی واپس آئے،اور 1852 میں جب درگارام منچھرام راجکوٹ کے لیے روانہ ہوئے تو اس نے کام کرنا چھوڑ دیا۔اگرچہ اس کی زندگی بہت محدود تھی، لیکن یہ سبھا مہاراشٹرا اور گجرات کے بعد کی پیشرفت سے براہ راست جڑی ہوئی تھی کیونکہ اس کے ممبران تحریک کے نظریات کو اپنے ساتھ لے کر چلتے تھے اور اسی طرح کی تنظیموں کے رہنما بنے۔

مانو دھرم سبھا نے سورت کے پڑھے لکھے اشرافیہ سے اپیل کی اور عیسائی مذہب کی تبدیلی کے رد عمل کے طور پر شروع کام کیا۔ایک مختصر مدت کے لیے یہ معاشرہ ایک ایسے نظریے کے ساتھ ایک ثقافتی سماجی-مذہبی تحریک کی بنیاد بنتا نظر آیا جس نے اہم تبدیلی کی ضرورت پر بات کی۔ تاہم، اس کے نظریات اور پروگرام میں اپنے پیروکاروں کی جانب سے مضبوط عزم پیدا کرنے کی صلاحیت، قائم کردہ مذہب کی قیادت اور تسلط کو براہ راست چیلنج کرنے کے لیے طاقت کے عزم کی کمی تھی۔اس سبھا کی مختصر زندگی کے باوجود، یہاں پیدا ہونے والے خیالات دو براہ راست نسلوں تک منتقل ہوئے، جن میں سے پہلا مہاراشٹر کا پرمہنس منڈلی تھا۔پرمہنس منڈلی کی تاریخ کا تعلق ثقافتی مانو دھرم سبھا اور دادوبا پانڈرنگ کی قیادت سے ہے۔

20.4.2 دادوبا پانڈورنگ ترکھڈکر (Dadoba Pandurang Tarkhadkar, 1814–82)

سماجی طور پر باشعور نوجوانوں میں نمایاں افراد میں سے ایک دادوبا پانڈورنگ ترکھڈکر (1814-1882) تھے۔وہ ایلفنسٹن انسٹی ٹیوشن کے طالب علم اور بعد میں وہاں استاد رہے۔ سنسکرت کے ایک مشہور عالم، وہ عیسائی تعلیم اور فلسفہ سے واقف تھے۔دادوبا کو مراٹھی زبان کے پانینی (معروف سنسکرت گرامر) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔انہوں نے مراٹھی زبان کی ترقی کے لیے کام کیا اور مراٹھی گرامر پر ایک جلد بھی لکھی اور در حقیقت مراٹھی نحو کی بنیاد رکھی۔

دادوبا پانڈورنگ کا تعلق بال شاستری جمبھیکر سے تھا۔وہ ایک ساتھ پڑھتے تھے۔انہوں نے 1844 میں "ایسوسی ایشن آف ریلیجن آف مینکائنڈ (مانو دھرم سبھا) The Association of Religion of Mankind (Manava Dharmasabha) کی بنیاد رکھی۔1843 میں شائع ہونے والی اپنی کتاب 'دھرم ویوچنا' (*Dharma Vivechana*) میں انہوں نے خدا اور مذہب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔انجمن جس کی بنیاد 1844 میں رکھی گئی تھی نے "انسانیت کے مذہب کی انجمن" کے اصولوں کو وضع کیا۔ایسوسی ایشن نے مذہب اور سماجی زندگی میں عالمگیریت کی نمائندگی کی۔یہ انجمن 1846 میں دادوبہ کے سورت سے نکلنے کے بعد مشکل سے ہی زندہ رہ سکی۔ وہ بال شاستری سے ایک قدم آگے بڑھے، کیونکہ وہ انہیں عقلیت پسند (Rational) کے بجائے احیاء پسند (Revivalist) محسوس کرتے تھے۔اور وہ رام موہن رائے کے عقلیت پسندی کے رویے سے بہت متاثر تھے۔اس لیے دادوبا نے جو تحریک شروع کی تھی اس کی اپنی ایک اصل اور نشوونما تھی۔

پرمہنس سبھا (The Paramahamsa Sabha, 1850)

دادوبا پانڈورنگ کی تعلیم شعور نے اسے ذات پات کے نظام کے خاتمے کی ضرورت پر قائل کر دیا تھا جسے وہ تمام سماجی اصلاح کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔انہوں نے ایلفنسٹن کے ادارے میں اپنے بہت سے طلباء کو اپنے ارد گرد اکٹھا کیا اور 1850 میں ذات پات کے نظام اور اس کی معاون برائیوں کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے 'پرمہنس منڈلی یا سبھا' کے نام سے ایک سماجی) خفیہ انجمن (قائم کی۔وہ اس انجمن کے پہلے صدر تھے۔

ذات پات کے نظام کی مخالفت کے علاوہ "پرمنس منڈل یا سبھا" کا موقف تھا: بیواؤں کی دوبارہ شادی، بت پرستی کی ممانعت، دوسرے عقائد اور مذاہب کی رواداری، اور مساوات اور بھائی چارے کا فروغ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خفیہ انجمن، ہندو مذہب اور سماج کی اصلاح کرنا چاہتا تھا۔ محبت اور اخلاقی طرز عمل پر مبنی ایک خدا اور مذہب کا نظریہ۔ توجہ عقلیت، فکر کی آزادی، ذات پات کے قوانین کو توڑنا (نچلی ذات کے لوگوں کی طرف سے ان کی میٹنگوں میں پکایا گیا کھانا) اور خواتین کی تعلیم پر مرکوز تھی۔ اس کی اہم شاخیں پونا، ستارہ اور مہاراشٹر کے دیگر قصبوں میں تھیں۔ دادوبا کی عقلیت پسندی نے بمبئی اور مہاراشٹر کے شہروں میں مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کی سوچ میں ایک خاص اثر ڈالا ہے۔ جادوگروں کے خلاف ان کی مہمات نے تجویز کیا کہ وہ پڑھے لکھے لوگوں کا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ عوام کے ذہنوں سے توہمات کے جال کو صاف کریں۔ پرہنس سبھا کی بنیاد نے دوسروں کو پیروی کرنے کا راستہ دکھایا۔ یہ سبھا کا بنیادی فکر مذہب نہیں تھا بلکہ غیر سائنسی نظریات کے خلاف عوام کے ذہنوں میں جو عقلی رویہ ابھارا گیا تھا وہ اس کا بنیادی مقصد تھا۔

20.4.3 آتمارام پانڈورنگ (Atmaram Pandurang, 1823–1898)

ہندومت کی اصلاح اور ہر طرح کی ناپاکی کو ختم کرکے سماج کو بچانے کے لیے بہت سارے تعلیم یافتہ لوگ تفریحی خیالات رکھتے تھے۔ مذہبی اور سماجی معاملات پر یکساں خیالات رکھنے والوں میں دادوبا کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر آتمارام پانڈورنگ ترکھڈکر بھی شامل تھے۔ درحقیقت یہ ڈاکٹر آتمارام پانڈورنگ کی توحید پرست ایسوسی ایشن تھی جو پرارتھنا سماج یا پریئر سوسائٹی (Prayer Society) کے نام سے مشہور ہوئی۔ جمبھیکر، لوکیتاواڑی، گوپال ہری دیش مکھ، جوتی راؤ پھولے، آر جی۔ بھنڈارکر اور ایم جی راناڈے عیسائی مشنریوں کی طرف سے ہندوستانی سماج پر تنقید کے جواب میں سماجی اصلاح میں مصروف تھے۔ بلاشبہ، آتمارام پانڈورنگ ترکھڈکر جیسے چند افراد نے برطانوی حکومت کی تنقید کی تھی۔

پرارتھنا سماج (The Prarthana Samaj, 1867)

برہمو سماج کا اثر ہندوستان کے دیگر حصوں میں بھی محسوس کیا گیا، خاص طور پر مغربی ہندوستان میں، کیشب چندر سین کی کوششوں کی وجہ سے، جنہوں نے 1864 میں مہاراشٹر کا دورہ کیا۔ ان کے دورے کی وجہ سے مہاراشٹر کے سماجی حالات پر گہرا اثر پڑا، کئی سماجی تنظیمیں وجود میں آئی جن میں ایک سماج پرتھنا سماج تھی۔ آتمارام پانڈورنگ اور ان کے ساتھ جگناتھ شنکر سیٹھ، بال شاستری جمبھیکر، وشنو شاستری، اور کرشنا شاستری چپلونکر نے 1867 میں بمبئی میں پرارتھنا سماج (پریئر سوسائٹی) کی بنیاد رکھی۔ رام کرشن گوپال بھنڈارکر اور مہادیو گووند راناڈے (1842-1901) سماج کے حقیقی رہنما تھے، پرتھنا سماج، جسے اکثر "پروٹسٹنٹ ہندوازم" کہا جاتا ہے۔ پرارتھنا سماج کے پیروکاروں نے سماجی اصلاح پر زیادہ توجہ 'عقیدہ' کے بجائے عملی کاموں پر دیا۔ انہوں نے مہاراشٹر کے مشہور بھگتی سنتوں جیسے نام دیو، توکارام اور رام داس کے عظیم آدرشوں کو زندہ رکھا اور سماج کو توہمات اور بدکاریوں سے اوپر اٹھنے کی ترغیب دی جو ترقی پسندی کے بجائے رجعت پسند تھے۔ انہوں نے اس عقیدے پر زور دیا کہ انسان کی خدمت سے ہی خدا کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔

پرارتھنا سماج ان اصولوں پر یقین رکھتے تھے:

- سب سے طاقتور اور سب سے محبت کرنے والا خدا ایک ہے۔
- خدا کی عبادت کے ذریعے نجات حاصل ہے۔
- پادریوں اور بت پرستوں کے اختیار کی مخالفت کرنا۔
- ویدوں اور اپنشدوں کے اختیار کو قبول کرنا۔
- بھکتی کے ذریعے بھگوان تک پہنچنا۔

پرارتھنا سماج مذہبی اصلاحات پر توجہ مرکوز کرنا چاہتا تھا اور سماج میں خواتین اور اچھوتوں کی زندگی کو بہتر بنانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے نئی مذہبی سرگرمیاں شروع کیں۔ جیسے سنڈے سروسز(Sunday services)، سنڈے اسکول(Sunday schools) تعلیم یافتہ نوجوان کی یونین کی بنیاد وغیرہ اور رسالہ 'سبودھ پتریکا'(*Subodh Patrika*) کے ذریعے لوگوں تک سماج کا پیغام پہنچایا جائے۔ پرتھنا سماج محض مذہب پرستوں پر یقین نہیں رکھتے تھے جو دیوتاؤں، نذرانے، رسومات وغیرہ پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ بلکہ کاروباری معاملات کے ساتھ ساتھ ذاتی تعلقات اور مساوی انصاف سے نمٹنا۔ انہوں نے مذہب کی مقدس سچائیوں کو زندگی کے عملی فرائض سے جوڑ دیا۔ انہوں نے سماجی مساوات، بیوہ کی دوبارہ شادی، غریبوں کے لیے نائٹ اسکول، بیواؤں کی پناہ گاہیں قائم کرنے اور سماج کے افسردہ طبقوں کے لیے مشن پر توجہ مرکوز کی۔ ان کے اچھے کام اور غیر جانبدارانہ موقف کی وجہ سے پرتھنا سماج تحریک جنوبی ہندوستان میں بھی پھیل گئی۔

20.4.4 جیوتیبا پھولے (Mahatma Jyotiba Phule, 1827–1890)

مہاتما پھولے مہاراشٹر کے سماجی اصلاح کاروں میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ پھولے کا تعلق او۔بی۔سی(OBC) ذات مالی سے تھا۔ اصلاحی تحریکوں کی لہر سے متاثر ہو کر، انہوں نے اعلیٰ ذات کے جبر کے خلاف ایک مضبوط مزاحمت پیدا کی۔ غریبوں، ان پڑھ اچھوتوں اور عورتوں کے درمیان کام کیا۔ انہوں نے 1875 میں "ستیہ شودھک سماج" کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے پونے میں اچھوت لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کر کے تعلیم کی شروعات کی۔ ایک سماجی مصلح کے طور پر ان کا ایک نظریہ تھا کہ اگر غریب اچھوتوں کو تعلیم دی جائے تو یہ پادری ذات سے لڑنے کے لیے عقلیت کو فروغ دینگے۔ انہوں نے تعلیم کو سماجی تبدیلی کا ایک بڑا ذریعہ سمجھا اور دلیل دی کہ علم، تعلیم اور سائنس غریبوں کے ہاتھ میں ترقی کے ہتھیار ہیں۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ اچھوت نچلی ذاتوں سے زیادہ مظلوم ہیں لیکن ان کے اتحاد پر زور دیا کیونکہ انہوں نے مل کر ہندوستان کی استحصال زدہ عوام کو تشکیل دیا۔ برہمنوں کی وجہ سے بیواؤں کی حالت ناقابل برداشت ہے۔ انہوں نے بیواؤں اور بچوں کے لیے اسکول کھول کر برہمنوں کے ظلم کو چیلنج کیا اور سماج کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ مزید ایسے مقاصد کے حصول کے لیے تنظیم اور تعلیم کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے ہندوستانی کسانوں اور مزدوروں کے استحصال کی بھی خالفت کی۔ اور پھولے نے آریوں کی فتح کے بارے میں بھی لکھا۔ وہ آریاؤں کے بارے میں ظالمانہ اور متشدد حملہ آوروں کے طور پر لکھتے ہیں۔

تحریریں (Writings)

پھولے اصل میں ایک مفکر بھی تھے اور اس لیے انہوں نے نہ صرف سیاسی رسالے لکھنا بلکہ اپنے بنیادی فلسفیانہ موقف کو پیش کرنا بھی ضروری سمجھا۔ برہمنچے قصاب(*Brahmanache Kasab*,1869) میں پھولے نے برہمن پجاریوں کے استحصال کو بے نقاب کیا ہے۔ غلامگیری(1873) میں انہوں نے نچلی ذاتوں کی غلامی کا تاریخی سروے کیا ہے۔ 1883 میں اس نے اپنی تقاریر کا ایک مجموعہ "کاریارلچہ اسود" (کاشتکار کی کوڑی) کے عنوان سے شائع کیا جس میں اس نے تجزیہ کیا ہے کہ ان دنوں کسانوں کا کس طرح استحصال کیا جارہا تھا۔ ہمیں ان کے فلسفیانہ بیان کا متن "سروجنک ستیہ دھرم پسٹک" (*Sarvajanik Satyadharma Pustak*) (سب کے لیے سچے مذہب کی کتاب) میں ملتا ہے جو ان کی موت کے ایک سال بعد 1891 میں شائع ہوئی۔ ان کی تحریروں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سماجی اور سیاسی مسائل پر ان کی سوچ عیسائیت اور تھامس پین (1737-1809) کے نظریات سے متاثر تھی۔ وہ انگلینڈ میں اپنی مذہبی بنیاد پرستی کے لیے جانا جاتا تھا۔ پھولے نے خود ریکارڈ کیا ہے کہ وہ پین کے خیال سے متاثر تھے۔ نچلی ذاتوں کے لیے ان کے عظیم کام کے اعتراف کے طور پر، انہیں اعزازات نوازہ گیا اور 1888 میں بمبئی کے لوگوں نے انہیں 'مہاتما' کے خطاب نوازہ۔

ستیہ شودھک سماج (The Satya Shodhak Samaj,1873)

انگریزوں کے خلاف ہندوستانی بغاوت (1857) تک، جیوتی راؤ پھولے برطانوی سماجی قانون سازی کے حق میں تھے اور تیزی سے سماجی تبدیلی کی امید رکھتے تھے۔ لیکن 1857 کے بعد انگریزوں نے غیر جانبداری کی پالیسی اپنائی اور قانون سازی کے ذریعے سماجی اصلاحات کی سمت میں بہت کم کام کیا۔ اور دوسری طرف زیادہ تر سماجی مصلحین غریب کسانوں اور کاریگروں کی بہت کم پرواہ کرتے تھے۔ اس لیے وہ ایک ایسی انجمن کے قیام کے حوالے سے سوچتے ہیں جو مہاراشٹریوں کے نظرانداز طبقے کی شکایات کو بیان کرے، ان میں بیداری پیدا کرے اور انہیں انصاف اور مساوات کے لیے لڑنے پر آمادہ کرے۔ آخرکار، ایک آزاد تنظیم کا قیام عمل میں لایا جو "شودروں" کی آزادی کے لیے کام کریں، جو ابھی تک برہمنوں کی "غلامی" کرتے تھے۔ اِس کے مطابق، 24 ستمبر، 1873 کو، پھولے اور ان کے ساتھیوں نے "ستیا شودک سماج"(Society of Seekers of Truth) قائم کی۔

سماج کے بنیادی مقاصد:

- شودروں کو سماجی اور مذہبی غلامی سے آزاد کرانا اور برہمنوں کے ہاتھوں ان کے استحصال کو روکنا تھا۔
- سماج کے تمام ارکان کو تمام انسانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین کی۔ جیسے "خدا کے بچوں کے ساتھ نیک سلوک اور خالق کی عبادت کرتے ہیں"۔
- سماج کی رکنیت بلا تفریق ذات پات اور مذہب سب کے لیے کھلی تھی۔ تاہم، ہر رکن کو برطانوی سلطنت سے وفاداری کا عہد کرنا تھا۔
- ایک "ستیہ شودھاک" کو سچائی کا متلاشی ہونا تھا جس کا حوالہ انسانی شخص اور سچائی کی فکر تھی۔
- پھولے نے ویدوں کو مقدس ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے بتوں (بت پرستی) سے پہلے پوجا کرنے کے رواج کی مخالفت کی اور چتروَنیا

(چاروَرنوں) کی مذمت کی۔

سماجی اور مذہبی معاملات میں، پھولے چاہتے تھے کہ مرد اور عورت دونوں کو مساوی حقوق دیے جائیں۔ انہوں نے جنس کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تفریق کو گناہ سمجھا۔ انہوں نے تمام انسانوں کے اتحاد پر زور دیا اور آزادی، مساوات اور بھائی چارے پر مبنی سماج کا تصور کیا۔ وہ مذہبی بغض پرستی اور جارحانہ قوم پرستی کا مخالف تھا کیونکہ دونوں ہی بنی نوع انسان کے اتحاد کو تباہ کرتے ہیں اور ترقی کے خلاف ہیں۔ 1874 کے اوائل میں پھولے نے بمبئی میں سماج کی ایک شاخ شروع کی اور تین سال بعد اس کے پیغام کو پھیلانے کے لیے ایک ہفتہ وار جریدہ 'دین بندھو' شروع کیا گیا۔ پھولے کے قریبی ساتھی نارائن میگھاجی لوکھنڈے اِس اخبار کے ایڈیٹر بنے۔ انہوں نے اس کے کالموں کو مزدوروں کی فلاح کے لیے استعمال کیا۔ پھولے نے پونے میونسپلٹی کے نامزد رکن کی حیثیت سے مہاراشٹر کے قحط زدہ علاقوں (1877) کی مدد کے لیے اپنی حیثیت کا استعمال کیا۔ 'دین بندھو' کے صفحات کے ذریعے ستیہ شودھک سماج کے رہنماؤں نے کسانوں اور مزدوروں کی شکایات کو بیان کیا۔ درحقیقت جیوتی راؤ اور لوکھنڈے جیسے ان کے ساتھی کسانوں اور مزدوروں کو منظم کرنے اور ان کی شکایات کے ازالے کی کوششوں میں پیش پیش تھے۔

تاہم، پھولے کی تحریک سیاست کے رسمی دائرے سے باہر رہی۔ اس کی صلاحیت کو 1880 کی دہائی تک محسوس نہیں کیا گیا جب پھولے نے برہمو سماج، پرارتھنا سماج، سروجنک سبھا اور انڈین نیشنل کانگریس کے رہنماؤں کے خلاف عوام کی بہتری کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے میں ناکامی پر سخت تنقید کی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان تنظیموں پر برہمنوں کا غلبہ ہے اور اس وجہ سے یہ حقیقی معنوں میں عوام کی نمائندہ نہیں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ، وہ حکومت پر اپنی تنقید میں اتنے ہی بے خوف تھے۔ مثال کے طور پر، انہوں نے مقامی صحافت پر پر گورنر جنرل لٹن کی پابندیوں کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔

پھولے نے برہمنوں پر الزام لگایا ہے کہ وہ اپنی برادری کے مطابق ہندو صحیفوں کی غلط تشریح کرتے ہیں اور ان پڑھ کے ذہنوں کو دھوکا دینے کے لیے جھوٹ گھڑتے ہیں اور انہیں غلامی کی زنجیروں مضبوطی سے جکڑ دیتے ہیں۔ وہ اس بحث کی حد تک چلا گیا کہ شودر اسی مٹی کے بیٹے ہیں اور برہمن باہر سے آئے اور شودروں کے پاس جو کچھ تھا اس پر قبضہ کر لیا گیا۔ ان کی کتابیں "سروجنک ستیہ دھرم پُستک (*Sarvajanik Satyadharma Pustak*) اور 'غلامگیری' برہمن برادری کے الزامات کو کاٹ رہی تھیں۔ انہوں نے تمام برہمن صحیفوں اور ان کی تعلیمات کی مذمت کی جس میں شودروں کو برہمنوں کا غلام قرار دیا گیا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ تمام لوگ جن میں غیر ملکی بھی شامل ہیں، جو انکی برادری کے ساتھ برابری کا سلوک کرتے تھے، وہ ان کے بھائی تھے۔

'ستیہ شودھک سماج' کی برہمن مخالف تحریک نہیں تھی بلکہ اس نظام کے خلاف تھی جو سماجی اور مذہبی معاملات میں برہمن کی برتری کی اجازت دیتا ہے۔ پھولے کے برہمن مصلحین اور خاص طور پر جسٹس راناڈے کے ساتھ ذاتی تعلقات اچھے رہے۔ ان کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ سچائی، مساوات اور عالمگیر انسانیت پر ان کا زور تھا۔ مہاراشٹر کے اس عظیم فرزند نے جدید ہندوستان کے عظیم مفکرین اور

مصلحین کی صحبت میں اپنے لیے ایک مستقل جگہ بنائی۔

20.4.5 وشنو پرشرم شاستری پنڈت (Vishnu Parushram Shastri Pandit,1827–1876)

بمبئی میں، نوجوان تعلیم یافتہ اصلاح پسند، جن میں دادا بھائی نوروجی، دادو با پانڈورنگ، جمبھیکر اور عسکریت پسند ہندو وشنو بووا برہما چاری نے بیوہ کی دوبارہ شادی کی وکالت کی۔ پونہ میں، ''لوکھیت واڑی'' گوپال ہری دیش مکھ، وشنو شاستری پنڈت اور ایم۔ جی۔ راناڈے جیسے مصلحین نےاِس تحریک کو تیز کر دیا۔ان مصلحین نے بیوہ کی دوبارہ شادی کے لیے ویدوں کے اختیار کا حوالہ دیا۔ 'انڈوپرکاش' جیسے جرائد نے بیوہ کی دوبارہ شادی کی وکالت کی۔ اس کی اشاعت بمبئی میں 1862 سے شروع ہوئی۔ اس کا انتظام وشنو شاستری پنڈت نے کیا۔اِس نے سماجی اصلاحات پر زور دیا اوراِس مقالے کے کالموں کے ذریعے عوامی مسائل جیسے چائلڈ میرج، خواتین کی تعلیم اور بیواؤں کی تضحیک پر بات کی گئی۔ اس کا بنیادی مقصد سماجی برائیوں کو دور کرنا اور اصلاح کے لیے سازگار عوامی شعور پیدا کرنا تھا۔اس وجہ سے اس نے زبردست مقبولیت حاصل کی۔

وشنو شاستری نے اپنے عوامی کیریئر کا آغاز بیوہ شادی کی وکالت کے ساتھ کیا۔ وہ مصلح کیشب چندر سین سے متاثر تھے۔ وہ خواتین کی آزادی کی تحریک کے میدان میں ایک سرکردہ شخصیت تھے۔ وشنو شاستری پنڈت اور ان کے کچھ دوستوں نے 1866 میں 'ودھوا ویواہوتجکا منڈلی' (‘Vidhava Vivahottejaka Mandali’) (بیوہ کی دوبارہ شادی کو فروغ دینے والی ایسوسی ایشن) تشکیل دی۔ ایسوسی ایشن کا مقصد محدود تھایعنی ہندو دھرم کے اختیار کے مطابق اونچی ذات کی بیواؤں کی دوبارہ شادی۔ وشنو شاستری پونے کے ایک سرکردہ لبرل پنڈت تھے۔انہوں نے 1875 میں ایک بیوہ سے شادی کرکے ایک مثال قائم کی۔

20.4.6 رام کرشن گوپال بھنڈارکر (Ramkrishna Gopal Bhandarkar, 1837-1925)

بھنڈارکر نہ صرف ایک عالم تھے بلکہ ایک اصلاح پسند اور انسان دوست بھی تھے۔ وہ پرمہس سبھا اور پھر پرارتھنا سماج سے وابستہ تھے۔انہوں نے پسماندہ طبقے اور خواتین کے لیے کام کیا۔انہوں نے کم عمری کی شادی، ذات پرستی اور شراب نوشی جیسی سماجی برائیوں کی سختی سے مخالفت کی۔ وہ خواتین کی تعلیم اور بیواؤں کی دوبارہ شادی کے لیے کھڑا تھے۔ انہوں نے اپنی بیوہ بیٹی کی دوسری شادی کرادی۔ قدیم سنسکرت صحیفوں کے حوالات دیتے ہوئے، انہوں نے خواتین کی تعلیم، نوعمری کی شادی کی ممانعت اور بیوہ کی وکالت کے بارے میں پرجوش انداز میں بات کی۔ بیواؤں کی دوبارہ شادی کے لیے وظیفے دینے کی وجہ سے بھنڈارکر نے اپنے لیے 'مہارشی' کا خطاب حاصل کیا۔ وہ ان چند لوگوں میں سے ایک تھے جنہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی بھرپور حمایت کی۔

20.4.7 مہادیو گوبند راناڈے (Mahadev Gobind Ranade, 1842-1901)

مہادیو گووند راناڈے نے ایلفنسٹن کالج میں انگریزی ادب، تاریخ اور معاشیات کے پروفیسر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔ راناڈے کا خیال تھا کہ تعلیم کے پھیلاؤ کے بغیر اصلاح ناممکن ہے۔اس لیے ستمبر 1882 میں پونے میں سرس باغ گرلز ہائی اسکول کی بنیاد

رکھی۔ تلک، اگرکر، گوکھلے اور چپلونکر کے ساتھ، انہوں نے 1884 میں پونے میں "دکن ایجوکیشن سوسائٹی" کی بنیاد رکھی۔ اس سوسائٹی نے 1885 میں پونے میں "فرگوسن کالج" اور 1919 میں سانگلی میں "ولنگڈن کالج" قائم کیا۔ راناڈے کا پختہ یقین تھا کہ تعلیم کا ذریعہ ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے نصاب میں مراٹھی (کو بطور مضمون شامل کرنے کی مسلسل کوششیں کیں اور بالآخر 1898 میں ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔

راناڈے کئی سرگرمی کے حامی تھے۔ ایلفنسٹن کالج کے طالبِ علم اور بعد میں بمبئی ہائی کورٹ کے جج تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ذات پات کی تفریق ہندوستانی سماجی نظام پر بنیادی چیلنج ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ سماجی اصلاح کی تحریک لوگوں کو اس وقت تک منتقل نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ مذہبی اصلاحات کو ضم نہیں کرتی۔ ان کی رہنمائی میں 1867 میں "پرہنس سبھا کو پرارتنا سماج" کے نام سے دوبارہ منظم کیا گیا۔ انہوں نے مہاراشٹر میں اپنی زندگی کے آخر تک فکری قوت اور عملیت پسندی کے ساتھ تحریک کی رہنمائی کی۔ پرارتھنا سماج نے توحید کی تبلیغ کی اور پجاریوں کے تسلط اور ذات پات کے امتیازات کی مذمت کی۔ تیلگو مصلح ویرسالنگم کی کوششوں سے اس کی سرگرمیاں جنوبی ہندوستان میں بھی پھیل گئیں۔

جسٹس مہادیو گووند راناڈے نے مذہبی اصلاحات لانے کے لیے 1867 میں بمبئی میں "پونا سروجنک سبھا" اور "پرتھنا سماج" قائم کیا۔ اس میں ذات پات کی پابندیوں کو ختم کرنے، کمسن عمر کی شادیوں کو ختم کرنے، بیواؤں کے سر منڈوانے، شادیوں کے بھاری اخراجات، جہیز اور دیگر سماجی کاموں کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ خواتین کی تعلیم کی حوصلہ افزائی اور بیوہ کی دوبارہ شادی کو فروغ دینا۔ برہمو سماج کی طرح، انہوں نے ایک خدا کی عبادت کی وکالت کی۔ انہوں نے بت پرستی اور مذہبی معاملات میں پادری ذاتوں کے تسلط کی مذمت کی۔ انہوں نے یونیورسٹی کے نصاب میں مقامی زبانیں متعارف کروائیں جس سے ہندوستانیوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کی رسائی ممکن ہوئی۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے بانی رکن بھی تھے۔

20.4.8 وشنوشاستری چپلونکر (Vishnushastri Chiplunkar, 1850-1882)

چپلونکر نے 1874 میں اپنا مشہور نبنڈمالا (*Nibandhmala*) شروع کیا، ایک ماہانہ مراٹھی میگزین، جو سماجی اصلاح کے مقصد کے لیے وقف تھا۔ "نبندامالا" اور "کیسری" میں اپنے مضمون کے ذریعے انہوں نے نہ صرف اپنے ہم خیال لوگوں پر بلکہ ادیبوں، صحافیوں اور تلک جیسے عوامی امور سے وابستہ افراد کی آنے والی نسل پر بھی گہرے نقوش چھوڑے۔ وہ اپنے ماہانہ میگزین "نبندامالا" کے لیے مشہور تھے۔ اس لیے انھیں "نبندامالاکر" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ وہ اپنے رسالے کے ذریعے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھنے کے بعد اس نے دادا بھائی نوروجی کے افکار کو فروغ دینا شروع کیا جو انڈین نیشنل کانگریس کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ چپلونکر کا "نبندامالا" نوجوانوں میں قوم پرستی پھیلانے کا ایک ذریعہ بن گیا تھا۔ وہ قوم پرست لہر کے سرخیل تھے جو انیسویں صدی کے آخر میں مہاراشٹر میں ابھری۔ اس لیے وشنواشتری چپلونکر مہاراشٹر کے پہلے لسانی، صحافی، سماجی اور سیاسی مفکر ہیں۔

20.4.9 پنڈتا رمابائی سرسوتی (Pandita Ramabai Saraswati, 1858-1922)

مہاراشٹر میں، پنڈتا رمابائی، ایک مشہور سماجی مصلح نے خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد کی اور کم عمر میں بچوں کی شادی کے رواج کے خلاف بات کی۔ انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کو فروغ دیا اور 1881 میں پونے میں "آریہ مہیلا سماج" کا آغاز کیا، تاکہ عورتوں کی حالت کو بہتر بنایا جاسکے، خاص طور پر بیواؤں کی. یورپ کے سفر کے دوران رمابائی کا عیسائیت سے سامنا ہوا جس کی وجہ سے وہ عیسائیت اختیار کر گئیں۔ اس فیصلے نے سماجی اصلاحات کے لیے ان کے نقطہ نظر کو متاثر کیا، کیونکہ اس نے خواتین کے حقوق اور سماجی انصاف کے لیے اپنی وکالت کے ساتھ عیسائی اصولوں کو مربوط کرنے کی کوشش کی۔

1889 میں، رمابائی نے "مکتی مشن" ('Mukti Mission') کی بنیاد رکھی جس کا مطلب ہے 'نجات کا گھر'، پونے میں، بیواؤں اور یتیم لڑکیوں کے لیے ایک گھر۔ اس مشن نے ان خواتین کے لیے ایک پناہ گاہ فراہم کی جن کے ساتھ سماج میں اکثر بدسلوکی اور پسماندہ کیا جاتا تھا۔ انہوں نے "شاردا سدن" ('Sharda Sadan') بھی شروع کیا جس نے بیواؤں، یتیموں اور نابینا افراد کو رہائش، تعلیم، پیشہ ورانہ تربیت اور طبّی خدمات فراہم کیں۔ اس نے اپنی پہلی کتاب، "مورلز فار ویمن *Morals for Women*" شائع کی۔ رمابائی کا کام خواتین کی مشکل زندگی کو ظاہر کرتا ہے، خاصکر کمسن دلہن اور بیوہ خواتین۔ پنڈتا رمابائی 'مکتی مشن' آج بھی سرگرم ہے۔ ان کی میراث ہندوستانی سماجی اصلاحات کی تاریخ میں خاص طور پر خواتین کے حقوق اور تعلیم کے تناظر میں اہم ہے۔ وہ ہندوستان میں صنفی مساوات اور سماجی انصاف کی وکالت کرنے والوں کے لیے ایک تحریک بنی ہوئی ہیں۔

20.4.10 نارائن گنیش چنداورکر (Narayan Ganesh Chandavarkar, 1855-1923)

چنداورکر ہندوستان میں سماجی اور سیاسی اصلاحی تحریکوں میں سرگرم عمل رہے۔ ان کا تعلق انڈین نیشنل کانگریس اور "بمبئی پریزیڈنسی ایسوسی ایشن" سے تھا۔ انہوں نے شہری آزادیوں، سماجی انصاف اور تعلیمی اصلاحات کی وکالت کی۔ چنداورکر، ایک فلسفی، پرارتھنا سماج کے عظیم رہنما تھے۔ وہ بانی صدر، رہنما اور مشیر کے طور پر وابستہ تھے۔ انہوں نے روحانی روشنی اور طاقت کے لیے جس تنظیم کا رخ کیا وہ پرارتنا سماج تھی، جس کے وہ 1901 سے اپنی زندگی کے آخری دن تک بیس سال تک صدر رہے۔ ان کا ہندوستانی قوم پرست تحریک سے گہرا تعلق تھا اور اس نے دادا بھائی نوروجی، گوپال کرشن گوکھلے اور بال گنگادھر تلک جیسی اہم شخصیات کے ساتھ مل کر کام کیا۔ انہوں نے سماجی اصلاحات کی وکالت کی، بشمول خواتین کی تعلیم، ذات پات کی اصلاح، اور اچھوت کا خاتمہ۔

20.5.11 دھونڈو کیشو کاروے (Dhondo Keshav Karve, 1858-1962)

دھونڈو کیشو کاروے، جسے مہارشی کاروے کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، ایک ہندوستانی سماجی مصلح، ماہر تعلیم، اور ہندوستان میں خواتین کی پہلی یونیورسٹی کی بانی تھیں۔ کاروے ہندوستان میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی سماجی اصلاحی تحریکوں میں ایک نمایاں شخصیت تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی خواتین کی تعلیم اور سماجی ترقی کے لیے وقف کردی۔ 1896 میں، انہوں نے ہندو بیواؤں کی

دوبارہ شادی کی وکالت کرتے ہوئے، "بیوہ میرج ایسوسی ایشن" کی بنیاد رکھی اور اس نے خود ایک بیوہ سے شادی کی۔ کاروے بیواؤں کی تعلیم کو فروغ دینے میں پیش پیش تھے۔ اس علاقے میں ان کی کوششوں نے 1891 میں "رضامندی ایکٹ" کی منظوری میں اہم کردار ادا کیا، جس نے اس عمر میں اضافہ کیا جس میں ایک لڑکی شادی کر سکتی تھی اور جنسی سرگرمی کے لیے رضامندی حاصل کر سکتی تھی۔

دھونڈو کیشو کاروے کا تعلیمی کام بہت قیمتی تھا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی خواتین کی تعلیم کے فروغ کے لیے وقف کر دی۔ 1907 میں، اس نے پونے میں "مہیلا ودیالیہ" (خواتین کا کالج) قائم کیا۔ دیہاتوں میں تعلیم کو پھیلانے کے لیے، انہوں نے 'گرام پرتھمک تعلیم منڈل" (Gram Prathamik Shikshan Mandal) قائم کرنے میں پیش قدمی کی۔ کاروے کی سب سے اہم شراکت میں سے ایک 1896 میں پونے میں ہنگنے اسٹری تعلیم سمستھا کا قیام تھا، جو بعد میں مہارشی کاروے اسٹری تعلیم سمستھا بن گئی۔ 1916 میں، اس نے ہندوستان میں خواتین کے لیے پہلی یونیورسٹی، "شریمتی ناتھی بائی دامودر ٹھاکرسی "(SNDT) ویمن یونیورسٹی پونے میں قائم کی۔ یونیورسٹی کا مقصد خواتین کو مختلف شعبوں میں تعلیم اور تربیت فراہم کرنا تھا۔ دھونڈو کیشو کاروے کو ان کی سماجی اور تعلیمی خدمات کے لیے کئی اعزازات سے نوازا گیا، جن میں 1958 میں بھارت کا سب سے بڑا شہری اعزاز، بھارت رتن بھی شامل ہے۔

20.5 اصلاحی تحریکوں کی اہمیت (Significance of the Reform Movements)

اصلاحی تحریکیں انیسویں صدی کے دوران ہندوستانیوں میں سماجی اور مذہبی شعور پیدا کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ ان تمام تحریکوں نے سماجی اور مذہبی نظریات کی عقلی سوچ بوجھ پر زور دیا اور سائنسی اور انسانی نقطہ نظر کی حوصلہ افزائی کی۔ مصلحین نے محسوس کیا کہ جدید نظریات اور ثقافت کو ہندوستانی ثقافتی دھاروں میں ضم کر کے بہترین طریقے سے جذب کیا جا سکتا ہے۔ مصلحین نے محسوس کیا کہ نئی سوچ اور ثقافت کو ہندوستانی رہن سہن میں جذب کیا جا سکتا ہے۔ جدید تعلیمی پالیسی نے ہندوستانیوں کو زندگی کے بارے میں سائنسی اور عقلی نقطہ نظر کی طرف رہنمائی کی۔ تمام تحریکوں نے عورتوں کی حیثیتوں کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کام کیا اور ذات پات کے نظام پر خاص طور پر اچھوت کے رواج پر تنقید کی۔ یہ تحریکیں سماجی اتحاد کی کھوج میں تھیں اور آزادی، مساوات اور بھائی چارے کے لیے کوشاں تھیں۔ تعلیم بالخصوص خواتین کی تعلیم کو اہمیت دی گئی۔ خواتین کی مرتبوں کو بلند کرنے کے لیے کچھ قانونی اقدامات متعارف کرائے گئے۔ مثال کے طور پر ستی پرتھا اور بچوں کے قتل کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ بیوہ کی دوبارہ شادی 1856 میں منظور ہونے والے ایک قانون سے ممکن ہوئی اور بیواؤں کی حالت بہتر ہوئی۔ 1872 میں ایک قانون پاس کیا گیا جس میں بین ذات اور بین الاجتماعی شادیوں کی منظوری دی گئی۔ 1860 میں منظور ہونے والے ایک قانون کے ذریعے لڑکیوں کی شادی کے قابل عمر کو بڑھا کر دس کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ، شاردا ایکٹ 1929 میں بچوں کی شادی کو روکنے کے لیے منظور کیا گیا تھا۔ اِس کے مطابق 14 سال سے کم عمر کی لڑکی اور 18 سال سے کم عمر کے لڑکے کی شادی نہیں ہو سکتی۔ ان مصلحین کی کوششوں کا اثر قومی تحریک میں سب سے زیادہ تھا۔ خواتین کی بڑی تعداد جدوجہد آزادی میں حصہ لینے کے لیے باہر نکلی۔ آزادی کی جدوجہد میں انڈین نیشنل آرمی کی کیپٹن لکشمی سہگل، سروجنی نائیڈو، اینی بیسنٹ، ارونا آصف علی اور دیگر بہت سی خواتین کا کردار انتہائی اہم تھا۔ عورتیں اب پردے سے نکل کر نوکری کرنے لگیں۔

مصلحین کی مسلسل کوششوں کے سماج پر بہت زیادہ اثرات پڑے۔انہوں نے کتابیں، مضامین، شاعری، رسالے، اخبارات استعمال کیااور انکی اصلاحی تحریکوں نے ہندوستانیوں کے ذہنوں میں اپنے ملک میں عزت نفس، خود اعتمادی اور فخر پیدا کیا۔ان اصلاحاتی تحریکوں نے بہت سے ہندوستانیوں کو جدید دنیا سے پہچان کرانے میں مدد کی۔لوگ ہندوستانی کے طور پر اپنی شناخت کے بارے میں زیادہ باشعور ہو گئے اور حب الوطنی کے جذبات کو فروغ دیا اور اس طرح قومی شعور کا احساس پیدا کیا۔ بالآخر ہندوستان کی تحریک آزادی میں انگریزوں کے خلاف ان کی متحدہ جدوجہد کا ذمہ دار تھا۔ تمام سماجی مذہبی مصلحین نے سماج کی اصلاح کے لیے جدید تعلیم اور سائنسی علم پر زور دیا۔ سماج میں خواتین کے مقام کو بہتر بنانے کے لیے خواتین کی تعلیم پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔

20.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

انیسویں صدی کے مصلحین نے دوگنا کام کیا۔ ہندوستانی سماج پر تنقید کی گئی۔ذات پات، ستی، بیوہ، کمسن عمر کی شادی وغیرہ جیسے ادارے شدید نشانہ بنے۔ تشدد اور مذہبی تعصب کی مذمت کی گئی۔ہندوستانی سماج کو نئے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی اور استدلال، عقلیت پسندی اور رواداری کی اپیل کی گئی۔ان کی سرگرمیوں کا دائرہ صرف مذہب تک محدود نہیں تھا بلکہ اس میں پورے سماج کو شامل کیا گیا تھا۔اگرچہ انہوں نے مختلف طریقے وضع کیے اور وقت کے حساب سے الگ بھی ہو گئے، لیکن انہوں نے نقطہ نظر اور مقاصد میں ایک اہم چیز بھائی چارے کو اہمیت دی۔انہوں نے ایک خوشحال جدید ہندوستان کا خواب دیا اور اس کے بعد یہ نظریہ ہندوستانی قومی تحریک میں شامل ہو گیا۔ مجموعی طور پر اصلاحی تحریکوں کا بنیادی مقصد سماجی خوشیوں کا حصول، عوام کی بھلائی اور قومی ترقی تھی۔ سماجی نجات کے لیے دانشوروں نے سچائی، مساوات، بھائی چارے اور انصاف پر زور دیا کہ وہ مستقبل کے ہندوستانی سماج کی حکمرانی کی اقدار ہوں۔ایم۔جی۔راناڈے نے لکھا: "ہم جس ارتقاء کی تلاش کر رہے ہیں وہ رکاوٹ سے آزادی تک، اعتبار سے عقیدے تک، حیثیت سے معاہدے تک، اختیار سے عقل تک، غیر منظم سے منظم زندگی، تعصب سے رواداری، اندھی تقدیر سے انسانی وقار کی طرف تبدیلی ہے۔" مغربی ہندوستان میں ان اصلاحاتی تحریکوں نے اجتماعی طور پر سماجی تبدیلی، تعلیم، اور ذات پات کی بنیاد پر امتیازی سلوک اور توہمات کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔انہوں نے ہندوستانی تاریخ کے ایک اہم دور میں خطے کے فکری اور سماجی تانے بانے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

20.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

قوم پرستی : ملک کو خود پر افضل اور برتر سمجھنا اور ہر حال میں اپنی قوم کی حمایت و طرفداری کرنا اور اپنی قوم کا پاس رکھنا ہے۔

عزت نفس : غیرت مندی یا خود اعتمادی اس حالت کو کہتے ہیں جہاں فرد بھرپور اعتماد کی کیفیت میں رہتا ہے۔

عسکریت : سپاہیانہ جذبہ یا رجحان، فوجی یا جنگی ذہنیت۔

تعصب : کسی کے متعلق فیصلہ صادر کر دینا یا رعایت بے جا، طرفداری، بے جا حمایت۔

حب الوطنی : ایک شخص کی اپنے وطن کے لیے محبت یا محبِ شخص اپنے ملک و قوم سے ثقافتی و فکری طور پر جڑا ہو۔

توہم پرستی : خوف یا جہالت کی وجہ سے غیر عقلی عقائد پر یقین رکھنا۔

آرتھوڈوکسی : مذہبی یا سیاسی خیالات یا عقائد جو عام طور پر روایتی طور پر قبول یا قائم کیے جاتے ہیں۔

20.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

20.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. کتاب "غلامگیری" کا مصنف کون ہے؟
2. رسالہ "دیگدرشن" کس نے شروع کیا؟
3. مہاراشٹر کے سماجی و مذہبی چار اصلاح کاروں کے نام بتائیں۔
4. "ستیہ شودھک سماج" کا بانی کون ہے؟
5. "پرارتھنا سماج" کا قیام کس سال ہوا ہے؟
6. دو اخباروں کے نام بتائیں جو انیسویں صدی میں مہاراشٹر میں مشہور تھے؟
7. "پرارتھنا سماج" کی بنیاد ڈالنے میں کس کا کردار ہے؟
8. جریدہ 'دین بندھو' کے ایڈیٹر کا نام بتائے۔
9. "پرمنس سبھا" کا بانی کون ہے؟
10. مکتی مشن" کی بنیاد کس نے ڈالی؟

20.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہندوستانی سماج کو بیدار کرنے کے لیے اصلاحی تحریکیوں کی ضرورت کیوں تھی؟
2. انیسویں صدی میں خواتین کے ساتھ سماجی دشواریوں کی وضاحت کریں۔
3. سماجی و مذہبی اصلاحی تحریکوں نے ہندوستان میں قومی بیداری میں کیا کردار ادا کیا؟
4. ان سماجی رسومات کی وضاحت کریں جو انیسویں صدی کے ہندوستان میں موجود تھی۔
5. کیا مصلحین ہندوستانی سماج میں تبدیلی لانے میں کامیاب ہوئے؟ روشنی ڈالیے۔

20.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اتمارام پانڈورنگ اور مہادیو گووند راناڈے کی شراکت پر تفصیلی تحریر لکھیں، خاص طور پر پرتھنا سماج کی بنیاد میں ان کے تعاون پر روشنی ڈالیے۔
2. ستیہ شودک سماج کی بنیاد اور اس کے بنیادی اصولوں پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

3. جیوتیبا پھولے سماجی و مذہبی اصلاحی تحریکوں کے بارے میں اپنے خیالات کے حوالے سے دوسرے مصلحین سے کس طرح مختلف تھے؟ تفصیل سے بیان کریں۔

20.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
3. Deshpande, G.P. ed., *Selected Writings of Jotirao Phule*, Left Word, New Delhi, 2012.
4. Hanlon, O' Rosalind, *Caste, Conflict, and Ideology*: *Mahatma Jotirao Phule and Low Caste Protest in Nineteenth-Century Western India*, Permanent Black, Ranikhet, 2002.
5. Gupta, Reeta Ramamurthy, *Savitribai Phule*: *Her Life, Her Relationships, Her Legacy*, HarperCollins, Gurugram, 2023.
6. Jones, Kenneth, W., *Socio-religious Reform Movements in British India: The New Cambridge History of India III. I*, Cambridge University Press, New Delhi, 1999 (first pub. in 1994)
7. Keer, Dhananjay, *Mahatma Jyotirao Phooley*: *Father of Indian Social Revolution*, Popular Prakashan, Bombay, 1997 (first pub. in 1974).
8. Mani, Braj Ranjan, *De-brahmanising History*: *Dominance and Resistance in Indian Society*, Manohar, New Delhi, 2005.
9. Natarajan, S., *A Century of Social Reform in India*, Asia Publishing House, New Delhi, 1959.
10. Omvedt, Gail, *Cultural Revolt in a Colonial Society*: *The Non-Brahman Movement in Western India*, Manohar, New Delhi, 2011.

اکائی 21۔ 1857 سے قبل مزاحمتی تحریکیں

(Resistance Movements before 1857)

اکائی کے اجزا

21.0 تمہید

21.1 مقاصد

21.2 مزاحمتی تحریکوں سے متعلق ذمہ دار عوامل

21.3 1857ء سے قبل مزاحمتی تحریکوں کی ابتداء

21.4 1857ء سے قبل اہم عوامی، کسان اور قبائلی بغاوتیں

21.4.1 سنیاسی اور فقیر بغاوت

21.4.2 مدناپور اور ڈھال بھوم میں بغاوت

21.4.3 رنگ پور بنگال کی کسان بغاوت

21.4.4 بھیل بغاوت

21.4.5 میسور بغاوت

21.4.6 کول بغاوت

21.4.7 طریقۂ محمدیہ تحریک

21.4.8 فرائضی تحریک

21.4.9 موپلہ بغاوت

21.4.10 سنتھال بغاوت

21.5 1857ء سے قبل مزاحمتی تحریکوں کی نوعیت

21.6 اکتسابی نتائج

21.7 کلیدی الفاظ

21.8 نمونہ امتحانی سوالات

21.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

21.0 تمہید (Introduction)

اس اکائی میں 1857 سے قبل مزاحمتی تحریکوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ یہ تحریکیں اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی ہندوستان میں مختلف کسانوں اور قبائلی گروہوں نے قائم کی تھیں۔ ان تحریکوں کی نوعیت قدامت پسند تھی، اور انہوں نے نوآبادیاتی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے انقلابی طریقے استعمال کیے۔ ان تحریکوں میں دیہی اور کسان لوگوں نے متعدد مزاحمتی رد عملوں کے ذریعے سابقہ نظام کو بحال کرنے کی کئی ناکام کوششیں کی۔ دراصل، اٹھارویں صدی کے پہلے نصف میں محصولات کے بڑھتے ہوئے مطالبات نے مغل حکومت اور کسانوں کے درمیان سمجھوتے کی خلاف ورزی کی اور کسانوں کے اناج کی فراہمی کو متاثر کیا؛ اور مغل صوبائی افسر شاہی اسے جمع کرنے میں پہلے سے زیادہ جابر اور سخت ہو چکی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں یہ رجحان مزید بڑھ گیا کیونکہ نوآبادیاتی حکومت نے اپنی طاقت کو بڑھانے کے لیے محصولات کے تجربات (زمینداری، ریتواری اور محل واری بندوبست) کا ایک سلسلہ قائم کیا، جس کا مقصد ریاستی آمدنی کو بڑھانا تھا۔

ہندوستان میں برطانوی اقتدار کا قیام معاشی اور معاشرتی نوآبادکاری کا ایک طویل عمل ہے۔ اس عمل نے ہر مرحلے پر عدم طمانیت، ناراضگی اور عوامی مزاحمت کو جنم دیا۔ متعدد علاقوں میں اس عدم طمانیت اور عوامی مزاحمت نے تین وسیع شکلیں اختیار کی، جیسے عوامی بغاوتیں، قبائلی بغاوتیں اور کسان تحریکیں۔ عوامی بغاوتوں کا سلسلہ، جو برطانوی حکومت کے ابتدائی سو سالوں میں جاری رہا، اکثر معزول راجاؤں، نوابوں، زمینداروں، جاگیرداروں اور پولیگاروں (Poligars) کی قیادت میں شروع ہوا تھا۔ ان بغاوتوں میں کاریگروں اور غیر متحرک فوجیوں نے بڑے پیمانے پر حصہ لیا تھا۔ اس کے علاوہ، کسان اور قبائلی بغاوتیں مقامی رہنماؤں کی قیادت میں شروع کی گئی، جن میں کسانوں اور دیہاتی لوگوں نے بڑے پیمانے پر شرکت کی۔ یہ بغاوتیں اکثر مقامی شکایات کی وجہ سے ظاہر ہوتی تھی جس میں سینکڑوں سے لے کر کئی ہزار کے مسلح گروہ شامل ہوا کرتے تھے۔ ان بغاوتوں کے بنیادی وجوہات میں برطانوی حکومت کے ذریعے معیشت، انتظامیہ اور مالگزاری نظام میں لائی گئی تبدیلیاں شامل ہیں۔ ان تبدیلیوں سے سماج میں خلل پڑ گیا، جس کے نتیجے میں کسان اور زرعی پیداوار وسیع پیمانے پر متاثر ہوئے۔ اس طرح محصولات کو بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کرنے کی نوآبادیاتی پالیسی نے ہندوستانی دیہاتوں میں ایک انقلابی صورتحال پیدا کی۔ مثال کے طور پر، بنگال میں تیس سال سے بھی کم عرصے میں محصولات کی وصولی مغلوں کے دور میں جمع کی گئی رقم سے تقریباً دوگنی ہو گئی۔ برطانوی راج کے پھیلتے ہی ملک کے دیگر علاقوں میں بھی اس طرز عمل کو دہرایا گیا۔ اس سے کسانوں کی ناراضگی اور عدم طمانیت میں اضافہ ہوا، کیونکہ آمدنی کا ایک بھی حصہ زراعت کی ترقی یا کاشتکار کی فلاح و بہبود پر خرچ نہیں کیا جا رہا تھا۔ ہزاروں زمینداروں نے نوآبادیاتی تدابیر کی وجہ سے اپنی زمین پر کنٹرول کھو دیا، کیونکہ وہ محصولات کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے میں ناکام رہے۔ ان زمینداروں اور پولیگاروں نے اس وقت مزید ناراضگی کا اظہار کیا جب ان کی جگہ بیرونی عہدیداروں، سرکاری افسروں، تاجروں اور ساہوکاروں نے لے لی۔ مزید برآں،

محصولات کے بڑھتے ہوئے مطالبات نے کسانوں کی بڑی تعداد کو مقروض بناڈالا اور انہیں اپنی زمینیں بیچنے پر مجبور کر دیا۔ چونکہ برطانوی کمپنی کسانوں کے لیے کسی بھی روایتی پدرانہ رویے سے عاری تھی؛ اس لیے، محصول کی عدم ادائیگی کی صورت میں کمپنی نے انہیں زمین سے بے دخل کر دیا۔ مختصر طور پر، اس صورتحال کی عکاسی 1770 سے 1857 تک بارہ بڑے اور متعدد چھوٹے قحطوں سے بھی کی جاسکتی ہے۔

21.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مزاحمتی تحریکوں کے سے متعلق ذمہ دار عوامل۔
- متعدد مزاحمتی تحریکیں جو 1857ء سے قبل قائم ہوئی تھیں۔
- وہ حالات جن کے پس منظر میں یہ تحریکیں شروع ہوئی تھیں۔
- ان تحریکوں میں عوامی شرکت اور تنظیم بندی کی نوعیت۔
- کمپنی راج کی طرف عوامی رد عمل۔
- کیا 1857ء کی بغاوت ایک الگ تھلگ واقعہ تھا؛ یا اس سے پہلے اسی نوعیت کی کئی احتجاجی تحریکیں واقع ہوئی تھیں؟

21.2 مزاحمتی تحریکوں سے متعلق ذمہ دار عوامل

(Factors Responsible for the Rise of Resistance Movements)

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف لوگوں کی ناراضگی اور بغاوت کے ذمہ دار عوامل مندرجہ ذیل ہیں:

- برطانوی حکومت کے ذریعے قائم کردہ محصولاتی نظام، ٹیکسوں کا بھاری بوجھ، کسانوں کو ان کی زمینوں سے بے دخلی اور قبائلی زمینوں پر غاصبانہ قبضے نے لوگوں کو باغی بننے پر مجبور کیا۔
- دیہی معاشروں میں محصولاتی عہدیداروں اور ساہوکاروں کے کردار سے لوگوں کے استحصال میں اضافہ ہوا۔
- نئی حکومت اور نئے قوانین کی وجہ سے زرعی اور جنگلاتی زمینوں پر قبائلی لوگوں کا قبضہ ختم کیا گیا۔
- برطانوی تیار کردہ اشیا کے فروغ اور ہندوستانی صنعتوں سے متعلق حفاظتی اقدامات کے فقدان نے ہندوستانی صنعتوں کو تباہ کیا۔
- دیسی صنعتوں کی تباہی سے کاریگروں نے اپنا پیشہ چھوڑ کر کاشتکاری کا پیشہ اختیار کیا، جس کی وجہ سے زرعی پیداوار پر دباؤ بڑھ گیا۔
- نوآبادیاتی حکومت کی وجہ سے، کئی زمینداروں اور پولیگاروں نے اپنی زمین اور اس کی آمدنی پر کنٹرول کھو دیا تھا۔ یہ زمیندار نئے حکمرانوں کے ساتھ تصفیہ کر کے اپنے ذاتی مفادات حاصل کرنا چاہتے تھے۔
- مذہبی رہنماؤں نے بھی برطانوی حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے میں اچھا کردار ادا کیا، کیونکہ مذہبی مبلغین اور روایتی اشراف طبقہ بھی سابقہ زمینداری اور نوکر شاہی نظام پر منحصر تھے۔

21.3 1857ء سے قبل مزاحمتی تحریکوں کی ابتداء

(The Emergence of Resistance Movements before 1857)

ما قبل نوآبادیاتی ہندوستان میں مغل حکمرانوں اور ان کے اہلکاروں کے خلاف عوامی احتجاج کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ سترہویں اور اٹھارویں صدیوں میں حکمران طبقے کے خلاف کسانوں کی کئی بغاوتیں ہوئیں۔ ریاست کی طرف سے مسرفانہ محصول کی طلب کا نفاذ، بدعنوان طرز عمل اور محصول جمع کرنے والے اہلکاروں کا سخت ترین رویہ ان وجوہات میں سے تھے جنہوں نے کسانوں کو بغاوت پر اکسایا۔ تاہم، ہندوستان میں نوآبادیاتی حکومت کے قیام اور ان کی پالیسیوں کا تباہ کن اثر کسانوں اور قبائلی لوگوں پر ضرور پڑ گیا۔ ہندوستانی معیشت میں متعدد تبدیلیوں جیسے ہندوستانی منڈیوں میں برطانوی تیار کردہ اشیا کا فروغ، ہندوستانی روایتی صنعتوں کی تباہی اور ہندوستان سے انگلینڈ دولت کی نکاسی (Drain of Wealth) نے صورتحال کو مزید خراب کر دیا۔ برطانوی محصولاتی بندوبست، نئے ٹیکسوں کی ادائیگی، کسانوں کی ان کی زمینوں سے بے دخلی، قبائلی زمینوں پر غاصبانہ قبضہ، دیہی سماج میں استحصال اور محصول جمع کرنے والوں اور ساہوکاروں کی ترقی سے کسانوں کی مالی حالت پست ہوگئی۔ برطانوی محصولاتی انتظامیہ کی توسیع نے زرعی اور جنگلاتی زمینوں پر قبائلی لوگوں کا قبضہ ختم کر دیا۔ کسانوں اور قبائلی سماج پر ان تبدیلیوں کے مجموعی اثرات بہت تباہ کن ثابت ہوئے۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے کارکنوں کی طرف سے اضافی پیداوار کی تخصیص، ٹیکسوں کے بڑھتے ہوئے بوجھ نے کسانوں کو مکمل طور پر محصولاتی اہلکاروں، تاجروں اور ساہوکاروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ مزید یہ کہ مقامی عدم صنعت کاری کی وجہ سے مزدوروں نے صنعت سے زراعت کی طرف بڑے پیمانے پر نقل مکانی کی۔ چونکہ زرعی پیداوار پر دباؤ کافی بڑھ چکا تھا؛ پھر بھی برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے زراعت کی بہتری کے لیے کوئی خاص قدم نہیں اٹھایا۔ اس کے برعکس، برطانوی معاشی پالیسی نے ہندوستانی کسانوں کو مزید کمزور کر دیا۔ برطانوی قانون اور عدلیہ نے بھی کسانوں کی کوئی مدد نہیں کی۔ انہوں نے حکومت اور اس کے حامیوں جیسے جاگیرداروں، تاجروں اور ساہوکاروں کے مفادات کا تحفظ کیا۔ اس طرح نوآبادیاتی استحصال کا شکار ہو کر اور نوآبادیاتی انتظامیہ کے انصاف سے محروم ہو کر کسانوں نے اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار اٹھا لیے۔ قبائلی عوام کی شکایتیں کسانوں سے مختلف نہیں تھیں؛ لیکن جس چیز نے انہیں سب سے زیادہ پریشان کیا تھا وہ ان کی آزاد سیاست میں بیرونی لوگوں کی مداخلت تھی۔

21.4 1857ء سے قبل اہم عوامی، کسان اور قبائلی بغاوتیں

(Major Civil, Peasant, and Tribal Uprisings before 1857)

کسانوں اور قبائلی لوگوں کی بڑھتی ہوئی عدم طمانیت برطانوی حکومت کے پہلے سو سالوں میں ہندوستان کے مختلف حصوں اور مختلف اوقات میں عوامی بغاوتوں کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ یہ بغاوتیں یا احتجاجی تحریکیں نوآبادیاتی جبر سمیت مختلف قسم کے ظلم اور تشدّد کے مشترکہ تجربات کا نتیجہ تھیں۔ ان بغاوتوں میں سے چند اہم بغاوتوں کا ذکر درج ذیل ہے:

21.4.1 سنیاسی اور فقیر بغاوت (Sanyasi, and Fakir Rebellion, 1763–1800)

اس دور کی کئی کسان تحریکوں میں مذہب نے ایک معقول بنیاد فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا، جس کے اندر کسانوں نے نو آبادیاتی حکمرانی کو سمجھا اور مزاحمت کرنے کا تصور پیش کیا۔ دوسرے الفاظ میں، کسانوں کے مذہب نے احتجاج کے نظریے اور طریقے کی وضاحت کی۔ ان میں سب سے اولین سنیاسی اور فقیر بغاوت تھی، جس نے 1763 اور 1800 کے درمیان شمالی بنگال اور بہار کے ملحقہ علاقوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بنکیم چندر چٹرجی نے اپنی ناول 'آنند متھ' میں اس بغاوت کا تذکرہ کیا ہے۔ اگرچہ سنیاسی بغاوت میں مذہب نے ایک اچھا خاصا کردار نبھایا تھا، لیکن اصل میں یہ کسان تحریک تھی۔ اس تحریک میں شامل باغی اکثر وہ لوگ تھے جن کو اپنی آبائی زمین سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ تاہم، کسانوں کے بڑھتے ہوئے مشکلات، محصول کی بڑھتی ہوئی طلب اور 1770 کے بنگال کے قحط کی وجہ سے چھوٹے زمیندار، منتشر فوجی اور دیہی غریب بھی سنیاسی اور فقیر بغاوت میں شامل ہو گئے۔

یہ دونوں گروہ کمپنی کے اعلیٰ محصولاتی مطالبات اور تجارتی اجارہ داری سے متاثر ہوئے تھے۔ اسکے بعد ان کی جدوجہد میں 1770 کے قحط کے متاثرین، زمین سے محروم کیے گئے چھوٹے زمیندار، منتشر فوجی اور دیہی علاقوں میں رہنے والے غریب بھی شامل ہو گئے۔ دونوں گروہوں کے درمیان قابل ذکر مذہبی احکامات کی فلسفیانہ وابستگی، ان کے باہمی تعلقات، ان کا تنظیمی ڈھانچہ اور اپنے پیروکاروں کے ساتھ مسلسل رابطے نے باغیوں کو متحرک کرنے میں اچھا کردار نبھایا۔ لیکن جب کمپنی نے مسلح راہبوں کے آوارہ گروہوں کو برداشت نہیں کیا، تو دونوں کے درمیان سیاسی اختلاف شروع ہوا۔ دراصل کمپنی چاہتی تھی کہ سنیاسی کسان مستقل طور پر بنگال میں آباد ہو جائے اور مزاحمت کا سہارا لیے بغیر باقاعدگی سے محصولات ادا کرے۔ چنانچہ 1760 کی دہائی سے لے کر 1800ء تک سنیاسی اور فقیر باغیوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی مسلح افواج کے درمیان بنگال اور بہار کے وسیع علاقے میں تصادم جاری رہا۔ جب یہ بغاوت عروج پر پہنچی تو اس میں حصہ لینے والوں کی تعداد لگ بھگ پچاس ہزار تک پہنچ گئی، جو 1800ء کے بعد کم ہونا شروع ہوا۔ وہ پانچ سے سات ہزار کے گروہوں میں بنگال اور بہار کے مختلف حصوں میں گھومتے رہتے تھے؛ اور دشمن کو شکست دینے کے لیے گوریلا تکنیک کا استعمال کرتے تھے۔ ان کے حملے کا نشانہ امیروں کے اناج کے ذخیرے اور بعد میں سرکاری اہلکار ہوا کرتے تھے۔ وہ مقامی حکومت کے خزانوں کو لوٹتے تھے؛ اور کبھی کبھی لوٹی ہوئی دولت غریبوں میں بانٹ دیتے تھے۔ اس کے علاوہ، انہوں نے بوگرا اور میمن سنگھ میں آزاد حکومت قائم کی تھی۔

لیکن جلد ہی مشرقی بنگال کے ضلع میمن سنگھ کے شیر پور پرگنہ میں ہندو قبیلوں جیسے گارو، حاجنگ اور ہادیوں کے درمیان ایک نئی مذہبی تحریک شروع ہوئی، جس کی قیادت کریم شاہ اور بعد میں ان کے جانشین ٹیپو شاہ نے کی۔ جب کمپنی کی حکمرانی اس خطے میں مستحکم ہوئی اور زمینداری بندوست نے اپنی جڑیں مضبوط کی؛ تو کسانوں نے غیر جائز ابواب محصول کی وصولی کے خلاف شکایت کا اظہار کیا۔ ایسے حالات میں، 1824 میں ٹیپو کے پاگل پنتھی فرقے نے ایک نئی حکومت قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ نئی تحریک رفتہ رفتہ پورے خطے میں پھیل گئی اور ایک مسلح بغاوت کی شکل اختیار کر گئی، جسے 1833 میں برطانوی فوج نے کچل دیا۔ ان بغاوتوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں طور پر شرکت کی۔ ان تحریکوں کے چند اہم رہنما منجو شاہ، موسیٰ شاہ، بھوانی پاٹھک اور دیبی چودھرانی تھے۔

21.4.2 مدناپور اور ڈھال بھوم میں بغاوت (Rebellion in Midnapur and Dalbhum, 1766–74)

انگریزوں نے 1760 میں مدناپور پر قبضہ کیا۔ اس وقت وہاں متعدد زمیندار اور تعلقدار تھے جنہوں نے کسانوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کیے تھے۔ لیکن یہ ہم آہنگ منظر 1772 میں متعارف کیے گئے نئے مالگزاری نظام سے متاثر ہوا۔ محصول جمع کرنے والے اہلکاروں اور کسانوں کے درمیان تنازعے کی صورت میں مدناپور کے زمینداروں نے کسانوں کا ساتھ دیا۔ بغاوت کے اہم رہنماؤں میں دامودر سنگھ اور جگن ناتھ ڈھل شامل تھے۔ بالآخر 1800 کے آس پاس ڈھال بھوم، مانبھوم، رائے پور، کرناگڑھ اور باگری کے زمینداروں کو اپنی زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا۔

21.4.3 رنگ پور، بنگال کی کسان بغاوت (Peasant Uprising of Rangpur-Bengal, 1783)

1757 کے بعد بنگال پر برطانوی تسلط اور متعدد مالگزاری نظاموں کے مختلف تجربات نے عام آدمی کے لیے ناقابل برداشت مشکلات پیدا کیے۔ رنگ پور اور دیناج پور بنگال کے ایسے دو اضلاع تھے جن کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے محصولاتی ٹھیکیداروں کی طرف سے گوناگوں غیر قانونی مطالبات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ محصولاتی ٹھیکیداروں کا سخت رویہ اور ان کی وصولی کسانوں کی زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ ایسا ہی ایک محصولاتی ٹھیکیدار رنگ پور اور دیناج پور کا دیبی سنگھ تھا۔ اس نے رنگ پور اور دیناج پور اضلاع کے دیہاتوں میں دہشت کا راج قائم کیا تھا۔ زمینداروں پر محصول بڑھا دیا گیا، جس کا دباؤ خود بخود کاشتکاروں یا کسانوں پر آ گیا۔ کاشتکار دیبی سنگھ اور اس کے اہلکاروں کے بڑھتے ہوئے مطالبات کو پورا کرنے کی حالت میں نہیں تھے۔ دیبی سنگھ اور اس کے آدمی کسانوں اور ان کی عورتوں پر ظلم کرتے تھے، ان کے گھر جلاتے اور ان کی فصلوں کو تباہ کرتے تھے۔ کسانوں نے ابتدائی طور پر کمپنی کی حکومت کو ایک عرضی بھیجی تھی جس میں ان کو مظلوموں کی شکایتیں دور کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ لیکن جب ان کی انصاف کی اپیل پر کوئی توجہ نہ دی گئی تو انہوں نے اپنے آپ کو منظم کیا، اپنا رہنما منتخب کیا، تیر کمانوں اور تلواروں سے لیس ایک بہت بڑی فوج تیار کی، مقامی عدالتوں اور سرکاری اہلکاروں پر حملہ کرنا شروع کیا، اناج کی دکانوں کو لوٹا اور قیدیوں کو زبردستی رہا کیا۔ انہوں نے درجی نارائن (Dirjinarain) کو اپنا رہنما منتخب کیا، موجودہ حکومت کی طرف محصولات کی ادائیگی روک دی اور اپنی حکومت قائم کی۔ بالآخر دیبی سنگھ کی اپیل پر وارن ہاسٹنگز کے تحت کمپنی کی حکومت نے بغاوت کو ختم کرنے کے لیے فوج بھیجی۔ تاہم، بغاوت کو ختم کرنے کے بعد مالگزاری نظام میں متعدد اصلاحات کی گئی۔

21.4.4 بھیل بغاوت (Bhil Uprising, 1818–31)

1857ء سے پہلے، ہندوستان میں بعض کسان بغاوتوں میں خصوصی طور پر قبائلی آبادی نے حصہ لیا تھا، جن کی سیاسی خود مختاری اور مقامی وسائل کو برطانوی راج کے قیام اور اس کے غیر قبائلی کارکنوں کی آمد سے خطرہ لاحق تھا۔ مثال کے طور پر، بھیلوں کا مرکز مراٹھا علاقہ خاندیش کے پہاڑی سلسلوں میں واقع تھا۔ 1818 میں جب یہ خطہ برطانوی قبضے میں آ گیا، تو خاندیش کے لوگوں کی اجتماعی زندگی میں خلفشار پیدا ہوا۔ مزید برآں، یہ خیال کیا جاتا تھا کہ باجی راؤ ثانی کے وزیر ترمبک جی نے بھیلوں کو خاندیش پر انگریزوں کے قبضے کے خلاف اکسایا تھا۔ 1819ء میں ایک عام بغاوت ہوئی اور بھیلوں نے کئی چھوٹے گروہوں میں میدانی علاقوں میں بغاوت کے جھنڈے لہرائے تھے۔ برطانوی

حکومت نے باغیوں کو دبانے کے لیے اپنی فوجی طاقت کا استعمال کیا اور ساتھ ہی مختلف مصالحتی اقدامات کے ذریعے ان پر قابو پانے کی کوشش کی۔ لیکن برطانوی اقدامات بھیلوں کو اپنی طرف لانے میں ناکام ثابت ہوئے۔ یہ صورتحال 1831 تک برقرار رہی، جب پورندھر کے راموشی لیڈر اوماجی راجے کو بالآخر گرفتار کرکے پھانسی دے دی گئی۔

21.4.5 میسور بغاوت (The Rebellion at Mysore, 1830–31)

ٹیپو سلطان کی آخری شکست کے بعد انگریزوں نے میسور کو وودیار خاندان (Wodeyar Dynasty) کے حوالے کر دیا، اور اس پر نظام عہد معاونت (Subsidiary Alliance) مسلط کر دیا۔ میسور کے حکمران پر کمپنی کے مالی دباؤ نے اسے زمینداروں سے آمدنی کے مطالبات بڑھانے پر مجبور کیا۔ آمدنی کا بڑھتا ہوا بوجھ بالآخر کسانوں اور کاشتکاروں پر پڑا۔ اس کے علاوہ، مقامی اہلکاروں کی رشوت ستانی، بدعنوانی اور بھتہ خوری نے کسانوں کے موجودہ مشکلات میں اضافہ کیا۔ کسانوں کی بڑھتی ہوئی ناراضگی، نفرت اور عدم اطمینان کی وجہ سے میسور کے ناگر صوبے میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ دوسرے صوبوں کے کسان ناگر کے باغی کسانوں میں شامل ہو گئے اور باغی کسانوں نے سردار ملّا، جو کریمسی کے ایک عام کاشتکار کا بیٹا تھا، کو اپنا رہنما منتخب کیا۔ کسانوں نے میسور کے حکمران کے سیاسی اقتدار کا بھی انکار کیا۔ برطانوی فوج نے کسانوں کی زبردست مخالفت کے بعد ناگر کا کنٹرول دوبارہ حاصل کر لیا اور بالآخر ملک کا انتظام انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔

21.4.6 کول بغاوت (The Kol Uprising, 1831–32)

کول بغاوت، ایک اور بڑی قبائلی بغاوت، بہار اور اڑیسہ کے چھوٹاناگپور اور سنگھ بھوم کے علاقے میں ہوئی تھی۔ سنگھ بھوم کے کولوں نے طویل صدیوں تک اپنے سرداروں کے ماتحت آزاد اقتدار کا لطف اٹھایا تھا۔ انہوں نے چھوٹاناگپور اور میور بھنج کے راجہ کی طرف سے انہیں محکوم کرنے کی تمام کوششوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا تھا۔ اس علاقے میں برطانوی مداخلت اور کول سرداروں کے دائرہ اختیار پر برطانوی امن و امان قائم کرنے کی کوشش نے قبائلی عوام میں تناؤ پیدا کیا۔ سنگھ بھوم اور پڑوسی علاقوں پر برطانوی قبضے کے نتیجے میں، غیر مقامی لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس علاقے میں آباد ہونے لگی، جس کے نتیجے میں زمین غیر قبائلی لوگوں کی طرف منتقل ہونے لگی۔ قبائلی زمینوں کی منتقلی، تاجروں، ساہوکاروں (عام طور پر جن کو قبائلی لوگ 'سوڈ' کے نام سے پکارتے تھے) اور قبائلی علاقوں میں برطانوی قانون کی آمد نے قبائلی سرداروں کی آزادانہ موروثی طاقت کو للکارا۔ اس سے قبائلی عوام میں شدید ناراضگی پیدا ہوئی اور قبائلی علاقے میں بیرونی لوگوں کے خلاف بغاوتیں شروع ہوئیں۔ یہ بغاوت رانچی، ہزاری باغ، پالاماؤ اور منبھوم تک پھیل گئی۔ حملے کا نشانہ غیر مقامی لوگ تھے، جن کے گھر جلائے گئے اور املاک لوٹ لی گئی۔ لوٹ مار اور آتش زنی کسانوں کے احتجاج اور مزاحمت کے اہم طریقے تھے، جب کہ ہلاکتوں کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی۔

21.4.7 طریقۂ محمدیہ تحریک (The *Tariqah-i-Muhammadiya* Movement, 1831)

انیسویں صدی کے اوائل میں طریقۂ محمدیہ ایک مسلم احیاء پسند تحریک تھی۔ اس تحریک کا مقصد ایسے ضابطۂ حیات کا پرچار کرنا تھا، جس کی وکالت پیغمبر محمدؐ نے کی تھی۔ سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل اس تحریک کے بانی تھے۔ طریقۂ محمدیہ تحریک شمالی ہندوستان میں

شروع ہوئی تھی، اور 1820 اور 1830 کی دہائی میں بنگال پہنچ گئی۔ بنگال میں سید احمد رائے بریلوی کے شاگرد ٹیٹو میر نے اس کی قیادت کی۔ ان کے پیروکار بنیادی طور پر غریب مسلمان کسانوں اور بافندہ طبقے سے وابستہ تھے، جن کی شناخت مخصوص لباس اور داڑھی بن چکی تھی۔ چونکہ کسانوں کی اس خوداعتمادی نے موجودہ اقتدار کو للکارا، اس لیے مقامی زمینداروں نے مختلف طریقوں، مثلاً داڑھی پر ٹیکس لگانے سے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ ٹیٹو میر اور ان کے پیروکاروں نے موجودہ سیاسی اقتدار (جس کی نمائندگی مقامی زمیندار، نیل باغبان اور ریاست کر رہی تھی) کی خلاف ورزی کی—انہوں نے خطے میں دہشت پھیلادی، ٹیکس جمع کرنے شروع کیے اور اپنی حکومت قائم کی۔ لہذا، موجودہ اقتدار کو بالآخر اپنی فوج اور اسلحہ استعمال کرنا پڑا؛ اور 16 نومبر 1831 کو اس کی تحریک کو کچلنے کے لیے ٹیٹو کے بانس کے قلعے کو اڑا دیا گیا۔

21.4.8 فرائضی تحریک (The Faraizi Movement, 1838–51)

فرائضی تحریک اصل میں ایک مقامی تحریک تھی۔ اس فرقے کی بنیاد فرید پور کے حاجی شریعت اللہ نے رکھی تھی۔ اس تحریک نے اسلام کو تمام غیر اسلامی عقائد اور طریقوں سے پاک کر کے قرآن کو ان کا واحد روحانی رہنما قرار دیا۔ اس تحریک کی اہمیت اس کی سماجی جڑوں میں موجود تھی، کیونکہ مشرقی بنگال کے دیہی غریب مسلمان اس مذہبی فرقے کے تحت متحد ہو گئے اور زمینداروں، نیل باغبانوں اور برطانوی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ جب 1839ء میں حاجی شریعت اللہ کا انتقال ہو گیا، تو ان کے بیٹے دودو میاں (Dudu Mian) نے تحریک کی قیادت سنبھالی۔ انہوں نے کسانوں کو ایک مساواتی نظریے کے مطابق متحرک کیا۔ فرائضی باغیوں نے فرید پور، بکرگنج، ڈھاکہ، پبنا، ٹپیرا، جیسور اور نوکھالی کے اضلاع میں اپنی حکومت قائم کی، اور کسانوں کے تنازعات کو حل کرنے کے لیے مقامی عدالتیں شروع کی۔ حکومت نے دودو میاں کو گرفتار کر دیا اور فوجی طاقت کا استعمال کر کے بغاوت کو کچل دیا۔ 1870 کی دہائی میں ان کے جانشین نیا میاں (Naya Mian) نے اسے دوبارہ بحال کیا۔

21.4.9 موپلہ بغاوت (The Mappila Uprising, 1836–54)

موپلہ بغاوت جنوبی ہندوستان کے مالابار علاقے میں 1840 اور 1850 کے دہائیوں کی وہ کسان تحریک تھی، جس میں مذہب نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ موپلہ لوگ ان عرب تاجروں کی نسل تھی، جنہوں نے مقامی نیر (Nair) اور تیار (Tiyar) خواتین سے شادی کی اور اس خطے میں آباد ہوئے تھے۔ بعد میں 1843 کے قانون کے تحت ان کے درجے میں اضافہ ہوا، جس سے ان کے سماجی مسائل مزید بڑھ گئے۔ رفتہ رفتہ موپلہ لوگوں نے کاشتکاروں، مزدوروں، چھوٹے تاجروں اور ماہی گیروں کا پیشہ اختیار کیا۔ جب انگریزوں نے 1792 میں مالابار پر قبضہ کیا تو انہوں نے زمین پر انفرادی ملکیت کے حقوق قائم کر کے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ روایتی نظام نے زمین کی خالص پیداوار کا یکساں حصہ جنمی (جنمم کی مدت کا حامل)، کانمدار یا کناکرن (کنم مدت کا حامل) اور کاشتکار کے درمیان طے کیا تھا۔ برطانوی نظام نے جنمی کو زمین کا مطلق مالک تسلیم کرتے ہوئے کانمداروں اور کاشتکاروں کو زمین سے بے دخل کیا۔ اس کے علاوہ، حد سے زیادہ تشخیص، غیر قانونی محصول اور عدلیہ اور پولیس کے زمیندار نواز رویے کی وجہ سے، جیسا کہ کے۔ این۔ پینکر لکھتے ہیں کہ، "مالابار کے کسان زمیندار اور ریاست کی دوہری سزاؤں کی وجہ سے انتہائی تنگدستی میں زندگی بسر کرتے تھے"۔ اس لیے انیسویں صدی کے دوران مالابار میں مزاحمتی

واقعات کا ایک سلسلہ رونما ہوا، جس نے دیہی غریبوں کے ظلم اور استحصال کے خلاف بغاوت کی۔

مذکورۂ بالا زرعی تعلقات کا اہم پہلو یہ تھا کہ عام طور پر اونچی ذات کے جنمی ہندو مذہب سے اور کسان اسلام سے وابستہ تھے۔ اس سماجی سانچے کے اندر، ولیم کوڈ (Veliamkode) کے عمر قاضی، ممبورام کے سید علوی تنگل اور ان کے بیٹے سید فضل پوکویا تنگل اور سید ثناء اللہ مکتی تنگل جیسے روایتی مسلم دانشوروں نے ایک مقبول نظریاتی دائرۂ اختیار کو زندہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا، جہاں مذہب اور معاشیات آپس میں مل کر کھلی مزاحمت کی ذہنیت پیدا کریں۔ مساجد متحرک ہونے کا مرکز بن گئیں اور ان کا نشانہ ہندو جنمی، ان کے منادر اور ان کے بچاؤ کے لیے آنے والے برطانوی اہلکار تھے۔ مذہبی رہنماؤں نے سماجی اور مذہبی اصلاحات کے ذریعے موپلہ لوگوں کی یکجہتی کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور ان میں برطانوی مخالف شعور کے ارتقاء میں بھی مدد کی۔ بالآخر موپلہ لوگوں کی بڑھتی ہوئی ناراضگی اور عدم اطمینان ریاست اور جاگیرداروں کے خلاف بغاوت کی شکل اختیار کر گیا۔ 1836 اور 1854 کے درمیان مالابار میں تقریباً بائیس بغاوتیں ہوئیں۔ موپلہ بغاوت سے متعلق تین سنگین واقعات وقوع پذیر ہوئے۔ بغاوت کو دبانے کے لیے برطانوی مسلح افواج کو تعینات کیا گیا۔ ان جابرانہ اقدامات کے بعد تقریباً بیس سال تک امن قائم رہا، لیکن پھر 1870 میں موپلہ بغاوت دوبارہ ظاہر ہوئی۔

21.4.10 سنتھال بغاوت (The Santhal Rebellion, 1855–56)

اس دور کی سب سے مؤثر قبائلی تحریک 1855–56 سنتھال ہول (بغاوت) تھی۔ سنتھال مشرقی ہندوستان میں کٹک، ڈھال بھوم، منبھوم، بارابھوم، چھوٹاناگپور، پالاماؤ، ہزاری باغ، مدناپور، بنکورا اور بیر بھوم کے مختلف اضلاع میں بکھرے ہوئے رہتے تھے۔ بنگال میں زمینداری بندوبست کے مطابق جو زمین صدیوں سے کسانوں کے پاس تھی، اسے زمینداروں کے حوالے کر دیا گیا۔ زمینداروں کے حد سے زیادہ لگان نے ان امن پسند لوگوں کو اپنے آبائی گھر چھوڑنے اور راج محل کی پہاڑیوں سے متصل میدانی علاقوں میں آباد ہونے پر مجبور کیا۔ اپنا وطن چھوڑنے کے بعد انہوں نے راج محل کی پہاڑیوں کے آس پاس کے علاقے کو صاف کیا اور اسے دامن کوہ کا نام دیا۔ انہیں بتدریج ایک مایوس کن صورتحال کی طرف اس وقت دھکیل دیا گیا جب قبائلی زمینیں غیر سنتھال زمینداروں اور ساہوکاروں کو کرایہ یا ٹھیکے پر دی گئی۔ اس کے علاوہ، ان لوگوں کو مقامی پولیس اور ریلوے کی تعمیر میں مصروف یورپی افسران کے ظلم و ستم بھی سہنے پڑھتے تھے۔ غیر مقامی لوگوں (عام طور پر سنتھال غیر مقامی لوگوں کو ڈیکو کہتے تھے) نے ان کی مانوس دنیا کو مکمل طور پر تباہ کر دیا، اور انہیں اپنے کھوئے ہوئے علاقوں پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے کارروائی پر مجبور کر دیا۔ جولائی 1855 میں، جب زمینداروں اور حکومت نے کسانوں کی انتباہ پر توجہ نہ دی، تو کئی ہزار سنتھال باغیوں نے اپنے دشمنوں یعنی زمینداروں، مہاجنوں اور حکومت کی ناپاک تثلیث کے خلاف کھلی بغاوت کا اعلان کیا۔ یہ بغاوت تیزی سے پھیل گئی، یہاں تک کہ بگلپور اور راج محل کے درمیان ایک وسیع علاقے میں کمپنی کی حکمرانی عملی طور پر ختم ہو گئی، جس سے حکومتی حلقوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اس مرحلے پر نچلی ذات کے غیر قبائلی کسانوں نے بھی سنتھال باغیوں کی بھرپور مدد کی۔ باغی سنتھالوں نے سدھو اور کانہو کو اپنے رہنما تسلیم کیے، جن کے بارے میں خیال کیا گیا تھا کہ وہ سنتھالوں پر جاری ظلم کو ختم کرنے اور "اچھے پرانے دنوں" کو بحال کرنے کے لیے دیوتاؤں سے بخشش حاصل کر چکے ہیں۔

کمپنی حکومت نے مسلح افواج کو متحرک کیا اور سنتھال باغیوں کے متعدد گاؤں کو یکے بعد دیگرے جلا دیا۔ ایک اندازے کے مطابق تیس سے پچاس ہزار باغیوں میں سے پندرہ سے بیس ہزار باغیوں کو بغاوت کے دوران مارا گیا۔ اس لیے مستقبل میں، برطانوی حکومت ان کے بارے میں زیادہ محتاط رہی اور سنتھال آباد علاقوں کو علیحدہ انتظامی اکائیوں یعنی سنتھال پرگنوں میں تقسیم کیا، جس نے ان کی قبائلی ثقافت اور شناخت کے امتیاز کو تسلیم کیا۔ بالآخر، سنتھالوں کی جدوجہد برطانوی ہتھیاروں کی برتری کی وجہ سے ناکام ہوگئی۔

مشرقی ہندوستان کی دیگر اہم قبائلی اور کسان بغاوتوں میں، چوار بغاوت، بشنوپور اور بیر بھوم بغاوت (1799)، سنبل پور بغاوت (40–1827) قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح جنوبی ہندوستان میں 1794 میں وزیانا گرام کے راجہ نے بغاوت کی، 1790 کی دہائی میں تامل ناڈو کے پولیگاروں نے بغاوت کی، انیسویں صدی کی پہلی دہائی کے دوران ساحلی آندھرا میں بغاوت ہوئی، 14–1813 کے دوران پار لیکا میڈی میں بغاوت ہوئی اور 1805 میں ٹراوانکور کے دیوان ویلو تھمپی نے بغاوت کی۔ اس کے علاوہ، 34–1830 میں وشاکھاپٹنم میں، 1835 میں گنجام میں اور 47–1846 میں کرنول میں بغاوتیں ہوئیں۔

مغربی ہندوستان میں سوراشٹر کے سرداروں نے 1816 سے 1832 تک متعدد بغاوتیں کی۔ گجرات کے کولیوں نے بھی 1824 کے دوران ایک بڑی بغاوت کی تھی۔ 31–1818 میں بھیل بغاوت، 1824 میں چناوا کی صدارت میں کتور بغاوت، 1841 میں ستارا بغاوت اور 1844 میں گدکاری بغاوت مہاراشٹر خطے کی سب سے اہم بغاوتیں تھیں۔ اسی طرح، 1814-17 میں علی گڑھ کے تعلقداروں کی بغاوت اور 1842 میں جبلپور کے بندیلوں کی بغاوت شمالی ہندوستان کی معروف بغاوتیں تھیں۔

الغرض، مجموعی طور پر ان بغاوتوں کی تعداد کافی زیادہ تھی، لیکن پھیلاؤ میں یہ مکمل طور پر مقامی اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھیں۔ یہ بغاوتیں مقامی وجوہات اور شکایات کا نتیجہ تھیں، اور ان کے اثرات بھی مقامی تھے۔ وہ اکثر ایک ہی کردار کے حامل تھے اس لیے نہیں کہ وہ قومی یا مشترکہ کوششوں کی نمائندگی کرتے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ وقت اور جگہ میں الگ ہونے کے باوجود مشترکہ حالات کی نمائندگی کرتے تھے۔ سماجی، معاشی اور سیاسی لحاظ سے ان بغاوتوں کے نیم جاگیر دار رہنماؤں کی سوچ پسماندہ اور روایتی تھی، اور ان کی قیادت شکل، نظریاتی اور ثقافتی لحاظ سے صدیوں پرانی تھیں۔

21.5 1857ء سے قبل مزاحمتی تحریکوں کی نوعیت

(Nature of Resistance Movements before 1857)

مذکورۂ بالا بیان کی گئی کسان، عوامی اور قبائلی بغاوتیں برصغیر میں ہوئی دیگر بغاوتوں کی ایک طویل فہرست میں زیادہ نمایاں ہیں۔ ان کی اصلیت اور نوعیت کے بارے میں کوئی بھی تعمیم سازی گمراہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔ پھر بھی وسیع معنوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نوآبادیاتی دور میں بدلتے ہوئے معاشی تعلقات نے کسانوں کی شکایات میں مزید اضافہ کیا اور ان کی اذیت اور پریشانی ان مختلف بغاوتوں کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ ما قبل نوآبادیاتی دور میں ہندوستانی کسانوں کی معیشت دو وقت کی روٹی تک محدود تھی، یا اصول بقاء (Subsistence) پر مبنی

تھی۔ جب ماقبل نوآبادیاتی دور میں، ریاستی اہلکاروں نے اضافی پیداوار حاصل کرنے میں ظالمانہ طریقہ یا اسلوب اختیار کیا، تو کسانوں اور مغلوں کے درمیان سمجھوتہ ٹوٹ گیا۔ اس کے نتیجے میں کسانوں کی روزی کی فراہمی متاثر ہوئی، اور بار بار کسان بغاوتیں ظاہر ہوئیں۔ یہی عمل جب نوآبادیاتی محصولاتی نظام نے مضبوط کرنے کی کوشش کی، تو ملک کے بیشتر علاقوں میں کسان بغاوتیں وقوع پذیر ہوئی۔ لیکن نوآبادیاتی زرعی معیشت میں عام طور پر تسلسل سے زیادہ تبدیلی واقع ہوئی۔ اس کے علاوہ، ہندوستانی معیشت کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے جوڑنا اور سرمایہ دارانہ زراعت کو ترقی بخشنے کی نوآبادیاتی کوششوں نے بہت سے معاملات میں زرعی تعلقات پر تباہ کن اثر ڈالا۔ زمین میں مالکانہ حقوق کی تخلیق اور اس کے نتیجے میں زمین حاصل کرنے کی طلب نے روایتی پیداواری تعلقات کو معاہدے سے بدل دیا۔ لین دین اور بیوپاری کی ترقی کی وجہ سے منافع بحیثیت غالب استخراجی عمل نے خراج کی جگہ لے لی۔ لیکن تبدیلی کا عمل کبھی مکمل نہیں ہوا۔ چونکہ خراج اور منافع ساتھ ساتھ جاری رہا، جس کی وجہ سے زرعی تعلقات کے تمام مانوس اصول ٹوٹ گئے۔

رنجیت گہا لکھتے ہیں کہ نوآبادیاتی حکمرانی کا نتیجہ "زمینداریت کی احیاء" تھی۔ جائیداد کے تعلقات میں تبدیلیوں کی وجہ سے، کسانوں نے اپنی ملکیت کھودی اور وہ اپنی مرضی سے کاشتکار بن گئے۔ اس طرح، کسانوں کی حیثیت میں کافی تبدیلی آگئی۔ اس کے علاوہ، بدعنوان طرز عمل اور محصول جمع کرنے والے اہلکاروں کے سخت رویوں نے ان کے مشکلاتوں میں اضافہ کیا۔ مزید برآں، برطانوی قانون کے ذریعے زمینداروں کی طاقت نے کسانوں پر ظلم وجبر بڑھادیا۔ ان کی فوجی طاقت کو درحقیقت روکا نہیں گیا تھا؛ بلکہ زمیندار اور داروگا سمجھوتے کے ذریعے استعمال کیا جارہا تھا، جب کہ نئی عدالتوں اور طویل عدالتی عمل نے ان کے جبر کے اختیارات میں مزید اضافہ کیا۔ جاگیرداروں کو ظلم وجبر کے نمائندوں کے طور پر دیکھا جاتا تھا، جنہیں ریاست کی طرف سے تحفظ مل رہا تھا۔ اس لیے زمینداروں کے خلاف شکایات اور ناراضگی دراصل انگریزوں کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ زمیندار ہندوستان میں سرمایہ دارانہ کاروبار قائم کرنے کے بجائے لوگوں سے سرمایہ نکالنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، کیونکہ وہ بھی غروب آفتاب قانون (Sun-Set Law) کے مسلسل دباؤ اور کمپنی کی زیادہ آمدنی کی طلب سے پریشان ہوچکے تھے۔ بڑھتی ہوئی محصولاتی طلب نے کسانوں کے قرض کی ضرورت میں اضافہ کیا، جس نے دیہی سماج میں ساہوکاروں اور تاجروں کی طاقت کو بڑھادیا۔ بالآخر بڑھتے ہوئے قرضے کی وجہ سے کسان اپنی زمین سے محروم ہوگئے۔ اس سلسلے میں رنجیت گہا لکھتے ہیں کہ زمینداروں، ساہوکاروں اور ریاستی انتظامیہ نے کسانوں پر ایک جامع غلبہ قائم کیا تھا۔

قبائلی لوگوں کے پریشان ہونے کی کچھ خاص وجوہات تھیں۔ یہ قبائلی لوگ ہندو کسان معاشروں کے کناروں پر آباد تھے، ثقافتی خودمختاری سے لطف اندوز ہورہے تھے اور مساوات انسانی پر عمل پیرا تھے۔ ایک خاص مدت کے دوران، وہ لوگ بتدریج ہندو رسم ورواج سے متاثر ہوگئے۔ انہیں رسمی درجہ بندی میں شامل کیا گیا؛ اور پھر برطانوی محصولاتی نظام کی توسیع نے ان کی خودمختاری کو مکمل طور پر تباہ کردیا۔ وہ بڑے معاشی گٹھ جوڑ میں شامل کیے گئے، جس کی وجہ سے ان کی زمین غیر قبائلی جابر کارکنوں یعنی زمینداروں اور ساہوکاروں کے ہاتھ میں آگئی۔ اور جنگل کے نئے ضوابط ان کے فطری حقوق اور آزادی پر تجاوزات کے طور پر ظاہر ہوئے۔ اس طرح برطانوی راج کے مسلط ہونے کے نتیجے میں ان کی طاقت، آزادی اور ثقافت کے خودمختار حلقے ختم ہوگئے۔ لہذا، دخل اندازی کرنے والے بیرونی لوگوں (سوڈاور ڈیکو) کے ذریعے

ان کے تصور کردہ سنہرے ماضی کی تباہی سے پر تشدد بغاوتیں ظاہر ہوئی۔

ابتدائی نوآبادیاتی دور کی ان عوامی، کسان اور قبائلی بغاوتوں کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ کمپنی حکومت ان بغاوتوں کو امن وامان قائم کرنے کے مسئلوں میں شامل کرتی ہے؛ اور باغیوں کو تہذیب کے خلاف مزاحمت کرنے والے قدیم اور غیر مہذب لوگوں کے طور پر پیش کرتی ہے۔ باغیوں نے جدیدیت کی علامات جیسے ریلوے، عدالتوں، محصولاتی دفاتر، پلوں، سرکاری ذخائروں، وغیرہ پر حملے کیے۔ یہ حملے اس بات کی نمائندگی کرتے ہیں کہ یہ باغی غیر مہذب تھے اور اس طرح تہذیب اور جدیدیت کے خلاف مزاحمت کرتے تھے۔ بعض اوقات نوآبادیاتی مؤرخوں نے ان باغیوں کو اسکول کے شرارتی بچّوں (جو اسکول میں خلل پیدا کرتے ہیں) کے طور پر پیش کیا ہے، جب وہ (باغی) سمجھتے تھے کہ استاد (یعنی نوآبادیاتی ریاست) کا دھیان کچھ لمحوں کے لیے ہٹ چکا ہے۔

بعد میں قوم پرست مؤرخوں نے کسان اور قبائلی تاریخ کو نوآبادیاتی مخالف جدوجہد کے مقاصد پیش کرنے کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے کسان اور قبائلی بغاوتوں کو جدید قوم پرستی کی ماقبل تاریخ کے طور پر پیش کیا ہے۔ ایرک سٹوکس (Eric Stokes) نے ان بغاوتوں کو بنیادی مزاحمت اور روایتی سماج کی پر تشدد نافرمانی کے طور پر بیان کیا ہے، جس سے عام طور پر جواب میں نوآبادیاتی حکمرانی کا نفاذ ہو سکتا ہے۔ ڈی۔ این۔ دھنا گرے نے ان بغاوتوں میں سیاسی شعور کا فقدان محسوس کیا، کیونکہ ان میں تنظیم سازی، منصوبہ بندی اور نظریہ کی کمی تھی۔ دوسری طرف رنجیت گہا دعوی کرتے ہیں کہ "دیہی عوام کی عسکری تحریکوں میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی، جو سیاسی نہ ہو"۔ ماتحت تاریخ نویسی (Subaltern Historiography) کے پیشوا رنجیت گہا لکھتے ہیں کہ ابتدائی دور کی قبائلی اور کسان تحریکوں کو جدید قوم پرستی کی ماقبل تاریخ تصوّر نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ، ان کی بھی ایک اپنی تاریخ ہے۔ رنجیت گہا اور دوسرے ماتحت تاریخ نویسوں کا کہنا ہے کہ متوسط طبقے کے دانشوروں نے انہیں اپنے نمونے یا نقش کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن کسان خود اپنے آپ کو منظم کرنے کے قابل تھے اور وہ اپنی شکایات کو بیان کر سکتے تھے۔ رنجیت گہا استدلال کرتے ہیں کہ دیہی عوام کی قبائلی اور کسان تحریکوں میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جو غیر سیاسی ہو؛ کیونکہ باغی کسان ظلم و جبر کے سیاسی ذرائع سے کافی حد تک باخبر تھے، جس کا مظاہرہ ان کے حملوں کے نشانات سے ہوتا ہے۔

برطانوی حکمرانی کی پہلی صدی کے دوران، بغاوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا، جنہیں کیتھلین گوہ (Kathleen D. Gough) نے "بحالی بغاوتوں (Restorative Rebellions)" کا نام دیا ہے، کیونکہ ان کا آغاز مقامی حکمرانوں، مغل جاگیرداروں زمین سے بے دخل زمینداروں نے کیا تھا۔ زیادہ تر معاملات میں ان بغاوتوں کے رہنماؤں کو مقامی کسانوں کی حمایت حاصل ہوتی تھی، جن کا بنیادی مقصد پرانے نظام کو بحال کرنا، یا موجودہ زرعی تعلقات کو قائم کرنا تھا۔ اس سلسلے میں، 81–1778 میں راجہ چیت سنگھ اور دیگر زمینداروں کی بغاوت کا ذکر کیا جا سکتا ہے، اس کے بعد 1799 میں اودھ کے معزول نواب وزیر علی کی بغاوت قابل ذکر ہے۔ یہ خطے 1830 کی دہائی تک سیاسی افراتفری سے متاثر رہے، جو محصول جمع کرنے والے اہلکاروں کے لیے پریشانی کا سبب بن گیا تھا۔ اس کے بعد 1842ء میں بندیلا راجپوت سرداروں کی بغاوت ہوئی، جس نے زرعی پیداوار میں خلل ڈالا اور کچھ سالوں کے لیے خطے میں تجارتی عمل کو

متاثر کیا۔ تاہم ان تمام مسلح بغاوتوں کو بالآخر برطانوی فوج نے کچل دیا۔ کچھ معاملات میں ان باغیوں کو بعد میں مزید شرائط کے ساتھ بحال کیا گیا۔ لیکن زیادہ تر، کیتھ لین گوہ(Kathleen D. Gough) کے مطابق، ان بغاوتوں کو برطانوی فوج نے مثالی وحشیانہ طریقوں کے ذریعے قلع قمع کیا۔

متذکرہ بالا بیان کی گئی بغاوتیں غیر سیاسی کارروائیاں نہیں تھیں، بلکہ انہوں نے ایک سیاسی عمل تشکیل دی، جس نے کسانوں کے سیاسی شعور کو مختلف طریقوں سے ظاہر کیا۔ جیسا کہ رنجیت گہا(1994) لکھتے ہیں کہ قبائلی لوگوں اور کسانوں نے دیہی سماج میں بیرونی اقتدار کے بارے میں واضح شعور ظاہر کیا اور اس ڈھانچے کو ختم کرنے کے عزم کا مظاہرہ کیا۔ باغی کسان ظلم و جبر کے سیاسی ذرائع سے بخوبی واقف تھے، جس کا مظاہرہ ان کے حملوں کے ہدف سے ہوتا ہے۔ باغیوں کے حملوں کے اہداف میں زمینداروں کے مکانات، اناج کے ذخائر، ساہوکار، سوداگر اور بالآخر کمپنی حکومت شامل ہیں۔ یہ بغاوتیں، جرائم سے مختلف سیاسی کارروائیاں تھیں، کیونکہ وہ عوام النّاس سے متعلق اور اجتماعی تھیں۔ مثال کے طور پر، سنتھالوں نے بغاوت سے پہلے ہی کمپنی حکومت کو آگاہ اور خبردار کیا تھا، اور رنگپور کے رہنماؤں نے کسانوں پر بغاوت کے لیے محصول بھی عائد کیا تھا۔ اس کے علاوہ، باغیوں کے درمیان عوامی اجتماع، مجلسیں اور منصوبہ بندی ہوا کرتی تھی، جس میں یقینی طور پر صلح و مشورے کی باتیں ہوتی تھی۔ بغاوت سے پہلے باغی شاندار تقریبات منعقد کرتے تھے۔ سنتھالوں نے متعدد دیہاتی علاقوں پر حملہ کرنے سے پہلے انہیں خبردار کیا تھا۔ کسانوں کے ظلم کا سیاسی ذریعہ جان کر، باغیوں نے 1783 میں دیبی سنہا کے خلاف مقامی عدالتوں پر حملہ کیا۔ اسی طرح کولوں نے 1832 میں قبائلی آبادی پر حملہ نہیں کیا، کیونکہ وہ ان کے اتحادی تھے۔ مزید برآں، اس تحریک نے اپنی ترقی کے لیے فوری شکایات سے بالاتر مسائل کو شامل کرکے اپنے دائرے کو وسیع کیا، جس سے احتجاجی عمل شروع ہوتی تھی۔

جہاں تک ان کسان بغاوتوں کی قیادت کا تعلق ہے، ان کے رہنما متعلقہ قبیلوں سے ہی وابستہ تھے۔ چونکہ یہ رہنما کسان اور قبائلی ثقافتوں سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے انہوں نے ان بغاوتوں کو مؤثر قیادت فراہم کی۔ اس تحریک میں متعدد طبقوں اور معاشروں نے شرکت کی۔ نوآبادیاتی دیہی معاشروں میں طبقاتی، ذات پات، نسلی اور مذہبی گروہوں کے درمیان مختلف درجات کے تناؤ محسوس کیے گئے، جو دیہی علاقوں میں ظلم اور غربت کے پرتشدد حالات سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے معاملات میں مذہب نے غریب طبقوں کے درمیان اتحاد کا رشتہ قائم کیا، کیونکہ قائدین نے مافوق الفطرت ذرائع سے لڑنے کے بعد ایک ہزار سال کی آزادی کا وعدہ کیا۔ ماقبل سرمایہ داری معاشروں میں، جہاں طبقاتی شعور اور طبقاتی نظریہ موجود نہیں تھا، مذہب نے بغاوت کے لیے ایک نظریہ فراہم کیا۔ ان رہنماؤں نے بیرونی مداخلت کی وجہ سے اخلاقیات اور حسن عمل کے فقدان کا بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اس طرح مذہب نے ان کی بغاوتوں کو جواز فراہم کیا۔ ایسے مسیحائی انقلاب میں، ان کرشماتی رہنماؤں کو جادوئی یا الہامی طاقت سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح، ان بغاوتوں کو الہامی اور بعد میں قانونی حیثیت حاصل ہو گئی۔ لہذا مذہب نے کسانوں کے ردعمل کو ایک نظریاتی بنیاد اور حوصلہ افزائی بخشی۔ جیسا کہ فرائضی بغاوت واضح کرتی ہے کہ کس طرح قایدین ایک طرف اپنے مذہب کے ماضی کی پاکیزگی کی طرف لوٹنے کی کوشش کررہے تھے اور دوسری طرف کسانوں کے مسائل کو بھی حل کررہے تھے۔ اس طرح، یہ تصور کہ "ساری زمین خدا کی ہے اور اس میں سب کا برابر کا حصہ ہے" نے مظلوم کسانوں کو مذہب کی حرمت کے

لیے متحرک کیا۔

یہ کسان بغاوتیں جدید قوم پرستی سے بھی مختلف تھیں۔ ان بغاوتوں کا پھیلاؤ باغیوں کے علاقائی اور نسلی شعور پر بھی منحصر تھا۔ یہ بغاوتیں اپنے متعلقہ جغرافیائی علاقوں میں کافی موثر رہی۔ لیکن بعض اوقات نسلی تعلقات علاقائی حدود سے باہر نکل گئے، جیسا کہ کول بغاوت میں مختلف خطوں کے کولوں نے بیک وقت بغاوت کی۔ بعض اوقات باغیوں کے ذاتی تصورات نے بھی بغاوت کے متعدد واقعات کی حوصلہ افزائی کی۔ ماضی بعید میں ایک "سنہری دور" کے تصور میں اکثر تاریخ کا ارتقاء ہوتا ہے۔ اس تصوراتی سنہری ماضی کی بحالی کے حصول نے کسانوں کی کارروائی کے لیے ایک نظریہ فراہم کیا، جس کی اہم مثالیں سنتھال اور فرائضی بغاوتیں ہیں۔ مزید برآں، یہ بغاوتیں ہمیشہ براہ راست نوآبادیاتی نظام کے خلاف نہیں ہوا کرتی تھی، لیکن ان کا تعلق نوآبادیاتی پالیسیوں سے متعلق ضرور ہوتا تھا۔ تاہم، ہندوستان میں کمپنی حکومت کے خلاف ناراضگی اور مزاحمت کا سب سے طاقتور اور ممکنہ طور پر خطرناک ردعمل 1857 کی بغاوت تھی۔

21.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

یہ مزاحمتی تحریکیں اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی ہندوستان میں مختلف کسانوں اور قبائلی گروہوں نے قائم کی تھیں۔ ان تحریکوں کی نوعیت قدامت پسند تھی، اور ان کے رہنماؤں نے نوآبادیاتی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے انقلابی طریقے استعمال کیے۔ دراصل، اٹھارویں صدی کے پہلے نصف میں محصولات کے بڑھتے ہوئے مطالبات نے مغل حکومت اور کسانوں کے درمیان سمجھوتے کی خلاف ورزی کی اور کسانوں کے اناج کی فراہمی کو متاثر کیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ رجحان بڑھتا گیا، کیونکہ نوآبادیاتی حکومت نے اپنی طاقت کو بڑھانے کے لیے محصولات کے تجربات کا ایک سلسلہ قائم کیا، جس کا مقصد ریاستی آمدنی کو بڑھانا تھا۔ مندرجہ بالا بیان کی گئی عوامی، کسان اور قبائلی تحریکیں انتہائی مقامی اور الگ تھلگ تھیں۔ یہ بغاوتیں مقامی وجوہات اور شکایات کا نتیجہ تھیں، اور ان کے اثرات بھی مقامی تھے۔ اگرچہ ان میں سے بہت سی تحریکوں نے نسلی یا مذہبی تعلق سے طاقت حاصل کی، لیکن بعد میں یہ حقیقت خود ایک رکاوٹ بن گئی۔ ان شورشوں اور بغاوتوں کی تنہائی نے اعلیٰ ترتیب کے سیاسی شعور کو مربوط اور مضبوط کرنے میں قومی سطح پر ان تحریکوں کے اثرات کو محدود کر دیا۔ وہ اکثر ایک ہی کردار کے حامل تھے اس لیے نہیں کہ وہ قومی یا مشترکہ کوششوں کی نمائندگی کرتے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ وقت اور جگہ میں الگ ہونے کے باوجود مشترکہ حالات کی نمائندگی کرتے تھے۔ سماجی، معاشی اور سیاسی لحاظ سے ان بغاوتوں کے نیم جاگیردار رہنماؤں کی سوچ پسماندہ اور روایتی تھی، اور ان کی قیادت شکل، نظریاتی اور ثقافتی لحاظ سے صدیوں پرانی تھیں۔ ان شورشوں کی الگ تھلگ نوعیت کے علاوہ، برطانوی مسلح افواج کی تکنیکی برتری، قائم شدہ سماجی نظام اور کمپنی کے انتظامی ڈھانچے نے برطانوی کامیابی کو یقینی بنایا۔ اس کے باوجود، نوآبادیاتی حکومت کے خلاف سب سے پہلی بغاوتوں کے طور پر یہ تحریکیں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس پس منظر میں، 1857 کی بغاوت ایک ایسی تحریک ثابت ہوئی، جس میں کسانوں کی عدم طمانیت کے ساتھ ساتھ برطانوی راج کے خلاف سماج کے کچھ دوسرے طبقات کا بھی ردعمل محسوس کیا گیا۔ اس بغاوت نے نسلی، مذہبی اور ذات پات کی سرحدوں کو پار کرتے ہوئے ہے بیک وقت ہندوستان کے کئی حصوں میں برطانوی راج کو ایک حقیقی چیلنج پیش کیا۔

21.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

ڈیکو (Dikus) : یہ وہ نام تھا جو سنتھال باغیوں نے غیر مقامی لوگوں کو دیا تھا۔

سوڈ (Sud) : عام طور پر قبائلی لوگ غیر مقامی تاجروں اور ساہوکاروں کو 'سوڈ' کے نام سے پکارتے تھے۔

ماجھی اور پرگنی : ماجھی اور پرگنی قبائلی سردار تھے۔

جنمی (Janmi) : جنم کی مدت کا حامل۔ (جنمی ایک اصطلاح ہے جو کیرالا کے زمیندار طبقے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ انہوں نے وسطی دور میں خطے کے جاگیردار طبقۂ اشراف کے ساتھ ساتھ زمیندار طبقے کی بھی تشکیل دی۔)

کانمدار یا کناکرن : کنم مدت کا حامل۔ (کنم سابقہ مالابار میں مروجہ زمینوں کی مدّت کے طریقوں میں سے ایک تھا، یا کاشتکاری کی ایک اہم ترین شکل تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کنم دار نے حقیقی مالک کے مقابلے میں اعلی اختیارات حاصل کر لیے۔

21.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

21.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Very Short Answer Type Questions)

1. میدناپور اور ڈھال بھوم میں بغاوت کے اہم رہنماؤں کے نام بتائیے۔
2. سدھو اور کانہو کون تھے؟
3. سنیاسی اور فقیر بغاوت کے اہم رہنماؤں کے نام بتائیے۔
4. آنند مٹھ (*Anandmath*) کس نے لکھی ہے؟
5. ڈیکو ('Dikus') سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
6. فرائضی تحریک کے معروف رہنما حاجی شریعت اللہ کی وفات کب ہوئی؟
7. حاجی شریعت اللہ کی وفات کے بعد فرائضی تحریک کی رہنمائی کس نے کی؟
8. طریقۂ محمدیہ تحریک کے معروف رہنماؤں کے اسمائے گرامی تحریر کیجئے؟
9. بھیل بغاوت کے کسی اہم رہنما کا نام بتائے؟
10. کتور بغاوت (1824) کی قیادت کس نے کی؟

21.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. کسان اور قبائلی بغاوتوں کے کیا وجوہات تھے؟
2. کسان اور قبائلی بغاوتوں کے بارے میں رانا جیت گہا کا مؤقف بیان کریں۔

3. فرائضی تحریک پر مختصر نوٹ تحریر کریں۔

4. مغربی اور جنوبی ہندوستان کی معروف بغاوتوں پر روشنی ڈالیے۔

5. مزاحمتی تحریکوں سے متعلق ذمہ دار عوامل بیان کریں۔

21.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. موپلہ بغاوت (1836-54) پر ایک تفصیلی نوٹ تحریر کریں۔

2. 1857ء سے پہلے کی قبائلی اور کسان بغاوتوں کی نوعیت پر بحث کیجیے۔

3. سنتھال بغاوت (1855-56) کے واقعات پر روشنی ڈالیے۔

21.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Bandhopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition: A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
2. Banerjee Dube, Ishita, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2014.
3. Chandra, Bipan et al., *India's Struggle for Independence*, Penguin, New Delhi, 1988.
4. Chaudhuri, S.B., *Civil Rebellion in the Indian Mutinies (1857–1859)*, The World Press Private Ltd., 1957.
5. Desai, A.R. (ed.), *Peasant Struggles in India*, Oxford University Press, New Delhi, 1979.
6. Grover and Grover, *A New Look at Modern Indian History*, S. Chand & Company Limited, New Delhi, 1983.
7. Guha, Ranajit, *Elementary Aspects of Peasant Insurgency in Colonial India*, Duke University Press, 1999.
8. Mukherjee, Rudragshu, *Awadh in Revolt, 1857–1858: A Study of Popular Resistance*, Oxford University Press, New Delhi, 1984.

اکائی 22۔ 1857: 'پہلی جنگ آزادی' – نوعیت اور اسباب

(1857: 'First War of Independence' – Nature and Causes)

اکائی کے اجزا

22.0 تمہید

22.1 مقاصد

22.2 1857ء کی بغاوت کی نوعیت

22.3 1857ء کی بغاوت کے اسباب

22.3.1 سیاسی اسباب

22.3.2 سماجی و مذہبی اسباب

22.3.3 معاشی اسباب

22.3.4 فوجی اسباب

22.3.5 فوری سبب

22.4 اکتسابی نتائج

22.5 کلیدی الفاظ

22.6 نمونہ امتحانی سوالات

22.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

22.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

22.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

22.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

22.0 تمہید (Introduction)

10 مئی 1857ء کو میرٹھ چھاؤنی کے ہندوستانی فوجیوں نے یورپی افسروں کو قتل کیا، اپنے ساتھیوں کو قید سے آزاد کرایا اور برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ 11 مئی کو دہلی آئے اور بہادر شاہ ظفر سے بغاوت کی قیادت کرنے کی گزارش کی۔ تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد بادشاہ بھی بغاوت میں شریک ہو گئے۔ اس بغاوت کی خبر ہندوستان کے بیشتر صوبوں اور ریاستوں میں جنگل کی آگ کی طرح آناً فاناً پھیل گئی۔ انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کے ذریعہ 1857ء میں کی جانے والی آزادی کی پہلی کوشش کو مورخین نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں ایک طبقہ اسے مسلح فوجیوں کی بغاوت('Sepoy Mutiny') کہتا ہے تو دوسرا اسے تمام ہندوستانیوں کی بغاوت گردانتا ہے۔ کچھ انگریزوں نے اسے کٹر مولویوں کی برطانوی حکومت کے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش بتایا ہے۔ تاہم قومی مورخین نے ان تمام الزامات کا دفاع کرتے ہوئے اسے پہلی جنگ آزادی قرار دیا ہے۔ اس اکائی میں ہم اس بغاوت کی نوعیت سے متعلق تمام نظریات اور بغاوت کے ہر قسم کے اسباب پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

22.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- 1857 کی پہلی جنگِ آزادی کی نوعیت سے واقف ہو سکیں گے۔
- 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے اغراض و مقاصد کو بیان کر سکیں گے۔
- 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے اسباب و وجوہات کو بخوبی جان سکیں گے۔
- 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے اہم مراکز کی نشان دہی کر سکیں گے۔
- 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے وجوہات کا جائزہ لے سکیں گے۔

22.2 1857ء کی بغاوت کی نوعیت (Nature of the Revolt of1857)

1857ء کی بغاوت ہندوستان کی تاریخ کا واحد ایسا موضوع ہے جو مورخین کے مابین مسلسل بحث کا سبب بنا ہوا ہے۔ متعدد مورخین نے اس کی نوعیّت پر اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے چند مورخین کی رائے پیش کر کے بغاوت کی نوعیّت سمجھنے کی کوشش کرنا لازمی ہے۔

- جان کے(John Kaye)اور جی۔ بی۔ میلیسن(G.B. Malleson)نے اس بغاوت کو کٹّر مذہبی طبقے بالخصوص مولویوں کی برطانوی حکومت کے خلاف سازش بتایا ہے۔ اس سازش میں ہندوستانی حکمراں طبقہ اپنی حکومتوں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے شامل ہو گیا تھا۔ مجموعی طور پر وہ اس بغاوت کے لیے مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔
- ٹی۔ رائس۔ ہومس(T. Rice Holmes) کا خیال ہے کہ فوجی بغاوت سے ہندوستانی حکمراں فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ برطانوی حکومت کے قیام سے اُنھیں سب سے زیادہ دھکّا پہنچا تھا۔ مسلمان اور برہمن جو بغاوت میں شامل ہوئے اُن کے سیاسی اور مذہبی مفاد کو بھی

ٹھیس پہنچی تھی۔ اجمالی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرکاری مورخین بغاوت کی اہمیت کو متعصبانہ طریقے سے کم پیش کر کے اپنی کوتاہیوں کی پردہ پوشی کرتے نظر آتے ہیں۔

- آر۔ سی۔ مجومدار (R.C. Majumdar) انگریز مورخین کے سُر میں سُر ملاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس بغاوت میں زوال آمدہ ہندوستانی حکمرانوں کی شمولیت مرتے دم کی ہچکیوں کے مترادِف تھی۔ اس خیال میں تعصب کی بُو آتی ہے، کیونکہ اس دور میں جدید اور جمہوری خیالات کا کوئی تصور نہیں تھا۔ علاوہ ازیں برطانوی حکمراں اپنی تانا شاہی کے ذریعہ اپنی مفاد براری کر رہے تھے۔ اُنھیں ہندوستانیوں کی فلاح کی ذرا پرواہ نہیں تھی۔ اس لحاظ سے وہ ہندوستانی حکمرانوں سے بہتر نہیں سمجھے جا سکتے۔
- مذکورہ بالا آراء کے برعکس وی۔ ڈی۔ ساورکر (V.D. Savarkar) قومی جذبے سے سرشار 1857ء کی بغاوت کو 'آزادی کی پہلی جنگ' سے عبارت کرتے ہیں۔
- جون ہیرس (John Harris) اس خیال سے اتفاق رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ 1857ء کی بغاوت 'آزادی حاصل کرنے کا پہلا زبردست ہیجان تھا۔'
- ایس۔ این۔ سین (S.N. Sen) کہتے ہیں کہ 'کوئی بھی قوم زیادہ عرصے تک غلامی برداشت نہیں کر سکتی۔' بالالفاظ دیگر یہ برطانوی حکومت کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی ایک عظیم کوشش تھی۔
- ایس۔ بی۔ چودھری (S. B. Chaudhuri) اپنی عمیق تحقیق کی بنیاد پر 1857ء کی بغاوت کو 'قومی پیمانے پر ایک عظیم اور بے ساختہ مزاحمت' سے تعبیر کرتے ہیں۔ مزید برآں فرماتے ہیں کہ اس طرح کی بغاوتوں میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے، جو اس سے پیشتر بھی چھوٹے پیمانے پر رُونما ہوتی رہی تھیں۔'
- مارکسی نظریات سے متاثر مورخین اس بغاوت کو برطانوی سامراجیت اور سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد قرار دیتے ہیں۔
- ایم۔ این۔ رائے (M.N. Roy) اپنی متناسب رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ 'یہ بغاوت حالاں کہ سیاسی اعتبار سے کسی حد تک آزادی کی پہلی جنگ سمجھی جا سکتی ہے، مگر سماجی اعتبار سے یہ ایک رجعت پسندانہ تحریک تھی۔'
- سر سیّد احمد خاں اس بغاوت کے چشم دید گواہ تھے، انہوں نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف 'اسبابِ بغاوتِ ہند' میں اس موضوع کے ہر پہلو کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے اس تاریخی واقعہ کو ہندوستان کے تمام طبقوں کی ایک عام بغاوت قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کے لیے برطانوی حکومت کی توسیعِ سلطنت کی پالیسی، ناجائز معاشی انتفاع کے طریقے اور ہندوستان کے مذہبی اور ثقافتی معاملات میں بے جا مداخلت ذمہ دار تھے۔ انھیں اسباب کی بِنا پر میرٹھ کی چھوٹی سی فوجی بغاوت کی چنگاری آناً فاناً پورے ہندوستان میں شعلوں کی طرح بھڑک گئی۔ مزید برآں انگریز مورخین کی رائے کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس بغاوت میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھائی بھی شریک تھے۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے بیشتر مقاموں میں اس کی قیادت کی تھی اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس کی صفائی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ دراصل ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام سے سب سے زیادہ مسلمانوں کو صدمہ اور نقصان پہنچا تھا۔

مذکورہ بالا آراء کے پیش نظر یہ باوثوق طور پر کہا جاسکتا ہے کہ 1857ء کی بغاوت در حقیقت تاریخ کا ایک ایسا عظیم واقعہ تھا، جس کے بے حد سنگین اور دوررس نتائج مرتب ہوئے اور ہر طبقے کو متاثر کیا تھا، بالخصوص برطانوی حکومت کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اس کی ناکامی بھی کسی المیے سے کم نہ تھی۔

22.3 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے اسباب

(Causes for the 'First War of Independence' in 1857)

22.3.1 سیاسی اسباب (Political Causes)

میسور ریاست کی بیخ کنی: 1857ء میں بنگال کی فتح کے بعد انگریز تاجروں کو ایک ریاستی حکمراں کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ کرناٹک کی جنگوں میں فتحیابی کے بعد انگریزوں کو اپنی فوجی طاقت کا احساس ہو گیا تھا۔ لہٰذا توسیع سلطنت کے لیے گورنر جنرل ویلزلی نے امدادی صلح کا طریقہ اختیار کیا۔ دکن میں ٹیپو سلطان انگریزوں کی توسیع سلطنت میں بڑی رُکاوٹ تھا۔ اس نے انگریزوں کو کئی جنگوں میں زبردست ٹکر دی تھی۔ ویلزلی نے جب ٹیپو کے سامنے امدادی صلح کی پیش کش کی تو اس نے انکار کر دیا۔ اس پر برانگیختہ ہو کر ویلزلی نے ایک بڑی فوج تیار کر کے نظام حیدرآباد اور مراٹھوں کو اپنے ساتھ ملا کر میسور پر حملہ کر دیا۔ میسور دربار کے غدّار امراء کے ساتھ سازش کر کے 1799ء میں میسور کی جنگ میں ٹیپو سلطان کو شکست دی۔ اس جنگ میں ٹیپو سلطان شہید بھی ہوئے۔ معاشی اعتبار سے کئی مفید علاقوں کو اپنی حکومت میں الحاق کر کے چھوٹی سی ریاست میسور کے پشتینی راجا کے حوالے کر دی۔ اس سے امدادی صلح کا معاہدہ بھی کر لیا۔ اس طرح ایک جرأت مند اور بہادر حکمراں ٹیپو سلطان کی انگریزوں نے بیخ کنی کر دی تھی۔ ظاہر ہے کہ انگریزوں کی سفّاکانہ پالیسی سے میسور کے عوام بالخصوص مسلمان بے حد ناراض ہو گئے تھے۔ 1857ء کے بے خوف جنگجو احمد اللہ شاہ مدراسی بعد کو احمد اللہ شاہ فیض آبادی ٹیپو سلطان سے بہت متاثر تھے۔

امدادی صلح اور نظام حیدرآباد کی ماتحتی: کرناٹک کی جنگوں میں حیدرآباد کے حکمران نظام علی نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا حتیٰ کہ ٹیپو سلطان سے بھی بے اعتنائی برتی تھی۔ ویلزلی نے نظام سے دوستی کو مزید مضبوط کرنے کے بہانے امدادی صلح کی پیش کش کی۔ نظام علی نے امراء سے صلاح مشورہ کر کے معاہدے پر دستخط کرنے میں خیریت سمجھی۔ اس معاہدے کے تحت انگریزوں کی نگرانی میں ایک فوج تیار کی گئی، جس کا پورا خرچہ نظام کو برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کے عوض میں انگریزوں نے نظام کی حکومت کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ امدادی فوج انگریز اپنی دیگر جنگوں میں بھی استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا بغیر خرچ کیے انگریزوں کے پاس ایک بڑی فوجی طاقت تیار ہو گئی تھی۔ دربار میں ایک برٹش ریزیڈنٹ رکھا جاتا تھا، جو انگریزوں کے مفاد کی حفاظت کرتا تھا، رفتہ رفتہ دربار کے اندرونی معاملات میں بھی انگریزوں کی دخل اندازی بڑھ گئی۔ نظام کو اپنے وزیر اور جانشیں انگریزوں کی منظوری کے بغیر انتخاب کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ نظام علی کے بعد سکندر جاہ نے انگریزوں کے چُنگل سے نکلنے کی بہت کوشش کی۔ وزیر کا تقرر کئی سال تک التواء میں پڑا رہا۔ آخر کار انگریزوں کی مرضی ہی سے وزیر کا تقرر ہو سکا۔ وزراء میر عالم، منیر الدولہ، سالار جنگ وغیرہ انگریزوں کے وفادار تھے۔ اس طرح خرچہ نظام کا ہو رہا تھا اور فائدہ انگریزوں کا۔ سکندر جاہ کو

اپنی مرضی کا جانشین نامزد کرنے کی منظوری نہ دے کر انگریزوں نے کمزور نصیر الدولہ کو جانشین تسلیم کیا۔ نصیر الدولہ کے زمانے میں انگریزوں سے کوئی تکرار نہیں ہوا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اول،اس کے دور میں ولیم بینٹنگ نے سیاسی مداخلت کی پالیسی سے گریز کیا تھا۔دوم، اس نے انگریزوں کے ساتھ امن کی پالیسی اختیار کی تھی۔ نصیر الدولہ نے اپنے جانشین افضال الدولہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ انگریزوں کے ساتھ امن رکھنے ہی میں خیر ہے۔افضال الدولہ حالاں کہ انگریزوں کو پسند نہیں کرتا تھا، مگر بظاہر انگریزوں سے ملا رہا۔جب 1857ء کی بغاوت ظہور پذیر ہوئی جس کا حیدرآباد پر بھی اثر پڑا تو اس نے درپردہ انقلابیوں کی مدد کی تھی، حیدرآباد میں اگر وزیر سرسالار جنگ نہ ہوتے تو انگریزوں کا خاتمہ یقینی تھا۔انہوں نے مصلحت انگیزی سے کام لے کر انگریزوں کو حیدرآباد میں محفوظ رکھا۔اس وفاداری کے عوض اُنھیں انعام واکرام سے نوازا اور 'سر' کا خطاب بھی عطا کیا۔

دہلی کے بادشاہوں کی تذلیل: 1803ء میں مراٹھوں کی شکست کے بعد ایک طرف تو مراٹھوں کی دیگر ریاستیں امدادی صلح کی پابند ہو چکی تھیں۔دوسری طرف ویلزلی نے دہلی کے مغل بادشاہ کے ساتھ سمجھوتہ کیا تھا۔1764ء میں بکسر کی جنگ میں میر قاسم اودھ اور دہلی کے حکمرانوں کی شکست کے بعد سندھیا مغل حکومت کا محافظ تقرر ہوا تھا۔1805ء میں شاہ عالم دوم سے معاہدے کے بعد انگریز دہلی کی حکومت کے محافظ بن گئے تھے۔امدادی صلح کے تحت ہندوستان کی تقریباً تمام ریاستیں لارڈ ہسٹینگز کے زمانے میں 1818ء تک کمپنی کی ماتحت ہو چکی تھیں۔اسی کے ساتھ کمپنی کے حاکموں نے ریاستوں کے اندرونی معاملات میں من مانی دخل اندازی شروع کر دی تھی۔نتیجے کے طور پر شاہ عالم دوم کی حکومت دلی کی حدود تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ مثل مشہور تھی کہ ''حکومتِ شاہ عالم دِلّی تا پالم''، شاہ عالم کے جانشین اکبر ثانی نے جب لارڈ ہسٹینگز سے معاہدے کے تحت خراج میں اضافہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تو گورنر جنرل نے بادشاہ کے سامنے کئی نامناسب شرطیں رکھیں ۔اول، بادشاہ کو اپنے تمام خطابات کو خیر باد کرنا ہوگا۔دوم، نذر پیش کرنے کی رسم ختم کرنی ہوگی۔ سوم، گورنر جنرل کو دربار میں بادشاہ کے برابر مرتبہ دینا ہوگا، جس کے تحت بادشاہ اور گورنر دربار میں ایک ساتھ داخل ہوا کریں گے۔اکبر ثانی کے ان شرطوں کو منظور کرنے سے انکار کرنے پر گورنر جنرل نے خراج میں اضافے کے معاملے کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا تھا۔ ہسٹینگز کے بعد آخر کار ایمرہسٹ کے زمانے میں اکبر ثانی کو تمام شرطوں کو ماننا پڑا۔اکبر ثانی نے جب مرزا جہانگیر کو اپنا وارث بنانے کی تجویز رکھی تو گورنر جنرل نے نامنظور کر دی۔اسی زمانے میں انگریزوں نے خراج کو پنشن کی اصطلاح دے دی تھی، اس طرح دہلی کی ماتحتی کے ظاہری گمان کو بھی ختم کر دیا تھا۔انتہا تو اس وقت ہوئی جب ڈلہوزی نے بہادر شاہ کی دہلی کی حکومت کو سرے سے قلع قمع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔اُس نے پہلے مرزا فخر الدین کے سامنے تجویز رکھی کہ اگر وہ لال قلعہ چھوڑ کر مہرولی میں رہائش پذیر ہونے کے لیے تیّار ہو جائیں تو اُن کو جانشیں تسلیم کیا جا سکتا ہے۔دراصل انگریز لال قلعہ کو اسلحہ خانہ بنانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔فخر الدین کے انتقال کے بعد مرزا قویش کے سامنے بھی یہی شرطیں رکھی تھیں۔بہادر شاہ نے انھیں حالات کے پیش نظر پیشین گوئی کر دی تھی کہ اس کے بعد نہ تو بادشاہ رہے گا اور نہ ہی بادشاہت۔ چنانچہ اُن کی پیشین گوئی لفظ بہ لفظ سچ ثابت ہوئی۔ 1857ء کی بغاوت کے بعد انگریزوں نے مغلیہ سلطنت کا نام ونشان ہی مٹا دیا۔

واجد علی شاہ کی معزولی: اودھ کے نواب شجاع الدولہ 1764ء میں بکسر کی جنگ میں میر قاسم کی شکست کے بعد ہی سے انگریزوں کی ماتحتی

قبول کر چکے تھے۔ ویلزلی نے معاہدے میں مزید شرطوں کا اضافہ کر کے سعادت علی خان کو 1797ء میں نواب بنا دیا تھا۔اس طرح اودھ کے اندرونی معاملات میں انگریزوں کا مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ سعادت علی خاں کے انتقال کے بعد انگریزوں نے غازی الدین حیدر کو نواب بنا دیا تھا۔ غازی الدین حیدر بہت مالدار اور فیاّض تھے۔انگریز اُن سے وقتاً فوقتاً بے تحاشا دولت بطور قرض لیتے رہے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ولیم بینٹنگ نے ریاستوں میں سیاسی مداخلت سے گریز کیا تھا۔ محمد علی شاہ اور ان کے وزیر مہدی علی خاں گوناگوں انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔انہوں نے اودھ ریاست کے نظم ونسق کو چار چاند لگا دیے تھے۔اس لیے انگریزوں کو مذکورہ بالا نوابوں کے دور میں دخل اندازی کا کوئی بہانہ نہ مل سکا۔ محمد علی شاہ کے جانشیں امجد علی شاہ نااہل ثابت ہوئے اور ریاست بدحالی کا شکار ہو گئی۔اس طرح انگریزوں کو ایک بار پھر دخل اندازی کا موقعہ مل گیا۔امجد علی شاہ کے بعد جب واجد علی شاہ اودھ کے حکمراں بنے تو مذکورہ بالا وجوہات سے ریاست کے حالات ناگفتہ بہ ہو چکے تھے۔اب ایسا زمانہ آگیا تھا کہ انگریزوں کی دخل اندازی کے سامنے اصل حکمراں بے دست و پا ہو چکے تھے۔یہی وجہ تھی کہ واجد علی شاہ نے حکمرانی سے غیر دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور وہ موسیقی اور رقص ورنگ کی محفلوں میں مست رہنے لگے تھے۔ڈلہوزی نے توسیعِ سلطنت کے لیے نئے بہانے تراشے تھے۔ان میں ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ ماتحت ریاستوں کی بدحالی کو درست کرنا برطانوی حکومت کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ اس اصول کے تحت 1856ء میں واجد علی شاہ کو اودھ کے تخت سے معزول کر دیا۔اُنھیں پینشن دے کر کلکتہ مٹیا برج کے علاقے میں رہائش پذیر ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ڈلہوزی کے اس قدم سے برطانوی حکومت کو بیش بہا دولت کا فائدہ پہنچا۔ڈلہوزی ملکہ وکٹوریہ کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''آپ کے خادم نے اودھ کا الحاق کر کے برطانوی حکومت کو کروڑوں روپیوں سے مالا مال کر دیا ہے۔''

اصولِ الحاق: مزید توسیعِ سلطنت کے لیے ڈلہوزی نے ایک اور نیا بہانہ تراشا تھا اور وہ یہ کہ وہ تمام ریاستی حکمراں جن کے اولاد نہیں ہے اور متبنّیٰ بیٹا ہے اسے جانشین نہیں مانا جائے گا۔اس اصول کے تحت آٹھ ریاستوں کا اپنی حکومت میں الحاق کر لیا۔اِن ریاستوں میں 1848ء میں ستارا، 1849ء میں جیت پور اور سنبھل پور، 1850ء میں باغت، 1852ء میں اُدے پور، 1853ء میں جھانسی، 1854ء میں ناگپور کا برطانوی حکومت میں الحاق کر لیا۔اسی اصول کے تحت 1853ء میں پیشوا باجی راؤ دوم کے انتقال کے بعد اُن کے متبنّیٰ بیٹے نانا صاحب کی اسّی ہزار پاؤنڈ سالانہ پینشن بند کر دی گئی اور انھیں کانپور کے قریب بیتھور میں رہائش پذیر ہونا پڑا۔

22.3.2 سماجی ومذہبی اسباب (Social and Religious Causes)

1813ء کے ایکٹ میں برطانوی حکومت نے مذہبی اور سماجی معاملات میں غیر جانبداری کی پالیسی اپنانے کا وعدہ کیا تھا، لیکن دوسری جانب عیسائی مذہب کی نجی مشنریوں کو ہندوستان میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کی اجازت بھی دے دی گئی تھی۔ایک قانون کے تحت عیسائی مذہب قبول کرنے والے کو اپنے والدین کی جائیداد میں وراثتی حق برقرار رکھا، بقول سر سید 1857ء کے زمانے میں یورپ سے کئی پادری ہندوستان آئے تھے اور وہ ہندوستان کے مذہبی پیشواؤں سے مجادلے میں مصروفِ کار تھے۔ مسلم دانشوران اور ہندو بھائی بھی برطانوی حکومت کی مذہبی معاملات میں دخل اندازی کے سخت خلاف تھے۔ 1857ء سے قبل سید احمد بریلوی کی تحریک پروان چڑھ رہی تھی جو برطانوی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف تھی۔1831ء میں بالاکوٹ کی جنگ میں سید احمد کی شہادت کے بعد اس تحریک کی باگ ڈور صادق

پور کے دانشوران مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی نے سنبھالی تھی۔ مولانا عنایت علی نے تو ہندوستانی فوجیوں سے خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا۔ بقول پروفیسر محمد مجیب سید احمد شہید کی تحریک نے پورے ہندوستان میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی تھی، اسی تحریک سے محرّک دانشوران نے 1857ء کی بغاوت میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ بالخصوص مولانا قاسم نانوتوی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بذاتِ خود بغاوت میں حصہ لیا تھا، حتیٰ کہ شاملی اور تھانہ بھون میں انگریزوں کو نکال کر اپنی حکومت بھی قائم کر لی تھی۔ ہندو مذہب کے اونچی ذات کے لوگ بھی برطانوی حکومت کی مذہبی مداخلت کی پالیسی سے ناخوش تھے۔ بالخصوص لارڈ ولیم بینٹنگ نے ہندو مذہب کی فرسودہ رسم ورواج پر زبردست وار کیا تھا۔ 1829ء میں ستی کی رسم کو قانون نافذ کرکے جرم قرار دے دیا تھا۔ بعد ازاں قانون پاس کرکے بیواؤں کی دوبارہ شادی کرنا جائز قرار دے دیا، لڑکیوں اور بچّوں کی قربانی کا انسداد کیا۔ انگریزی تعلیم کا جب فروغ شروع کیا تو انگریزی زبان کو فارسی کی جگہ سرکاری زبان بنا دیا گیا تھا۔ درحالانکہ ان میں کچھ اصلاحیں یقیناً سماجی بہتری کی ضامن ثابت ہوئیں، لیکن اُس وقت ہندوستانیوں کو ان کے مذہبی اور سماجی معاملات میں دخل اندازی قطعاً پسند نہیں تھی، انھیں وجوہات کی بنا پر ہندوستان کے مذہبی طبقے بھی پُرجوش طریقے سے بغاوت میں شریک ہو گئے تھے۔

22.3.3 معاشی اسباب (Economic Causes)

مالگزاری بندوبست اور ناجائز انتفاع: مالگزاری بندوبست میں بے جا تبدیلیاں کرکے کسان، زمین دار اور تعلق دار سبھی طبقوں کو ناراض کر دیا تھا۔ بنگال میں فتح کے بعد لارڈ کارنوالس نے سب سے پہلے استمراری بندوبست نافذ کیا۔ اس کے تحت کسانوں کی بجائے زمین داروں سے لگان کا معاہدہ کیا۔ اس طرح کسانوں کی حق تلفی ہوئی۔ تھامس منرو نے استمراری بندوبست کی جگہ رعیّت داری بندوبست اپنایا، جس کے تحت کسانوں کو زمین کا مالک مان کر ان سے براہِ راست لگان وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ بظاہر یہ طریقہ بہتر تھا، مگر انگریز افسر لگان وصول کرنے میں بہت سختی سے پیش آتے تھے اور لگان ادا نہ کرنے کی صورت میں کسانوں کی زمینیں چھین لی جاتی تھیں۔ ولیم بینٹنگ نے لینڈ ریزمپشن ایکٹ پاس کر کے انعامی جاگیریں ضبط کر لی تھیں۔ یہ جاگیریں دانشوران، فن کار، شاعر اور ادیبوں کو ان کی مخصوص خدمات کے عوض دی جاتی تھیں۔ اس طرح زمین اور زراعت سے جُڑے تمام طبقوں کو کسی نہ کسی طرح تباہ و برباد کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اِن طبقوں کے لوگ بھی بغاوت میں شامل ہو گئے تھے۔

آزادانہ تجارت اور دولت کا بہاؤ: ابتداء میں اِیسٹ انڈیا کمپنی کو تجارت میں اجارہ داری حاصل تھی۔ ہندوستان کی گھریلو صنعتوں میں تیار شدہ نایاب اشیاء انگلینڈ برآمد کی جاتی تھیں۔ اِن اشیاء میں ڈھاکے کی ململ، ریشم، ہیرے جواہرات وغیرہ شامل تھے۔ اس سے ہندوستان کو بھی فائدہ ہوتا تھا۔ 18ء ویں صدی کے آخر میں اور 19ء ویں صدی میں انگلینڈ میں صنعتی انقلاب کے ساتھ بہترین اور پائیدار کپڑے اور دیگر اشیاء بننے لگیں۔ لہٰذا 1813ء کے ایکٹ کے ذریعہ کمپنی کی اجارہ داری ختم کر دی گئی اور انگلینڈ کی دیگر نجی کمپنیوں کو آزادانہ تجارت کی اجازت مل گئی۔ اس طرح ہندوستان انگریز تاجروں کے لیے ایک وسیع مارکیٹ بن گیا، جہاں سے سستا کچّا مال برآمد کیا جاتا تھا اور انگلینڈ کی اشیاء کو زیادہ سے زیادہ منافعہ لے کر بیچا جاتا تھا۔ اس طرح ہندوستان کی دولت کا بہاؤ انگلینڈ کی جانب ہو گیا تھا۔ مگر ہندوستان کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ آزادانہ تجارت

کو انگلینڈ کے چند معاشیات کے ماہرین نے مزید بڑھاوا دیا۔ ایڈم امتھ کی کتاب 'ویلتھ آف نیشنس' نے آزادانہ تجارت کی وکالت کی تھی۔ بعد ازاں جیرمی بینتھم نے ایڈم اسمتھ سے اتفاق کرتے ہوئے اس نظریے کو مزید دلیلوں کے ساتھ جائز قرار دیا۔ بینتھم کے مطابق آزادانہ تجارت سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدے اٹھائیں گے اور زیادہ سے زیادہ خوشحالی آئے گی۔ ظاہر ہے کہ اِن تمام اقدامات سے انگلینڈ تو مالا مال ہو گیا، مگر ہندوستان اقتصادی اعتبار سے مسلسل بدحالی کا شکار ہوا۔ اس طرح برطانوی حکومت کی معاشی پالیسیوں نے ہندوستانیوں کی اقتصادی اعتبار سے کمر توڑ کر رکھ دی تھی، جس کی وجہ سے زراعت اور تجارت سے جُڑے طبقے بغاوت میں شامل ہو گئے تھے۔

22.3.4 فوجی اسباب (Military Causes)

تنخواہ اور ترقی کے مسئلے: کافی عرصے سے ہندوستانی فوجیوں کو برطانوی حکومت سے شکایتیں تھیں۔ اول ان کی یورپی سپاہیوں کے مقابلے میں تنخواہیں بہت قلیل تھیں۔ ایک ہندوستانی پیدل سپاہی کو صرف سات روپے ماہانہ اور گھوڑ سوار کو صرف 27، روپے ماہانہ ملتے تھے، جس میں گھوڑوں کو پالنے اور دیکھ ریکھ کرنے کا خرچہ بھی شامل ہوتا تھا۔ اس کے برعکس یورپی سپاہیوں کی تنخواہیں تین گنی ہوتی تھیں۔ علاوہ ازیں بیرونی جنگوں میں بھتّہ ملتا تھا وہ بھی برما اور افغانستان کی جنگوں کے بعد منقطع کر دیا گیا تھا۔ ایک ہندوستانی سپاہی کو اونچے عہدے پر ترقی کے لیے بیس سال انتظار کرنا پڑتا تھا اور وہ بھی صوبیدار کی آسامی سے اوپر ترقی نہیں کر پاتا تھا۔ اونچے عہدوں پر صرف یورپی کو فائز کیا جاتا تھا، یہ چلن کارنوالس نے شروع کیا تھا اور یہ برابر جاری رہا۔ اُس کو ہندوستانیوں پر بھروسہ نہیں تھا۔ مزید برآں یورپی افسر نسلی امتیاز کی بنا پر ہندوستانیوں کے ساتھ نفرت آمیز رویّہ اختیار کرتے تھے، بنگال رجمنٹ میں زیادہ تر سپاہی اونچی ذات کے ہوتے تھے۔ ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد تین لاکھ کے قریب تھی، جب کہ یورپی صرف چالیس ہزار تھے۔ حقیقت میں برطانوی فتوحات کا افتخار ہندوستانی سپاہیوں کو حاصل تھا، بقول کرسٹوفر 'بیشک ہندوستانی فوجی جسمانی اعتبار سے یورپی کے مقابلے میں کیم و شیم اور بہادر ہوتے تھے' اس کے باوجود ان کے ساتھ ہر معاملے میں امتیاز برتا جاتا تھا۔

ہندوستانی فوجیوں پر پابندیاں: علاوہ ازیں ہندوستانی فوجیوں پر انگریز افسروں نے جو پابندیاں عائد کی تھیں، ان سے ان کے مذہبی جذبات کو بہت ٹھیس پہنچتی تھی۔ 1857ء سے پیشتر یورپی افسروں نے حکم جاری کیا کہ کسی سپاہی کو ٹیکا لگانے، بالی پہننے اور داڑھی رکھنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ حد تو اس وقت ہوئی جب کہ ولیم بینٹنگ کے زمانے میں کچھ یورپی افسروں نے ہندوستانی سپاہیوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنا شروع کی۔ ظاہر ہے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔

22.3.5 فوری سبب (The Immediate Cause)

چربی کے کارتوسوں کے استعمال کا مسئلہ: 1857ء کے دوران برطانوی حکومت نے پُرانی توپوں کی جگہ اِنفیلڈ رائفل کا استعمال رائج کیا تھا۔ یہ رائفل 1854ء میں کریمیا کی جنگ میں بہت موئثر ثابت ہوئے تھے۔ اس کے استعمال میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا مگر اِن میں جو کارتوس استعمال کیے جاتے تھے، اُن کو بنانے میں سؤر اور گائے کی چربی استعمال کی جاتی تھی۔ اِن کارتوسوں کو دانت سے کاٹ کر استعمال کیا جاتا

تھا۔ ظاہر ہے اس میں ہندو اور مسلمان سپاہیوں کو سخت اعتراض ہوا اور انھیں وجوہات کے باوصف رانی گنج، بارک پور اور بہرام پور کی چھاؤنیوں میں بغاوت ہو چکی تھی۔ 29، مارچ 1857ء کو 34، انفنٹری کے ایک سپاہی منگل پانڈے نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یورپی افسروں پر حملہ کیا اور قتل کر دیا۔ اس بغاوت کے جُرم میں اس کو گرفتار کیا اور پھانسی پر چڑھا دیا تھا۔ 9، مئی کو عبداللہ نام کے ایک سپاہی نے اپنے فوجی بھائیوں سے خطاب کرتے ہوئے سوال کیا کہ کیا وہ چربی کے کارتوس کا استعمال کرنا برداشت کر سکیں گے؟ اس پر تمام ہندوستانی سپاہی مشتعل ہو گئے تھے۔ منگل پانڈے کو پھانسی کے صدمے اور مذکورہ بالا شکایات کے باوصف ہندوستانی سپاہیوں نے میرٹھ چھاؤنی میں بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ تقریباً اسّی سپاہیوں کو قید بند کر دیا گیا۔ 10، مئی کو بالآخر ہندوستانی سپاہیوں نے یورپی افسروں کا قتل کیا، اپنے بھائیوں کو قید سے آزاد کرایا اور 11، مئی کو میرٹھ سے روانہ ہو کر تمام انقلابی دہلی پہنچ گئے اور مغل بادشاہ سے قیادت سنبھالنے کی گزارش کی۔ انہوں نے پہلے توریزیڈنٹ سے گفتگو کر کے سپاہیوں کی شکایات رفع کرانے کی کوشش کی، جیسے ہی ریزیڈنٹ دربار میں داخل ہوا، انقلابیوں نے اس پر گولی چلادی۔ اتفاق سے وہ بچ کر بھاگ گیا۔ اس کے بعد بادشاہ کو بغاوت کی کمان سنبھالنی پڑ گئی اور اسی کے ساتھ پورے ہندوستان میں بغاوت کی آگ شعلوں کی مانند بھڑک گئی۔ چربی کے کارتوس کا کمال بہادر شاہ اپنے حسب ذیل شعر میں بیان کرتے ہیں:

نہ ایران نے کیا نہ شاہ روس نے۔
انگریز کو تباہ کیا کارتوس نے۔

22.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

1757 کے بعد سے انگریزوں نے ہندوستان کے تمام شعبوں سیاسی، معاشی، سماجی، ثقافتی، انتظامی وغیرہ میں براہ راست مداخلت کی پالیسی اپنائی اور اس کے نتیجے میں ہندوستانیوں میں بتدریج عدم اطمینان بڑھتا گیا۔ یہ تقریباً 100 سال بعد 1857 کی بغاوت پر منتج ہوا۔ 1857 کی بغاوت کی نوعیت کے حوالے سے مختلف آراء رائج ہیں۔ اس بغاوت کی نوعیت کے تعین کے حوالے سے مختلف دانشوروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کچھ مورخین اسے فوجی بغاوت قرار دیتے ہیں تو کچھ اسے عام لوگوں کی بغاوت قرار دیتے ہیں۔ سر جان سیلے نے کہا تھا کہ '1857 کی بغاوت محض ایک فوجی بغاوت تھی۔' لیکن سیلے کا قول قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم گہرائی سے جائزہ لیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس بغاوت میں صرف فوجی ہی شامل نہیں تھے بلکہ ملک کا مزدور طبقہ، کسان طبقہ، عام لوگ وغیرہ اس بغاوت سے وابستہ تھے۔ ایسے میں اس بغاوت کو محض فوجی بغاوت کہنا منطقی نہیں لگتا۔ کچھ مورخین اسے ہندوستان کی پہلی قومی جدوجہد بھی کہتے ہیں لیکن ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس بغاوت کے تمام رہنما بلاشبہ انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے لیکن ان میں قوم پرستانہ شعور کی کمی تھی۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی منصوبہ نہیں تھا کہ بغاوت میں کامیابی کے بعد ہندوستان کو بحیثیت قوم کس قسم کی سیاسی حیثیت دی جائے گی۔ اس نقطہ نظر سے اس بغاوت کو قومی بغاوت کہنا مناسب نہیں لگتا۔ 1857 کی اس بغاوت میں ملک کے مختلف طبقوں کے لوگوں نے اپنی شرکت درج کرائی تھی۔ جن لوگوں نے اس میں حصہ لیا ان میں ہندو، مسلمان، کسان، مزدور، عورتیں، بوڑھے، نوجوان وغیرہ شامل تھے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بغاوت سماج کی مختلف شکلوں پر مشتمل تھی اور چونکہ یہ بغاوت انگریزوں کی سامراجی پالیسی کے خلاف تھی، اس لیے اس

بغاوت کی نوعیت کو سامراج مخالف قرار دیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک بغاوت کے اسباب کی بات ہے تو اس کے متعدد اسباب تھے۔ ماتحت امدادی معاہدے کے ذریعے ہندوستانی ریاستوں پر کنٹرول اور جبری الحاق پالیسی کے ذریعے ہندوستانی ریاستوں کو ہڑپ کرنا اہم سیاسی وجوہات تھیں۔ ڈاکٹرن آف لیپس پالیسی کے تحت ڈلہوزی نے ستارہ، جیت پور، سنبھل پور، باگھاٹ، ادے پور، جھانسی اور ناگپور حاصل کر لیے تھے۔ اس انتظام کے تحت لارڈ ڈلہوزی نے جھانسی کی ریاست کو بھی ہتھیا لیا تھا۔ انتظامیہ میں اعلیٰ عہدوں سے ہندوستانیوں کی محرومی، ہندوستانیوں کے ساتھ مسلسل غیر مساوی سلوک وغیرہ 1857 کی بغاوت کی اہم انتظامی وجوہات تھیں۔ زمینی مالگزاری کی تین پالیسیوں دوامی، رعیت واری اور محل واری بندوبستوں، برآمد محصول میں اضافہ، درآمد ٹیکس میں کمی، دستکارانہ صنعتوں کا زوال، دولت کی نکاسی وغیرہ اقتصادی عوامل نے 1857 کے بغاوت کے ابھرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ عیسائی مشنریوں کا ہندوستان میں داخلہ، ستی کی رسم کا خاتمہ، بیوہ کی دوبارہ شادی کو قانونی طور پر تسلیم کرنا، ہندوستانی فوجیوں کو سمندری سفر پر مجبور کرنا 1857 کی بغاوت کی اہم سماجی اور مذہبی وجوہات تھیں۔ ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ غیر مساوی سلوک، اعلیٰ عہدوں پر تقرری سے انکار، یورپی فوجیوں کے مقابلے میں کم تنخواہ، پوسٹ آفس ایکٹ پاس کرکے مفت پوسٹل سروس کا خاتمہ، وغیرہ 1857 کی بغاوت کی بڑی فوجی وجوہات تھیں۔ لیکن اس کا فوری سبب چربی والے کارتوسوں کا استعمال تھا جس نے دبے ہوئے لاوے کو ایک دم سے پھٹ پڑنے پر مجبور کردیا۔

22.13 کلیدی الفاظ (Keywords)

گریسڈ کارتوس : نئے انفیلڈ کارتوس جنہیں چلانے سے پہلے دانت سے کاٹنا پڑتا تھا اور عام افواہ تھی کی اس میں گائے اور سور کی چربی کا استعمال کیا گیا تھا۔

اصولِ الحاق : مزید توسیعِ سلطنت کے لیے ڈلہوزی نے ایک نیا بہانہ تراشا تھا اور وہ یہ کہ وہ تمام ریاستی حکمراں جن کے اولاد نہیں ہے ان کا متبنی نہیں مانا جائے گا اور اس ریاست کو برطانوی سلطنت میں شامل کرلیا جائے گا۔

22.14 مونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

22.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. میرٹھ چھاؤنی کے ہندوستانی فوجیوں نے یورپی افسروں کو کب قتل کیا؟
2. دہلی میں باغیوں نے کس سے قیادت کرنے کی گزارش کی؟
3. جان کے اور جی۔ آر میلیسن نے اس بغاوت کو کس طبقے کی سازش بتایا؟
4. 1857ء کی بغاوت کو 'قومی پیمانے پر ایک عظیم اور بے ساختہ مزاحمت' سے کس نے تعبیر کیا؟
5. انگریزوں نے پہلا امدادی معاہدہ کس نے کیا؟

6. فارسی زبان کی جگہ کسے سرکاری زبان بنایا گیا؟

7. کس نے استمراری بندوبست کی جگہ رعیّت داری بندوبست لاگو کیا؟

8. برطانوی حکومت نے پُرانی توپوں کی جگہ کس رائفل کا استعمال رائج کیا؟

9. انقلابی کب دہلی پہنچے؟

10. مندرجہ ذیل شعر کس نے کہا؟

نہ ایران نے کیا نہ شاہ روس نے۔ انگریز کو تباہ کیا کارتوس نے۔

22.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے سماجی و مذہبی اسباب بیان کیجیے۔
2. 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے معاشی اسباب بیان کیجیے۔
3. 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے فوجی اسباب بیان کیجیے۔
4. کارتوس کے مسئلے پر ایک نوٹ لکھیے۔

22.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. 1857ء کی بغاوت کی نوعیت پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے سیاسی اسباب تفصیلی طور پر بیان کیجیے۔
3. 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے معاشی، فوجی اور فوری اسباب کی تفصیلی وضاحت کیجیے۔

22.15 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ashraf, Mujeeb, *Muslim Attitudes towards British Rule and Western Culture in India in the first half of the Nineteenth Century*, Idarah-i-Adabiyat- Delhi, Delhi, 1982.
2. Ashraf, Mujeeb, *Some Aspects of British Colonial Rule in India*, New Delhi, 2002)
3. Bhattacharya, Sabyasachi ed., *Rethinking 1857*, Orient Longman, New Delhi, 2007.
4. Chaudhari, S.B., *Civil Rebellion in the Indian Mutinies, 1857–1859*, The World Press Pvt., Ltd., Calcutta, 1957.
5. Divekar, V.D., *South India in 1857 War of Independence*, Lokmanya Tilak Smarak Trust, Pune, 1993.
6. EPW, *1857*: *Essays from Economic and Political Weekly*, Orient Longman in

association with Sameeksha Trust, New Delhi, 2008.
7. Joshi, P.C. ed., *Rebellion 1857*, National Book Trust India, New Delhi, 2007.
8. Khan, Sir Syed Ahmad, *Causes of Indian Rebellion 1857*, Asha Jyoti Book Sellers & Publishers, Delhi, 2007.
9. Khan, Sir Saiyyad Ahmad, *Asbab-i-Baghawat-e-Hind*, Delhi, 1971.
10. Malleson, G.B., *The Indian Mutiny of 1857*, Rupa, New Delhi, 2005.
11. Marx and Engels, *The First Indian War of Independence*, *1857–1859*, Progress Publishers, Moscow, 1988 (first printing 1959).
12. Mishra, Amaresh, *Mangal Pandey*: *The True Story of an Indian Revolutionary*, Rupa, New Delhi, 2005.
13. Mukherjee, Rudrangshu, *Mangal Pandey*: *Brave Martyr or Accidental Hero?* Penguin, New Delhi, 2005.
14. Savarkar, V.D., *The Indian war of Independence*, Bombay, 1947.
15. Sen, Surendra Nath, *Eighteen Fifty-Seven*, The Publications Division, Government of India, Delhi, 1957.
16. Taylor. P.J.O., *What Really Happened during the Mutiny*: *A Day-by-Day Account of the Major Events of 1857–1859 in India*, Oxford University Press, New Delhi, 1999.
17. Taylor. P.J.O., *A Star Shall Fall*: *India in 1857*, Indus, New Delhi, 1993.

اکائی 23۔ 1857 کی بغاوت کی توسیع، قیادت اور ناکامی

(Spread, Leadership, and Failure of the 'Revolt' of 1857)

اکائی کے اجزا

23.0 تمہید

23.1 مقاصد

23.2 بغاوت کی پہلی لڑائی شمالی ہند میں

23.2.1 دہلی میں بغاوت

23.2.2 لکھنؤ میں بغاوت

23.2.3 کانپور میں بغاوت

23.2.4 شاہجہان پور میں بغاوت

23.3 آگرہ اور روہیل کھنڈ میں شورش

23.4 مرکزی ہندوستان میں بغاوت

23.5 راجستھان میں بغاوت

23.6 گجرات میں بغاوت

23.7 دکن میں مزاحمتی سرگرمیاں

23.8 ناکامی کے اسباب ووجوہات

23.9 بغاوت کی اہمیت

23.10 اکتسابی نتائج

23.11 کلیدی الفاظ

23.12 نمونہ امتحانی سوالات

23.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

23.0 تمہید (Introduction)

پچھلی اکائی میں آپ میں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی نوعیت اور اسباب کے بارے میں جانا۔اس اکائی میں ہم اس بغاوت، غدر یا پھر پہلی جنگ آزادی کے مزید پھیلنے،اس کی قیادت اور ناکامی کے بارے میں پڑھیں گے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کی میرٹھ کے باغی سپاہیوں نے دہلی پہنچ کر آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو بغاوت کی قیادت کرنے کے لیے راضی کر لیا اور ان کو باقاعدہ تخت نشین کرا کر ان کے نام سے خطبے اور سکے جاری کیے۔دہلی اور دیگر شہروں کے علماء نے بھی بغاوت کے حق میں فتویٰ دیا۔باغیوں نے روہیلا افغان جنرل بخت خان کو اپنا رہنما منتخب کیا۔دیکھتے ہی دیکھتے شمالی ہند کے متعدد حکمراں گھرانے،عوام اور زمیندار برطانوی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔مولوی عظیم اللہ، مولوی احمد اللہ، بیگم حضرت محل،رانی لکشمی بائی،تانتیا ٹوپے،نانا صاحب،جنرل بخت خان اور دوسرے لوگوں نے اپنی اپنی جگہ بغاوت کی قیادت کی۔حالانکہ شمالی ہند میں برطانوی اقتدار کچھ عرصے کے لیے ڈگمگا گیا،لیکن بنگال اور سکھ رجیمنٹ کی طرف سے مدد ملنے اور مراٹھوں اور نظام کے غیر جانبدار رہنے سے انہیں سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ایک سال کے عرصے میں بغاوت نہایت بے رحمی سے کچل دی گئی اور جگہ جگہ لاشوں کے ڈھیر لگادیے گئے۔بغاوت کی ناکامی کا اہم سبب یہ تھا کہ باغی رہنماؤں میں باہمی اتحاد اور اتفاق کی کمی رہی اور وہ ایک مشترکہ محاذ نہ بنا سکے۔ساتھ ہی بغاوت میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے جن کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے اور وہ ایک دوسرے کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے تھے،اس کے بھی بغاوت پر منفی نتائج مرتب ہوئے۔ساتھ ہی برطانوی فوجوں کو نظم وضبط اور ان کا بہتر توپخانہ اور ہتھیار بھی ان کی فتح کا باعث ثابت ہوئے۔اس طرح ایک عظیم بغاوت جتنی تیزی سے ابھری اور پھیلی،اتنی ہی تیزی سے سمٹ کر ختم ہوگئی،جس کے بارے میں تفصیل سے آپ اس اکائی میں پڑھیں گے۔

23.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- 1857ء کی ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مزاحمت کے اہم مراکز کے بارے میں بتا سکیں گے۔
- مزاحمت کے کچھ عام مراکز کی نشاندہی کر سکیں گے۔
- آزادی کی ناکامی کے اسباب کا جائزہ لے سکیں گے۔

23.2 بغاوت کی پہلی لڑائی شمالی ہند میں (The First Battle of the Revolt in North India)

23.2.1 دہلی میں مزاحمت (Revolt in Delhi)

میرٹھ میں ہندوستانی فوجیوں نے 10 مئی 1857ء کو بغاوت کا علم بلند کیا،یورپی افسروں کا قتل کیا،اپنے بھائیوں کو قید سے آزاد کرایا اور 11 مئی کو دہلی پہنچے اور بہادر شاہ ظفر سے بغاوت کی قیادت کرنے کی گزارش کی۔بادشاہ نے انہیں سمجھایا اور برٹش ریزیڈنٹ سے ان کی

شکایات کو دُور کرانے کی پیش رفت کی، لیکن انقلابیوں نے ریزیڈنٹ پر گولی چلادی، وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر فرار ہو گیا۔ بالآخر بادشاہ کو انقلابیوں کے ساتھ بغاوت میں شریک ہونا پڑا۔ بادشاہ کے بغاوت میں شامل ہوتے ہی پورے ہندوستان میں بغاوت کے شعلے بھڑک گئے۔ بادشاہ نے ایک فرمان جاری کیا، جس میں بغاوت کی وجوہات کی وضاحت کی، ہندو اور مسلمانوں کو متحد ہو کر برطانوی حکومت کو ہندوستان کی زمین سے اکھاڑ پھینکنے کی اپیل کی۔

اسی دوران جنرل بخت خاں جو بریلی میں انگریزی فوج میں صوبیدار کی حیثیت سے متمکن تھے۔ اپنی فوج کے ساتھ دہلی پہنچ گئے۔ دہلی میں انقلابیوں کی ایک مضبوط قیادت کی کمی کو انہوں نے پورا کیا۔ وہ مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ افغانستان کی جنگ میں بر سرِ پیکار رہ چکے تھے۔ بخت خاں نے پہلے بادشاہ سے ملاقات کی اور گزارش کی کہ وہ انہیں مغلیہ فوج کا کمانڈر مقرر کر دیں اور انہیں جنرل کا خطاب عطا کیا جائے۔ بہادر شاہ نے حالات کے پیشِ نظر جنرل بخت خاں کی تمام شرطیں منظور کر کے بغاوت کی قیادت کرنے کے احکام جاری کر دیے۔ انقلابیوں نے بڑی خوش دلی سے جنرل بخت خاں کا خیر مقدم کیا۔ جنرل بخت خاں نے علماء حضرات بالخصوص فضلِ حق خیر آبادی سے جو اس وقت دہلی میں مقیم تھے، برطانوی حکومت کے خلاف فتویٰ جاری کرایا۔ اس طرح بغاوت کے لیے مذہبی جواز بھی حاصل کر لیا۔ بخت خاں نے دوسرا خاص قدم یہ اُٹھایا کہ ہندو بھائیوں کے مذہبی جذبات کا خیال رکھتے ہوئے دہلی میں گؤکشی پر پابندی لگادی۔ جنرل بخت خاں کی قیادت میں انقلابیوں نے اول انگریزوں کو دہلی سے نکالا اور انگریزی فوج کا تمام حملوں میں بڑی مستعدی سے مقابلہ کرتے رہے اور انہیں دہلی کے اندر داخل نہیں ہونے دیا۔ جب برطانوی فوج دہلی کے کشمیری گیٹ کی جانب سے 19 ستمبر 1857ء کو داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی تو برطانوی فوج کے ساتھ انقلابیوں نے زبردست مقابلہ کیا۔ انگریزوں کی فوج بے حد طاقتور تھی، اس لیے انقلابیوں کی شکست ہوئی۔ بہادر شاہ کو ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لینی پڑی۔ جنرل بخت خاں بدایوں اور روہیل کھنڈ ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچ گئے، چلتے وقت انہوں نے بادشاہ سے بہت اصرار کیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلیں، مگر بادشاہ نے دہلی ہی میں رہنا پسند کیا۔ بخت خاں نے لکھنؤ اور شاہ جہاں پور میں انقلابیوں کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کیا، جب انقلابیوں کو ان مراکز میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا تو وہ نیپال میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ دہلی میں داخل ہوتے ہی ہڈسن نے شہزادوں کا بے رحمانہ قتل کر کے ان کی لاشوں کو کوتوالی کے مرکزی گیٹ پر لٹکوادیا تھا جو خونی دروازے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 27 جنوری 1858ء کو میجر ولیم ہڈسن نے بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کیا، دو ماہ تک اُن پر مقدمہ چلتا رہا۔ بعدازاں بادشاہ کو عمر قید کی سزا دی گئی اور برما میں رنگون شہر میں بھیج دیا گیا۔ 7 نومبر 1861ء میں ان کا انتقال ہو گیا، وہیں ان کا مقبرہ ہے۔ بہادر شاہ ظفر کو اپنے وطن ہندوستان کو چھوڑنے کا بہت غم تھا۔ وطن کی محبت میں انہوں نے حسب ذیل شعر کہا تھا:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے   دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

23.2.2 لکھنؤ میں بغاوت (Revolt in Lucknow)

بغاوت کا دوسرا بڑا مرکز لکھنؤ تھا۔ اودھ کا صوبہ چونکہ سیاسی اعتبار سے مرکزی اہمیت کا حامل تھا۔ اس لیے یہاں جو بغاوت ہوئی وہ بڑی فیصلہ کن تھی۔ واجد علی شاہ کی 1856ء میں معزولی کی وجہ سے یہاں کا ہر طبقہ برطانوی حکومت کے خلاف ہو گیا تھا اور بے حد غم وغصے

میں تھا۔ 16 مئی کو میرٹھ اور دہلی کی بغاوت کی خبر سُن کر اودھ کے انقلابیوں نے بھی بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ انگریزوں نے بھی احتیاطاً حفاظتی انتظامات کر لیے تھے۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد بیگم حضرت محل واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ نہیں گئی تھیں اور جب بغاوت ہوئی تو انہوں نے بہ نفسِ نفیس انقلابیوں کی سربراہی اختیار کر لی تھی۔ 9 جولائی 1857ء کو اپنے نابالغ بیٹے برجیس قدر کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔ بندوقوں کی گونج کے ساتھ ان کی تخت نشینی کی گئی اور قائم مقام کی حیثیت سے بیگم حضرت محل نے اودھ کا نظم و نسق درست کیا۔ شرف الدولہ کا وزیر کی اسامی پر تقرر کیا۔ مموں خان کو دیوان اور جے لال سنگھ کو فوج کا کلکٹر بنایا۔ مخصوص شخصیات پر مشتمل ایک کورٹ کی تشکیل کی مگر اختیارات سب اپنے ہاتھ میں رکھے۔ وہ ایک باعزت اور باحُرمت خاتون تھیں۔ ہر وقت حجاب میں رہتی تھیں، ضرورت پڑنے پر حجاب ہی میں رہتے ہوئے جنگ میں شامل ہونے سے گریز نہیں کرتی تھیں۔ ایک شاہی فرمان کے ذریعہ بیگم حضرت محل نے تمام ہندو اور مسلمانوں سے متحد ہو کر بغاوت میں شریک ہونے کی اپیل کی۔ مولانا فضلِ حق خیر آبادی سے مشورہ کر کے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کا فتویٰ جاری کرا دیا تھا۔

اودھ کی ماتحت زمینداریاں مقامی سربراہوں کے تحت کر دی گئیں۔ گورکھپور میں محمد حسن، سلطان پور میں مہدی حسن، سنکر پور میں بٹی مادھو بخش، نرپٹ سنگھ کورؤیا، اُدت نارائن اور مادھو پرساد کو بیرپور دیوی بخش سنگھ اور تین دیگر زمینداروں کو ڈھریا کے سربراہ مقرر کیے۔ اِن سب نے متحد ہو کر بیگم حضرت محل کا آزادی کی جنگ میں بھرپور تعاون دیا تھا۔ بالخصوص راجامان سنگھ اپنے 90 ہزار سپاہیوں کے ساتھ بیگم حضرت محل کے جہاد میں شریک ہو گئے تھے۔ تعلقدار بھی برطانوی حکومت سے ناراض تھے، کیونکہ ڈلہوزی نے تعلقداری بندوبست کو ختم کر دیا تھا اور انہیں ان کی زمینداریوں سے بے دخل کیا تھا اور جو سپاہی اس بغاوت میں شامل تھے وہ بھی زیادہ تر اودھ سے تعلق رکھتے تھے۔

لکھنؤ کے فیض آباد میں سپاہیوں نے 8 جون 1857ء کو بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ انہوں نے پہلے خزانہ لوٹا اور جیل کو توڑ کر قیدیوں کو رہا کرایا۔ اسی جیل میں احمد اللہ شاہ فیض آبادی قید بند تھے، وہ انگریزوں کے جانی دشمن تھے، وہ گوریلا جنگ کے طریقوں کے ماہر تھے۔ ان کو انقلابیوں نے اپنا کمانڈر تسلیم کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے انقلابیوں کا انگریزوں سے چِن ہٹ کے مقام پر مقابلہ ہوا، جہاں انہیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ 30 جون کو شہر پر قبضہ کیا، بعد ازاں 2 جولائی کو برٹش ریزیڈنسی کا محاصرہ کیا۔ 6 ہزار سپاہیوں کے علاوہ اس مورچے میں تعلقدار بھی شامل تھے۔ یورپی کے پاس صرف 1600 فوجی تھے، انقلابیوں نے سب سے پہلے مچھّی بھون کے اسلحہ خانے کو تباہ و برباد کیا۔ یہ محاصرہ 67 دن تک جاری رہا۔ لارنس اپنی فوج کا معائنہ کر کے جیسے ہی اپنے کمرے پر پہنچا ایک گولی دیوار پار کر کے لارنس کو لگی، جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ کلکتہ کی جانب سے ہیولاک فوج لے کر بغاوت کی سرکوبی کے لیے آیا۔ لکھنؤ میں گومتی ندی کا کنارہ پار کر کے برٹش ریزیڈنسی کی جانب رُخ کیا، اس وقت قیصر باغ سے ہیولاک کی فوج پر گولیاں برسنا شروع ہو گئیں۔ لیکن آخر میں حضرت محل کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو وہ 14 مارچ کو بھیروں ہوتے ہوئے بریلی پہنچیں۔ وہاں بغاوت میں شامل ہوئیں، شاہ جہاں پور میں احمد اللہ شاہ کی مدد کی، مراد آباد اور خیر آباد میں انقلابیوں کی مدد کی۔ اِن تمام مراکز میں جب بغاوت ناکام ہو گئیں تو حضرت محل نے نیپال میں نیا کوٹ میں پناہ لی۔ نیپال کے حکمراں نے

1874ء میں ان کے انتقال تک ان کی خبر گیری میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ ملکہ وکٹوریہ نے انہیں خطوط لکھ کر ہندوستان واپس آنے پر اصرار کیااور اُن کی حفاظت کی ضمانت بھی لی، مگر انہوں نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ دراصل انہیں انگریزوں پر بالکل بھروسہ نہیں رہا تھا۔ شاہی فرمان اور حکومت کی نئی تنظیم کو وہ ایک ڈھکوسلا مانتی تھیں۔

23.2.3 کانپور میں بغاوت (Revolt in Kanpur)

کانپور: پیشوا باجی راؤ دوم کے مُتبنّیٰ بیٹے پیشوا نانا صاحب کانپور کے پاس بتھور میں رہائش پذیر تھے۔ 1818ء میں پیشوا باجی راؤ دوم کی انگریزوں کے مقابلے میں شکست کے بعد اسّی ہزار پونڈ سالانہ پینشن دے کر انہیں بتھور میں رہائش پذیر کر دیا تھا۔ 1851ء میں پیشوا باجی راؤ کے انتقال کے بعد ان کی تمام جائیداد کے علاوہ نانا صاحب پنشن کے بھی وارث بن گئے تھے۔ جب ڈلہوزی گورنر جنرل بن کر آیا تو اس نے اصولِ الحاق کے تحت نانا صاحب کی پینشن بھی بند کر دی۔ نانا صاحب نے اپنے مقدمے کی وکالت کے لیے عظیم اللہ خاں کی قیادت میں ایک وفد انگلینڈ بھیجا۔ عظیم اللہ خاں بہت اچھی انگلش جانتے تھے، لیکن ان کی کوئی دلیل کام نہیں آئی اور وہ ناکام واپس آئے۔ میرٹھ اور دہلی میں بغاوت کی خبر سننے کے بعد کانپور کے انقلابیوں نے نانا صاحب سے بغاوت میں شامل ہونے کے لیے اصرار کیا۔ نانا صاحب جو پہلے ہی سے برطانوی حکومت کے رویے سے ناراض تھے، بغاوت میں فوراً شامل ہو گئے۔ بہادر شاہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا، اُن کی تعظیم میں توپوں کی سلامی بھی دی۔ اس طرح 4 جون 1857ء کو کانپور میں بھی بغاوت شروع ہو گئی۔ نانا صاحب کے گھوڑ سواروں نے پہلے نواب گنج پر قبضہ کیا، اس کے بعد جیل پر حملہ کیا، سرکاری عمارتوں اور آفسوں کو لوٹا، سرکاری خزانہ لوٹا، اسلحہ خانے پر قبضہ کیا، لیکن جب سر ہگ ویلر نے حملہ کیا تو انقلابیوں کے اصرار پر نانا صاحب دہلی کی جانب روانہ ہونے کو تیار ہو گئے تھے، مگر عظیم اللہ خاں نے ترغیب دی کہ وہ دہلی نہ جا کر کانپور ہی کو اپنا مضبوط مرکز بنائیں۔ بعد ازاں نانا صاحب نے کانپور میں اپنی آزاد حکومت کا استحکام کیا۔ جب ہیولاک اپنی فوج کے ساتھ کانپور کی جانب آ رہا تھا تو نانا صاحب نے یورپی کا قتلِ عام کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ ہیولاک کی خبر سُن کر نانا صاحب نے گرانڈ ٹرنک روڈ پر جو کانپور سے سات میل دور ہے، اپنا مورچہ جمایا تھا، لیکن برطانوی فوج نے نانا صاحب کو شکست دے دی۔ نانا صاحب پہلے اپنے اہل و عیال کے ساتھ بتھور گئے۔ 30 جولائی کو لکھنؤ پہنچے، نانا صاحب کے ایک دوسرے ساتھی تانتیا ٹوپے نانا صاحب کی جانب سے برطانوی فوجوں سے اب بھی ٹکرلے رہے تھے۔ یہ مقابلہ دسمبر 1857ء تک جاری رہا۔ شکست کے بعد نانا صاحب نے نیپال میں پناہ لی۔ 1858ء میں شاہی فرمان کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے نانا صاحب سے ہندوستان واپس آنے کو کہا، نانا صاحب نے حفاظت کی ضمانت چاہی تو رچارڈسن نے جواب دیا کہ حفاظت کی ضمانت شاہی فرمان ہی میں مُضمر ہے۔ اِس کے باوجود نانا صاحب ہندوستان واپس نہیں آئے، کیونکہ انہیں انگریزوں کے قول و فعل پر قطعاً بھروسہ نہیں تھا۔

23.2.4 شاہجہاں پور میں بغاوت (Revolt in Shahjahanpur)

شاہجہاں پور: شاہ جہاں پور بغاوت کا ایک اہم مرکز ثابت ہوا۔ یہاں دیگر مراکز کے سربراہ جمع ہو گئے تھے۔ علاوہ ازیں احمد اللہ شاہ فیض آبادی کی شرکت سے یہاں کی بغاوت کو تقویت پہنچی تھی۔ میرٹھ چھاؤنی اور دہلی کی بغاوت کی خبر سنتے ہی 28ویں پلٹن کے ہندوستانی سپاہی چربی کے کارتوس استعمال کرنے پر بے حد مشتعل ہو گئے۔ چنانچہ گورکھپور کے مولوی سرفراز علی کی سربراہی میں سپاہیوں نے بغاوت کا

علم بلند کر دیا۔ 31 مئی کو یورپی افسروں کا قتل کیا، مولوی سرفراز علی کے شاگرد قدرت علی اور نیاز علی بھی بغاوت میں شامل ہو گئے تھے۔ قرب وجوار کے گاؤں کے لوگ بھی بغاوت میں شامل ہو گئے۔ انقلابیوں نے چینی کی فیکٹری پر حملہ کیا اور متحد ہو کر بڑی بہادری سے برطانوی فوج کا مقابلہ کرتے رہے۔ شاہ جہاں پور میں ایک دوسرا اہم لیڈر کا نزول ہوا اور وہ تھے مولوی احمد اللہ شاہ فیض آبادی۔ اُن سے بغاوت کو بہت تقویت پہنچی تھی۔ انگریز احمد اللہ شاہ سے بے حد خائف رہتے تھے اور گھبراتے تھے۔ وہ گوریلا وار فئر کے ماہر تھے۔ انہوں نے کئی مقابلوں میں انگریزوں کے چھکّے چھڑا دیے تھے۔ انگریزوں نے ان کے سر پر پچاس ہزار روپے کا انعام تک رکھ دیا تھا، جب 30 اپریل 1858ء کو کرنل ہیلے کی سرکردگی میں انگریزی فوجیں شاہ جہاں پور آئیں تو مولوی احمد اللہ شاہ نے بڑی جرأت اور بہادری سے مقابلہ کیا۔ 3 مئی سے 11 مئی تک سخت مقابلہ ہوا، جس میں برطانوی فوج کمزور پڑتی نظر آئی، کولن کیمپ بیل نے فوراً بریگیڈیئر جنرل جونسن کو انگریزوں کی مدد کرنے کے لیے شاہ جہاں پور بھیجا۔ مولوی احمد اللہ شاہ نے 11 مئی 1858ء کے مقابلے میں جونسن کی فوج کو بھی شکست دے دی۔ بعد کو شہزادہ فیروز شاہ اور اودھ کی بیگم حضرت محل بھی شاہ جہاں پور کی بغاوت میں شریک ہو گئے۔ مختلف مراکز کے سربراہوں نے فیصلہ کیا کہ انگریزوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ تیار کیا جائے۔ احمد اللہ شاہ جب شاہجہاں پور کے راجا سے اس ضمن میں صلاح ومشورہ کرنے پہنچے تو اس نے احمد اللہ شاہ کو بندوق کی گولی سے 5 جون 1858ء کو ہلاک کر دیا۔ اِسی کے ساتھ انگریز شاہ جہاں پور کی بغاوت کی سرکوبی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

23.3 آگرہ اور روہیل کھنڈ میں شورش (Rebellions in Agra and Rohilkhand)

آگرہ: آگرہ شمال مغربی صوبے کا صدر مقام تھا، یہ دہلی سے صرف 130 میل کی دوری پر ہے۔ چنانچہ بغاوت کی خبر آناً فاناً آگرہ میں 11 مئی کو پہنچ گئی تھی۔ مولوی احمد اللہ شاہ جب آگرہ میں رہائش پذیر تھے، تو انہوں نے پہلے ہی سے برطانوی حکومت کے خلاف ماحول تیار کر دیا تھا۔ آگرہ میں بغاوت کی سربراہی مولوی رحمت اللہ خان نے سنبھالی اور بڑی بہادری سے برطانوی فوج کا مقابلہ کیا۔ انقلابیوں نے دہلی کے بادشاہ کو اپنا قائد تسلیم کر لیا تھا۔ دوران جنگ قرب وجوار کے گاؤں اور قصبات کے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ انقلابیوں نے شاہ گنج تک برطانوی فوج کا پیچھا کیا، تحصیل اور تھانے پر قبضہ کر لیا تھا۔ ماہ جولائی میں نصیر الدولہ کو اپنا حکمراں مان کر آگرے میں حکومت بھی قائم کر لی۔

تھانہ بھون، کیرانہ اور شاملی: اس بغاوت کا اثر تھانہ بھون کے کیرانہ اور شاملی قصبات پر بھی پڑا۔ اس بغاوت میں رحمت اللہ اور چودھری عظیم الدین پیش پیش تھے۔ علاوہ ازیں علماء بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ رشید احمد گنگوہی، مولانا قاسم نانوتوی نے بغاوت کی قیادت کی تھی، حتیٰ کہ تھانہ بھون میں ایک آزاد حکومت بھی قائم کر لی۔ آخر کار کالوِن نے برطانوی فوج کو از سر نو تیار کر کے حملہ کیا، کچھ لوگ بچ کر بھاگ گئے، کچھ کو گرفتار کر لیا گیا، مولانا قاسم نانوتوی کسی طرح بچ کر بھاگ گئے۔ بعد کو انہوں نے دار العلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی۔

بریلی: روہیل کھنڈ اور فرخ آباد کے علاقے اودھ کے نواب سعادت علی خان نے 1801ء میں ویلزلی سے امدادی صلح کے معاہدے کے تحت برطانوی حکومت کو عطا کر دیے تھے۔ بریلی، برطانوی حکومت کا صدر مقام تھا، جہاں برطانوی فوج کی تین پلٹنیں تعینات تھیں۔ ہندوستانی سپاہی کیپٹن میکنزی کے برتاؤ سے بہت ناراض تھے، بغاوت کی خبر سن کر 31 مئی 1857ء کو 18 ویں اور 68 ویں پلٹنوں کے ہندوستانی

سپاہیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ میکینزی نے یورپی افسروں کے ساتھ نینی تال میں جا کر پناہ لی۔ اس بغاوت کی کمان حافظ رحمت خان کے پوتے چیف جسٹس خان بہادر خان نے سنبھالی تھی۔ جنرل بخت خان کے توسط سے انہیں دہلی کے بادشاہ کی طرف سے نائب گورنر کا خطاب ملا تھا۔ بادشاہ نے انہیں روہیل کھنڈ کا نواب مقرر کر دیا تھا۔ انتظام الدولہ کا خطاب بھی عطا کیا گیا۔ بڑی تعداد میں ہندو اور مسلمان شامل ہو گئے تھے۔ نکاٹیا کے مقام پر بہادر خان نے اپنی فوج کے ساتھ برطانوی فوج کا بڑی جرأت اور بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن آخر میں انقلابیوں کی شکست ہوئی، خان بہادر پہلے پیلی بھیت گئے، پھر لکھنؤ گئے، بعد کو گھوڑے پر سے گر کر زخمی ہو گئے اور گرفتار کر لیے گئے، مقدمہ چلایا گیا، جس میں انہوں نے بڑے فخر سے کہا کہ ہندوستان ہمارا ہے اور عوام انگریزوں سے بیزار ہیں۔ مقدمے کے بعد ان کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔

مرادآباد: مرادآباد کے ضلع میں سب سے پہلے امروہہ میں بغاوت شروع ہوئی، سید گلزار علی نے دہلی کے بادشاہ سے نائب کا خطاب حاصل کر کے انقلابیوں کی قیادت کی۔ اس کے بعد مرادآباد میں 28ویں پلٹن کے ہندوستانی سپاہیوں نے 3 جون 1857ء کو بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ اس بغاوت میں ہندو مسلمان اور قرب و جوار کے گاؤں اور قصبات کے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ جون 1858ء کو امروہہ کی جنگ میں برطانوی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے انقلابیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

بدایوں: بدایوں کے انقلابیوں کے سربراہ عبدالرحمن اور فصاحت اللہ تھے۔ وزیر خاں نے بغاوت کی قیادت سنبھالی تھی۔ 27 اپریل کو ککرولہ کی جنگ میں شکست ہوئی۔ آخری دور میں رام نرائن نے اسلام نگر میں انگریزوں کا مقابلہ کیا، مگر شکست ہوئی۔

بجنور: بجنور میں بغاوت کی خبر 19 مئی 1857ء کو پہنچی۔ اسی کے ساتھ وہاں بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی، نجیب آباد کے نواب محمود خان نے اس بغاوت کی کمان سنبھالی تھی، بغاوت میں مسلمانوں کے علاوہ گوجر، بنجارے، میواتی، جاٹ اور چوہان شامل تھے۔ ان سب نے مل کر تحصیل کو لوٹا اور انگریز افسروں کا قتل کیا۔ سر سید احمد خان وہاں جج کی حیثیت سے مقیم تھے، انہوں نے چند یورپی افسروں کی جان بھی بچائی۔ انگریزوں کے جانے کے بعد نواب محمود خاں نے بجنور میں حکومت کا نظم و نسق درست کیا، ایک فرمان جاری کیا، جس میں تحریر تھا کہ 'عوام اللہ کے بندے، ملک بادشاہ کا اور احکام نواب محمود خاں کے۔' 21 اپریل 1858ء تک انقلابی انگریزوں کے حملوں کا مقابلہ کرتے رہے، جب جونس نے ایک بھاری فوج لے کر حملہ کیا تو انقلابیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

الہ آباد: میرٹھ اور دلی کی بغاوت کی خبر جب الہ آباد پہنچی تو وہاں کے ہندو مسلمان تعلقدار اور کسانوں نے لیاقت علی کی سربراہی میں بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ ہندوؤں کے لیڈر رامچندر نے بھرپور تعاون دیا۔ لیاقت علی خاں نے اپنا صدر مقام خسرو باغ کو بنایا تھا۔ یہ خبر سن کر کیپٹن نیل 11 جون کو بنارس ہوتے ہوئے 12 جون کو الہ آباد کی باہری آبادی داراؤ گنج پر بمبارڈمنٹ کر دیا اور انقلابیوں کو وہاں سے تتر بتر کر دیا۔ اس کے بعد نیل نے خسرو باغ پر حملہ کیا، مولوی لیاقت علی نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، حالات کے پیش نظر کانپور جانے کا فیصلہ کیا۔ 18 جون تک نیل نے الہ آباد کے انقلابیوں کو شکست دے دی تھی۔

پٹنہ: پٹنہ میں مولوی علی کریم نے جہادی تحریک کی سربراہی کی تھی۔ لکھنؤ کے کتابوں کے تاجر پیر علی نے اس بغاوت میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ 3 جون 1857ء کو پیر علی نے 200 مسلمان پیروکاروں کے ساتھ بغاوت کا آغاز کیا۔ کچھ عرصے تک یہ جہد جاری رہی۔ بالآخر گرفتار ہوئے، انگریزوں نے ان پر مقدمہ چلا کر صادق پوری علماء کے گھر میں قید بند کر دیا۔

متھرا: 30 مئی 1857ء کو متھرا کے محافظ فوجیوں نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ انگریز خزانے کی گاڑیاں بھر کر آگرہ لے جا رہے تھے۔ ہندوستانی فوجیوں نے انہیں اجازت نہیں دی۔ گولیاں چلا کر برٹن کو مار دیا۔ سرکاری آفسوں اور عمارتوں کو لوٹا اور جلا دیا۔ یورپی نے کسی نہ کسی طرح جان بچا کر آگرہ میں پناہ لی۔ انقلابی اپنے ساتھیوں کو قید سے چھڑا کر دِلّی کی جانب چلے گئے۔

فرخ آباد: 1801ء کے امدادی صلح کے معاہدے کے بعد فرخ آباد برطانوی سلطنت کا حصہ بن گیا تھا۔ نواب تفضل حسین خاں کو دو لاکھ آٹھ ہزار روپے سالانہ پینشن مقرر کر دی گئی تھی۔ یہاں بغاوت کے خدشے سے کرنل اسمتھ نے اپنی جان بچا کر فتح پور کے قلعہ میں پناہ لے لی تھی۔ 41ویں پلٹن کے سپاہی بھی بغاوت میں شامل ہو گئے۔ انقلابیوں نے نواب تفضل حسین کو اپنا قائد منتخب کر کے فتح گڑھ کے قلعے پر حملہ کر دیا۔ جب انقلابی قلعے میں داخل ہونے سے قاصر رہے تو انہوں نے قلعہ میں آگ لگا دی۔ کرنل اسمتھ کو جب کامیابی کی امید نہیں رہی تو یورپی عورتوں، مردوں اور بچوں کے ساتھ ایک ناؤ میں بیٹھ کر ندی پار کر کے آگرہ جانے لگے۔ انقلابیوں نے اس ناؤ پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ ان میں بڑی تعداد ہلاک ہوئی، کچھ کو گرفتار کر کے نواب صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ نواب صاحب نے انہیں گولیاں مار کر ہلاک کرنے کا حکم دے دیا۔ بعد کو یورپی فوجیوں نے فرخ آباد پر زبردست حملہ کیا۔ انقلابیوں کو شکست ہوئی، نواب تفضل حسین خاں اور ان کے بھائی گرفتار ہوئے، نواب صاحب کو حِجاز روانہ کر دیا گیا اور ان کے بھائی کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔

اٹاوہ: 19 مئی 1857ء کو اٹاوہ اور جسونت نگر میں بھی بغاوت شروع ہو گئی۔ ضلع اٹاوہ میں ایلن اوکٹیوین ہیوم کلکٹر تھے۔ انہوں نے اٹاوہ میں سماجی اصلاحات کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ایک انگلش ہائی اسکول بھی قائم کیا تھا، جسونت نگر میں جب ہیوم بغاوت کی روک تھام کے لیے پہنچے تو انقلابی انہیں بھی قتل کرنا چاہتے تھے۔ ہیوم کسی نہ کسی طرح بچ کر اٹاوہ آ گئے، ہیوم کو خبر ملی تھی کہ دیگر مقاموں سے بھی انقلابی آ رہے ہیں، تاج خان بغاوت کے لیڈر تھے۔ 24 مئی 1857ء کو گوالیار کی فوج کی مدد سے اٹاوہ پر دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد بھی برطانوی فوج اور انقلابیوں کے مابین جھڑپیں ہوئیں۔ آخر کار انگریزوں نے 10 دسمبر 1858ء تک اٹاوہ پر پوری طرح قابو پا لیا۔

بستی: بستی میں 5 جون 1857ء کو بغاوت شروع ہوئی۔ گورکھپور کے محمد حسن انقلابیوں کے سربراہ تھے۔ 5 جنوری 1858ء کو جب گورکھپور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو بستی کے انقلابی امروہہ چلے گئے اور وہاں بغاوت میں حصہ لیا۔ امروہہ کی جنگ میں زبردست مقابلہ ہوا تھا۔

جونپور: 5 جون 1857ء کو جونپور میں انگریزوں کی پالیسی کی وجہ سے پرانے زمیندار ناراض تھے۔ یہ لوگ بھی بغاوت میں شامل ہوئے۔ اس بندوبست کی قیادت ارادت جہاں کے سپرد کی گئی۔ فصاحت جہاں اس کے دوسرے لیڈر تھے۔ 27 ستمبر 1857ء کو کرنل روبن نے اپنی

فوج کے ساتھ انقلابیوں سے مقابلہ کیا۔ بعد کو ارادت جہاں اور فصاحت جہاں کو گرفتار کر کے پھانسی کی سزا دی گئی۔

اعظم گڑھ: اعظم گڑھ میں منصب علی نے انقلابیوں کی سربراہی کی۔ کُرمی راجا بنی پر شاد بھی اس بغاوت میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن اکتوبر کے وسط تک انگریز اس بغاوت کو بھی دبانے میں کامیاب ہو گئے۔ 3 جون 1857ء کو اعظم گڑھ میں ہندوستانی فوج کے سپاہیوں نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ پلور کا سردار پرتھوی پال سنگھ بھاری فوج لے کر شمال مغربی شہر میں داخل ہوا۔ نظام آباد ساگری کی تحصیل کو تباہ و برباد کیا، کوئل سنگھ جو انگریزوں کا وفادار تھا، وہ بھی پرتھوی پال سنگھ کے ساتھ شامل ہو گیا۔ گھوسی اور سکندر پور کے پرانے جاگیرداروں نے اپنی جاگیروں پر قبضہ کیا۔ محمود آباد تحصیل میں جو مؤاور مبارک پور دیو گاؤں اور چڑیا کوٹ کے کسانوں میں انگریزوں کے خلاف غبار تھا وہ بھی شامل ہو گئے۔ کوئلہ اور اترولی کے راجپوت جو اپنی بہادری اور سرکشی کے لیے مشہور ہیں وہ بھی شامل ہو گئے۔ اترولی کے کُرمی راجا کے بھائی جے پال اعظم گڑھ پر اپنا حق جماتے تھے تو وہ بھی انقلابیوں کے ساتھ بغاوت میں پیش پیش ہو گئے۔ 21 جولائی کو مادھو پر شاد نے پلوار پر حملہ کر دیا۔ مظفر جہاں نے جون کے آخر میں ماہول تحصیل پر قبضہ کر لیا تھا۔ قرب وجوار کے گاؤں کے لوگوں نے نیل کی فیکٹری کو لوٹا۔ لکھنؤ کے انقلابیوں کی حکومت نے کُرمی راجا بنی مادھو کو اعظم گڑھ اور جونپور کا ناظم مقرر کر دیا تھا۔ 20 ستمبر 1857ء کو کیپٹن بوائے لیو کی سربراہی میں گورکھوں کی پلٹن سے مندوردی گاؤں کے مقام پر بنی مادھو نبرد آزما ہوئے۔ ناکامی کے پیش نظر وہاں سے فرار ہو گئے۔ 4 نومبر کو انقلابیوں نے ایک بار پھر اعظم گڑھ پر حملہ کیا۔ گورکھا فوج اس حملے پر قابو نہ پا سکی۔ اترولی پر انقلابیوں کا 10 نومبر تک قبضہ رہا۔ وہاں سے مختلف علاقوں میں انقلابی فرار ہو گئے۔ بغاوت کی لہر غازی پور تک پھیل گئی۔ جگدیش پور میں کنور سنگھ نے بغاوت کی۔ اس بغاوت نے شاہ آباد کو بھی متاثر کیا۔ سید پور تحصیل میں بھی انگریزوں کے خلاف غصہ تھا۔ وہاں کے لوگ بھی بغاوت میں شامل ہو گئے۔ جگدیش پور کے انقلابی آخر کار انگریزوں سے مقابلے میں پست ہو گئے اور وہاں سے فرار ہو گئے۔ پٹنہ میں زمیندار جن کی جاگیریں انگریزوں نے ہڑپ کر لی تھیں، اپنی جاگیریں حاصل کرنے کے لیے بغاوت میں شامل ہو گئے تھے۔ آخر کار جنرل ڈوکلاس کی سرکردگی میں اکتوبر 1858ء کو انگریزوں نے اعظم گڑھ پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح اعظم گڑھ کی بغاوت دب گئی۔

سیتاپور: سیتاپور کے خیر آباد کے بخشی ہر پرساد نے بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ محصول میں بندہ حسین، چہلاری کا راجا رائک وار، محمود آباد کا راجا نواب علی خان، ان سب نے مل کر انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ اکتوبر 1858ء کو بریگیڈیئر مار کر سے انقلابیوں کا سخت مقابلہ ہوا، مگر شکست ہوئی۔ 12

23.4 مرکزی ہندوستان میں شورش (Rebellion in Central India)

مندیسر: وسطی ہندوستان میں بغاوت کے ضمن میں دو مراکز قابل ذکر ہیں: اوّل مندیسر اور دوم جھانسی۔ مرکزی ہندستان (مدھیہ پردیش) میں زیادہ تر صوبوں میں مراٹھوں کی حکومت تھی۔ یہ صوبے امدادی صلح کے معاہدے کی تحت انگریزوں کے ماتحت تھے۔ لکشمی بائی کے علاوہ وسطی ہند کی تمام ریاستوں کے راجا برطانوی حکومت کے وفادار تھے۔ وسطی ہند میں شہزادہ فیروز شاہ اور لکشمی بائی انقلابیوں کے عظیم رہنما بن

کر ابھرے تھے۔

فیروز شاہ مغل خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ 1856ء میں حج کرنے گئے تھے۔ 1857ء میں جب حج کر کے واپس آئے تو بغاوت کا آغاز ہو چکا تھا۔ پہلے وہ اِندور گئے، وہاں جب گرفتاری کا خطرہ لاحق ہوا تو وہ گوالیار چلے گئے۔ دھیرے دھیرے بغاوت کی آگ پورے مشرقی مالوہ میں پھیل چکی تھی۔ انقلابیوں نے مندیسر پر قبضہ کر لیا تھا۔ انہوں نے فیروز شاہ کو مندیسر کا کمانڈر انچیف مقرر کر دیا۔ فیروز شاہ نے ایک پُر اثر فرمان جاری کیا، جس میں تمام ہندو اور مسلمانوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ متحد ہو کر برطانوی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اس میں ایک تنبیہ بھی کی گئی تھی کہ جو سردار اور ریاستی حکمراں بغاوت میں شامل ہوں گے، انہیں بادشاہ کی طرف سے انعام و اکرام سے نوازا جائے گا اور جو اس حکم کی نافرمانی کریں گے، انہیں سخت سزائیں دی جائیں گی۔ یہ سن کر مغل شاہی خاندان کا رُکن بغاوت کی قیادت کر رہا ہے، تمام ہندو اور مسلمان پُرجوش طریقے سے بغاوت میں شریک ہو گئے۔ ادھر ریاست کے راجا اور وزیر نے زبردست طریقے سے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ میواتی، مکرانی اور افغانی بھی فیروز شاہ کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ مندیسر کے نواسیوں نے فیروز شاہ کو اپنا حکمراں تسلیم کر لیا تھا۔ فیروز شاہ نے ایک نامور شخص مرزا جی کو اپنا وزیر منتخب کیا تھا۔ اس طرح فیروز شاہ نے پورے وسطی ہند میں بغاوت کی زبردست مہم چلائی تھی۔ گوالیار کے راجا سندھیا کو بھی بغاوت میں شریک ہونے کے لیے کہا مگر وہ شریک نہیں ہوئے اور نہ ہی کوئی مدد پہنچائی۔ عرصے تک فیروز شاہ اپنے فوج کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کرتے رہے، مگر جب انہوں نے دیکھا کہ کامیابی ناممکن ہے تو شہزادہ فیروز شاہ گوالیار دھولپور، آگرہ اور فرخ آباد ہوتے ہوئے اپنے انقلابیوں کے ساتھ دہلی پہنچے، لیکن جب شہزادے نے دیکھا کہ انقلابی دہلی سے نکل کے جا رہے ہیں تو وہ متھرا گئے اور پھر لکھنؤ پہنچے۔ نومبر 1857ء میں روہیل کھنڈ میں بیگم حضرت محل کے معاون بن کر انگریزوں سے برسرپیکار ہوئے، انگریزوں کے لکھنؤ میں قبضے کے بعد شاہ جہاں پور میں احمد اللہ شاہ کے ساتھ انگریزوں سے جنگ لڑی۔ احمد اللہ شاہ کے قتل اور شکست ہونے کے بعد تانتیا ٹوپے کی مدد کی، وہاں سے وہ کعبہ شریف روانہ ہو گئے، کئی مسلم ممالک میں پناہ کے لیے گھومتے رہے۔ آخر کار محض 45 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

جھانسی: جھانسی جو اس وقت وسطی ہند کی مراٹھی ریاست تھا، گنگادھر رائے جھانسی کے حکمراں تھے۔ 1853ء میں انتقال کے بعد ان کی بیوی رانی لکشمی بائی جھانسی کی حکمراں بنی تھیں۔ گنگادھر راؤ کا کوئی بالغ جانشیں نہیں تھا۔ ڈلہوزی جب گورنر جنرل بن کر آئے تو انہوں نے توسیعِ سلطنت کا ایک نیا بہانہ تراشا، 'اصول الحاق' یعنی جس حکمراں کا اصل جانشیں نہیں ہو گا اس کی ریاست کو برطانوی حکومت میں براہ راست ملا لیا جائے گا۔ لکشمی بائی کی جھانسی کی حکومت کو اس اصول کے تحت دیگر ریاستوں کے ساتھ برطانوی حکومت میں ملا لیا گیا۔ لکشمی بائی کو ڈلہوزی کا یہ ناجائز طریقہ بے حد ناگوار لگا تھا اور وہ بے حد ناراض ہوئیں۔ لہٰذا انہوں نے ہندو مسلمانوں کو متحد کر کے 7 جون 1857ء کو انگریز افسروں پر حملہ کر دیا اور انہیں جھانسی سے نکال کر اپنی حکومت قائم کی، جھانسی کے قلعہ پر اپنا جھنڈا لہرایا۔ رانی لکشمی بائی کی اس مہم میں بالخصوص رسالدار کالے خاں، تحصیلدار محمد حسین اور حکیم صالح نے جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ حکیم صالح نے انگریزوں سے کہا کہ اگر وہ پُرامن طریقے سے خود کو سپرد کر دیں تو ان کی جانیں بخشی جا سکتی ہیں۔ انگریزوں نے اپنے تمام ہتھیاروں کے ساتھ خود کو سپرد کر دیا۔ مگر کچھ پُرجوش انقلابیوں نے انہیں تہہ تیغ کر دیا۔ بعد کو برطانوی حکومت نے فوجیں بھیجیں، مہارانی کی سربراہی میں زبردست جنگ

ہوئی، لکشمی بائی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر قلعہ سے فرار ہوتے وقت گھوڑے سے گر کر زخمی ہو گئیں اور اُن کو گرفتار کر لیا اور شہید کر دیا گیا۔

اِندور: اِندور یشونت رائے ہولکر کی ریاست تھی۔ بغاوت سے کچھ پہلے مارتنڈ راؤ ہولکر اندور کے راجا بنے تھے۔ 2 جون 1849ء میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اُن کے مُتبنّیٰ بیٹے تکوجی راؤ ہولکر 8 مارچ 1852ء کو بالغ ہوئے اور ریاست کی حکمرانی براہِ راست اپنے ہاتھ میں لی۔ جون 1857ء کے دوسرے ہفتے میں گوالیار فوج کی پلٹن کے ہندوستانی فوجیوں نے بغاوت کر دی۔ تکوجی برطانوی حکومت کے وفادار تھے۔ انقلابیوں نے ایک متّحدہ محاذ تیار کیا تھا، جس میں جھانسی کی رانی، پیشوا نانا صاحب، اِندور کے سعادت خاں، شہزادہ فیروز شاہ وغیرہ شامل تھے۔ سعادت خاں رسالدار ہولکر کے بخشی حافظ کا بھتیجا تھا۔ سعادت خاں کے فوجیوں سے اچھے مراسم تھے۔ بھوپال میں وارث محمد خاں سے بھی گُفت و شنید جاری تھی، اِندور کے ہندوستانی جتّھے کی مدد سے برٹش ریزیڈنسی پر حملہ کر دیا۔ بھوپال کی سکندر بیگم کو بغاوت میں شامل ہونے کے لیے اصرار کیا، مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ اِندور کے وارث علی اور سعادت خاں کے بھائی سردار خاں بھی انقلابیوں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ میہد پور پلٹن کے افسر شیخ رحمت اللہ بھی اس بغاوت میں شامل ہو گئے۔ سعادت خاں گوالیار کے راجا سندھیا سے ملاقات کرنے گئے مگر انہوں نے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ انقلابیوں نے مہاراج سے اپنی تنخواہیں ادا کرنے کی مانگ کی۔ منع کرنے کی صورت میں انقلابیوں نے بزورِ طاقت خزانہ لوٹ کر اپنی تنخواہیں حاصل کر لیں۔ انگریزوں نے اِندور کا آفس اور خزانہ موٗ میں منتقل کرنے کا ارادہ کیا۔ یکم جولائی 1857ء کو اندور کی برٹش ریزیڈنسی پر انقلابیوں نے حملہ کر دیا، 59 انگریزوں کو تہہِ تیغ کیا، سعادت خاں نے سندھیا کے محل پر حملہ کیا، جہاں وہ گرفتار ہو گئے لیکن امن قائم رکھنے کے معاہدے پر انہیں چھوڑ دیا گیا۔ ایک بار پھر سعادت خاں نے انقلابیوں کے ساتھ برٹش ریزیڈنسی پر حملہ کیا اور اندور سے انگریزوں کی حکومت اُکھاڑ پھینکی۔ یکم اگست کو دہلی جا کر باشاہ سے ملے۔ ڈورنڈ سنٹرل انڈیا کے ایجنٹ تھے، وہ موٗ کے قلعے میں جا کر چھُپ گئے تھے، انقلابی جب کمزور پڑے تو ڈورنڈ نے تکوجی راؤ ہولکر سے انقلابیوں کو سزا دینے کی مانگ کی۔ چنانچہ 9 انقلابیوں کے ہتھیار چھین لیے گئے۔ 147 گھوڑ سوار اور 95 پیدل فوجیوں کو تاعمر قید کی سزا دی گئی۔ اس طرح اِندور کی بغاوت دبا دی گئی۔

دھر: دھر ایک چھوٹی سی ریاست تھی، جس کا جسونت راؤ پوار راجا تھا۔ 31 اگست 1857ء کو عرب، افغان اور مکرانیوں کی مدد سے گل خان نے بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ گل خاں نے 31 اگست 1857ء کو انقلابیوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے ایک نعرہ بلند کیا، 'ہمارا مذہب خطرے میں ہے'۔ 31 اگست کو آنند راؤ کو قلعہ میں بلایا، مگر وہ نہیں آئے۔ 2 ستمبر 1857ء کو آخر مہارانی ریجینٹ نے انقلابیوں سے معاہدہ کر لیا، طے پایا کہ وہ انگریزوں کو نہیں ماریں گے۔ اس وقت تک انقلابیوں کی طاقت کافی بڑھ چکی تھی۔ لہٰذا انہوں نے ایک بار پھر بغاوت کا علم بلند کر دیا، سرکاری آفسوں کو لوٹا اور برباد کیا۔ انگریزوں کی فوج 22 اکتوبر کو دھر میں داخل ہوئی، قلعے کے باہر زبردست مقابلہ ہوا۔ انقلابیوں کو شہر کے اندر اور قلعے میں پناہ لینی پڑی۔ پانچ سو انقلابی کسی خفیہ راستے سے بچ کر فرار ہو گئے۔ ایک بڑی تعداد کو قید کر لیا گیا۔ اس کے بعد، امجھیرا، میہد پور، مانپور اور سردار پور میں بھی اسی طرح کی بغاوتیں ہوئیں۔ انقلابی ان بغاوتوں میں بھی انگریزوں سے نبرد آزما ہوئے، لیکن انگریزوں کی فوجی طاقت کے آگے انہیں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

امجھیرا: امجھیرا میں انقلابیوں کے سربراہ بشیر اللہ خاں تھے، جن کو پھانسی کی سزا دی گئی، میہد پور کے انقلابیوں کے سربراہ ٹن خاں تھے، ان کو

بھی پھانسی کی سزا دی گئی، مان پور میں تانتیا ٹوپے انقلابیوں کے سربراہ تھے، ان کے ساتھ راؤ صاحب، نواب رحمت علی خاں، ستّار خاں، بس راؤ شاستری، اشرف علی خاں اور رحیم خاں شامل تھے۔ بھوپال کی سکندر بیگم حالاں کہ بغاوت میں شامل نہیں ہوئیں، لیکن بھوپال ریاست کے بانی کے رشتہ دار بغاوت میں شامل تھے، عادل محمد خاں، واحد محمد خاں، فاضل محمد خاں نے 2 اگست کو امبا پانی میں بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ امبا پانی انگریزی فوج سے گھرا ہوا تھا، اس لیے انقلابیوں نے راحت گڑھ کے قلعے میں پناہ لے لی تھی۔ جنوری 1858ء تک فاضل محمد قلعہ کا دفع کرتے رہے۔ 16 جنوری 1858ء کو ہیوگ روز فوج کے ساتھ راحت گڑھ پہنچے، ایک ہفتہ مقابلہ کرنے کے بعد انقلابی وہاں سے فرار ہو گئے۔ فاضل محمد خاں اور راجا بان پور جو بغاوت میں شامل ہو گئے تھے اور کامدار خاں پنڈارا کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ عادل محمد خاں نے سرفراز خاں، شجاعت خاں اور شفاعت خاں کے ساتھ بغاوت کو جاری رکھا۔ شفاعت خاں کو پھانسی ہوئی، ایک دوسرا انقلابی فضل الحق لڑائی میں مارا گیا۔ بھوپال کے علاقے سپری، اگراور منڈ لیشوَر میں بھی بغاوتیں ہوئیں، ساگر، داموا اور سیونی میں بھی بغاوت کے شعلے بھڑکے، نرسیما پور اور اسیر گڑھ میں بھی بغاوت ہوئی۔ آخر میں انگریز اِن تمام بغاوتوں کی سرکوبی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ الغرض کوئی مقام ایسا نہیں تھا جہاں بغاوتیں نہیں ہوئی ہوں۔

23.5 راجستھان میں بغاوت (Rebellion in Rajasthan)

راجستھان کے صوبے پر 1857ء کی بغاوت کا اثر محدود علاقوں میں نظر آتا ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ راجستھان کی ریاستوں کے تقریباً تمام راجا امدادی صلح کے معاہدوں کے تحت برطانوی حکومت سے پُختہ وفاداری نبھاتے رہے۔ اگر کہیں بغاوت کے آثار نمایاں ہوئے بھی تو اس کو اپنی فوجی طاقت سے فوراً سرکوبی کر دی۔

جے پور: جے پور میں کسی طرح کی بغاوت نہیں ہوئی، لیکن جے پور کے چند درباری انقلابیوں کے ساتھ خط و کتابت کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ ان میں راول شو سنگھ، نواب ولایت علی خاں، میاں عثمان خاں اور سعد اللہ خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ بغاوت کے وقت یہ لوگ دہلی میں تھے، لیکن جیسے ہی یہ لوگ دہلی سے جے پور واپس آئے، انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ مہاراجا رام سنگھ کے دربار میں اِن سب کی پیشی ہوئی، بغاوت کا جرم عائد کر کے اِن سب کو قلعوں میں قید بند کر دیا گیا۔

اجمیر: اجمیر میں انگریزوں کی براہِ راست حکومت تھی اور وہاں چھاؤنی بھی قائم تھی۔ لہٰذا اجمیر چھاؤنی کے ہندوستانی سپاہیوں نے دہلی میں بغاوت کے بارے میں سُن کر 9 اگست 1857ء کو اجمیر جیل سے قیدی سپاہیوں کو چھڑا کر دیگر عوام کے ساتھ بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔

نصیر آباد: اجمیر کے قریب نصیر آباد چھاؤنی میں ہندو اور مسلمان انقلابیوں نے برطانوی حکومت سے بے حد ناراضگی کے سبب بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ انہوں نے مغل بادشاہ کو اپنا قائد اور حکمراں تسلیم کیا۔ دیگر وجوہات کے علاوہ ایک افواہ یہ پھیلی ہوئی تھی کہ آٹے میں ہڈّیوں کے پاؤڈر کی ملاوٹ کی جا رہی ہے۔ اس بات سے ہندو اور مسلمان دونوں مشتعل تھے۔ کیونکہ اس سے ان کے مذہب کو ٹھیس پہنچتی تھی۔ لہٰذا 28 مئی 1857ء کو نصیر آباد میں بغاوت شروع ہو گئی۔ انقلابیوں نے یورپی افسروں کی بندوقیں چھینیں، سرکاری عمارتوں کو نقصان پہنچایا، جب یورپی

حکام نے سخت قدم اٹھائے تو نصف نے تو خود کو سپرد کر دیا اور نصف وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

نیمچ: 3 جون 1857ء کو نیمچ چھاؤنی میں بھی بغاوت شروع ہو گئی۔ انقلابیوں نے سرکاری بنگلوں پر گولیاں چلائیں اور کرنل لارنس کی کوٹھی پر آئے۔ اِس بغاوت کے خاص سربراہ شیخ ارادت علی تھے، انہوں نے نیمچ پر قبضہ کر لیا تھا، فوجیوں کو جب انگریز حکام نے وفاداری کی قسم کی یاد دلائی تو ایک فوجی محمد علی نے انگریزوں سے طنزیہ طور پر سوال کرتے ہوئے جواب مانگا کہ 'کیا تم نے معاہدے پر عمل کیا تھا جو ہم کریں گے؟' اس بغاوت میں 2 انگریز عورتوں کو قتل کیا اور بچوں کو جلا دیا گیا، لیکن اُدے پور کے راجا کی فوج کی مدد سے اس بغاوت کی سرکوبی کر دی گئی۔ تمام انقلابی وہاں سے فرار ہو کر کچھ تو دہلی اور آگرہ پہنچے اور کچھ روہیل کھنڈ کے نواب بہادر خاں سے جا ملے۔ نومبر 1857ء میں شہزادہ فیروز شاہ نے نیمچ میں دوبارہ مورچہ کھولا۔ اس نے یہ اعلان کرایا کہ جہاں کہیں بھی انگریز پائے جائیں، انہیں اسی طرح سے مارو جیسے سانپ کو مارتے ہیں۔ اس مورچے پر بھی اُدے پور کے راجا کی طرف سے انگریزوں کو مدد حاصل ہوئی اور انقلابیوں کی شکست ہوئی۔

کوٹا: کوٹا میں محراب خاں کی سربراہی میں انقلابیوں نے 15 اکتوبر 1857 کو ایجنسی ہاؤس کا محاصرہ کیا، انہوں نے میجر برٹن کو قتل کیا اور مہاراؤ کے محل کا بھی محاصرہ کیا۔ چھاؤنی کی سرکاری عمارتوں پر قبضہ کیا، مجبوراً مہاراؤ نے اُدے پور کے راجا سے اس کی بیوی اور خاندان کی حفاظت کرنے کے لیے ان کے محل میں پناہ مانگی۔ آخر کار میجر جنرل رابرٹ اپنی بھاری فوج کے ساتھ آیا اور انقلابیوں کو شکست دے دی۔ محراب خاں اور ایک دوسرے انقلابی لیڈر جے دیال کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ انقلابی محمد خاں، امیر خاں اور گل محمد خاں جنگ میں مارے گئے۔ اکبر خاں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔

اوا: راجستھان کے ریاست اوا میں ٹھاکر کشال سنگھ نے جودھ پور کے راجا سے ناراض ہو کر بغاوت کا علم بلند کر دیا تھا۔ اسی کے ساتھ رسالدار عبدالعلی، عبّاس علی خاں، شیخ محمد بخش اور کرنل موتی خاں بھی شریک ہو گئے تھے۔ ماؤنٹ آبو اور ارن پورا میں بھی بغاوت ہوئی۔ موتی خان اس بغاوت کا سربراہ تھا، صوبیدار شیتل پرساد اور تلک رام بھی اس کے ساتھ مل گئے تھے اور انہوں نے 'دِلّی چلو اور انگریزوں کو مارو' کا نعرہ بلند کیا۔

ٹونک: راجستھان میں ٹونک ایک مسلم ریاست تھی، اس کا حکمراں وزیر محمد خاں تھے۔ میرٹھ چھاؤنی اور دہلی کی بغاوت کی جب خبر پہنچی تو نواب کی فوج کے سپاہیوں نے بغاوت کا علم بلند کیا، وزیر خاں امدادی صلح کے معاہدے کے پابند اور انگریزوں کے وفادار تھے۔ انقلابی انگریزوں کے ظُلموں سے تو بے حد ناراض ہی تھے، ٹونک کے حکمراں سے بھی ان کو شکایتیں تھیں، نواب کے بھائی صاحبزادہ منیر خاں اس بغاوت کے سربراہ تھے۔ اس بغاوت میں نواب کے چچا عظیم اللہ خاں اور نمباہیرہ کے غلام محی الدین بخشی بھی شریک تھے۔ انقلابیوں نے نواب کو گھر میں ہی قید بند کر دیا تھا۔

نمباہیرہ: بخشی غلام محی الدین نے نمباہیرہ میں بھی بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ انہوں نے مندیسر کے شہزادہ فیروز شاہ سے بھی مدد حاصل کی تھی، کیپٹن شاور نے اس بغاوت کی سرکوبی کے لیے سخت اقدام کیے۔ اس نے اپنی فوج لے کر قلعہ پر حملہ کیا اور انقلابیوں کو شکست کا منہ دیکھنا

پڑا۔ نواب کے حکم کے مطابق صاحبزادہ منیر خاں کو گرفتار کر لیا گیا اور قلعہ میں قید کر دیا گیا تھا۔ عظیم الدین خاں کو بھی قید کر لیا گیا۔ حافظ منیر عالم کو گرفتار کر کے پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ باقی انقلابی دہلی کی جانب کوچ کر گئے تھے۔ اس طرح راجستھان کے مختلف مراکز کی بغاوت کو دبا دیا گیا۔

23.6 گجرات میں بغاوت (Rebellion in Gujarat)

وڈودرا: گجرات ممبئی پریسی ڈنسی کا حصہ تھا۔ شمالی ہند کی بغاوت کا اثر گجرات کی ریاستوں پر بھی پڑا تھا۔ وڈودرا کا گائک واڑ حکمراں انگریزوں کے ساتھ امدادی صلح کا معاہدہ کر چکا تھا اور وہ ان کا پختہ وفادار دوست تھا۔ انگریزوں نے امدادی صلح کے عیوض گائک واڑ کی حفاظت کی ذمہ داری لی تھی۔ وڈودرا کے ہندو اور مسلمان انگریزوں کی مذہبی معاملات میں دخل اندازی سے پہلے ہی بہت نالاں تھے۔ جب شمالی ہند میں بغاوت کے شعلے بھڑکے تو بلوچ جمعدار اور نواب سرفراز علی خاں کی سربراہی میں انقلابیوں نے ریاستی حکمراں اور انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ وڈودرا کا ایک تاجر مگن لال بھی بغاوت میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ اپنے 100 آدمی اور 30 گھوڑے لے کر برن گور پہنچا۔ اس نے اپنی طاقت میں مزید اضافہ کر لیا تھا اور اب اس کے پاس 200 آدمی اور ایک سو پچاس گھوڑے ہو گئے تھے۔ لوڈرا گاؤں کے مقام پر برطانوی فوج سے مقابلہ ہوا۔ جس میں دو انقلابی مارے گئے اور 4 زخمی ہوئے۔ اس کے بعد آخر میں مگن لال کے ساتھی اسے چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ کانکواڑ کی فوج نے تھانہ سامے کے مقام پر مگن لال اور اس کے گیارہ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ اُن پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان میں سے تین کو بندوق کی گولیوں سے ہلاک کر دیا گیا اور تین کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ مگن لال کے باقی ساتھیوں کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ ایک دوسرے انقلابی وڈودرا کے عمر خان نے اپنے 13 وطن پرستوں کے ساتھ 1857ء میں بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ اِن سب کو بھی گرفتار کر کے قید بند کر دیا گیا۔ اس بغاوت کی ناکامی کی وجہ انقلابیوں میں آپسی تعاون اور تال میل کا فقدان تھا۔

ناندود: گجرات کے ضلع ناندود مقام راج پیپلا میں سید مراد علی کی سربراہی میں بغاوت کا علم بلند کیا گیا۔ شہر کی دیواروں پر پمفلٹ لگا کر لوگوں کو انگریزوں کے خلاف للکارا، نواب اور راجاؤں سے بغاوت میں شامل ہونے کی اپیل کی اور کہا کہ ان کے اس قدم سے بادشاہ بہادر شاہ بہت خوش ہوں گے۔ ایک معاملات دار بھی اس بغاوت میں شریک ہو گیا تھا۔ مسٹر روجر فوج لے کر ناندود میں مراد علی کا مقابلہ کرنے پہنچا اور اس کو گرفتار کر لیا گیا، لیکن وہ کسی طرح فرار ہو گیا۔ ایک عرب جمعدار بھی بغاوت میں شامل ہو گیا تھا، مگر وہ بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح ناندود کی بغاوت کی برطانوی فوج نے سرکوبی کر دی۔

دوہد اور گودھرا: دوہد اور گودھرا میں یکم جولائی 1857ء کو تالے دار کی سربراہی میں بغاوت شروع ہوئی، یہ ایک انعامی گاؤں کا جاگیردار تھا۔ اس کے ساتھ چُنّی لال دیسائی بھی بغاوت میں شریک ہو گیا۔ 600 انقلابیوں نے دوہد کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ یہاں سندھیا کی فوج بھی آئی ہوئی تھی، انگریزوں کے وفادار صوبیدار حسین شاہ خاں نے قلعہ پر حملہ کر کے انقلابیوں کو وہاں سے جانے پر مجبور کر دیا۔ کیپٹن بکل اپنی فوج کے ساتھ دوہد کی بغاوت کی سرکوبی کرنے آیا۔ 11 جولائی کو دوہد پہنچا۔ تالے دار اپنے ساتھیوں کو لے کر فرار ہو گیا۔ 23 جولائی 1857ء تک دوہد

کو انقلابیوں سے خالی کرا لیا گیا۔ 15 انقلابی گرفتار کیے گئے تھے، جن پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان میں سے ایک کو 14 سال کی بامشقت سزا دی گئی۔ 9 انقلابیوں کو تاعمر قید کی سزا دی گئی، 4 انقلابیوں کو سزائے موت دی گئی۔

گودھرا: گودھرا وڈودرا سے 45 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ بیزا بائی کی فوج کے لوگ گودھرا آئے۔ یہ بھوپاور مہوؔ اور اندور سے اپنی بندوقیں لے کر آئے تھے۔ انہوں نے گودھرا کے سرکاری آفسوں اور عمارتوں پر قبضہ کیا، کیپٹن بکل اور میجر تھامس شیپی کی سرکردگی میں گودھرا کی بغاوت کُچلنے کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کے آنے سے تمام انقلابی فرار ہو گئے۔

سُنتھ اور سانکھید: دکنی گجرات کے پنچ محل ضلع کے مقامات سُنتھ اور سانکھید پر بھی بغاوت کا اثر پڑا تھا۔ جمعدار مصطفی خاں نے وہاں کے لوگوں کے ساتھ حکمران مہارانا بھُون سنگھ جی کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ انقلابیوں میں سندھی، مکرانی اور کابلی بھی شامل تھے۔ مصطفی خاں کا جھگڑا تنخواہ کی عدم ادائیگی سے شروع ہوا تھا۔ وہ اپنے لوگوں کے ساتھ محل کے اندر داخل ہو گیا۔ آخر کار راجا کو بقایا تنخواہ ادا کرنے پر راضی ہونا پڑا۔ انقلابی لیڈر بھاؤ صاحب پوار بھی اپنے آدمیوں کے ساتھ بغاوت میں شریک ہو گئے۔ بھاؤ صاحب کے ساتھ روپا نائک اور کیول نائک بھی بغاوت میں شامل ہو گئے اور حملہ کر کے سرکاری عمارتوں کو نقصان پہنچایا۔ نارو کوٹ کا تھانہ برباد کیا، کیپٹن بیٹس کی سرکردگی میں برطانوی فوج نے انقلابیوں پر حملہ کیا۔ جمبو گھوڈا کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ انقلابیوں کی ہار ہوئی اور وہ جنگلوں میں جا چھپے۔ بھاؤ صاحب کے باغی نمائندے گنتپت رائے کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ مقابلہ ختم ہو جاتا مگر مکرانی جب اس میں شامل ہو گئے تو انہوں نے چمپانیر اور نارو کوٹ پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے انگریزوں کی فوج کے ناک تلے چنے چبوا دیے تھے۔ کرنل والیس جو اس بغاوت کو دبانے کے لیے مقرر ہوئے تھے، وہ بھی ناکام رہے، انقلابی اس علاقے پر دسمبر 1858ء تک قابض رہے۔ نائک بھائیوں نے گوریلا وار فیر کے طریقے آزما کر انگریزوں کو بہت پریشان کیا تھا۔ 28 جنوری 1859ء کو کیپٹن ہیوارڈ فوجدار حسین علی کی گولی سے زخمی ہوا۔ برطانوی فوج کے کچھ سپاہی اور سرکاری صوبیدار بھی مارے گئے۔ آخر کار کیپٹن رچارڈ بینر نے انگریزی فوج کی کمان سنبھالی۔ اُس نے روپا نایک اور کیول نایک انقلابیوں کے ٹھکانوں پر چھاپے مارے۔ آخر کار رُوپا اور کیول نے بینر کی نرم شرائط منظور کر لیں۔

مُدیتی: مُدیتی ایک چھوٹی سی جاگیر اِدر کے راجا کے ماتحت تھی۔ 1857ء کی دہلی کی بغاوت کی خبر سن کر سورج مل ٹھاکر نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر بغاوت کا علم بلند کیا۔ اِدر کے راجا نے میجر وہائٹ لوک سے مدد مانگی۔ 9 اگست 1857ء کو انقلابیوں نے مُدیتی پر حملہ کیا۔ لیفٹیننٹ لانے مُدیتی جا کر کیپٹن کونجر اور حسین شاہ کو انگریزی فوج کے ساتھ راجا کی مدد کرنے کا حکم دیا۔ اِن حالات کے پیش نظر انگریزوں نے ٹھاکر سے مکرانیوں کو مُدیتی سے نکالنے کی شرط رکھی تھی، لیکن معاہدہ نہ ہو سکا۔ 24 نومبر 1858ء کو آخر کار کیپٹن رائیکس نے سورج مل کو شکست دے دی۔ سورج مل نے جب اپنے آپ کو کمزور پایا تو اس نے اپنے ہتھیار راجا کے سامنے ڈال دیے، اس طرح مُدیتی کی بغاوت اختتام پذیر ہوئی۔

23.7 دکن میں مزاحمتی سرگرمیاں (Resistance Activities in the Deccan)

حیدرآباد: شمالی ہند میں 1857ء کی بغاوت جس جوش وخروش، انہماک اور قربانی کے جذبے سے ظہور پذیر ہوئی تھی، اتنی شدّت سے دکنی ہندوستان کے صوبوں اور ریاستوں میں نظر نہیں آتی۔ دکن میں صرف حیدرآباد کی بغاوت قابل ذکر ہے۔ پونا چھاؤنی کے مولوی نورالہدیٰ حیدرآباد کی کچھ اہم شخصیات سے گفت وشنید کررہے تھے، تاکہ وہاں بھی بغاوت کا علم بلند کیا جاسکے۔ آخر کار مولوی الہ الدین نے انقلابیوں کی سربراہی کا بیڑہ اُٹھایا، جیسے ہی دہلی کی بغاوت کے بارے میں سنا، حیدرآباد کے انقلابی بھی بغاوت پر آمادہ ہوگئے تھے، وہ پہلے ہی سے برطانوی سرکار کی پالیسیوں سے ناخوش تھے۔ پہلے انقلابیوں نے مکّہ مسجد اور چار مینار کی دیواروں پر عوام کو بغاوت کے بارے میں باخبر کرنے اور بغاوت کرنے اور اکسانے کے لیے پمفلٹ چسپاں کیے۔ جون 1857ء کو تمام انقلابی مکّہ مسجد میں جمع ہوگئے تھے۔ ان میں رشید الدین خاں اور مولوی الہ الدین بھی شریک تھے۔ 16 جولائی 1857ء کو انہوں نے جہاد کی ایک تفصیلی اسکیم تیار کی۔ بعدازاں مولوی الہ الدین کی سربراہی میں برٹش ریزیڈنسی پر حملہ کیا گیا۔ روہیلہ جمعدار ترّا باز خاں بھی بغاوت میں شامل ہوگئے۔ حیدرآباد کے نظام افضال الدولہ بلاواسطہ طور پر بغاوت کے نہ صرف حامی تھے، بلکہ مدد بھی فراہم کررہے تھے، لیکن انجام کار نظام حیدرآباد کے وزیر سرسالار جنگ نے جو انگریزوں کے وفادار تھے، اس بغاوت کو اپنی مصلحت انگریزی سے زیادہ مشتعل ہونے سے باز رکھا۔ سرسالار جنگ کے تعاون سے انگریزوں کی فوج نے حیدرآباد کی بغاوت کی بہت جلد سرکوبی کردی۔ اس وفاداری کا برطانوی حکومت نے سالار جنگ کو 'سر' کا خطاب عطا کیا تھا۔

ماسوائے حیدرآباد دکنی ہندوستان میں بغاوت کا اثر دیگر دکنی ریاستوں میں نہ ہونے کے برابر پایا جاتا ہے۔ بغاوت کی خبر سن کر کرناٹک میں میسور کے کچھ مسلمان ٹیپو سلطان کے مزار پر ہندوستان کے دیگر مراکز میں بالخصوص شمالی ہند میں بغاوت کی کامیابی کی دعائیں مانگنے ضرور گئے تھے۔ اس کے سوا وہاں کوئی قابل ذکر بغاوت کی تحریک نہیں ہوئی۔ تامل ناڈو میں چُنگل پت کے سلطان بخش نے اور سیّد حمید جلیل نے دہلی کی بغاوت کے بارے میں سن کر بغاوت کا علم بلند کیا تھا، مگر انگریزی فوج نے اس کی سرکوبی کردی۔ کوئمبتور میں شیخ عبداللہ، کڈّالور میں سیّد قاسم اور شیخ امام کے نام بغاوت کے محرکات سے جُڑے ہوئے تھے، جن کی گرفتاری کرلی گئی تھی۔ اس طرح کی چند مثالیں ضرور مل جاتی ہیں، لیکن دکنی ہندوستان میں بغاوت کی تحریک اس شدت سے ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی جس طرح شمالی ہند میں ہوئی تھی۔

23.7 ناکامی کے اسباب (Causes for Failure)

جب ہم بغاوت کی ناکامی کی وجوہات پر غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے کئی سوال اُبھر کر آتے ہیں، کیا یہ تحریک کچھ اصول اور ضابطوں کے پیراؤں میں منظم کی گئی تھی، کیا یہ کسی خاص سیاسی تحریک یا جماعت سے منسلک تھی؟ ان سوالوں کے جواب میں ہم پاتے ہیں کہ نہ تو یہ باقاعدہ منظم تحریک تھی اور نہ ہی یہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتی تھی۔ اگر ایک نعرہ دیا گیا تھا تو وہ تھا جہاد کا یا دھرم یُدھ کا، مگر یہ محض لوگوں میں جذبہ اُبھارنے کا وسیلہ تھا، نہ کہ کسی منظم جماعت کا ایجنڈا، یہ بغاوت نہ تو کسی خاص طبقے کی نمائندگی کررہی تھی اور نہ ہی اس کا کوئی مرکزی لیڈر تھا۔ فی الوقت جو مقصد ہر انقلابی کے لب پر تھا وہ برطانوی سامراج اور حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کا تھا اور ظالم حکومت سے آزادی

حاصل کرنا تھا۔ جدید خیالات اور نئی سوچ کی غیر موجودگی میں بس اس پر اکتفاء کیا گیا تھا کہ برطانوی حکومت کے مقابلے میں اپنے ہندوستانی حکمراں زیادہ فیض رساں اور بہتر ہوں گے۔ ہر طبقہ اور قوم اُن اغراض اور مفادات کی بھرپائی کا خواہاں تھا جو برطانوی حکومت نے ان سے سلب کر لیے تھے۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسا حیرت انگیز اچانک واقعہ درپیش ہوا تھا جس کی نظیر تاریخ کے پنّوں میں آج تک نظر نہیں آتی۔ اس میں انقلابیوں کے وطنی جذبے اور قربانیوں کی تو کمی نہیں تھی مگر جدید خیالات اور قومی پیمانے پر تنظیم کی یقیناً کمی تھی، جو ناکامی کی اوّل وجہ تھی۔ بغاوت کی ناکامی کی دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ ریاستی حکمران امدادی صلح کے معاہدوں سے بندھے ہوئے تھے۔ یہ اپنے مفاد اور اغراض کی وجہ سے ہمیشہ برطانوی حکومت کے وفادار رہے۔ امدادی صلح ہی کی وجہ سے ریاستی حکمرانوں کی جنگی صلاحیتیں بھی سلب ہو چکی تھیں۔ ان کی اپنی کوئی فوجی طاقت نہیں تھی بلکہ وہ انگریزی فوج پر منحصر رہتے تھے۔ درحالانکہ برطانوی فوج انہیں کے خرچے سے تیار کی گئی تھی مگر حکم انگریزوں کا چلتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی سپاہیوں کی شرکت نے بغاوت کی ریڑھ کی ہڈّی کا کام کیا تھا۔ اس کے باوجود ایک بڑی تعداد پھر بھی ہندوستانی سپاہیوں کی برطانوی فوج میں انگریزوں کی مددگار ثابت ہوئی تھی۔ متعدد ہندوستانی انگریزوں کے پٹّھو اور مخبر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

ایک دیگر اہم وجہ یہ تھی کہ ایک مرکزی باصلاحیت لیڈر کی غیر موجودگی اور ہر جگہ علیحدہ علیحدہ تحریکیں چلانے میں بغاوت منظم نہ ہو سکی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر مرکز میں انقلابیوں نے جذبۂ وطن پرستی کا زبردست مظاہرہ کیا تھا۔ بے خوف اور نڈر ہو کر جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ ان میں قابلِ قدر قربانی کا جذبہ تھا اور ان کی قربانیوں کی مثالیں آزادی کی تحریک میں آج تک دی جاتی ہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ انہیں یہ اندازہ بخوبی تھا کہ برطانوی فوج کے سامنے اُن کی مکمل فتح ناممکن تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی جانوں کی قربانیاں دیں، لیکن مرکز کے اندر اور مرکزوں کے مابین آپسی تال میل کا بہت فقدان تھا، جس کی وجہ سے انقلابیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

بغاوت کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ برطانوی فوجوں کے مقابلے میں انقلابیوں کے پاس جدید ہتھیاروں کی بہت کمی تھی۔ انگریز اگر کسی مرکز میں ناکام ہوتے تھے تو ان کی مدد کے لیے دیگر پریسیڈنسیز سے فوجی مدد بھرپور طریقے سے دستیاب ہو جاتی تھی۔

23.9 بغاوت کی اہمیت (Significance of the Rebellion)

مذکورہ بالا وجوہات سے 1857ء کی بغاوت ناکام رہی، لیکن اس ناکامی میں بھی ایک بڑی کامیابی پوشیدہ تھی۔ یہاں ایک ضرب المثل صادق آتی ہے کہ *'Dead Julius Caesar proved more powerful than when he was alive'* (مرحوم جُولیس سیزر بنسبت زندہ کے زیادہ طاقت ور ثابت ہوا۔)۔ 1857ء کی بغاوت کی نوعیّت اور مقاصد کے صرفِ نظر اگر ہم اس واقعہ کے مختلف طبقوں اور اداروں پر گہرے اثرات پر غور کریں تو بظاہر ناکامی کے باوجود تاریخ کا یہ واحد عظیم واقعہ تھا جو لا متناہی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ 1858ء میں ایک ایکٹ پاس کر کے ملکہ وکٹوریہ کی براہِ راست حکومت کا قیام، ملکہ کا شاہی فرمان، جس میں فیض رساں حکومت قائم کرنے کا وعدہ، حکومت کی نئی تنظیم اور اس کے پہلے وائسرائے لارڈ کیننگ کی احتیاط اور اعتدال کی پالیسی، برطانوی حکومت کی

کونسلوں میں ہندوستانیوں کی نمائندگی، لارڈ رِپن کے دور میں لوکل سیلف پنچایتوں کے الیکشن، لارڈ ڈفرن کے زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام اور تحریک آزادی کا آغاز، یہ سب حقائق 1857ء کی بغاوت کی اہمیت کا بیّن ثبوت ہیں۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ 1857ء کے بہادر سپوتوں نے فقید المثال قربانیوں کی وہ چھاپ چھوڑی تھی جس نے آزادی کی طویل تحریک کو بے حد متاثر کیا تھا۔ اس میں ہمارے متعدد لیڈروں نے جان کی بازی لگائی اور بڑی تعداد نے اپنی خوشحال زندگی کو خیر آباد کر کے آزادیٔ ہند کو پروان چڑھایا تھا۔ آج ہم آزادی کا سانس انہیں کی وجہ سے لے رہے ہیں۔ تاریخ کے اس گوناگوں اہمیت کے واقعہ سے نہ تو کسی ماضی کے واقعہ سے اور نہ ہی بعد کی کسی تحریک سے مماثلت کی جاسکتی ہے۔ اس واقعہ سے تمام طبقوں، قوموں، ہندو، مسلمان، انگریزوں تک نے سبق حاصل کیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہندوستان کے روشن مستقبل کی تشکیل نو بغاوت کے اثرات ہی میں مضمر ہے۔

23.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے جانا کہ 1857 کی بغاوت کی توسیع کس طرح ہوئی۔ کس طرح یہ بغاوت میرٹھ کی فوجی چھاونی میں ایک معمولی نافرمانی سے بدل کر ایک عظیم مسلح مزاحمتی تحریک میں تبدیل ہوگئی۔ شمال ہند خاص کر مغربی یوپی اور دہلی اس کے ابتدائی مراکز بنے جہاں سے یہ بغاوت آگے پھیلتی چلی گئی۔ بہادر شاہ ظفر کے بغاوت کا رہنما بنائے جانے کا عوام پر خاطر خواہ اثر ہوا جو اب بھی اس ضعیف مغل حکمراں کو اپنا شہنشاہ تسلیم کرتے تھے۔ ملک میں انگریزوں کے ظلم وستم سے ستائے ہوئے طبقے جیسے زمیندار جو نئے بندوبستوں سے پریشان تھے، متبنیٰ حکمراں جنہیں برطانوی حکومت گدی کا جانشین نہیں مانتی تھی، علما جنہیں اسلامی قانون اور تہذیب میں انگریزوں کی مداخلت سے پریشانی تھی، ہندو عوام جو قدیم رسم ورواج پر حکومتی قوانین سے ناراض تھے اور سب سے آخر میں مظلوم اور غریب کسان جس پر بے تحاشہ مہاجنی قرضوں کا بوجھ تھا اور بے روزگار دستکار جن کے کاروبار بدیسی حکومت نے تباہ کر دیے تھے، اس بغاوت میں بھرپور طریقے سے شامل ہوئے۔ قیادت میں اتحاد کی کمی اور فوجیوں میں نظم وضبط کے فقدان سے مزاحمت میں کامیابی بھلے ہی نہ مل سکی لیکن اس ایک بغاوت نے پورے انگریزی سسٹم کی چولیں ہلادیں اور انہیں احساس ہوگیا کہ اپنی حکمرانی برقرار رکھنے کے لیے صرف زور زبردستی سے کام نہ چلے گا۔ نتیجتاً کمپنی کے ہاتھ سے سیاسی اقتدار لے لیا گیا اور مقامی حکمرانوں کو برطانیہ کا حامی بنائے رکھنے کی پالیسی اپنائی گئی۔ مقامی رسم ورواج میں مداخلت میں بھی کمی آگئی اور انگریزوں کا اصلاحی جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس بغاوت نے آگے چل کر ہندوستانیوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا اور انہیں ایک قوم ہونے کا احساس دلایا جس کا ایک ہی مشترکہ دشمن تھا اور وہ تھا انگریزی حکومت۔ انگریزوں نے بھی ہندو مسلم اتحاد کے اس نظارے کو دیکھ کر ان میں پھوٹ ڈالنے کی پالیسی اپنائی جس کا نتیجہ بلآخر قیام پاکستان اور ملک کے بٹوارے کی شکل میں نکلا۔

23.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

برٹش ریزیڈنٹ : برطانوی حکومت کی طرف سے دیسی ماتحت ریاست میں مقیم حکومت برطانیہ کا نمائندہ۔

اودھ : ایک مغل صوبہ جس میں مشرقی یوپی، شمالی بہار اور مدھیہ پردیش کا کچھ علاقہ شامل تھا۔

23.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

23.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. دہلی میں باغیوں نے کسے فوجی قیادت سونپی؟
2. لکھنؤ میں بیگم حضرت محل نے کس کے قائم مقام کی حیثیت سے نظم ونسق سنبھالا؟
3. انگریزوں سے چن ہٹ کے مقام پر کس نے جنگ کی اور انہیں شکست دی؟
4. پیشوا باجی راؤ دوم کے مُتبنّیٰ بیٹے کا نام بتائیے۔
5. سر سید احمد خان جج کی حیثیت سے کہاں مقیم تھے؟
6. الہ آباد میں باغیوں کے قائد کون تھے؟
7. کس امدادی صلح کے معاہدے کے بعد فرخ آباد برطانوی سلطنت کا حصہ بن گیا تھا؟
8. اعظم گڑھ میں ہندوستانی سپاہیوں نے کب علم بغاوت بلند کیا؟
9. فیروز شاہ کون تھے؟
10. نصیر آباد میں آٹے میں کس چیز کے پاؤڈر ملانے کی افواہ تھی؟

23.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. دہلی میں بغاوت کے پھیلنے پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. لکھنؤ میں باغیانہ سرگرمیوں پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. کانپور میں بغاوت کے ابھرنے پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. شاہجہاں پور میں بغاوت کے ابھرنے پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. بغاوت کی ناکامی کے اسباب پر نوٹ لکھیے۔

23.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. آگرہ اور روہیل کھنڈ میں شورش پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. مرکزی ہندوستان میں مزاحمت پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. گجرات میں باغیانہ کاروائیوں کے ابھرنے پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

23.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ashraf, Mujeeb, *Muslim Attitudes towards British Rule and Western Culture in India in the first half of the Nineteenth Century*, Idarah-i-Adabiyat- Delhi, Delhi, 1982.
2. Ashraf, Mujeeb, *Some Aspects of British Colonial Rule in India*, New Delhi, 2002)
3. Bhattacharya, Sabyasachi ed., *Rethinking 1857*, Orient Longman, New Delhi, 2007.
4. Chaudhari, S.B., *Civil Rebellion in the Indian Mutinies*, *1857–1859*, The World Press Pvt., Ltd., Calcutta, 1957.
5. Divekar, V.D., *South India in 1857 War of Independence*, Lokmanya Tilak Smarak Trust, Pune, 1993.
6. EPW, *1857*: *Essays from Economic and Political Weekly*, Orient Longman in association with Sameeksha Trust, New Delhi, 2008.
7. Joshi, P.C. ed., *Rebellion 1857*, National Book Trust India, New Delhi, 2007.
8. Khan, Sir Syed Ahmad, *Causes of Indian Rebellion 1857*, Asha Jyoti Book Sellers & Publishers, Delhi, 2007.
9. Khan, Sir Saiyyad Ahmad, *Asbab-i-Baghawat-e-Hind*, Delhi, 1971.
10. Malleson, G.B., *The Indian Mutiny of 1857*, Rupa, New Delhi, 2005.
11. Marx and Engels, *The First Indian War of Independence*, *1857–1859*, Progress Publishers, Moscow, 1988 (first printing 1959).
12. Mishra, Amaresh, *Mangal Pandey*: *The True Story of an Indian Revolutionary*, Rupa, New Delhi, 2005.
13. Mukherjee, Rudrangshu, *Mangal Pandey*: *Brave Martyr or Accidental Hero?* Penguin, New Delhi, 2005.
14. Savarkar, V.D., *The Indian war of Independence*, Bombay, 1947.
15. Sen, Surendra Nath, *Eighteen Fifty-Seven*, The Publications Division, Government of India, Delhi, 1957.
16. Taylor. P.J.O., *What Really Happened during the Mutiny*: *A Day-by-Day Account of the Major Events of 1857–1859 in India*, Oxford University Press, New Delhi, 1999.
17. Taylor. P.J.O., *A Star Shall Fall*: *India in 1857*, Indus, New Delhi, 1993.

اکائی 24۔ ملکہ وکٹوریہ کا اعلامیہ اور انتظامی تنظیم نو

(Queen Victoria's Proclamation and Administrative Reorganisation)

اکائی کے اجزا

24.0 تمہید
24.1 مقاصد
24.2 ملکہ وکٹوریہ کا اعلامیہ
24.3 ہندوستان میں برطانوی حکومت کی از سر نو تنظیم
24.3.1 مرکزی انتظامیہ
24.3.2 صوبائی انتظامیہ
24.3.3 مقامی ادارے
24.3.4 فوج
24.3.5 عوامی خدمات
24.3.6 دیسی ریاستیں
24.4 1857 کے بعد انتظامی پالیسیاں
24.4.1 پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو
24.4.2 تعلیم یافتہ ہندوستانیوں سے نفرت
24.4.3 ہندوستانی زمینداروں کی حمایت
24.4.4 سماجی اصلاح کی طرف بے رخی
24.4.5 نئے مزدور قوانین
24.4.6 اخبارات پر پابندیاں
24.4.7 نسلی تفریق پر زور

24.5 اکتسابی نتائج

24.6 کلیدی الفاظ

24.7 نمونہ امتحانی سوالات

24.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

24.0 تمہید (Introduction)

1857 کی پہلی جنگ آزادی جسے انگریز سامراجی مورخین، سپاہیوں کی بغاوت، مسلمانوں کی سازش، مذہبی کٹر طبقات کا رد عمل یا روایتی طبقے کی سماجی اصلاحات کے خلاف بغاوت قرار دیتے ہیں اور اسے ایک مقامی اور علاقائی معمولی بغاوت گردانتے ہیں۔ دوسری طرف قوم پرست مورخین چاہے وہ فرقہ پرست ہوں یا معتدل اسے ایک متحد عوامی بغات یا پہلی جنگ آزادی تصور کرتے ہیں۔ بہر کیف اس پر اکائی 22 میں تفصیلی بحث کی چکی ہے، جب کہ اکائی 23 میں اس کے نتائج اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس اکائی میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ آخر اس عظیم واقعہ کے بعد کیا ہوا۔ برطانوی رد عمل کیسا تھا اور اس جنگ آزادی کے بعد ان کی انتظامی، سماجی اور معاشی پالیسیوں میں کس حد تک تبدیلی آئی۔ یہ بات تو طے تھی کہ ہندوستانی سماج کو اپنے مفاد کے مطابق ڈھالنے اور اسے جدید بنانے کی ان کی کوششوں کو سخت دھکا لگا تھا۔ بھورے رنگ کے انگریز بنانے کی ان کی خواہش دم توڑ چکی تھی، نتیجتاً ان طور طریقوں سے رجعت پسندی نمایاں ہونے لگی اور وہ ہر اصلاحی تحریک کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ برطانوی حکمراں طبقہ جو اب تک ہندوستانی حکمرانوں کی ظلم وزبردستی کی داستانیں گڑھتا اور انگریزی امن وانصاف کے قصیدے پڑھتا تھا، یک بیک ان جاگیرداروں اور رجواڑوں کا پکا حمایتی نظر آنے لگا۔ دیسی ریاستوں کی الحاق کی پالیسی قصہ پارینہ بن چکی تھی، اب انگریز اور ہندوستانی راجہ مہاراجا ایک ساتھ جام چھلکانے لگے۔ اہل برطانیہ سمجھ چکے تھے کہ عوامی بغاوت کی روک تھام کا اس سے بہتر ذریعہ کوئی نہیں تھا۔ عوام کی تعلیم میں سخت رکاوٹیں ڈالی جانے لگیں، البتہ کچھ قابل اعتماد ہندوستانیوں کو میونسپلٹیوں اور وائسرائے کی کونسل میں یہ دکھانے کے لیے رکھا گیا کہ اب سے ہندوستانی بھی انتظامیہ میں شریک ہیں۔ کمپنی راج کی لوٹ مار کے بجائے پورا برطانوی سرمایہ دار طبقہ، ہندوستانی سرمایہ کی لوٹ کھسوٹ میں لگ گیا۔ ہندوستان میں غیر ملکی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی گئی اور ان پر حد سے زیادہ منافع غیر ملکیوں کو دیا جانے لگا۔ ریلوے، تار، ڈاک نظام قائم کیا گیا جس سے کسی بھی انہونی سے قبل از وقت نپٹا جاسکے۔ یہی وہ دور تھا جب ہندوستانی جدید تعلیم یافتہ طبقہ حکومت کی ان تباہ کن پالیسیوں کو سمجھنے اور ان پر تنقید کرنے لگا۔ حکومت کا سرکاری بابو اور کلرک کا داؤ الٹا پڑ چکا تھا۔ طباعت اور اس کے نتیجے میں اخبارات اور رسائل کی اشاعت نے خیالات کے تیزی سے پھیلنے میں بیحد مدد کی۔ ہم خیال لوگ انجمنیں بنانے لگے اور ان میں سیاسی حال اور مستقبل کی باتیں کی جانے لگیں۔ حکومت نے ان چیزوں کو روکنے کی بھرپور کوشش کی لیکن اب بوتل کا جن باہر آچکا تھا۔ نئے مغربی تصورات جیسے آزاد خیالی، مساوات اور نسلی برتری کی مخالفت اب نوجوان ذہنوں میں گھر کر چکی تھی اور انگریزی تعلیم نے اس کے پھیلنے میں اہم کردار ادا کیا جو کہ میکالے کی روداد کے بعد سرکاری سطح کی زبان بن چکی تھی۔ 1857 کے بعد

حکومت نے اس پالیسی کو پلٹنے کی کوشش کی مگر تب تک عوامی سطح پر باشعور ہندوستانی خود تعلیم کی ضرورت محسوس کر کے متعدد تعلیمی ادارے قائم کر چکے تھے جو دھیرے دھیرے ہی سہی لیکن نوآبادیاتی پالیسیوں کے حق میں خطرناک ثابت ہوئے۔اس طرح ہم باقاعدہ قومی تحریک کے آغاز سے پہلے ہونے والی برطانوی انتظامی اور مجموعی پالیسیوں پر اور ان کے نتائج پر اس اکائی میں روشنی ڈالیں گے۔

24.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ملکہ برطانیہ کے اعلامیہ کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کی از سر نو تنظیم کو سمجھ سکیں گے۔
- مرکزی، صوبائی اور مقامی انتظامیہ میں آنے والی تبدیلیوں کی نشاندہی کر سکیں گے۔
- 1857 کے بعد انگریزوں کی تفریقی، قدامت پرستانہ اور جابرانہ پالیسیوں کو سمجھ سکیں گے۔

24.2 ملکہ وکٹوریہ کا اعلامیہ (Queen Victoria's Proclamation)

1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے وقت برطانیہ پر ملکہ وکٹوریہ کی آئینی بادشاہت قائم تھی۔1688 کے شاندار انقلاب کے بعد برطانیہ میں مطلق العنان بادشاہت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اقتدار اعلیٰ برطانوی پارلیمنٹ کے ہاتھ میں آچکا تھا۔1857 سے پہلے ہندوستان پر ایک تجارتی کمپنی یعنی برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی جسے مشرق سے تجارت کرنے کا چارٹر ملا ہوا تھا۔اس بات سے دیگر اہل برطانیہ سخت خفا تھے۔1813 میں انہوں نے کمپنی کی ہندوستانی تجارت پر اجارہ داری کا خاتمہ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک بل کے ذریعے کروا دیا۔1833 میں ایک دوسرے بل کے ذریعے کمپنی کی رہی سہی تجارت پر بھی پابندی لگادی گئی اور وہ صرف ایک حکمراں طاقت بن کر رہ گئی۔1857 کی جنگ آزادی سے برطانوی سرمایہ دار طبقے کو ایک بھرپور موقع فراہم ہوا۔انہوں نے کمپنی کی بدانتظامی کی آڑ لے کر اس کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔پہلے میٹکاف اور پھر ڈربی نے وہ قانون ڈرافٹ کیا جس نے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا مکمل خاتمہ کر دیا۔

بہر کیف پہلی جنگ آزادی کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو برخاست کر کے ہندوستان کی حکومت براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لی۔ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک مخصوص رقم ادا کرنا طے پایا تھا۔ڈائریکٹروں نے اپیلیں بھی کیں مگر ان اپیلوں پر کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔یکم نومبر 1858ء کو ملکہ وکٹوریہ نے ایک شاہی فرمان جاری کیا،اس فرمان کو ملکہ کی ہدایتوں کی روشنی میں لارڈ ڈربی نے ڈرافٹ کیا تھا۔اس میں تحریر تھا کہ ملکہ وکٹوریہ کی ہندوستانی حکومت فیض رساں،اعتدال پسند اور غیر جانبدار ہو گی۔کسی کے بھی ساتھ کسی طرح کا نسلی اور مذہبی امتیاز نہیں برتا جائے گا اور مذہبی رواداری پر عمل کرتے ہوئے عوام کو احساس دلایا جائے گا کہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت،ہندوستان کے تمام لوگوں کی فلاح و بہبود کا کام کرے گی اور ملک میں خوشحالی لائے گی۔مزید برآں ریاستی حکمرانوں کے ساتھ اچھے رویے کی یقین دہانی کی گئی اور بھروسہ دلایا گیا کہ آئندہ کسی بھی ریاست کا الحاق نہیں کیا جائے گا،اور پرانے معاہدے برقرار رہیں گے۔فرمان میں تمام قیدیوں کو رہا کرنے

کے احکام بھی جاری کیے گئے تھے،البتہ قاتلوں کی سزا کو بدستور رکھا گیا تھا۔

24.3 ہندوستان میں برطانوی حکومت کی از سر نو تنظیم

(Reorganisation of the British Rule in India)

1857ء کی بغاوت نے ہندوستان کے برطانوی انتظامیہ کی چولیں ہلا ڈالیں اور اس کی از سر نو تنظیم نا گزیر ہو گئی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بغاوت کے بعد کی پہلی دہائی میں ہندوستانی سماج، ہندوستانی حکومت اور ہندوستانی معیشت میں کافی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انتظامیہ کی از سر نو تنظیم کے لیے برطانوی حکومت نے 1858 میں حکومت ہند قانون(Government of India Act)نافذ کیا۔ اس قانون ا(21 & 22 Vict. c. 106)کو برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعہ 2 اگست 1858 کو منظور کیا گیا تھا۔ اس کی دفعات نے پارلیمنٹ کی سرپرستی میں ہندوستان پر برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی راج کے خاتمے اور اس کی انتظامی ذمہ داریوں کی تاج برطانیہ کو منتقلی کا مطالبہ کیا۔ برطانیہ کے اس وقت کے وزیراعظم لارڈ پامرسٹن(Lord Palmerston)نے 1858 میں حکومت ہند کا کنٹرول ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاج برطانیہ کو منتقل کرنے کے لیے ایک بل پیش کیا تھا، جس میں حکومت ہند کے موجودہ نظام میں موجود سنگین نقائص کا ذکر کیا گیا تھا۔ تاہم اس سے پہلے کہ یہ بل منظور کیا جاتا، پامرسٹن کو ایک اور معاملے پر استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا گیا۔ ایڈورڈ اسٹینلے(Edward Stanley)، 15 ویں ارل آف ڈربی(جو بعد میں ہندوستان کے پہلے سکریٹری آف اسٹیٹ بنے)نے بعد ازاں ایک اور بل پیش کیا جس کا عنوان تھا ‘An Act for the Better Governance of India’(ہندوستان کی بہتر حکمرانی کے لیے قانون)اور یہ 2 اگست 1858 کو منظور ہوا۔ اس قانون کے تحت ہندوستان پر براہ راست اور تاج برطانیہ کے نام پر حکومت کی جانی طے پائی۔

24.3.1 مرکزی انتظامیہ (Central Administration)

برطانوی پارلیمنٹ کے حکومت ہند قانون(Government of India Act, 1858)اور ملکہ وکٹوریہ کے اعلامیہ نے حکومت کے اختیارات ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے نکال کر تاج برطانیہ کو سونپ دیے۔ ہندوستان کی حکومت کے جو اختیارات کمپنی کے ڈائرکٹروں اور بورڈ آف کنٹرول کے اراکین کو حاصل تھے، وہ اب وزیر ہند یا سکریٹری آف سٹیٹ فار انڈیا (Secretary of State for India)اور اس کی ہندوستانی کونسل کو منتقل ہو گئے۔ وزیر ہند، برطانوی کابینہ کا ممبر ہونے کی حیثیت سے، چونکہ پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ تھا، اس لیے ہندوستان پر حقیقی اختیارات پارلیمنٹ کو حاصل ہو گئے۔ وزیر ہند کی کونسل ، جسے ہندوستانی کونسل (India Council) کہا جاتا تھا، اس کا کام وزیر ہند کو صلاح و مشورہ دینا تھا، جو اس کے مشورے کو مسترد بھی کر سکتا تھا۔ حالانکہ مالی معاملات میں کونسل کی منظوری ضروری تھی۔ 1869ء میں کونسل کو قطعی طور پر وزیر ہند کے ماتحت کر دیا گیا۔ ہندوستانی کونسل کے بیش تر رکن وظیفہ یاب برطانوی افسران ہوا کرتے تھے۔

جدید قانون کے تحت بھی ہندوستان کی حکومت گورنر جنرل ہی چلاتا تھا، جسے اب وائسرائے یا تاج برطانیہ کے ذاتی نمائندے کا لقب

دیا گیا۔ اسے بہت سے بھتوں کے علاوہ ڈھائی لاکھ روپے سالانہ تنخواہ دی جاتی تھی۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کی پالیسی اور اس پر عمل درآمد کے معاملے میں وائسرائے کے اختیارات کم ہوتے گئے اور برطانوی حکومت کے مقابلے میں اس کی حیثیت ماتحت کی سی ہوتی گئی۔ یہ کوئی نیا رجحان نہیں تھا۔ ریگولیٹنگ قانون(Regulating Act)، پٹس انڈیا قانون(Pitt's India Act)اور بعد کے چارٹر قوانین(Charter Acts)کے تحت حکومت پر موثر اختیارات لندن ہی کو حاصل رہے تھے۔ ہندوستان کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اگرچہ اپنے فائدے کے لیے فتح کیا تھا، تاہم اس پر حکمرانی کے اختیارات رفتہ رفتہ برطانوی سماج کے برسر اقتدار طبقے کو حاصل ہوگئے۔ 1858ء کے قانون نے اس رجحان کو مزید قوی کر دیا۔ لیکن ماضی میں فیصلہ کن اختیارات عملاً وائسرائے ہی کو حاصل رہے تھے، کیوں کہ لندن سے احکامات موصول ہونے میں کئی ہفتے لگ جاتے تھے اور اکثر فیصلہ کرنے کی فوری ضرورت ہوتی تھی۔ اس طرح سے لندن کے ارباب اختیار اقدام کا فیصلہ کرنے سے زیادہ اقدام کیے جانے کے بعد اس کا تجزیہ اور اس کی تنقید کرتے۔ دوسرے الفاظ میں وہ حکومت ہند چلاتے نہیں تھے، بلکہ اس کی نگرانی کرتے تھے لیکن 1870ء میں ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیانی تار کے ذریعے مراسلت (Telegram Communications)کا سلسلہ قائم ہوا۔ یہ سمندری تار بحر احمر میں ڈالے گئے تھے۔ اب لندن سے گھنٹوں میں احکامات موصول ہو جاتے تھے اور وزیر ہند، انتظامیہ کی ادنیٰ تفصیلات پر بھی نظر رکھ سکتا تھا اور لمحہ لمحہ کی خبریں اسے مسلسل مل سکتی تھیں۔ اس طرح سے ہندوستانی معاملات پر اختیارات اور ان کے فیصلے اب لندن میں ہونے لگے، جو ہندوستان سے ہزاروں میل دور تھا۔

انڈیا کونسل میں یا برطانوی کابینہ یا پارلیمنٹ میں کسی ہندوستانی کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اتنی دور رہنے والے آقاؤں تک ہندوستانیوں کی رسائی بھی ممکن نہیں تھی۔ ان حالات میں حکومت کی پالیسی پر ہندوستانی رائے عامہ کا اثر پہلے سے بھی کم ہو گیا۔ دوسری طرف حکومت ہند پر برطانوی صنعت کاروں، تاجروں اور ماہو کاروں کے اثرات بڑھ گئے۔ ان حالات نے حکومت ہند کو، 1858ء سے پہلے سے بھی زیادہ رجعت پرست بنا دیا، کیوں کہ لبرل ازم کا جو پردہ تھا، وہ بھی رفتہ رفتہ اٹھ گیا۔ 1858ء کے ایکٹ کے تحت وائسرائے کی ایک کونسل بنائی گئی، جس کا ہر رکن کسی شعبے کا سربراہ اور گورنر جنرل کا سرکاری مشیر ہوتا تھا۔ کونسل کے رکن کی حیثیت کابینہ کے وزیر کی ہوتی تھی۔ ابتدائی طور پر کونسل کے 5 اراکین ہوا کرتے تھے، لیکن 1918ء تک 6 عام اراکین کا اضافہ ہو گیا۔ ان کے علاوہ کمانڈر انچیف بھی رکن ہوتا تھا، جو فوج کے اعلیٰ ترین افسر کے فرائض انجام دیتا تھا۔ کونسل میں تمام معاملات پر بحث کی جاتی تھی، فیصلہ ووٹ کے ذریعے ہوتا تھا۔ لیکن گورنر جنرل کو کونسل کے اہم فیصلوں کو بھی مسترد کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ رفتہ رفتہ تمام اختیارات وائسرائے کی ذات میں مرکوز ہو گئے تھے۔

ہندوستانی کاؤنسل قانون (Indian Councils Act, 1861)نے قوانین بنانے کے لیے وائسرائے کی کونسل میں مزید اضافہ کیا اور اسے Imperial Legislative Council(شاہی مجلس عاملہ) کا نام دیا گیا۔ وائسرائے کو اپنی کونسل میں 6 سے 12 اراکین تک کے اضافے کا اختیار دیا گیا، جن میں سے نصف تعداد غیر سرکاری افراد کی ہو سکتی تھی۔ ان میں ہندوستانی بھی ہو سکتے تھے اور انگریز بھی۔ شاہی مجلس عاملہ کو چونکہ کسی قسم کے حقیقی اختیارات حاصل نہیں تھے، اس لیے اسے پارلیمنٹ کی ابتدائی یا کم تر شکل سے بھی تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محض ایک مشاورتی ادارہ تھا، جسے نہ تو اہم اقدامات پر بحث کرنے اور نہ مالی معاملات میں دخل دینے کا اختیار حاصل

تھا، تاآنکہ حکومت سے اس کی پہلے سے اجازت نہ لے لی جائے۔ بجٹ میں تو ہاتھ لگانے کا بھی اسے کوئی حق نہیں تھا۔ انتظامی معاملات پر بھی کوئی بحث نہیں ہوسکتی تھی بلکہ اس کے بارے میں اراکین سوال بھی نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں انتظامیہ پر مجلس عاملہ کو کوئی اختیار نہیں تھا۔ مزید براں وائسرائے کی منظوری کے بغیر اس کونسل کا منظور کیا ہوا کوئی بھی بل قانونی شکل اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ کسی بھی قانون کو وائسرائے ہند نامنظور کر سکتا تھا۔ گویا مجلس عاملہ کا صرف یہی کام تھا کہ وہ تمام سرکاری اقدامات کی تصدیق کر دے اور ظاہر یہ کیا جائے کہ اسے مجلس عاملہ نے پاس کیا ہے۔

نظریاتی طور پر کونسل میں ہندوستانی اراکین کا اضافہ اس لیے کیا گیا تھا کہ بہت سے برطانوی ارباب اختیار اور سیاستدانوں کا خیال تھا کہ اگر حکمرانوں کو ہندوستانیوں کے خیالات کا علم ہوتا تو 1857ء کی بغاوت رونما نہ ہوئی ہوتی۔ حالانکہ کونسل کے ہندوستانی اراکین کی تعداد اول تو بہت کم ہوتی تھی، دوسرے انہیں ہندوستانی عوام منتخب نہیں کرتے تھے، بلکہ وائسرائے نامزد کرتا تھا اور اس کی نظر انتخاب راجوں، مہاراجوں، ان کے وزیروں، بڑے زمینداروں، بڑے تاجروں اور وظیفہ یاب سرکاری افسروں پر ہی پڑتی تھی۔ یہ لوگ ہندوستانی قوم، یا روز افزوں قوم پرستانہ جذبات سے سراسر انجان یا اس کے مخالف ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے ہندوستانیوں کو حکومت میں کوئی دخل نہیں تھا اور اس وقت بھی حکومت اسی درجہ مطلق العنان تھی، جتنی کہ 1858ء سے پہلے تھی۔ یہ کوئی اتفاق کی بات نہیں بلکہ ایک سوچی سمجھی پالیسی تھی۔ انڈین کونسلس ایکٹ کے مسودے کو پارلیمنٹ میں پیش کرتے ہوئے، وزیر ہند نے کہا تھا کہ؛

> تمام تجربات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ جب ایک حاکم نسل کسی دوسری نسل پر فرمانروائی کرتی ہے، تو حلیم ترین حکومت کی شکل بھی مطلق العنان ہی ہوتی ہے۔

24.3.2 صوبائی انتظامیہ (Provincial Administration)

انگریزوں نے انتظامی مصلحتوں کے پیش نظر ہندوستان کو صوبوں میں تقسیم کیا تھا، جن میں سے 3 یعنی بنگال، مدراس اور بامبے کو پریسیڈنسی کہا جاتا تھا جن کا انتظام گورنر (Governor) اور اس کی سہ رکنی مجلس عاملہ (Executive Council) کے ہاتھ میں تھا۔ ان تین ارکان کو بھی تاج برطانیہ نامزد کرتا تھا۔ پریسیڈنسیوں کی حکومتوں کو ان باقی صوبوں کے مقابلے میں زیادہ اختیارات حاصل تھے جن کا انتظام لیفٹیننٹ گورنر (Lieutenant Governor) اور چیف کمشنر (Chief Commissioner) کے ہاتھ ہوتا تھا، جنہیں وائسرائے نامزد کرتا تھا۔ 1833ء سے قبل صوبائی حکومتوں کو بہت زیادہ خود مختاری حاصل تھی۔ اس کے بعد قوانین بنانے کے اختیارات صوبوں سے لے لیے گئے اور ان کے اخراجات پر مرکز کی گرفت شدید تر ہو گئی۔ لیکن جلد ہی تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک پر شدید مرکزیت کے اصولوں کے مطابق حکمرانی نہیں کی جاسکتی۔ 1861ء کے قانون نے مرکزیت کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ اس قانون کے تحت صوبائی حکومتوں کو بھی وہی اختیارات حاصل ہو گئے، جو بنگال، مدراس اور بمبئی کی پریسیڈنسیوں کی حکومتوں کو حاصل تھے۔ صوبائی مجالس عاملہ کی حیثیت بھی صلاح کار کی ہی تھی جن میں سرکاری افسروں کے علاوہ 4 سے 8 تک انگریز یا ہندوستانی غیر سرکاری ارکان بھی ہوتے تھے۔ یہ کونسلیں بھی جمہوری پارلیمنٹ کے اختیارات سے معرا ہوتی تھیں۔ شدید مرکزیت کے خراب اثرات،

مالیات(finance) کے میدان میں سب سے زیادہ نمایاں ہوئے۔ ملک کے تمام حصوں کے اور مختلف ذرائع سے حاصل شدہ محصولات(taxes)، مرکز میں جمع کیے جاتے اور مرکز ہی اسے صوبوں میں تقسیم کرتا تھا۔ صوبائی اخراجات(expenditure) کی چھوٹی سے چھوٹی چیز پر بھی مرکز کڑی نظر رکھتا تھا۔ بہر کیف یہ طریقہ کار عملی طور پر بیکار ثابت ہوا۔ مرکز کے لیے صوبائی حکومتوں کی محاصل کی وصولیابی یا اس کے اخراجات کی پوری نگرانی کرنا ممکن نہیں تھا۔ ایک طرف انتظامیہ اور مصارف کی ادنیٰ تفصیلات پر مرکز اور صوبائی حکومتوں میں بحث و تکرار ہوتی اور دوسری طرف صوبائی حکومتیں کم خرچ پر مائل نہ ہوتیں۔ چنانچہ ارباب اختیار نے مالیات کو مرکز سے آزاد کرنے کا فیصلہ کیا۔

1870ء میں لارڈ میوؔ نے مرکزی اور صوبائی مالیات کو جدا کرنے کا قدم اٹھایا۔ مرکز سے صوبائی حکومتوں کو ایک مقررہ رقم پولیس، جیل، تعلیم اور صحت کے شعبوں اور سڑکوں کی تعمیر کے لیے ملنے لگی۔ اس رقم کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے کا بھی اختیار صوبوں کو دیا گیا۔ ساتھ ہی اس رقم کو تمام محکموں میں تقسیم کرنے اور کمی و بیشی کرنے کا اختیار بھی صوبائی حکومتوں کو حاصل ہو گیا۔ 1877ء میں لارڈ لٹن نے لارڈ میوؔ کی اسکیم میں مزید توسیع کی۔ مالگزاری، آبکاری، نظم و نسق اور قانون و عدل وغیرہ کے محکموں کے اخراجات بھی صوبوں کو منتقل کر دیے گئے۔ صوبائی حکومتوں کو مزید اخراجات پورے کرنے کے لیے اسٹامپ، آبکاری ٹیکس اور انکم ٹیکس کی آمدنی کے دروں سے بھی ایک مقررہ رقم ملتی تھی۔ 1882ء میں لارڈ رپن کے عہد میں اس طریقہ کار میں مزید تبدیلیاں کی گئیں۔ صوبوں کو مقررہ رقم دینے کا طریقہ ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ پر محاصل کی وصولی کے بعض ذرائع کی ساری آمدنی صوبوں کو ملنے لگی اور دوسرے ذرائع آمدنی سے بھی ایک مقررہ رقم دی جانے لگی۔ اس طرح سے جملہ محاصل کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک عمومی (General or, Central) دوسرا صوبائی (State) اور تیسرا مشترکہ (Concurrent) یعنی وہ جسے مرکز اور صوبوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ مرکز اور صوبوں کے درمیان جو مالیاتی انتظام تھا، اس پر ہر پانچویں سال نظر ثانی کی جاتی تھی۔

مالیات کو مرکز سے جدا کرنے کے جن اقدامات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، انہیں نہ تو حقیقی صوبائی خود مختاری کی ابتدا قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ صوبائی نظم و نسق میں ہندوستانیوں کی شرکت کا آغاز ہی کہا جاسکتا ہے۔ ان کی نوعیت کم و بیش نظم و نسق کی تنظیم نو کی سی تھی، جس کا مقصد اخراجات میں کمی اور آمدنی میں اضافہ کرنا تھا۔ اصولاً اور عملاً سبھی اعلیٰ اختیارات، مرکزی حکومت ہی کو حاصل رہے اور صوبائی حکومتوں پر اسی کا مکمل اور موثر اقتدار رہا۔ ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا، کیوں کہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں کلیتاً وزیر ہند اور برطانوی حکومت کے ماتحت تھیں۔

24.3.3 مقامی ادارے (The Local Bodies)

مالی دشواریوں نے حکومت کو مجبور کیا کہ نظم و نسق میں مزید عدم مرکزیت پیدا کرے۔ چنانچہ میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ذریعے سے مقامی انتظامیہ کا آغاز ہوا۔ انیسویں صدی میں صنعتی انقلاب نے یورپی معیشت اور سماج کی شکل ہی رفتہ رفتہ بدل دی۔ یورپ کے ساتھ ہندوستان کے بڑھتے ہوئے روابط نے اور سامراجی معاشی استحصال کے نئے نئے طریقوں نے یہ ناگزیر بنا دیا تھا کہ ہندوستان میں بھی

معاشیات، صحت وصفائی اور تعلیم کے یورپی طریقوں کے آغاز کیا جائے۔ اس کے علاوہ ابھرتی ہوئی ہندوستانی قومی تحریک کا بھی تقاضا تھا کہ شہری زندگی میں جدید ترقیوں کو روشناس کیا جائے۔ چنانچہ عوام کی تعلیم، صحت وصفائی، پانی کی فراہمی، بہتر سڑکوں اور دوسری شہری خدمات کی ضرورت کا احساس بڑھنے لگا۔ حکومت ان اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی، کیوں کہ فوج اور ریلوے کے اخراجات نے مالیات کو پہلے ہی درہم برہم کر دیا تھا۔ نئے ٹیکسوں کا اضافہ کر کے حکومت اپنی آمدنی بڑھا نہیں سکتی تھی، کیوں کہ غریب لوگوں پر ٹیکس کا پہلے ہی بہت زیادہ بوجھ تھا، اب اس میں مزید اضافے سے حکومت کے خلاف عام بے اطمینانی پیدا ہونے کا امکان تھا۔ دوسری طرف بالائی طبقے پر حکومت ٹیکس لگانا چاہتی نہیں تھی۔ چنانچہ حکومت نے یہ سوچا کہ نئے ٹیکس ادا کرنا عوام کو اس وقت بھاری نہیں پڑے گا جب انہیں یہ سمجھا دیا جائے کہ اس ٹیکس کی آمدنی خود ان کی فلاح وبہبود پر خرچ کی جائے گی۔ اسی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ تعلیم، صحت وصفائی اور پانی کی فراہمی جیسے شعبوں کو مقامی بورڈوں کے حوالے کر دیا جائے، جو مقامی ٹیکسوں کے ذریعے سے ان کے اخراجات پورے کریں۔

بعض انگریز دوسری وجوہات سے بھی مقامی بورڈوں کے قیام کے حق میں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کسی نہ کسی نوع سے اگر نظم ونسق میں شامل کر لیا جائے، تو ان میں سیاسی بے اطمینانی پیدا ہونے کو روکا جا سکے گا اور یہ کام مقامی اداروں ہی کی سطح پر ممکن تھا جس سے ہندوستان میں برطانوی اقتدار اعلیٰ کی اجارہ داری کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا تھا۔ 1864ء اور 1868ء کی درمیانی مدت میں مقامی بورڈوں کا قیام عمل میں آیا۔ ان اداروں کے ممبر نامزد کیے جاتے تھے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ان کی صدارت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس لیے ان کو مقامی حکومت خود اختیاری کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا اور سمجھ دار ہندوستانی ذہن اس کو قبول بھی نہیں کرتا تھا کہ یہ مقامی حکومت ہے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ ٹیکس وصول کرنے کا یہ ایک نیا طریقہ ہے۔ لارڈ رپن کی حکومت نے 1882ء میں ایک قدم مزید آگے بڑھایا، جو غیر مستقل اور ناکافی تھا۔ حکومت نے ایک قرار داد کے ذریعے یہ پالیسی بنائی کہ مقامی معاملات کا انتظام زیادہ تر دیہی اور شہری مقامی اداروں کے ذریعے انجام پائے، جن کے بیشتر اراکین غیر سرکاری افراد ہوں۔ جہاں کہیں اور جب بھی سرکاری افسران نے محسوس کیا کہ الیکشن کا طریقہ رائج کیا جا سکتا ہے، وہاں ان اداروں کے اراکین کا انتخاب عوام کرتے تھے۔ اس قرار داد میں اس کی بھی اجازت دی گئی تھی کہ مقامی اداروں کی صدارت کے لیے غیر سرکاری فرد کا انتخاب عمل میں آئے۔ اس قرار داد پر عمل درآمد کے لیے صوبائی قانون پاس کیے گئے۔ لیکن تمام ڈسٹرکٹ بورڈوں میں اور اکثر میونسپلٹیوں میں، غیر سرکاری افراد اقلیت میں ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ رائے دہندگی کا حق چونکہ بہت ہی کم لوگوں کو حاصل تھا، اس لیے انتخاب کنندگان کی تعداد بہت محدود ہوتی تھی۔

میونسپلٹیوں کے چیرمین تو رفتہ رفتہ غیر سرکاری لوگ ہونے لگے تھے، لیکن ڈسٹرکٹ بورڈوں کے صدر کے فرائض ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہی انجام دیتے رہے۔ ان مقامی اداروں کی سرگرمیوں کو سختی سے اپنے قابو میں رکھنے کا فرض بھی گورنمنٹ نے اپنے حق میں محفوظ رکھا تھا اور وہ جب بھی چاہتی اسے معطل یا برطرف کر سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کلکتہ، مدراس اور بمبئی پریسیڈنسی شہروں کے علاوہ تمام مقامات پر مقامی بورڈ، سرکاری شعبے کی طرح کام کرتے تھے، جنہیں کسی طرح بھی مقامی حکومت خود اختیاری کا اچھا نمونہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بایں ہمہ سیاسی ذہن رکھنے والے ہندوستانیوں نے اس امید پر رپن کی قرار داد کا خیر مقدم کیا اور ان مقامی اداروں میں سرگرمی سے حصہ لیا کہ

آگے چل کر انہیں موثر حکومت خود اختیاری کے اداروں میں تبدیل کیا جاسکے گا۔

24.3.4 فوج (Military)

1858ء کے بعد ہندوستانی فوج کی تنظیم نو بڑی احتیاط کے ساتھ عمل میں آئی۔ بعض تبدیلیاں تو اس لیے ضروری ہو گئی تھیں کہ اقتدار تاج برطانیہ کو منتقل ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ذاتی فوج بھی برطانوی شاہی فوج میں ضم ہو گئی۔ فوج کی تنظیم نو کی سب سے زیادہ ضرورت، دوسری بغاوت کے سد باب کے لیے پیش آئی تھی۔ حکمرانوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ان کی حکمرانی صرف سنگینوں ہی کے سائے میں محفوظ رہ سکتی ہے۔ متعدد اقدامات ایسے کیے گئے جن سے ہندوستانی سپاہیوں کے بغاوت کرنے کی اہلیت کا اگر کلی طور پر نہیں تو کم از کم بڑی حد تک ضرور استیصال کر دیا گیا۔ سب سے پہلے فوج کے یورپی حصے کو بڑی ہوشیاری سے ہندوستانی فوج پر مسلط کیا گیا۔ بنگال آرمی میں یورپی اور ہندوستانیوں کا تناسب 1 اور 2 کا اور مدراس اور بمبئی میں 2 اور 5 کا تھا۔ مزید براں کلیدی جغرافیائی مقامات پر یورپی فوجیں ہی رکھی جاتی تھیں۔

اہم فوجی محکمے، مثلاً توپ خانہ اور بیسویں صدی میں ٹینک اور بکتر بند دستے صرف یورپی فوجیوں کے ہی ہاتھ میں رکھے جاتے تھے۔ افسری کے عہدوں سے ہندوستانیوں کو الگ رکھنے کی دیرینہ پالیسی پر سختی سے عمل درآمد کیا جاتا رہا۔ 1914ء تک کوئی بھی ہندوستانی صوبیدار کے عہدے سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہندوستانی فوج کی تنظیم 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی پر مبنی تھی۔ فوجی بھرتی کے سلسلے میں ذات پات، علاقے اور مذہب کی تفریق برتی جاتی تھی۔ ایک یہ افسانوی تصور بھی پیدا کیا گیا تھا کہ ہندوستانی فوجی اور غیر فوجی طبقوں میں منقسم ہیں۔ اودھ، بہار، وسطی ہند اور جنوبی ہند کو غیر فوجی قرار دیا گیا تھا۔ ان علاقوں کے فوجیوں نے ابتدائی دور میں انگریزوں کو ہندوستان فتح کرنے میں مدد دی تھی، لیکن آگے چل کر انہوں نے 1857ء کی بغاوت میں بھی حصہ لیا تھا۔ ان علاقوں کے لوگوں کو وسیع پیمانے پر فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس سکھوں، گورکھوں اور پٹھانوں کو بڑی تعداد میں بھرتی کیا جانے لگا، کیوں کہ انہوں نے 1857ء کی بغاوت کو کچلنے میں مدد کی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستانی رجمنٹوں میں مختلف ذاتوں اور گروہوں کو اس طرح مخلوط کیا جاتا تھا کہ ایک دوسرے کا توڑ ہو سکے۔ سپاہیوں میں فرقوں، ذات پات، قبائلی اور علاقائی وفاداری کے جذبات کو ہوا دی جاتی تھی، تاکہ ان میں قوم پرستی کا جذبہ پیدا ہی نہ ہو سکے۔ مثلاً بیشتر رجمنٹوں میں کمپنیاں، ذات پات اور فرقوں کی بنیاد پر ترتیب دی جاتی تھیں۔ وزیر ہند چارلس وڈ نے 1861ء میں وائسرائے کیننگ کو لکھا تھا:

> میں ایک ایسی عظیم فوج کو دیکھنا کبھی پسند نہ کروں گا جس کے جذبات واحساسات اور روابط میں بہت زیادہ ہم آہنگی ہو، جسے اپنی قوت پر اعتماد ہو اور جس میں متحد ہو کر بغاوت کرنے کی اہلیت ہو۔ میں یہ چاہوں گا کہ ایک رجمنٹ اگر بغاوت کرے تو اس کی مخالف ایک ایسی رجمنٹ موجود ہو جو اس پر گولی چلانے کے لیے تیار رہے۔

اس طرح سے ہندوستانی فوج ایک بھاڑے کی فوج بنی رہی۔ مزید براں اس امر کی ہر ممکن کوشش کی گئی کہ فوج کو ملک کے بقیہ لوگوں کی زندگی اور ان کے احساسات و جذبات سے یکسر بیگانہ رکھا جائے۔ ہر ممکن طریقے سے ملک کے قوم پرستانہ خیالات سے اس کو الگ

تھلگ رکھا گیا۔ اخبارات ورسائل اور قوم پرستانہ مطبوعات کو سپاہیوں تک پہنچنے سے روکا جاتا تھا۔ لیکن جیسا کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے، یہ تمام کوششیں ناکام رہیں اور ہندوستانی فوج کے بعض حصوں نے ملک کی جدوجہد آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔

ہندوستانی فوج، ایک عظیم فوج تھی۔ 1904ء میں ہندوستانی محاصل کا تقریباً 52 فی صد حصہ فوج پر خرچ ہو گیا۔ اس کے اخراجات زیادہ ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ متعدد مقاصد کی تکمیل کرتی تھی۔ ہندوستان چونکہ برطانیہ کا انتہائی قیمتی مقبوضہ یا نوآبادی تھا، اس لیے روس، فرانس اور جرمنی کی حریف سامراجی طاقتوں سے اسے مسلسل محفوظ رکھنا ضروری تھا۔ اسی باعث ہندوستانی فوج میں بہت زیادہ اضافہ ناگزیر ہو گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہندوستانی فوج سے ہندوستانی سرحدوں ہی کے دفاع کی خدمت نہیں لی جاتی تھی۔ افریقہ اور ایشیا کے براعظموں میں برطانوی مقبوضات کی توسیع و استحکام کے لیے بھی ہندوستانی فوجوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔ آخر بات یہ تھی کہ ہندوستانی فوج کا برطانوی حصہ ہندوستان پر برطانوی اقتدار کو برقرار رکھتا تھا اور اس کی بقا کا ضامن تھا۔ اس کے اخراجات کا بوجھ بھی ہندوستانی محاصل پر ہی پڑتا تھا، جو حقیقتاً بہت بھاری بوجھ تھا۔

24.3.5 عوامی خدمات (Public Services)

یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان کی حکومت میں ہندوستانیوں کی برائے نام ہی حصے داری تھی۔ انہیں نہ تو قوانین بنانے کا کوئی اختیار تھا، اور نہ سرکاری پالیسیاں مرتب کرنے ہی کا حق دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ افسر شاہی (Bureaucracy) سے بھی ہندوستانیوں کو علاحدہ رکھا جاتا تھا، جو سرکاری پالیسیوں پر عمل درآمد کرتی تھی۔ انتظامیہ میں اقتدار اور ذمہ داری کے تمام عہدے ہندوستانی سول سروس کے ان افسروں کو ملتے تھے، جن کو لندن میں منعقدہ مقابلہ جاتی سالانہ امتحان کے ذریعے بھرتی کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی بھی مقابلے کے اس امتحان میں شریک ہو سکتے تھے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے بھائی ستیندر ناتھ ٹیگور پہلے ہندوستانی تھے، جو 1863ء میں اس مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس کے بعد مزید کئی ہندوستانیوں کو بھی اس پرکشش سروس میں داخلہ ملا، لیکن انگریزوں کے مقابلے میں ہندوستانیوں کی تعداد اتنی ہی ہوتی تھی جیسے کھانے میں نمک۔ بہت سی دشواریوں کی وجہ سے ہندوستانی سول سروس کے دروازے ہندوستانیوں کے لیے عملاً بند ہی رہے۔ مقابلے کا یہ امتحان لندن میں ہوتا تھا۔ ذریعہ امتحان، ایک غیر ملکی زبان یعنی انگریزی تھی جس کی بنیاد کلاسکی یونانی و لاطینی علوم تھے جو انگلینڈ ہی میں رہ کر کثیر خرچے کے بعد حاصل کیے جا سکتے تھے۔ علاوہ ازیں امتحان میں شریک ہونے کی عمر رفتہ رفتہ کم کر دی گئی۔ 1859ء میں اس کے لیے عمر کی قید 23 سال تھی جو 1878ء میں گھٹا کر 19 سال کر دی گئی۔ 23 سالہ ہندوستانی نوجوانوں کے لیے اس امتحان میں کامیاب ہونا اگر دشوار تھا تو 19 سالہ نوجوان کے لیے اس میں کامیابی تقریباً ناممکن ہو گئی۔

اسی طرح سے انتظامیہ کے دوسرے محکموں جیسے پولیس، تعمیرات، صحت، ڈاک و تار، جنگلات، انجینیرنگ، کسٹم اور آگے چل کر ریل کے شعبوں کی زیادہ تنخواہ والی ملازمتیں بھی برطانوی شہریوں ہی کے لیے مخصوص رہیں۔ تمام اہم عہدوں پر یورپیوں کی تقرری کوئی اتفاق نہیں تھا بلکہ ہندوستان کے برطانوی حکمراں، اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے اسے لازمی سمجھتے تھے۔ چنانچہ وزیر ہند لارڈ کمبرلے نے

1893ء میں یہ اصول بنادیا تھا کہ 'سول سروس میں اہل یورپ کا کثیر تعداد میں تقرر، ناگزیر ہے۔' وائسرائے لارڈ لینسڈاؤن نے بھی اس پر زور دیا تھا کہ 'سلطنت کو اگر برقرار رکھنا ہے، تو یہ بھی قطعی ضروری ہے کہ اس وسیع مملکت کی حکومت، اہل یورپ کے ہاتھ میں رہے۔' ہندوستانی حالات کے دباؤ کے تحت 1918ء کے بعد نظم ونسق کے مختلف شعبوں کو ہندوستانی بنایا گیا، لیکن اقتدار واختیار کے عہدے برطانوی ہاتھوں ہی میں رہے۔ چنانچہ عوام نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ ملازمتوں کو ہندوستانی بنادیے جانے کے باوجود اقتدار کا سیاسی حصہ ان کے پاس نہیں آیا ہے اور یہ کہ ملازمتوں میں داخل ہونے والے ہندوستانی برطانوی نمائندے ہی ہیں اور برطانوی سامراجی مفاد کی خدمت، وفاداری سے انجام دیتے ہیں۔

24.3.6 دیسی ریاستیں (The Princely States)

1857ء کی بغاوت نے دیسی ریاستوں کے باب میں برطانوی پالیسی یکسر تبدیل کر دی۔ 1857ء سے قبل کسی بھی دیسی ریاست کا الحاق کرنے کے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ اب یہ پالیسی ترک کر دی گئی۔ بغاوت کے دوران میں بیشتر رجواڑے انگریزوں کے وفادار ہی نہیں رہے تھے، بلکہ بغاوت کو کچلنے میں سر گرمی سے ان کی مدد کی تھی۔ وائسرائے لارڈ کیننگ کے الفاظ میں دیسی ریاستوں نے 'طوفان میں پشتے' کا کام دیا تھا۔ ان کی اس وفاداری کے صلے میں یہ اعلان کیا گیا کہ متبنیٰ کرنے کے ان کے حق کا احترام کیا جائے گا اور ان کی ریاستوں کے آئندہ الحاق نہ کیے جانے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ مزید برآں بغاوت کے تجربے نے برطانوی ارباب اختیار کو یقین دلا دیا تھا کہ عوامی بغاوت میں رجواڑے بہترین حلیف اور حمایتی ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیننگ نے 1860 میں لکھا تھا:

> بہت عرصہ ہوا جب سر جان مالکم نے کہا تھا کہ کل ہندوستان کو ہم اضلاع میں تقسیم کر دیں تو ہماری سلطنت کا پچاس سال چلنا بھی ممکن نہ ہوگا، لیکن آج ہم اگر بہت سی دیسی ریاستوں کو برقرار رکھیں، جو سیاسی اقتدار سے معرا اور شاہی اقتدار کا آلہ کار ہوں، تو ہندوستان میں ہم اس وقت تک برقرار رہیں گے جب تک کہ ہماری بحری بالادستی باقی رہے گی۔ اس خیال کے حقیقت پر مبنی ہونے میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے اور حالیہ تجربات نے اس خیال کو ہماری توجہ کا زیادہ مستحق بنادیا ہے۔

دیسی ریاستوں کے باب میں سلطنت کی بقا تو برطانوی پالیسی کا ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ یہ ریاستیں کلی طور پر برطانوی ارباب اختیار کے تابع تھیں۔ 1857ء کی بغاوت کے دوران میں بھی دیسی ریاستوں کے داخلی معاملات میں انگریز مداخلت کرتے رہے تھے اور ان کی حیثیت ایک اقتدار اعلا کے باج گزار کی سی رہی تھی۔ اب یہ صورتحال زیادہ بدتر ہو گئی۔ اپنی ریاستوں کو برقرار رکھنے کے لیے رجواڑوں کو برطانوی اقتدار اعلا تسلیم کرنا پڑا۔ 1862ء میں کیننگ نے بہ بانگ دہل کہا کہ 'تاج برطانیہ کے قدم مستحکم طور سے جمے ہیں اور ہندوستان میں وہی مسلمہ اقتدار اعلا ہے۔' ملکہ وکٹوریا نے 1876ء میں قیصر ہند کا خطاب اختیار کیا، جس کا مقصد بھی اس امر کو واضح کرنا تھا کہ سارا ہندوستان برطانوی اقتدار اعلا کے تحت ہے۔ آگے چل کر تو لارڈ کرزن نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ رجواڑے اپنی ریاستوں پر تاج برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے حکمرانی کرتے ہیں۔ رجواڑوں نے بھی اس حیثیت کو تسلیم کیا اور بہ رضا ورغبت سلطنت کا چھوٹا بنا قبول کر لیا، کیوں

کہ انہیں یقین دلادیا گیا تھا کہ ان کی ریاستوں میں انہیں بدستور حکمرانی کرنے دی جائیگی۔ مقتدر اعلا ہونے کی حیثیت سے ریاستوں کے اندرونی معاملات کی نگرانی کرتے رہنا بھی انگریز اپنا حق سمجھتے تھے اور اپنے رزیڈنٹ کے ذریعے ریاستوں کے نظم ونسق میں مداخلت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ وزیروں اور اعلا افسروں کی تقرری اور برطرفی میں اپنی مرضی چلاتے تھے۔ بعض اوقات ریاست کے حکمراں کو بھی برطرف کرکے اقتدار سے محروم کردیا جاتا تھا۔ اس نوع کی مداخلت کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی خواہش ہوتی تھی کہ ان ریاستوں کے نظم ونسق کو بھی جدید طرز پر ڈھالا جائے تاکہ برطانوی ہند کے ساتھ ان کا اتحاد مکمل ہو جائے۔ اس عمل کو ریل، ڈاک اور تار کے نظام کی توسیع نے، نیز سکہ اور معاشی زندگی کی یکسانیت نے مزید تقویت بخشی۔ بعض ریاستوں میں جمہوری اور قومی تحریکوں کے ظہور نے مداخلت کے لیے مزید تحریک پیدا کی۔ برطانوی ارباب اختیار نے ایک طرف جمہوری و قومی تحریکوں کو کچلنے میں حکمرانوں کی مدد کی اور دوسری طرف نظم ونسق کی بدترین خرابیوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کی۔ ریاستوں کے بارے میں برطانوی پالیسی میں تبدیلی کی نمایاں مثالیں میسور اور بڑودہ کی ریاستوں کے واقعات ہیں۔ 1831ء میں ولیم بنٹنک نے میسور کے حکمراں کو گدی سے اتار کر ریاست کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ 1868ء کے بعد حکومت نے بوڑھے حکمراں کے متبنیٰ کو جائز حکمراں تسلیم کرکے 1881ء میں مکمل طور پر میسور ریاست نوجوان مہاراجا کے حوالے کردی۔ دوسری طرف 1874ء میں بڑودہ کے حکمراں کو بدنظمی کے اور ریزیڈنٹ کو زہر دینے کی کوشش کے الزام میں مختصر عدالتی کارروائی کے بعد گدی سے اتار دیا۔ بڑودہ کا الحاق نہیں کیا گیا، بلکہ گائیکواڑ خاندان ہی کے ایک نوجوان کو گدی پر بٹھادیا گیا۔

24.4 1857 کے بعد انتظامی پالیسیاں (Administrative Policies after 1857)

1857ء کے بعد ہندوستان کے متعلق برطانیہ کی روش بدلی اور اس کے نتیجے میں اس کی پالیسیاں بھی بدل گئیں۔ 1857 سے قبل انگریزوں نے بے دلی سے اور ڈر ڈر کے ہی سہی، ہندوستان کو جدید بنانے کی کوشش کی تھی، لیکن 1857ء کے بعد انہوں نے ارادی طور پر رجعت پسندی کی پالیسی اختیار کی۔ برطانوی مورخ پرسیول اسپیر (Percival Spear) کے الفاظ میں '1857ء کے بعد ترقی پسندی کے ساتھ حکومت ہند کے شب وصال کا دور ختم ہو گیا۔' گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان و برطانیہ کے ان افسروں نے، جن کو انتظامی اداروں پر اختیار حاصل تھا، سول سروس اور فوج کو اس طرح مرتب کیا تھا کہ ملک کے نظم ونسق سے ہندوستانیوں کو موثر طریقے پر الگ رکھا جاسکے۔ سابق میں 'ہندوستان کو حکومت خود اختیاری کے لیے تیار کرنے' کے نظریے کا کم از کم زبانی ہی اظہار کرلیا جاتا تھا، لیکن اب اعلانیہ یہ کہا جانے لگا تھا کہ ہندوستانی اپنے ملک پر حکومت کرنے کے اہل ہی نہیں ہیں اور لامحدود زمانے تک برطانیہ کو ہندوستان پر حکمرانی کرنا چاہیے۔ اس رجعت پسند پالیسی کا متعدد میدانوں میں اظہار بھی ہوتا تھا۔

24.4.1 پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو (Divide and Rule)

ہندوستانی طاقتوں کی نااتفاقی سے فائدہ اٹھا کر اور انہیں ایک دوسرے سے لڑا کر برطانیہ نے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا۔ 1858ء کے بعد بھی انہوں نے اس پالیسی پر عمل کیا۔ دیسی راجاؤں کو ان کی رعایا سے لڑا کر، ایک صوبے کو دوسرے صوبے کا مخالف بنا کر، ایک ذات کو

دوسری ذات کے خلاف، ایک گروہ کو دوسرے کے خلاف صف آرا کر کے اور سب سے بڑھ کر ہندو مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر انگریزوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی جاری رکھی۔ 1857ء کی بغاوت کے دنوں میں ہندو مسلمانوں نے جس اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا، اس نے غیر ملکی حکمرانوں کو پریشان کر دیا تھا۔ ابھرتی ہوئی قومی تحریک کا زور کم کرنے کے لیے انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے کا تہیہ کر لیا تھا اور اس مقصد کے حصول میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ بغاوت کے فوراً بعد مسلمانوں پر انہوں نے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے، وسیع پیمانے پر ان کی جائیدادیں ضبط کیں اور ہندوؤں کو اعلانیہ اپنا منظور نظر کہا کیونکہ ان کی نظر میں یہ بغاوت مغل سلطنت کے احیاءِ نو کے لیے خالصتاً مسلم کوشش تھی۔ 1870ء کے بعد یہ پالیسی بدل گئی اور قومی تحریک کی مخالفت کے لیے بالائی طبقے کے مسلمانوں کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں مذہبی بنیادوں پر پھوٹ ڈالنے کے لیے حکومت نے چالاکی سے ملازمتوں کو پرکشش آلہ کار کے طور پر استعمال کیا۔ صنعتی اور تجارتی پچھڑے پن کی وجہ سے، ساتھ ہی سماجی ملازمتوں کی کمی کے باعث تعلیم یافتہ مسلمانوں کا تمام تر انحصار سرکاری ملازمتوں ہی پر تھا، کیوں کہ ملازمتوں کے دیگر ذرائع بہت کم تھے۔ اسی بنا پر سرکاری ملازمتوں کے حصول کی شدید دوڑ شروع ہو گئی تھی۔ اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر حکومت نے صوبائی اور فرقہ وارانہ رقابت و منافرت کو ہوا دی۔ وفاداری کے صلے میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر سرکاری مراعاتیں دینے کا وعدہ کر کے حکومت نے تعلیم یافتہ مسلمانوں اور تعلیم یافتہ ہندوؤں کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا۔

24.4.2 تعلیم یافتہ ہندوستانیوں سے نفرت (Hatred for the Educated Indians)

1833ء کے بعد حکومت ہند نے جدید تعلیم کی سرگرمی سے ہمت افزائی کی۔ 1857ء میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا اور اس کے بعد اعلا تعلیم تیزی سے پھیلنے لگی۔ بہت سے برطانوی افسروں نے اس کی تعریف کی تھی کہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے 1857ء کی بغاوت میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن جلد ہی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے بارے میں حکومت کی سوچ بدل گئی، کیوں کہ جو تعلیم انہوں نے حال ہی میں حاصل کی تھی، اس کی مدد سے انہوں نے برطانوی حکومت کے سامراجی کردار کا تجزیہ کرنا شروع کر دیا اور ملک کے نظم و نسق میں ہندوستانیوں کی شمولیت کا مطالبہ کرنے لگے۔ حکمراں طبقہ اس وقت تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا اور ہندوستانیوں کی اعلی تعلیم کا اور بھی زیادہ مخالف ہو گیا جب انہوں نے قومی تحریک کو منظم کرنا شروع کیا اور 1885ء میں انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی داغ بیل ڈالی۔ اب حکومت نے اعلا تعلیم کی رفتار تیزی سے کم کرنے کی شروعات کی اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو 'بابو' کا لقب دے کر ان کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ اس طرح سے انگریز اس گروہ کے مخالف بن گئے جس نے جدید طرز کی مغربی تعلیم حاصل کی تھی اور جو جدید طرز پر ترقی کا خواہاں تھا، لیکن اس کی یہ ترقی بنیادی برطانوی مفادات اور برطانوی سامراجی پالیسیوں سے میل نہیں کھاتی تھی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی اور اعلا تعلیم کی سرکاری مخالفت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابتدائی دور میں ہندوستان کو ترقی دینے کا جو برطانوی جوش تھا، وہ اب ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

24.4.3 ہندوستانی زمینداروں کی حمایت (Support to Indian Landlords)

ترقی کے خواستگار ہندوستانیوں کی مخالفت کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے رجواڑوں زمیندار اور تعلقہ دار طبقے کی طرف دوستی کا ہاتھ

بڑھایا جو ہندوستانیوں کا انتہائی رجعت پرست گروہ تھا۔ رجواڑوں کے ضمن میں انگریزوں کی پالیسی میں تبدیلی کا اور انہیں عوامی و قومی تحریک کے خلاف پشتے کے طور پر استعمال کرنے کی پالیسی کا ہم پہلے ہی جائزہ لے چکے ہیں۔ زمیندار اور تعلقہ دار طبقے کو بھی رجواڑوں ہی کی صف میں کھڑا کیا گیا۔ مثلاً اودھ کے بہت سے تعلقہ داروں کی جائیدادیں، انہیں واپس کر دی گئیں۔ زمینداروں اور تعلقہ داروں کو ہندوستانی عوام کا قدرتی لیڈر قرار دیا گیا، ان کے مفادات اور ان کی مراعتوں کا احترام کیا گیا، ان کی جائیداد و املاک کو کسانوں کے مفاد کو نظر انداز کر کے، محفوظ رکھا گیا اور انہیں قوم پرستانہ ذہن رکھنے والے تعلیم یافتہ افراد کا توڑ بنایا گیا۔ وائسرائے لارڈ لٹن نے 1876ء میں واضح طور پر اعلان کیا کہ 'تاج برطانیہ کے اور عظیم دیسی طبقہ امرا کے خیالات، عزائم، تصورات اور مفادات کو اب ایک سمجھنا چاہئے۔' اس کے جواب میں زمینداروں اور تعلقہ داروں نے بھی اسے تسلیم کیا کہ ان کی زندگی بھی برطانوی حکومت کی بقا ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ چنانچہ وہ برطانوی اقتدار کے پختہ حلیف بن گئے۔

24.4.4 سماجی اصلاح کی طرف بے رخی (Apathy towards Social Reform)

رجعت پسند طبقوں کے ساتھ اتحاد کی پالیسی کے ایک حصے کے طور پر سماجی مصلحین کی امداد کی پالیسی انگریزوں نے ترک کر دی۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ستی کی رسم کا خاتمہ کرنا اور عقد بیوگان کی اجازت دینا ہی بڑی حد تک 1857ء کی بغاوت کا ذمہ دار تھا۔ چنانچہ انہوں نے کٹر مذہبی خیالات رکھنے والوں کا ساتھ دینا شروع کیا اور سماجی مصلحین کی تائید بند کر دی۔ چنانچہ، جیسا کہ جواہر لال نہرو نے *The Discovery of India* میں لکھا ہے: 'ہندوستانی رجعت پرستوں کے ساتھ برطانوی اقتدار کے قدرتی اتحاد کی وجہ سے حکومت ایسے بہت سے مضر رسوم و رواج کی محافظ اور علم بردار بن گئی، جن کی پہلے وہ مذمت کر چکی تھی۔' حقیقت یہ ہے کہ حکومت ایک عجیب مخمصے میں پھنس گئی تھی۔ وہ اگر سماجی اصلاح کی حمایت کرتی اور انہیں نافذ کرنے کے لیے قانون بناتی تو ہندوستانی کٹر مذہبی طبقہ اس کی مخالفت کرتا اور کہتا کہ ایک غیر ملکی حکومت کو ہندوستان کے داخلی سماجی معاملات میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ دوسری طرف سماجی اصلاح کے قوانین اگر نہ بنائے جاتے تو سماجی خرابیاں بدستور قائم رہتیں اور ترقی پسند ہندوستانی رائے عامہ اس کے لیے حکومت کو مورد الزام ٹھہراتی۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ سماجی معاملات میں انگریز ہمیشہ غیر جانب دار نہیں رہے۔ صورتحال کو بدستور قائم رکھنے کی تائید کر کے بالواسطہ طور پر مروجہ سماجی خرابیوں کا انہوں نے تحفظ کیا۔ مزید براں، سیاسی مقاصد کے لیے ذات پات کی تفریق اور فرقہ پروری کی حوصلہ افزائی کر کے سماجی رجعت پسندی کی انہوں نے سرگرمی سے تائید کی۔ سماجی خدمات کی انتہائی پسماندگی، انیسویں صدی کے یورپ میں جب تعلیم، صحت وصفائی، پانی کی فراہمی اور دیہاتوں میں سڑکوں کی تعمیر کا کام تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا، ہندوستان میں ان سب میدانوں میں انتہائی پسماندگی کا دور دورہ تھا۔ حکومت ہند اپنی کثیر آمدنی کا بیشتر حصہ فوج پر، جنگوں پر اور انتظامی عہدوں کی تنخواہوں پر خرچ کرتی رہی اور سماجی خدمات کا خانہ خالی رہا۔ مثلاً 1886ء میں سرکاری محاصل کی آمدنی تقریباً 47 کروڑ روپے ہوئی تھی۔ اس میں سے تقریباً 19.41 کروڑ روپے فوج پر خرچ کیے گئے۔ 17 کروڑ روپے نظم و نسق پر، دو کروڑ روپے سے کم تعلیم، ادویات اور صحت پر اور صرف 65 لاکھ روپے آبپاشی پر صرف کیے گئے۔ صفائی، پانی کی فراہمی اور صحت عامہ کے سلسلے میں جو لڑکھڑاتے ہوئے قدم اٹھائے بھی گئے، ان کا دائرہ عمل شہری علاقوں ہی تک اور شہری

علاقوں کی بھی سول لائنوں ہی تک محدود رہا۔اس کا فائدہ صرف یورپی آبادیوں کو یا بالائی طبقے کے ان مٹھی بھر لوگوں ہی کو پہنچا، جو شہروں کے یورپی حصے میں آباد تھے۔

24.4.5 نئے مزدوروں کے قوانین (New Labour Laws)

انیسویں صدی میں کارخانوں اور چائے کے باغات میں کام کرنے والوں کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ 12 سے 16 گھنٹوں تک انہیں کام کرنا پڑتا تھا اور آرام کے لیے ہفتہ واری چھٹی بھی انہیں نہیں مل پاتی تھی۔ بچوں اور عورتوں کے کام کے اوقات بھی مردوں ہی کی طرح طویل تھے۔ تنخواہیں بھی حد درجہ کم، 4 سے 20 روپے ماہوار تھیں۔ فیکٹریاں گنجائش سے زیادہ کھچا کھچ بھری رہتی تھیں، ہوا اور روشنی کا بہت کم گذر ہوتا تھا اور فضا نہایت غیر صحت مند ہوتی تھی۔ مشینوں پر کام کرنا بڑا جوکھم بھرا ہوتا تھا اور یہ وقت حادثہ پیش آنے کا خطرہ رہتا تھا۔

حکومت ہند نے جدید کارخانوں کی افسوس ناک حالت کی اصلاح کرنے کے لیے جن کے مالک بالعموم ہندوستانی ہی تھے، بڑی بے دلی سے ناکافی اقدامات کیے، کیوں کہ حکومت کا رجحان سرمایہ داروں کی طرف تھا۔ ان اقدامات کی پشت پر انسانی جذبہ اتنا کام نہیں کر رہا تھا بلکہ برطانوی کارخانہ دار حکومت ہند پر مسلسل دباؤ ڈال رہے تھے کہ مزدوروں کے لیے قوانین بنائے جائیں، کیوں کہ انہیں اندیشہ تھا کہ کم خرچ پر مزدوروں کی دستیابی سے ہندوستانی کارخانہ دار ،منڈیوں سے ان کے پیر اکھاڑ دیں گے۔ پہلا ہندوستانی کارخانہ قانون (Indian Factory Act)، 1881 میں پاس کیا گیا، جس کا تعلق بنیادی طور پر بچہ مزدوروں سے تھا۔ اس قانون کے مطابق 7 سے 12 سال تک کے بچے کارخانوں میں 9 گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ بچوں کے لیے مہینے میں چار دن کی چھٹی بھی ضروری تھی۔ اس قانون کے مطابق خطرناک مشینوں کے گرد حلقہ کھینچنا بھی ضروری تھا۔ دوسرا انڈین فیکٹری ایکٹ 1891ء میں منظور کیا گیا، جس میں تمام مزدوروں کے لیے ہفتہ واری چھٹی لازمی قرار دی گئی۔ عورتوں کے لیے کام کا وقت 11 گھنٹے مقرر کیا گیا اور بچوں کے کام کا وقت نو گھنٹے سے گھٹا کر سات گھنٹے کر دیا گیا، لیکن مردوں کے لیے کام کے وقت کا اب بھی تعین نہیں کیا گیا۔

ان دونوں قانونوں کے نفاذ سے چائے اور کافی کے باغات مستثنا تھے، جن کے مالک انگریز تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان باغات کے غیر ملکی مالکوں کو مزدوروں کا انتہائی بے دردی سے استحصال کرنے میں حکومت نے ان کی ہر طرح سے مدد کی۔ چائے کے بیشتر باغات آسام میں تھے، جہاں آبادی بہت کم اور آب و ہوا بے حد خراب تھی۔ چنانچہ وہاں کام کرنے کے لیے مزدور باہر سے لائے جاتے تھے۔ مزدوروں کو زیادہ اجرت دینے کا لالچ دینے کے بجائے، زبردستی اور دھوکہ سے بھرتی کر کے لایا جاتا اور پھر غلاموں کی طرح انہیں رکھا جاتا تھا۔ اس کام میں حکومت ہند نے باغات کے مالکوں کی پوری طرح مدد کی۔ اسی مقصد کے لیے 1863ء، 1865ء، 1870ء، 1873ء اور 1882ء میں تعزیری قوانین پاس کیے گئے۔ معاہدے کی عدم پابندی، مزدوروں کے لیے قابل تعزیر جرم تھا اور باغات کے مالکوں کو معاہدے توڑنے والے مزدوروں کو گرفتار کروانے کا حق تھا۔ بیسویں صدی میں بڑھتی ہوئی ٹریڈ یونین تحریک کے دباؤ کے تحت مزدوروں کے لیے بہتر قوانین وضع کیے گئے۔ لیکن اس کے باوجود مزدوروں کی حالت انتہائی تکلیف دہ اور افسوس ناک ہی رہی۔

24.4.6 اخبارات پر پابندیاں (Curbs on the Press)

انگریزوں نے ہندوستان میں چھاپے کی مشینیں روشناس کر کے، جدید صحافت کی داغ بیل ڈالی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اخبارات کی مدد سے رائے عامہ کی تربیت کی جاسکتی ہے اور تنقید و تبصرہ کر کے حکومت کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوا جاسکتا ہے۔ رام موہن رائے، ودیاساگر، دادابھائی نوروجی، جسٹس راناڈے، سریندر ناتھ بنرجی، لوک مانیہ تلک، سوبرامنیا ایر، بپن چندر پال اور دوسرے بہت سے لیڈروں نے اخبارات نکالے اور انہیں مضبوط سیاسی ترجمان بنادیا۔ قومی تحریک کے لیے اخبارات رفتہ رفتہ اہم حربہ بن گئے۔ ہندوستانی اخبارات پر جو پابندیاں عائد تھیں، چارلس مٹکاف نے 1835ء میں ان کا خاتمہ کیا اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے اس پر خوشی ظاہر کی۔ یہی وجہ تھی کہ اخبارات نے کچھ عرصے تک ہندوستان کی برطانوی حکومت کی حمایت بھی کی۔ لیکن ان اخبارات نے رفتہ رفتہ عوام میں قومی احساسات پیدا کرنا اور حکومت کی رجعت پسندانہ پالیسیوں پر نکتہ چینی کرنا شروع کر دیا۔ اس طرز عمل نے سرکاری حلقوں کو اخبارات کا مخالف بنادیا اور انہوں نے اخبارات کی آزادی کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے 1878ء کا ورناکلر پریس ایکٹ نافذ کیا گیا جس نے دیسی زبانوں کے اخبارات پر شدید پابندیاں عائد کیں۔ اس وقت تک ہندوستانی رائے عامہ کافی بیدار ہو چکی تھی، چنانچہ اس ایکٹ کے نفاذ کے خلاف خاصا احتجاج ہوا، جس کا اثر بھی ہوا اور 1882ء میں یہ قانون منسوخ کر دیا گیا۔ اس کے بعد چوتھائی صدی تک ہندوستانی اخبارات کو کافی آزادی حاصل رہی لیکن 1905 کے بعد جب سودیشی کی اور غیر ملکی مال کے بائیکاٹ کی جارحانہ تحریک شروع ہوئی تو 1908ء اور 1910ء میں جابرانہ پریس ایکٹ نافذ کیے گئے۔

24.4.7 نسلی تفریق پر زور (Racial Discrimination)

ہندوستان میں انگریزوں نے ہندوستانیوں سے اپنے کو ہمیشہ الگ تھلگ رکھا اور نسلی اعتبار سے وہ اپنے کو افضل سمجھتے رہتے۔ 1857ء کی بغاوت نے اور اس کے سلسلے میں جانبین کے ظلم و تعدی نے اس کھائی کو گہرا کر دیا جو انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان پہلے ہی سے حائل تھی۔ اب انگریزوں نے اعلانیہ اپنی نسلی افضلیت کے نظریے پر زور دینا اور اس کا عملی مظاہرہ کرنا شروع کیا۔ ریل کے ڈبوں، ریلوے اسٹیشنوں کے وِیٹنگ روموں، پارکوں، ہوٹلوں، تالابوں اور کلبوں وغیرہ میں 'صرف یورپیوں کے لیے' کے بورڈ نظر آنے لگے، جو نسلی برتری کے نمایاں مظاہر تھے۔ ہندوستانی اس کو اپنی تذلیل تصور کرتے تھے۔ جواہر لال نہرو کے الفاظ میں:

> انگریزوں کی آمد کے بعد ہم ہندوستانیوں کو ہر طرح کی نسل پرستی کا تجربہ ہوا ہے۔ انگریزی حکومت کا سارا فلسفہ 'حاکم نسل' کے تصور پر مبنی تھا اور اسی کی بنیاد پر اس حکومت کا پورا ڈھانچہ کھڑا کیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ 'حاکم نسل' کا تصور سامراجیت کا لازمی حصہ ہے۔ یہ ایک ایسا جزو ہے جسے چھپانے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ مقتدر لوگوں نے واضح الفاظ میں اس کا اعلان کیا۔ اس کا موثر ترین اظہار نظریہ سے زیادہ عمل سے ہوتا تھا جس کے نتیجے میں ہندوستانیوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر نسلاً بعد نسلاً اور برس ہا برس ذلت و اہانت اور حقارت بھرے برتاؤ کا سامنا رہا ہے۔ ہم سے کہا جاتا تھا کہ انگریز حاکم نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم پر حکومت کرنے اور ہمیں غلام بنائے رکھنے کے لیے خدا نے ان کو پیدا کیا

ہے۔اگر ہم احتجاج کرتے تو حکمراں نسل کی دلیرانہ صفات، ہمیں یاد دلائی جاتیں۔

24.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

1857 کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد برطانوی انتظامی پالیسیوں میں کافی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔1858 میں ملکہ وکٹوریہ نے ایک اعلامیہ جاری کیا، جس میں ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ انصاف کے ساتھ حکومت کرنے اور ملکی حکمرانوں کے حقوق کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا۔اس شاہی فرمان جاری کرنے کے ساتھ ہی 2اگست 1858ء کو ایک انڈیا ایکٹ پاس کیا گیا، جس کے تحت ہندوستان میں ملکہ وکٹوریہ کی حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا گیا، گورنر جنرل کی جگہ وائسرائے کا تقرر کیا گیا،اس کے لیے انگلینڈ میں ایک بورڈ آف کنٹرول کی تشکیل دیا گیا اور ایک سیکریٹری آف اسٹیٹ کا تقرر کیا گیا جو بورڈ سے صلاح ومشورہ کرکے ہندوستان کے وائسرائے کو ہدایات جاری کیا کرے گا۔ہندوستان میں وائسرائے کی بھی ایک کونسل تشکیل کی گئی تھی، جس میں یورپیوں کے علاوہ مخصوص ہندوستانیوں کو نامزد کرکے برائے نام نمائندگی دی جانے لگی۔

اس ایکٹ کے تحت لارڈ کیننگ کو پہلا وائسرائے مقرر کیا گیا۔کیننگ نے فرمان کے اصولوں کے تحت اعتدال پسندی اور احتیاط کی پالیسی اپنائی۔ریاستی حکمرانوں سے رشتے کے بارے میں اس نے اصولِ الحاق کی پالیسی کو خیرباد کرنے اور گود لینے کی رسم کو منظوری دے دی، لیکن اپنے اس اصول کو بھی واضح کردیا کہ وفادار ریاستی حکمرانوں کو انعامات اور خطابات سے نوازا جائے گا اور جو حکمراں بے وفائی اور غدّاری کریں گے،اُنہیں سزائیں دی جائیں گی۔چنانچہ اس اصول کے تحت حیدرآباد کے نظام کو انعام واکرام اور خطابات سے نوازنے کے علاوہ اس کے پُرانے علاقے واپس کردیے گئے۔اسی طرح گوالیار کے حکمران سندھیا کی بھی تعظیم وتکریم کی گئی۔مگر دھار اور کوٹا ریاستوں کے حکمرانوں کو 1857ء میں ان کی تلوّن مزاجی اختیار کرنے کی وجہ سے کچھ علاقے کھونے پڑے۔پُرانے انصافی اداروں کی تنظیم نو کی گئی جس کے تحت پریسیڈنسیز میں ہائی کورٹ قائم کیے گئے۔فوج کی تنظیم نو کی گئی اور فوج میں کافی تخفیف کردی گئی تھی، لیکن فوج کو ایک نئے اصول،ڈویزن اینڈ کاؤنٹر پوائنز، کے تحت مذہب اور ذاتوں کی ملی جلی فوج تشکیل کی گئی۔ہتھیار بند فوج میں یورپیوں ہی کو نوکری مل سکتی تھی،آزادانہ تجارت کو مزید فروغ حاصل ہوا۔اب پورا انگلینڈ ہندوستان سے تجارت کرسکتا تھا اور فائدے اُٹھا سکتا تھا۔اسی کے تحت درآمد پر ٹیکس کم لگائے گئے اور برآمد پر زیادہ ٹیکس لگائے گئے، جس سے انگلینڈ کو اور بھی زیادہ فائدہ پہنچا اور ہندوستان کی صنعتوں کی حالت بدتر ہوتی گئی۔

وائسرائے جون لارنس کے دور میں پنجاب ٹیننسی بل اور اودھ رینٹ بل پاس کیے گئے۔اس کے تحت جو کسان 12 سال سے جس زمین پر کھیتی کررہے تھے،وہ اس زمین کے مالک قرار دیے گئے۔اس قانون سے تعلقدار اور زمیندار ناراض ہوگئے تھے۔وائسرائے لارڈ میوٗ کے دور میں بجٹ میں اصلاحات کی گئیں۔لارڈ میوٗ نے اجمیر میں شہزادوں اور رئیس زادوں کے لیے جدید تعلیم کا انتظام کیا اور بالخصوص انجینئرنگ کالج قائم کیا۔لارڈ نارتھ بُرک نے اقتصادی حالات درست کیے، مگر وہ ہندوستانیوں کو جدید تعلیم مہیا کرانے کے حق میں نہیں تھا۔اس کا مقولہ تھا کہ 'سوتے ہوئے کتّوں کو مت جگاؤ،اُنھیں سونے دو۔'

لارڈ لٹن کا دور کئی اعتبار سے مُنفرد ثابت ہوا۔ سب سے پہلے اسے ایک بڑے قحط کا سامنا کرنا پڑا، جس میں اس نے اپنی صلاحیتوں سے مشکل مسئلوں کے حل نکالے، لیکن وہ ایک رجعت پرست حکمراں تھا۔ اس کے زمانے میں یکم جنوری 1877ء میں دِلّی دربار منعقد کیا گیا، جس میں تمام ریاستوں کے حکمرانوں کو اور ہندوستان کی مخصوص ہستیوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس میں جو حاضر نہیں ہوا اس کو غدّار قرار دیا گیا۔ تمام حکمرانوں نے ملکہ وکٹوریہ کے ساتھ وفاداری کی قسم لی تھی۔ اسی کے زمانے میں 1878ء میں ورناکلر ایکٹ پاس کر کے ہندوستانی زبانوں کے اخبارات پر پابندی لگادی گئی تھی۔ اسی سال ایک آرمس ایکٹ پاس کر کے ہندوستانیوں کو ہتھیار رکھنا ممنوع قرار دے دیا تھا، لٹن نے سرسید کے اینگلو محمڈن کالج، علی گڑھ کا 1876ء میں سنگِ بنیاد رکھا، جس کا پرنسپل ایک انگریز کو مقرر کیا گیا تھا۔ لارڈ رِپن کا دور فیض رساں کہا جا سکتا ہے، اس نے ایک لوکل سیلف گورنمنٹ کا ایکٹ پاس کر کے پنچایتوں میں الیکشن کرائے تھے۔

لارڈ ڈفرن کے زمانے میں ایک انگریز مصلح ایلن اوکٹیوین ہیوم نے 28 دسمبر 1885ء میں بمبئی میں مخصوص ہندوستانیوں کو مدعو کر کے ایک انجمن کا قیام کیا، جس کا نام انڈین نیشنل کانگریس رکھا گیا۔ اس کا پہلا اجلاس 28 دسمبر تا 30 دسمبر کو ڈبلیو۔ سی۔ بنرجی کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ ہیوم 1912ء تک اس کے سکریٹری بنے رہے۔ ہیوم کا یہ قدم ہندوستان کی جمہوری سیاست میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ حالاں کہ اس انجمن کا مقصد ہندوستانیوں کو آزادی دلانا نہیں تھا، بلکہ ہیوم کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی، ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اپنے مسائل پر بحث کریں اور حکومت سے گفت وشنید کر کے ان مسائل کا حل نکالیں، تاکہ 1857ء جیسی بغاوت دوبارہ رُونما نہ ہو سکے۔ آر۔ سی۔ مجومدار کے بقول کانگریس دراصل برطانوی حکمرانوں کے لیے ایک سیفٹی والو کا کام کرنے کے لیے تشکیل کی گئی تھی، لیکن بعدازاں اسی انجمن نے ہندوستانیوں کے لیے آبِ حیات کا کام کیا۔ یعنی جمہوریت اور جدید دور کی پیغامبر ثابت ہوئی۔ مجموعی اعتبار سے ملکہ وکٹوریہ کے دورِ حکومت میں جو آغاز میں تبدیلیاں کی گئیں وہ محض ظاہری تھیں۔ اگر غور کیا جائے تو سیاسی رجعت پرستی، اقتصادی انتفاع کی پالیسی میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔

24.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

رکن	:	فرد یا ممبر (member)۔
ہندوستانی کونسل	:	(Council of India) گورنر جنرل یا وائسرائے کی مشاورتی مجلس ۔
وزیر ہند	:	(Secretary of State for India) کابینہ یا وزیر عہدے کا ایک سرکاری افسر جو ہندوستانی معاملات اور انتظامیہ سے متعلق برطانوی پارلیمنٹ میں جوابدہ تھا۔
پریسیڈنسی	:	(Presidency) انگریزوں کے ذریعہ قائم کردہ تین بڑے اہم صوبے، بامبے بنگال اور مدراس۔
بابو	:	انگریز پڑھے لکھے ہندوستانیوں کو بون (baboon) یعنی بندر کہتے تھے جو آگے چل کر بگڑ کر بابو بن گیا۔

24.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

24.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے وقت برطانیہ پر کس کی حکومت تھی؟
2. ملکہ وکٹوریہ کے اعلامیہ کو کس نے ڈرافٹ کیا تھا؟
3. ہندوستانی کونسل سے کیا مراد ہے؟
4. وزیر ہند کون تھا؟
5. وزیر ہند کسے جوابدہ تھا؟
6. پریسیڈنسی کسے کہتے تھے؟
7. حکومت ہند قانون 1858 کو برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعہ کس تاریخ میں منظور کیا گیا تھا؟
8. کن تین صوبوں کو پریسیڈنسی کا درجہ حاصل تھا؟
9. انگریز بابو کہ کر کس کا مزاق اڑاتے تھے؟
10. کس نے مرکزی اور صوبائی مالیات کو جدا کرنے کا قدم اٹھایا؟

24.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ملکہ وکٹوریہ کے اعلامیے پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. 1857 کے بعد فوج میں آنے والی تبدیلیوں پر نوٹ لکھیے۔
3. دیسی ریاستوں سے متعلق برطانوی پالیسی میں تبدیلی پر نوٹ لکھیے۔
4. پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی پر نوٹ لکھیے۔
5. نسلی تفریق پر نوٹ لکھیے۔

24.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں 1857 کے بعد مرکزی، صوبائی اور مقامی انتظامیہ میں آنے والی تبدیلیوں پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. 1857 کے بعد زمینداروں کی حمایت، سماجی اصلاحات سے بے رخی اور نئے مزدور قوانین کس چیز کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟ تفصیلی وضاحت کیجیے۔
3. 1857 کے بعد فوج، عوامی خدمات بشمول دیسی ریاستوں سے متعلق نئی پالیسی، تمام تبدیلیوں پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

24.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ashraf, Mujeeb, *Some Aspects of British Colonial Rule in India*, New Delhi, 2002).
2. Bandyopadhyay, Sekhar, *From Plassey to Partition*: *A History of Modern India*, Orient Longman, New Delhi, 2004.
3. Chandra, Bipan, *History of Modern India*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2014 (first pub. 2009).
4. Dalrymple, William, *The Anarchy*: *The East India Company*, *Corporate Violence*, *and the Pillage of an Empire*, Bloomsbury, London, 2019.
5. Dube, Ishita Banerjee, *A History of Modern India*, Cambridge University Press, New Delhi, 2019.
6. Durant, Will, *The Case for India*, Standard Book Stall, Mumbai, 2007.
7. Subramanian, Lakshmi, *History of India*, *1707–1857*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2010.
8. Wilson, Jon, *India Conquered*: *Britain's Raj and the Chaos of Empire*, Simon and Schuster, London and New Delhi, 2017.

نمونہ پرچہ امتحان

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم
Bachelor of Arts بیچلر آف آرٹس
Subject Code: BAHS501CCT
Subject : History of India (1750 A.D. – 1885 A.D)
پرچہ: تاریخ ہندوستان (1750عیسوی تا 1885عیسوی)
5th Semester Examination ، پانچواں سمسٹر امتحان
Time : 3 hours گھنٹے 3 : وقت   Marks : 70 70 : نشانات

ہدایات

یہ پرچہ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔
(1 0 x 1 =10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں 8 سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو (200) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی 3 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً پانچ سو (500) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30Marks)

حصہ اول

سوال : 1

i. واسکوڈی گاما کالی کٹ کب پہونچا؟

ii. راس امید ('Cape of Good Hope') کس ملک میں ہے؟

iii. بمبئی کا جزیرہ کمپنی کو 1668ء میں کس سے حاصل ہوا؟

iv. ہندوستان میں فرانسیسی علاقائی سلطنت کی بنیاد کس نے ڈالی؟

v. پہلی کرناٹک جنگ کب شروع ہوئی؟

vi. 1717 میں فرخ سیر نے کس کو بنگال کا صوبیدار متعین کیا؟

vii. سالبائی کا معاہدہ کب ہوا؟

viii. پہلی اینگلو میسور جنگ کب سے کب تک ہوئی؟

ix. دولت کی نکاسی کا نظریہ (‘Drain of Wealth’) کس نے دیا تھا۔

x. رسالہ ’تہذیب الاخلاق‘ کس نے شروع کیا؟

حصہ دوم

2. بنگال میں دوہری حکومت پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. پورندر کی صلح کی کیا شرائط تھیں؟ بیان کیجیے۔
4. ٹیپو سلطان کی شخصیت پر ایک نوٹ لکھیں۔
5. ریگولیٹنگ ایکٹ پر ایک نوٹ لکھیے۔
6. دولت کی نکاسی کے نتائج پر ایک نوٹ لکھیے۔
7. ہندوستان میں خواتین کے لیے روایتی تعلیم پر ایک نوٹ تحریر کریں؟
8. ویریش لنگم کی Satihitha Bodhini پر مختصر نوٹ لکھیے۔
9. ملکہ وکٹوریہ کے اعلامیے پر ایک نوٹ لکھیے۔

حصہ سوم

10. جنوبی ہند میں انگریزی فرانسیسی جدوجہد پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے فرانسیسیوں کے ناکامی کے اسباب بیان کیجیے۔
11. پہلی اینگلو مراٹھا جنگ کے اسباب و نتائج پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
12. اٹھارویں صدی میں مسلم سماج میں رائج معاشرتی برائیوں پر روشنی ڈالیں۔
13. انیسویں صدی میں سماجی مذہبی اصلاحی تحریک میں انگریزی تعلیم اور زبان کے کردار پر تفصیلی نوٹ تحریر کریں۔
14. 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے سماجی و مذہبی اسباب بیان کیجیے۔

اہم نکات